www.shibliacademy.org

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف شبلی نمبر

جلد ۱۹۴ ماہ صفر و ربیع الاول ۱۴۳۶ھ مطابق ماہ نومبر و دسمبر ۲۰۱۴ء عدد ۵ و ۶

فہرست مضامین

شذرات	اشتیاق احمد ظلی	۲
استقبالیہ	اشتیاق احمد ظلی	۱۷
خطاب نائب صدر جمہوریہ ہند	عزت مآب محمد حامد انصاری	۱۹
کلیدی خطبۂ شبلی صدی بین الاقوامی سمینار	پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی	۲۳
مصادر و مآخذ کے پارکھ شبلی	پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی	۴۲
علامہ شبلی نعمانی اور علم حدیث	مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی	۷۵
پاکستان میں شبلی شناسی کی روایت......	ڈاکٹر طاہر تونسوی	۸۵
فارسی شاعری کی تاریخ میں علامہ شبلی کے امتیازات	پروفیسر شریف حسین قاسمی	۱۰۱
تحقیق منسوبات اور علامہ شبلی نعمانی	پروفیسر ظفر احمد صدیقی	۱۱۷
علامہ شبلی کے ایام علی گڑھ کی اولین تصنیف ”مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم“	پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی	۱۲۸
شبلی کی قطعہ نگاری	پروفیسر شہپر رسول	۱۴۱
شبلی اپنی اردو شاعری کی روشنی میں	پروفیسر خالد محمود	۱۵۳
مراسلات شبلی-ایک مطالعہ	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	۱۷۵
مولانا شبلی کے غیر مدوّن خطوط	ڈاکٹر شمس بدایونی	۲۰۲
علامہ شبلی اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی	ڈاکٹر عطا خورشید	۲۲۸
علامہ شبلی اور مولانا حالی کے تعلقات کا جائزہ	ڈاکٹر خالد ندیم	۲۵۰
علامہ شبلی نعمانی اور انجمن اسلام	جناب شمیم طارق	۲۶۶
علامہ شبلی اور شبلی شناسی کے چند نئے پہلو	ڈاکٹر عمیر منظر	۲۷۶
علامہ شبلی کا معارف نامہ	ڈاکٹر جمشید احمد ندوی	۲۸۴
نیشنل اسکول اور شبلی	ڈاکٹر علاؤالدین خاں	۳۲۵
نئے ادبی اصول اور شبلی	ڈاکٹر احمد محفوظ	۳۳۸
شبلی صدی مطبوعات-ایک نظر	عمیر الصدیق دریابادی ندوی	۳۴۷
روداد شبلی صدی تقریبات	کلیم صفات اصلاحی	۳۵۲
نذر علامہ شبلی نعمانی	جناب وارث ریاضی	۳۷۵

www.shibliacademy.org

شذرات

دارالمصنّفین کی طویل اور روشن تاریخ میں ۲۹؍نومبر سے یکم دسمبر ۲۰۱۴ء تک کے تین دن یادگار کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ان یادگار دنوں میں دارالمصنّفین نے اپنے عظیم موسس کو محبت اور عقیدت کا خراج پیش کرنے کے لیے شبلی صدی بین الاقوامی سمینار کا اہتمام کیا۔اس کا افتتاح نائب صدر جمہوریہ عزت مآب جناب حامد انصاری صاحب نے فرمایا۔یہ بھی عجیب حسن اتفاق تھا کہ اسی وقت علم و دانش کے اس سراج منیر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی نے اپنی کامیاب اور باثمر زندگی کے سو سال پورے کیے۔چنانچہ علامہ شبلی کی یاد منانے کے ساتھ ساتھ اکیڈمی کے سو سال پورے ہونے کا جشن بھی اس پروگرام کا حصہ تھا۔یہی وجہ ہے کہ اس موقع کی مناسبت سے کیے جانے والے انتظامات کے ساتھ ساتھ خود دارالمصنّفین کے کیمپس کو سجانے اور سنوارنے کا بھی پورا اہتمام کیا گیا تھا۔چھ سال قبل جب دارالمصنّفین کی تعمیر نو کے منصوبہ پر کام شروع کیا گیا تھا یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ ایک ایسا ادارہ جس کی تاریخ اتنی درخشاں اور روشن ہو،جس کی خدمات ایسی عظیم الشان ہوں اور جسے برصغیر کے مسلمانوں کے ایک بے بہا ملی ورثہ کی حیثیت حاصل ہو کس مپرسی اور زبوں حالی کی اس منزل تک بھی پہنچ سکتا ہے۔اداروں کی زندگی میں چھ سال کا عرصہ ایک بہت مختصر مدت ہوتی ہے اور اتنے کم وقت میں کسی بڑی تبدیلی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔لیکن اللہ کا فضل وکرم شامل حال ہو تو ناممکن بھی ممکن ہو جاتا ہے اور مشکل سے مشکل کام بھی آسان ہو جاتا ہے۔فضل ایزدی کی یہ کرشمہ سازی ہم نے اپنی آنکھوں سے دارالمصنّفین کے احاطہ میں دیکھی۔اُس وقت اس عظیم ملی ورثہ کے درودیوار پر برستی ہوئی ویرانی کو دیکھ کر دل میں درد و کرب کی ایک لہر سی اٹھی تھی اور دل کی گہرائیوں میں ایک آرزو نے سر اٹھایا تھا کہ توفیق ایزدی شامل حال ہوئی تو اس چمن کو ایک بار عروس کی طرح سجایا اور سنوارا جائے گا۔احساس تشکر سے سر بارگاہ رب العزت میں سجدہ ریز ہے کہ اس نے اپنے ایک بے مایہ بندے کی آرزو اس طرح پوری فرمائی جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔شبلی صدی اور دارالمصنّفین کی پلیٹینم جوبلی کی مناسبت

www.shibliacademy.org

سے اکیڈمی کو جس طرح سجایا اور سنوارا گیا وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس چمن میں جہاں سے بہار روٹھ گئی تھی ایک بار پھر قافلہ نو بہار خیمہ زن تھا اور اس شان سے کہ ایک عالم تماشائی تھا۔ یہ نظارہ دیکھنے کے لیے کتنے ہی مشتاقانِ دید آئے اور اس کی جلوہ سامانیوں کو آنکھوں اور کیمروں میں محفوظ کرلیا۔ یہ محض فضل ایزدی کی کارسازی تھی اور اس کے لیے رب کریم کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ بلاشبہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

افتتاحی اجلاس ۲۹/نومبر کو سہ پہر میں تین بج کر نو منٹ پر شروع ہوا۔ یہ اجلاس شبلی کالج کے وسیع میدان میں منعقد ہوا۔ اس کا پورا انتظام اور اہتمام شبلی کالج نے کیا تھا۔ یہاں یہ ذکر شاید بے موقع نہ ہو کہ علامہ شبلی کے تعلیمی اور ملی کاموں میں سب سے پہلا کام ۱۸۸۳ء میں نیشنل اسکول کی تاسیس تھی جو آج شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج کا خوبصورت قالب اختیار کر چکا ہے۔ دارالمصنّفین ان کی آخری اور سب سے عظیم الشان یادگار ہے۔ چنانچہ پہلے دن کی میزبانی شبلی کالج کی انتظامیہ کی طرف سے علامہ شبلی کی یاد کو بہترین خراج عقیدت تھا۔ اس سے پہلے جناب نائب صدر بارہ بج کر پینتالیس منٹ پر ہوائی پٹی اترے تھے جہاں وہ بنارس سے آئی-اے-ایف کے ہیلی کاپٹر میں تشریف لائے تھے۔ ہوائی پٹی پر ان کے استقبال کے لیے ضلع انتظامیہ کے علاوہ منسٹران ویٹنگ شری بلرام یادو اور اکیڈمی کے نمایندے موجود تھے۔ وہاں سے وہ سرکٹ ہاؤس تشریف لے گئے۔ ٹھیک ڈھائی بجے ان کا قافلہ اکیڈمی پہنچا جہاں لائبریری کے مین ہال میں ان کی نشست اور چائے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اکیڈمی میں اپنے تیس منٹ کے قیام کے دوران مہمان گرامی نے میوزیم کا معائنہ کیا اور وہاں محفوظ نوادر کو بہت دلچسپی اور توجہ سے ملاحظہ فرمایا اور وزٹرس بک پر اپنے تاثرات بھی رقم فرمائے۔ ٹھیک تین بجے اندرونی راستہ سے شبلی کالج کے لیے روانہ ہوئے۔ افتتاحی اجلاس کے لیے کالج گراؤنڈ میں ایک وسیع اور خوبصورت پنڈال کا انتظام کیا گیا تھا جس میں چار ہزار سے زیادہ لوگوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ اسٹیج کو بہت سلیقہ اور خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ اسٹیج پر جناب نائب صدر کے علاوہ شری بلرام یادو، کابینی وزیر حکومت یوپی، ڈاکٹر افسر علی، پرنسپل شبلی کالج، ڈاکٹر ظفرالاسلام خاں، صدر مجلس عاملہ شبلی اکیڈمی اور

www.shibliacademy.org

راقم حروف تھے۔ تین بج کر نومنٹ پر کالج کی ٹیم نے قومی ترانہ پیش کیا۔ تلاوت قرآن مجید کا فریضہ شاہنواز فیاض، ریسرچ اسکالر شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے ادا کیا۔ اس کے بعد مہمانان گرامی کی خدمت میں گلدستہ پیش کیا گیا۔ پروگرام کے لیے ۴۵ منٹ کا وقت مقرر تھا۔ وقت کم تھا اور پروگرام کو وقت پر ختم کرنا تھا۔ تلاوت قرآن مجید کے بعد سپاس نامہ پیش ہونا تھا لیکن ملک کے گوشہ گوشہ اور بیرون ملک سے آنے والے مہمانوں کا استقبال بھی ضروری تھا۔ مزید براں ملک اور اعظم گڑھ کے مخصوص حالات کے پس منظر میں اس تاریخی موقع پر ضرورت تھی کہ دارالمصنّفین کی طرف سے کوئی پیغام بھی جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے راقم حروف نے ایک نہایت مختصر استقبالیہ پیش کیا اور اس کے وسیلہ سے وقت اور حالات اور دارالمصنّفین کی تاریخ اور خدمات کی مناسبت سے قومی اتحاد اور ایکتا کا موثر پیغام بھی دیا گیا۔ یہ مختصر استقبالیہ اسی شمارہ کے صفحات میں ملاحظہ فرمایا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد راقم حروف نے عزت مآب نائب صدر جمہوریہ جناب محمد حامد انصاری صاحب کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کرنے کی عزت حاصل کی۔ پھر منسٹر ان ویٹنگ شری بلرام یادو نے خطاب کیا۔ اس کے بعد مہمان خصوصی جناب نائب صدر کا خصوصی خطاب تھا جو علم و دانش، بصیرت و آگہی اور وسیع مطالعہ اور گہری فہم کا آئینہ دار تھا۔ اس خطبہ کا پورا متن اسی شمارہ میں شریک اشاعت ہے۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں کے اظہار تشکر کے بعد مہمانان گرامی کو مومنٹو پیش کیے گئے۔ اس کے بعد قومی ترانہ کے ساتھ یہ یادگار اور تاریخی افتتاحی اجلاس اختتام کو پہنچا اور مہمان گرامی کا قافلہ ہوائی پٹی کے لیے روانہ ہوگیا۔ ایک بڑے مجمع نے جس توجہ اور دلچسپی اور نظم وضبط سے پروگرام کو سنا وہ قابل ستائش ہے اور اعظم گڑھ کی تہذیبی روایات کا آئینہ دار۔ اس پروگرام میں میں بڑی تعداد میں پرنٹ اور الکٹرانک میڈیا نے شرکت کی اور وسیع پیمانے پر اس کی رپورٹنگ ہوئی۔ اس کے علاوہ اکیڈمی کی ویب سائٹ کے ذریعہ اس کو براہ راست نشر کرنے کا انتظام بھی تھا جسے ملک اور بیرون ملک بڑی تعداد میں لوگوں نے دیکھا۔ اعظم گڑھ جیسے چھوٹے شہر میں ملک کے نائب صدر کی آمد ایک غیر معمولی واقعہ کی حیثیت رکھتی تھی اور اس کے شایانِ شان انتظامات آسان نہیں تھے۔ ہم ضلع انتظامیہ کے بیحد ممنون ہیں کہ ان کے سرگرم تعاون سے یہ مشکل آسان ہوگئی۔ اس کے لیے تیاری کے ہر مرحلہ میں ہمیں ضلع انتظامیہ کا مکمل تعاون حاصل رہا اور

www.shibliacademy.org

جناب نائب صدر کی آمد سے متعلق جملہ انتظامات نہ صرف تسلی بخش تھے بلکہ نہایت اعلیٰ درجہ کے تھے۔اس کے لیے ہم ضلع انتظامیہ کے تہِ دل سے مشکور ہیں۔

اسی دن بعد مغرب اکیڈمی کے کانفرنس ہال میں ایک خصوصی اجلاس کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت حضرت مولانا محمد رابع ندوی صاحب نے فرمائی۔ نظامت کے فرائض اکیڈمی کے سینئر رفیق مولانا عمیر الصدیق ندوی صاحب نے ادا کیے۔اس اجلاس کو مولانا سید جلال الدین عمری صاحب، مولانا تقی الدین ندوی صاحب، مولانا سعید الرحمٰن اعظمی صاحب، پروفیسر شمیم جیراج پوری صاحب، پروفیسر نعیم الرحمٰن فاروقی صاحب اور پروفیسر اختر الواسع صاحب نے خطاب کیا۔اس سمینار کے لیے کلیدی خطبہ پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی صاحب نے لکھا تھا۔اسے پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی صاحب نے پیش کیا۔شبلی صدی مطبوعات کے سلسلہ میں جو کتابیں شائع کی گئی تھیں ان کی تقریب رونمائی بھی اسی اجلاس میں انجام پائی۔ان میں علامہ شبلی کی شہرۂ آفاق تصنیف سیرۃ النبیؐ کی ابتدائی دو جلدوں کا یادگار اڈیشن بھی شامل ہے، اسے بڑے اہتمام سے آرٹ پیپر پر شائع کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ اس موقع پر جن کتابوں کی رونمائی کا اہتمام کیا گیا ان میں ''شبلی کی آپ بیتی'' مرتبہ ڈاکٹر خالد ندیم، جناب کلیم صفات کی تصنیف ''دارالمصنّفین کے سو سال''، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کی مرتبہ ''شذرات شبلی'' اور ''الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی'' کا تحقیقی اڈیشن شامل ہے۔اس کی تحقیق مشہور محقق ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی نے کی ہے اور اس میں بہت کچھ مفید مواد کا اضافہ کر دیا ہے جن میں علامہ شبلی کی بعض دوسری عربی تحریروں کے علاوہ علامہ شبلی کے بارے میں سید رشید رضا کی نگارشات شامل ہیں۔ڈاکٹر جاوید علی خاں کی تصنیف "Muhammad Shibli Nomani: Life and Contributions" بھی اس موقع پر ریلیز کی گئی۔گذشتہ دنوں جامعۃ الفلاح بلریا گنج میں ''علامہ شبلی کے تعلیمی نظریات'' کے موضوع پر ایک اہم سمینار کا انعقاد ہوا تھا۔اس سمینار میں پیش کیے جانے والے مقالات کا مجموعہ بھی شائع کر دیا گیا ہے، اس کی رونمائی بھی اس موقع پر کی گئی۔رام پور رضا لائبریری نے کچھ پہلے فارسی قرآنی مخطوطات کی فہرست شائع کی تھی جو علامہ شبلی کو معنون کی گئی تھی، اس کی

www.shibliacademy.org

رونمائی بھی اس موقع پر کی گئی۔

اگلے دو دن ۳۰ر نومبر اور یکم دسمبر مقالات کی خواندگی اور ان پر بحث و تمحیص کے لیے وقف تھے۔ سمینار میں پیش کیے جانے والے مقالات کی تلخیص پہلے ہی حاصل کرلی گئی تھی اور ایک مجموعہ کی صورت میں شرکاء کو فراہم کردی گئی تھی۔ تلخیص کے لحاظ سے سمینار میں کل ۹۲ مقالے پیش ہوئے تھے لیکن مختلف اسباب کی وجہ سے کئی متوقع شرکاء تشریف نہیں لاسکے۔ اس طرح ان دو دنوں کے دوران کل ۸۶ مقالے پیش کیے گئے۔ اس سمینار کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں چار زبانوں، عربی، انگریزی، ہندی اور اردو میں مقالات پیش کیے گئے۔ انگریزی اور ہندی مقالات کے لیے الگ سیشن کا اہتمام کیا گیا جب کہ عربی مقالات کو اردو مقالات کے ساتھ شامل کرلیا گیا۔ یہ اپنے طرح کا ایک نیا تجربہ تھا۔ اس امر کو یقینی بنانے کے لیے مقالات کی پیشکش کے لیے شرکاء کو مناسب وقت مل سکے اور ساتھ ہی سوال و جواب کے لیے بھی گنجائش نکالی جاسکے ۳۰ر نومبر کو تین الگ الگ سیشن کا انتظام کیا گیا؛ ایک اکیڈمی کے کانفرنس ہال میں اور دو کالج میں۔ یکم دسمبر کو تین کے بجائے دو سیشن ساتھ ساتھ چلتے رہے، ایک کانفرنس ہال میں اور دوسرا لائبریری کے ریڈنگ ہال میں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا ہوتا تو تمام شرکاء کے مقالے پیش نہ کیے جاسکتے۔ اس سلسلہ میں خاص بات یہ تھی کہ اگرچہ ایک ساتھ تین الگ الگ سیشن چل رہے تھے لیکن کہیں بھی سامعین کی کمی نہیں تھی۔ عام طور پر اچھے سمیناروں میں سامعین کی جیسی حاضری ہوتی ہے ویسی ہر جگہ تھی اور کانفرنس ہال تو ہر وقت پوری طرح بھرا رہتا تھا۔ گویا تین سمینار بیک وقت چل رہے تھے۔ سامعین کے سلسلہ میں ایک بات جو باہر سے آنے والے مہمانوں نے خاص طور سے نوٹ کی وہ ہر سیشن میں بڑی تعداد میں خواتین کی موجودگی تھی۔

اعظم گڑھ ایک دور افتادہ مقام ہے اور خاص طور سے ہوائی سفر کرنے والوں کے لیے وہاں پہنچنا خاصا مشکل ہے۔ یہ علامہ شبلی اور دارالمصنّفین کے نام کی کشش تھی کہ نہ صرف ملک کے گوشہ گوشہ سے اسکالرز یہاں تشریف لائے بلکہ دنیا کے مختلف ملکوں سے بھی زحمت سفر اٹھا کر

www.shibliacademy.org

علامہ شبلی کی یاد میں منعقد ہونے والے اس سمینار میں شرکت کے لیے آئے اور یہاں کی رونق بڑھائی۔ جن ممالک سے محققین تشریف لائے تھے ان میں امریکہ، انگلینڈ، ملیشیا، ترکی، مصر، ابوظبی، سعودی عرب، ساؤتھ افریقہ اور پاکستان شامل تھے۔ بنگلہ دیش، کینیڈا اور ہانگ کانگ سے بھی اسکالرز کی آمد متوقع تھی لیکن کسی نہ کسی سبب سے یہ ممکن نہ ہوسکا۔ پاکستان سے بڑی تعداد میں شرکاء کی آمد کی توقع تھی لیکن ویزا نہ ملنے کی وجہ سے جسٹس محمد الغزالی صاحب، سپریم کورٹ آف پاکستان، کے علاوہ کوئی اور نہیں آسکا۔ ہم کو اس بات کا بہت ملال ہے کہ اس تاریخی موقع پر پاکستانی اسکالرز ہمارے ساتھ موجود نہیں تھے اور ہم ان سے مستفید نہ ہوسکے۔ ہم نے ان کی آمد کو یقینی بنانے کے لیے ہر وہ کوشش کی جو ہمارے امکان میں تھی لیکن وزارت خارجہ اور وزارت داخلہ دونوں کے اجازت ناموں کے باوجود ہمارے معزز مہمانوں کو ویزا نہ مل سکا۔ یہ ہمارے لیے بہت دکھ کی بات ہے۔ دونوں ملکوں کے باشندوں کے درمیان خیر سگالی کے جو جذبات پائے جاتے ہیں اس کا اظہار محترم جسٹس محمد الغزالی صاحب کے مختصر قیام کے دوران بار بار ہوا۔ سماج کے ہر طبقے نے ان کا کھلے دل سے خیر مقدم کیا اور ان کی آمد پر مسرت اور اطمینان کا اظہار کیا اور دوسرے اسکالرز کی عدم موجودگی پر گہرا رنج وغم ظاہر کیا۔ جب وہ واپس تشریف لے جارہے تھے تو یوپی میں برسر اقتدار سماج وادی پارٹی کے ضلعی صدر حولدار یادو جی، عالم بدیع صاحب اور نفیس احمد صاحب کی قیادت میں مقامی ہندو اور مسلم سیاسی کارکنوں کا ایک منتخب مجمع ان کو رخصت کرنے کے لیے موجود تھا اور ان کی طرف سے ان کو گلدستہ اور شال پیش کی گئی۔ پاکستانی شرکاء کی عدم موجودگی اس کامیاب تاریخی سمینار میں ایک بڑی کمی تھی جس کا احساس برابر رہا اور ہر سطح پر اس کا بار بار اظہار بھی ہوا۔ میڈیا میں بھی اس کی واضح گونج سنائی دی۔

یہ تقریب شبلی صدی سمینار کے ساتھ ساتھ شبلی اکیڈمی کے سو سال پورے ہونے کا جشن بھی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نے ایک بھرپور جشن کی صورت اختیار بھی کرلی۔ یہ کسی ایک طبقہ کا نہیں بلکہ پورے اعظم گڑھ کا جشن تھا جس میں سماج کے ہر طبقہ نے پورے جوش وخروش اور جذبہ سے حصہ لیا۔ اس مناسبت سے اکیڈمی کو خوب سجایا اور سنوارا گیا تھا۔ عام دلچسپی کے

www.shibliacademy.org

پیش نظر میوزیم کو اس طرح ازسرنو ترتیب دیا گیا کہ آنے والوں کے سامنے دارالمصنّفین کی لائبریری میں محفوظ نوادر کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ اکیڈمی کی پوری تاریخ آجائے اور اس کی خدمات اور حصول یابیوں کا ایک نقشہ ان کے سامنے آجائے۔ یہ کوشش پوری طرح کامیاب رہی اور بڑی تعداد میں مرد، عورتیں، بچے، ہندو اور مسلمان اکیڈمی میں آئے اور خاص طور سے میوزیم کو دیکھا۔ انہوں نے اس امر پر حیرت اور مسرت کا اظہار کیا کہ ان کے اپنے شہر میں عالمی شہرت رکھنے والا ایسا خوبصورت ادارہ موجود ہے۔ شہر اور آس پاس کی آبادی عام طور سے اکیڈمی سے بے خبر اور لاتعلق سی رہتی آئی ہے۔ عام تاثر یہ رہا ہے کہ یہ علم و دانش کی ایک ایسی دنیا ہے جو عام آدمی کی پہنچ سے باہر ہے۔ اس جشن نے ایک ایسا موقع فراہم کردیا جس کے دوران مقامی آبادی کو اکیڈمی کو قریب سے دیکھنے اور اس کی خدمات سے واقفیت حاصل کرنا ممکن ہوسکا۔ اکیڈمی کا نام اور اس کی خوبصورت عمارتوں اور سبزہ زاروں کی تصویریں گھر گھر پہنچ گئیں۔ اپنی صد سالہ تاریخ میں اس طرح اکیڈمی پہلی بار عوامی سطح پر بات چیت اور گھریلو گفتگو کا موضوع بنی اور اس کے کام سے واقفیت عام ہوئی۔ پوری تقریب کے دوران وہاں ایک میلہ کا سماں رہا۔ اس وقت جب یہ سطریں لکھی جارہی ہیں اس جشن کو اختتام پذیر ہوئے تین ہفتہ سے زیادہ کا عرصہ گذر چکا ہے لیکن ابھی لوگ بڑی تعداد میں برابر اکیڈمی آرہے ہیں۔ امید ہے اس کے اچھے اور دوررس اثرات مرتب ہوں گے۔

دارالمصنّفین کا بنیادی کام مستند اور صحت مند لٹریچر تیار کرنا اور اس کے ذریعہ ملک و ملت کی ذہنی اور علمی نشو ونما اور تعمیر و ترقی رہا ہے۔ ایک اچھے معاشرہ کی تعمیر کے لیے اچھا لٹریچر ایسے ہی ضروری ہے جیسے ایک صحت مند انسان کے لیے متوازن غذا۔ دل و دماغ کی روشنی اور نشو ونما کے لیے اچھی کتاب سے بہتر کوئی اور وسیلہ نہیں۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ دنیا میں سب سے اچھا ساتھی کتاب ہے۔ معاشرہ کو کتاب سے جوڑنا اور اس کے ذریعہ ایک اچھے معاشرہ کی تشکیل و تعمیر وہ بلند اور اعلیٰ نصب العین ہے جس کے حصول کے لیے دارالمصنّفین گذشتہ ایک صدی سے برابر کام کرتا رہا ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر دارالمصنّفین کی پلیٹینم جوبلی کی مناسبت سے یہ ضرورت

www.shibliacademy.org

محسوس کی گئی کہ اس موقع پر ایسے اقدامات کیے جائیں جن سے یہ تعلق مزید مضبوط ہو اور معاشرہ میں کتاب کا چلن عام ہو۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس موقع پر کتابوں کی ایک اچھی نمائش کا بھی اہتمام کیا گیا۔ اس کا موٹو رکھا گیا ''کتابیں بلا رہی ہیں''۔ ہم راجیو رنجن کے شکر گذار ہیں کہ انہوں نے اس کی پوری ذمہ داری سنبھال لی۔ اس سے پہلے بھی وہ کتابوں کی نمائش کا اہتمام کرتے رہے ہیں اور ایک دو مرتبہ یہ نمائش اکیڈمی کے احاطہ میں بھی منعقد ہو چکی ہے۔ اس بار یہ نمائش دارالمصنّفین کی دعوت پر منعقد کی گئی تھی اور اس کے لیے اکیڈمی کی طرف سے دعوت نامے ارسال کیے گئے تھے۔ خواہش یہ تھی کہ اردو، ہندی اور انگریزی کتابوں کی ایک اعلی درجہ کی نمائش کا اہتمام کیا جائے۔ خوشی کی بات ہے اچھے ناشرین کے علاوہ بڑے حکومتی طباعتی اداروں مثلاً نیشنل بک ٹرسٹ اور ساہتیہ اکیڈمی وغیرہ نے بھی اس میں شرکت کی۔ اس نمائش کا اہتمام شبلی انٹر کالج میں کیا گیا تھا۔ نمائش بہت کامیاب رہی۔ بڑی تعداد میں لوگ آئے اور کتابیں خریدیں۔ کتابوں کی فروخت کے علاوہ جو ناشرین کی توقعات سے زیادہ تھی، اس کا ایک اہم حصہ روزانہ منعقد ہونے والے بچوں کے مختلف پروگرام تھے جن سے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ملے۔ ان میں ڈرائنگ اور پینٹنگ کے مقابلے، بچوں کا رسالہ تیار کرنے کے مقابلے اور کہانیاں لکھنے کے مقابلے اور اس طرح کے کئی پروگرام شامل تھے۔ کامیاب ہونے والے بچوں کو کتابیں انعام میں دی گئیں۔ شبلی کالج کے پرنسپل جناب سہیل احمد اصلاحی اور ان کے اسٹاف نے اس نمائش کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کام میں ڈسٹرکٹ ایڈمنسٹریشن کا پورا تعاون حاصل رہا۔ اس کے علاوہ ضلع سماج وادی پارٹی کے صدر شری حولدار یادو نے اس میں ذاتی دلچسپی لی اور شروع سے آخر تک اس کی کامیابی کے لیے کوشاں رہے۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کی گولڈن جوبلی کے موقع پر ایک یادگار آل انڈیا مشاعرہ کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ اس موقع پر ایک بڑے بین الاقوامی سمینار کے تقاضوں اور ضروریات کے پیش نظر اس نوعیت کے مشاعرہ کی گنجائش تو نہیں تھی البتہ اس پہلو کو یکسر نظر انداز بھی نہیں کیا گیا۔ چنانچہ ۳۰ر نومبر کو بعد نماز عشاء ایک مختصر لیکن منتخب بین الاقوامی شعری نشست کا اہتمام کیا گیا۔ اس کا

www.shibliacademy.org

تمام تر انتظام واہتمام ڈاکٹر عمیر منظر، اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس، نے کیا۔ڈاکٹر عمیر منظر خود بھی شاعر ہیں اورانہیں شعری محفلوں کی نظامت کا سلیقہ بھی ہے۔ یہ شعری نشست اردو اکادمی، دہلی کے وائس چیرمین پروفیسر خالد محمود کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ پروفیسر خالد محمود کے علاوہ جن شعراء نے اس شعری نشست میں اپنا کلام پیش کیا ان میں جناب مصداق اعظمی، جناب نیاز جیراج پوری، ڈاکٹر عمیر منظر، جناب میکس بروس نادر، جناب احمد محفوظ، پروفیسر شہپر رسول، جناب شمیم طارق، ڈاکٹر عبداللہ اور جناب شمس بدایونی شامل تھے۔

جب دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی نے اپنی زندگی کے پچاس سال پورے کیے تھے تو اس وقت اس کی گولڈن جوبلی منائی گئی تھی۔ یہ ایک یادگار تقریب تھی اوراس کی خوشگوار یادیں اب بھی لوگوں کے دل و دماغ میں تازہ ہیں۔ اس وقت علامہ شبلی کی وفات کو بھی پچاس سال پورے ہوئے تھے لیکن یہ تقریب اصلاً دارالمصنّفین کی گولڈن جوبلی تھی۔ موجودہ تقریب دراصل شبلی صدی تقریبات کا ایک حصہ تھی۔ دارالمصنّفین علامہ شبلی کا ایک گراں مایہ ورثہ ہے جسے ان کے تلامذہ نے تعمیر کیا۔ چنانچہ یہ اگرچہ علامہ شبلی صدی سمینار تھا لیکن یہ حقیقت کسی وقت بھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوئی کہ یہ دارالمصنّفین کی پلیٹینم جوبلی بھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس موقع کی مناسبت سے ''دارالمصنّفین کے سو سال'' کے نام سے اس عظیم ادارہ کی ایک خصوصی تاریخ تیار کرانے کا اہتمام کیا گیا۔ ہر جگہ شبلی صدی بین الاقوامی سمینار کے ساتھ شبلی اکیڈمی کی پلیٹینم جوبلی کا ذکر موجود تھا۔ افتتاحی اجلاس کا دعوت نامہ صرف پلیٹینم جوبلی کے نام پر جاری کیا گیا تھا۔لیکن سمینار کا اصل ارتکاز علامہ شبلی پر تھا۔اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان تقریبات کا سلسلہ پورے سال چلتا رہے گا اوراس کا آخری پروگرام انشاءاللہ دارالمصنّفین سے متعلق ہوگا جو اکتوبر کے آخر یا نومبر کی ابتدا میں منعقد ہوگا۔ یہ ایک دوروزہ سمینار ہوگا اوراس کا موضوع ''دارالمصنّفین، اس کے معمار، رفقاء اور خدمات'' ہوگا۔

اس سمینار کی خصوصیات میں پرنٹ اورالکٹرانک میڈیا کا بے مثالی تعاون بھی شامل رہا

www.shibliacademy.org

ہے۔شروع ہی سے جب ابھی سمینار کی تیاریاں جاری تھیں مقامی میڈیا،جس میں اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے اخبارات شامل تھے،اس سے متعلق خبروں کو نمایاں طور پر اپنے صفحات میں جگہ دینی شروع کر دی تھی۔افتتاحی اجلاس میں میڈیا بڑی تعداد میں موجود تھا اور اس کی بھرپور رپورٹنگ ہوئی۔باقی اجلاسوں اور نمائش سے متعلق خبروں کو نمایاں طور پر شائع کیا گیا۔اردو سہارا نے سمینار سے ایک دن پہلے دو صفحات پر مشتمل دستاویز شائع کی۔انقلاب کے لکھنؤ بیورو چیف جناب فضل الرحمٰن سمینار کے دوران یہاں موجود رہے۔بڑے پیمانے پر رپورٹنگ کی وجہ سے سمینار سے دلچسپی رکھنے والوں کو برابر تفصیلی معلومات فراہم ہوتی رہیں۔بلکہ اس سے علامہ شبلی کے مشن اور وژن اور دارالمصنّفین کے مقاصد اور خدمات کے بارے میں لوگوں کی معلومات میں اضافہ ہوا۔مزید براں شبلی اکیڈمی کا باہمی اتحاد و یگانگت کا پیغام دور دور تک پہنچا اور ادھر کئی برسوں سے اعظم گڑھ کی جو ایک مخصوص شبیہ بنائی گئی تھی وہ ٹوٹی اور اس کی صحیح تصویر دور دور تک پہنچی۔اس اعظم گڑھ کی اصل شبیہ جو گذشتہ ایک صدی سے نہایت نامساعد حالات کے باوجود علم و دانش کی خدمت میں مصروف ہے،جو تحقیق و تصنیف کے ذریعہ دنیا کو روشنی بخش رہا ہے،جو کتاب اور لکھے ہوئے لفظ سے لوگوں کو جوڑنے کی جہد مسلسل میں مصروف ہے اور جس نے خدمت اور قربانی کی ایک نئی تاریخ رقم کی ہے۔دور نزدیک لوگوں کو اعظم گڑھ کو اپنی اصل شکل میں دیکھنے کا موقع ملا اور یہ ان کے لیے ایک خوش گوار تجربہ ثابت ہوا۔اس سلسلہ میں ہماری کوششوں کے وہ دوررس اثرات مرتب نہ ہوتے اگر اس سلسلہ میں میڈیا ہماری بھرپور مدد نہ کرتا۔ہم اس کے لیے تہ دل سے ان کے شکر گزار ہیں اور آیندہ بھی ان سے اسی تعاون کی توقع رکھتے ہیں۔

اس سطح اور اس پیمانہ کے کسی پروگرام کو کامیاب بنانے کے لیے بڑی منصوبہ بندی اور ٹیم ورک کی ضرورت ہوتی ہے۔اس سلسلہ میں کام کا آغاز بہت پہلے سے کیا جا چکا تھا۔عام حالات میں بھی اکیڈمی کو صاف ستھرا رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔صدی تقریبات کے لیے اس کا مزید اہتمام کیا گیا۔پورے کیمپس کی صفائی اور پینٹنگ کرائی گئی۔میوزیم کی تنظیم نو کی ضرورت تھی اور یہ خاصا مشکل اور دشوار کام تھا۔کئی کتابیں تیاری کے مختلف مراحل میں تھیں۔چھوٹے

www.shibliacademy.org

بڑے اور بھی بے شمار کام تھے جن کو تقریبات کے افتتاح سے پہلے مکمل ہونا تھا۔ان سب کاموں کی انجام دہی کے لیے جو افرادی وسائل دستیاب تھے ان کے پیش نظر یہ ایک بڑا چیلنج تھا۔مزید براں ایک اعلیٰ درجہ کے بین الاقوامی سمینار کے اپنے تقاضے تھے جن کو پورا کرنا تھا۔اور یہ سب کچھ اکیڈمی کے معمول کے کاموں کے ساتھ ہونا تھا۔ان مختلف النوع مسائل سے عہد برا ہونے اور دستیاب وقت کے اندران کے صبر آزما تقاضوں کو بحسن وخوبی پورا کرنے کے مقصد سے گذشتہ چند مہینوں کے دوران اکیڈمی کے عملہ نے جتنی لگن ،محنت اور جاں فشانی سے کام کیا ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔دن رات ایک کردینا عام لوگوں کے لیے ایک محاورہ ہے لیکن اکیڈمی کے اسٹاف کے لیے خاص طور سے ان لوگوں کے لیے جن کے اوپر میوزیم کی تنظیم نو کی ذمہ داری تھی گذشتہ چند مہینوں کے دوران یہ ان کی زندگی کی ایک جیتی جاگتی حقیقت بن گئی تھی۔بحیثیت مجموعی اگر اکیڈمی کے متعلقین کی غیر معمولی جاں فشانی نہ ہوتی تو یہ سمینار نہ تو اتنا کامیاب ہوسکتا تھا اور نہ اکیڈمی کا احاطہ ایسا خوبصورت اور دلآویز منظر پیش کرسکتا تھا۔اللہ تعالیٰ ان سب کی مخلصانہ کوششوں اور کاوشوں کو شرف قبول سے نوازے۔آمین

اس نوعیت کے پروگرام کے لیے جن اسباب و وسائل کی ضرورت تھی وہ یکسر معدوم تھے۔دارالمصنّفین کو حکومت یا کسی اور ایجنسی سے کوئی مدد نہیں ملتی۔ضروری وسائل کی حصول یابی کے لیے اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں تھا کہ علامہ شبلی کے قدردانوں اور دارالمصنّفین کے بہی خواہوں سے عطیات کے لیے درخواست کی جائے۔اس مقصد کے لیے کوپن تیار کرائے گئے۔یہ مہم بنیادی طور پر اعظم گڑھ اور اس کے اطراف میں چلائی گئی۔اس کا دوسرا اہم دائرہ کار علی گڑھ تھا۔بعض دوسری جگہوں پر بھی اس سلسلہ میں کچھ کوششیں ہوئیں۔ بیرون ملک بھی بعض بہی خواہوں اور احباب نے اس میں دلچسپی لی۔علامہ شبلی کے وطن بندول کے لوگوں نے خاص طور سے اس مہم میں حصہ لیا۔بعض احباب اور عزیزوں نے اس سلسلہ میں غیر معمولی فکر مندی اور جاں فشانی کا مظاہرہ کیا۔اللہ کے فضل وکرم اور اکیڈمی کے بہی خواہوں اور احباب کی کوششوں سے ضروری اسباب و وسائل کی فراہمی کی صورت پیدا ہوگئی۔اسی طرح سمینار کے تعلق سے کئی کام ایسے تھے

www.shibliacademy.org

جو بہت دشوار اور زحمت طلب تھے اور ان کے صبر آزما تقاضوں سے عہدہ برآ ہونا ہمارے لیے ممکن نہیں تھا۔ بنارس ایرپورٹ، اسٹیشن اور شہر میں مختلف مقامات پر پھیلی ہوئی قیام گاہوں سے مہمانوں کو وقت پر لے آنا اور واپس پہنچانا، بیک وقت تین الگ الگ مقامات پر چلنے والے سیشنز کی دیکھ ریکھ، وقت پر مہمانوں کو چائے وغیرہ کی فراہمی اور سب سے بڑھ کر کھانے کا انتظام تھا۔ علامہ شبلی اور ان کی اس عظیم یادگار سے عقیدت اور محبت کا تعلق رکھنے والوں نے یہ سب انتظامات جس اخلاص، تندہی اور محنت و جاں فشانی سے انجام دیے وہ دیکھنے کے لائق تھا۔ ہر کام وقت پر اور سلیقہ سے انجام پایا۔ کھانے کا انتظام سب سے مشکل تھا اور وہ اس طرح انجام پایا کہ مثال بن گیا۔ کھانے کے معیار اور تنوع کے ساتھ ساتھ اس بات کا اہتمام کیا گیا ہر آنے والے کو کھانا کھلایا گیا اور اللہ کے فضل وکرم سے کسی وقت کوئی زحمت پیش نہیں آئی۔ اللہ تعالیٰ ان عزیزوں کو ان کی محنت اور جاں فشانی کے لیے بہترین اجر سے نوازے جنھوں نے اپنے اخلاص اور محنت سے بظاہر ایک ناممکن کام کو ممکن بنا دیا۔

جن اداروں نے اس تقریبات کو کامیاب اور یادگار بنانے میں اہم کردار ادا کیا ان میں سرفہرست شبلی کالج ہے۔ شبلی کالج نے افتتاحی دن کے انتظامات کی ذمہ داری لی تھی۔ افتتاحی اجلاس کا انتظام جس اہتمام اور حسن سلیقہ سے کیا گیا تھا اس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ ۳۰؍ نومبر کو سمینار کے دو سیشن کالج کے دو ہالوں میں منعقد ہوئے۔ مزید براں کالج کا مہمان خانہ تقریبات میں آنے والے اہم مہمانوں کے لیے مخصوص تھا۔ ان سب انتظامات کے سلسلہ میں کالج انتظامیہ کا پورا تعاون ہمیں برابر حاصل رہا۔ شبلی انٹر کالج کے احاطہ میں کتابوں کی نمائش کا اہتمام کیا گیا تھا۔ کالج انتظامیہ نے اس کو کامیاب بنانے میں ہر ممکن تعاون کیا۔ شبلی نرسری اسکول کی مدد اور تعاون بھی حاصل رہا۔ جامعۃ الرشاد کی انتظامیہ نے مہمانوں کی آمد و رفت کے لیے کئی گاڑیاں فراہم کیں۔ ان تقریبات کے لیے مندوبین کے علاوہ اور بھی بہت سے مہمانوں کی آمد متوقع تھی۔ مہمانوں کی رہائش کے لیے جو سہولتیں دستیاب تھیں اس میں ان احباب کے قیام کی گنجائش نہیں نکل پا رہی تھی۔ اس مشکل کو جامعۃ الرشاد کے ذمہ داروں نے بحسن و خوبی حل کر دیا اور ان عزیز مہمانوں

www.shibliacademy.org

کے قیام اور دیکھ ریکھ کی پوری ذمہ داری لے لی اور ہمیں اس طرف سے یکسو کردیا۔ جامعۃ الفلاح نے ہمارے بعض محترم مہمانوں کے قیام کی ذمہ دری سنبھالی۔ ممبئی کی دواؤں کی مشہور کمپنی Wens نے مندوبین کے لیے بیگ، رائٹنگ پیڈ اور قلم مہیا کیے۔ انجمن طلبہ قدیم مدرسۃ الاصلاح اور شبلی چلڈرن اسکول نظام آباد نے بالترتیب ۳۰ رنومبر اور یکم دسمبر کو مندوبین کو عصرانہ پر مدعو کیا۔ اس سمینار کو کامیاب بنانے میں ان مشترکہ کوششوں کا بہت کچھ دخل رہا ہے۔ ہم ان اداروں کے ذمہ داروں کے صمیم قلب سے شکرگزار ہیں۔

علی گڑھ سے علامہ شبلی کا جو تعلق رہا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ ان تقریبات کی نسبت سے علی گڑھ نے اس تعلق کا حق ادا کرنے میں کوئی کمی اٹھا نہیں رکھی۔ اس پروگرام کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لیے اعظم گڑھ سے باہر سب سے زیادہ محنت اور کوشش علی گڑھ میں ہوئی۔ مندوبین، اہم مہمانوں اور مہمان خصوصی کو پیش کرنے کے لیے نہایت خوبصورت اور قیمتی مومنٹو علی گڑھ میں تیار ہوئے۔ مندوبین اور والینٹرس کے بیج علی گڑھ میں تیار ہوئے۔ یہ عام بیج نہیں تھے۔ بر اس کے بیج پر نام اور دوسری تفصیلات خوبصورتی سے کھدی ہوئی تھیں۔ مندوبین کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے پیپرویٹ جس میں علامہ شبلی اور لائبریری کی تصویریں بنی ہوئی ہیں علی گڑھ میں تیار ہوئے۔ سمینار اور تقریبات سے متعلق کئی چھوٹے بڑے اور دوسرے کام علی گڑھ میں انجام پائے۔ اور یہ سب کچھ علی گڑھ کے احباب کا تحفہ تھا۔ ادارہ علوم القرآن، علی گڑھ کے کارکنوں نے استقبالیہ کی پوری ذمہ داری سنبھالی۔ ان سب عنایات کے لیے ہم احباب علی گڑھ کے مشکور ہیں۔

ان تقریبات کا تعلق صرف دارالمصنّفین یا اعظم گڑھ کے مسلمانوں سے نہیں تھا۔ علامہ شبلی اور ان کا ورثہ پورے اعظم گڑھ کے لیے باعث فخر ہے اور اس کا احساس سماج کے ہر طبقے کو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس موقع پر برادران وطن نے نہ صرف ان تقریبات میں پوری دلچسپی سے حصہ لیا، بڑی تعداد میں اکیڈمی آئے، اس کو دیکھا اور اس کے کام سے واقفیت حاصل کی بلکہ اس کے انعقاد میں مدد بھی کی۔ ضلع سماج وادی پارٹی کے صدر شری حولدار یادو شروع سے ہمارے ساتھ

www.shibliacademy.org

شریک تھے، ہر مرحلہ میں ہمارے ساتھ رہے اور اس پروگرام کو کامیاب بنانے میں ہر ممکن تعاون کیا۔ ڈاکٹر انوپ یادو کئی بار اکیڈمی آئے اور اس پروگرام کو یادگار بنانے کے لیے اپنی خدمات اور تعاون پیش کیا۔ یوپی گورنمنٹ میں کیبنٹ منسٹر شری درگا پرشاد یادو سمینار کے دوران ہمارا حوصلہ بڑھانے کے لیے اکیڈمی آئے اور اس کی کامیابی کے لیے اپنا تعاون پیش کیا۔ رویندر رائے جی اور دوسرے احباب تیاری کے وقت سے ہمارے ساتھ تھے اور اسے کامیاب بنانے میں ہماری مدد کی، علامہ شبلی نے جس ہندوستان کا خواب دیکھا تھا اس کا ایک اہم عنصر ہندو مسلم اتحاد تھا۔ ہمیں خوشی ہے کہ یہ تقریبات اس خواب کی تعبیر کی طرف پیش قدمی کا وسیلہ ثابت ہوئیں۔

آرزو تھی کہ ملک وملت کے اس محسن کی یاد اس طرح منائی جائے جو اس کے مقام و مرتبہ کے شایان شان ہو۔ اس خواہش کا اظہار معارف کے صفحات میں بار بار کیا گیا۔ وہ شاید قبولیت کی گھڑی تھی اور دنیا بھی گوش برآواز تھی۔ ضرورت کا احساس بھی تھا اور علامہ شبلی کی علمی، ادبی، فکری، ملکی اور ملی خدمات کا ادراک بھی تھا اور اعتراف بھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک احسان مند اور احسان شناس قوم جس والہانہ انداز میں علامہ شبلی کو یاد کررہی ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ علامہ شبلی نے ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو اس عالم آب وگل سے عالم جاودانی کے لیے رخت سفر باندھا تھا۔ اس طرح ۱۸ر نومبر ۲۰۱۴ء سے ان کے انتقال کا صدی سال شروع ہوا۔ لیکن ان کو یاد کرنے کا سلسلہ اس سے کافی پہلے شروع ہو چکا تھا۔ ان سطور کے لکھنے کے وقت تک اس سلسلہ میں بھی جو مجالس مذاکرہ اور سمینار منعقد ہو چکے ہیں اور جن کے بارے میں معلومات حاصل ہو سکی ہیں ان کی مختصر تفصیل درج ذیل ہے:

انجمن اسلام،	ممبئی،	۲۲ر فروری
بمبئی یونیورسٹی،	ممبئی،	۲۴-۲۵ر فروری
سناتن دھرم کالج،	پانی پت،	۱۱-۱۲ر اگست
نیو کلیس سوسائٹی،	لکھنؤ	۲۹ر مارچ
جامعۃ الفلاح		۲۴-۲۵ر اکتوبر

www.shibliacademy.org

غالب اکیڈمی،	دہلی،	۲۵/اکتوبر
خواجہ معین الدین چشتی یونیورسٹی،	لکھنؤ،	۲۸-۲۹/نومبر
ساہتیہ اکیڈمی،	دہلی،	۷-۹/دسمبر
غالب انسٹی ٹیوٹ،	دہلی	۱۹-۲۱/دسمبر
فارغین ندوۃ العلماء	ریاض	۱۹/دسمبر
اردو اکیڈمی،	دہلی،	۲۲-۲۴/دسمبر

توقع کی جاتی ہے کہ صدی سال کے اختتام تک اس سلسلہ میں کئی اور پروگرام منعقد ہوں گے۔

گذشتہ تقریباً ایک صدی کے طویل عرصہ میں جواب معارف کی عمر ہے، اس کا صرف ایک خصوصی شمارہ شائع ہوا ہے۔ یہ ۱۹۵۲ء میں معمار دارالمصنّفین مولانا سید سلیمان ندوی کے انتقال کے بعد نکلا تھا اور دو مہینوں کا مشترکہ شمارہ تھا۔ شبلی صدی کے موقع پر یہ مناسب معلوم ہوا کہ نومبر اور دسمبر ۲۰۱۴ء کا مشترکہ شمارہ علامہ شبلی کی یاد میں ایک خصوصی شمارہ کی حیثیت سے شائع کیا جائے۔ یہ خصوصی شمارہ پیش خدمت ہے البتہ یہ ہماری خواہش کے مطابق نہیں ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس کے لیے تیاری کے لیے جتنا وقت درکار تھا وہ نہیں مل سکا۔ دسمبر کے پہلے ہفتہ کے اختتام تک کا پورا وقت سمینار کی تیاریوں اور اس سے متعلق دوسرے امور و معاملات سے نمٹنے میں صرف ہوگیا۔ اس کے بعد دسمبر کے صرف تین ہفتے بچے جن کے اندر اس خاص نمبر کو شائع ہوجانا چاہیے۔ معارف کا ایک بڑا امتیاز یہ رہا ہے کہ وہ گذشتہ ایک صدی سے ہمیشہ اپنے وقت پر نکلتا رہا ہے اور کبھی اس کا کوئی مہینہ ناغہ نہیں ہوا۔ اس خاص نمبر کو ہم جس انداز اور معیار پر شائع کرنا چاہتے تھے وہ اتنے کم وقت میں ممکن نہیں تھا۔ اس کے لیے مزید وقت کی ضرورت تھی لیکن اس صورت میں معارف کی سوسالہ روایت ٹوٹ جاتی۔ یہ ہم کو منظور نہیں تھا اور اسے دسمبر کے اختتام سے پہلے بہر صورت شائع ہونا تھا۔ اس کم وقت میں جو کچھ ممکن ہوسکا وہی پیش خدمت ہے۔ اس کی تلافی انشاء اللہ سمینار میں پیش کیے جانے والے مقالوں کے مجموعہ سے ہوسکے گی۔

www.shibliacademy.org

استقبالیہ

عزت مآب عالی مرتبت نائب صدر جمہوریۂ ہند جناب محمد حامد انصاری صاحب، عالی جناب شری بلرام یادو صاحب، محترم ڈاکٹر ظفرالاسلام خان صاحب، محترم ڈاکٹر افسر علی صاحب۔

قابل صد احترام مہمانانِ گرامی، خواتین وحضرات اور عزیز طلبہ وطالبات!

علم وادب، تہذیب وثقافت، حب الوطنی، سرفروشی اور قربانی کی سرزمین اعظم گڑھ پر علم ودانش کے مرکز دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی میں اراکینِ شبلی اکیڈمی، شبلی کالج، شبلی انٹر کالج، شبلی نرسری اسکول اور اعظم گڑھ کے تمام باشندوں کی طرف سے دل کی گہرائیوں سے آپ کا استقبال ہے۔ شبلی صدی تقریبات میں شرکت کے لیے دور دراز سے آپ کی تشریف آوری، علم وادب، تہذیب وشائستگی اور حریت پسندی اور حب الوطنی کی اس درخشاں روایت سے آپ کے تعلق خاطر کی دلیل ہے جس کی علم برداری کا شرف علامہ شبلی کے قائم کیے ہوئے اس ادارہ کو گزشتہ سو سال سے حاصل رہا ہے۔ اس سے بھی زیادہ یہ اس ادارہ کے عظیم مؤسس سے آپ کی عقیدت ومحبت کی غماز ہے جس نے اپنی پوری زندگی علم وادب اور ملک وقوم کی خدمت میں گزار دی اور عمر کے آخری حصہ میں دارالمصنّفین کی شکل میں دنیا کو ایک ایسا بے نظیر تحفہ دے گیا جس کو دور حاضر کا بیت الحکمت کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ گذشتہ ایک صدی کے طویل عرصہ میں دارالمصنّفین نے نہایت ناسازگار حالات کے باوجود علم وادب کی بے مثال خدمت کے ساتھ اپنے گراں بہا لٹریچر کے ذریعہ وطن عزیز میں رہنے بسنے والے مختلف طبقوں کے درمیان باہمی مفاہمت اور اتحاد ویگانگت پیدا کرنے اور ان کو ایک دوسرے سے قریب لانے کا جو عظیم الشان کارنامہ انجام دیا ہے وہ بے مثال ہے۔ اکیڈمی نے یہ کام جن حالات اور جس سطح اور پیمانہ پر انجام دیا ہے وہ قابل فخر بھی ہے اور نہایت دل خراش بھی۔ یہی علامہ شبلی کا مشن تھا۔ انہوں نے اپنی خداداد بصیرت اور تاریخ کے گہرے

www.shibliacademy.org

مطالعہ کی روشنی میں اس راز کو پالیا تھا کہ ہندوستان کا مستقبل یہاں بسنے والی قوموں کے باہمی اتحاد میں مضمر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں ایک طرف انہیں اپنے اسلامی ورثہ پر فخر تھا اور بحیثیت مسلمان اپنی شناخت کی حفاظت پر اصرار تھا وہیں وہ اس ملک میں رہنے والے مختلف طبقوں کے درمیان اتحاد، یک جہتی اور یگانگت کے زبردست حامی تھے اور ہر طرح کی فرقہ واریت کے سخت مخالف تھے۔ وقت اور حالات نے ثابت کر دیا ہے کہ ان کی سوچ صحیح تھی۔ اسی روایت کو مولانا ابوالکلام آزاد نے آگے بڑھایا جن کا علامہ شبلی اور شبلی اکیڈمی سے گہرا تعلق رہا ہے۔ اسی روایت کی ایک روشن علامت عزت مآب نائب صدر جمہوریۂ ہند جناب محمد حامد انصاری صاحب آج یہاں ہماری سرپرستی کے لیے تشریف فرما ہیں۔

آج جب ہم ملک وملت کے اس عظیم محسن کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں تو آیئے عہد کریں کہ ہم ان کے اس مشن کی تکمیل کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے اور وطن عزیز کے مختلف طبقوں اور قوموں کے درمیان بھائی چارہ، اتحاد، یگانگت، یک جہتی اور محبت کا جو پیغام علامہ شبلی نے ایک صدی پہلے دیا تھا، اس کو ہندوستان کے ہر گھر اور ہر فرد تک پہنچائیں گے اور وطن عزیز کی تعمیر اس انداز میں کریں گے جس کا خواب انہوں نے دیکھا تھا۔ ایک ایسا ہندوستان جس کے باشندے مذہب، علاقے اور رنگ ونسل کے اختلاف کے باوجود آپس میں مل جل کر رہیں گے اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوں گے، جہاں امن ہوگا، آشتی ہوگی، شانتی ہوگی، خوش حالی ہوگی، علم کی روشنی ہوگی، باہمی اتحاد، اعتماد اور محبت ہوگی، جہاں سب کو انصاف اور یکساں مواقع ملیں گے، جہاں جہالت کی تاریکی نہ ہوگی، جہاں ناانصافی، ظلم، خوف، ڈر، نفرت، عداوت، دشمنی اور بے اعتمادی کے لیے کوئی جگہ نہ ہوگی، جہاں کسی کی آنکھ میں آنسو نہ ہوگا۔ اسی ہندوستان جنت نشان کی تعمیر ان کی یاد کو صحیح خراج عقیدت ہوگا، سچی شردھانجلی ہوگی۔

www.shibliacademy.org

خطاب نائب صدر جمہوریہ ہند

عزت مآب جناب محمد حامد انصاری

بتاریخ ۲۹؍نومبر ۲۰۱۴ء بہ وقت ۳ بجے شام

بہ موقع افتتاح بین الاقوامی سمینار

بسلسلہ صد سالہ تقریب دارالمصنّفین،

شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔

میں شبلی اکیڈمی اور پروفیسر ظلی صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کی صد سالہ تقریب کی مناسبت سے منعقد کیے گئے اس بین الاقوامی سمینار کے افتتاح کے لیے مجھے دعوت دی۔ میرے لیے اس خطۂ زمین میں اجنبیت نہیں ہے۔

اب یاد رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

مولانا شبلی نعمانی ایک قاموسی شخصیت تھے جو ایک ایسے عہد میں علم و ادب کے منظرنامے پر رونما ہوئے جو مسلمانانِ ہند کے لیے ایک نازک اور تغیر پذیر عہد تھا۔ وہ بالکل ہی مختلف عہد تھا، شاید وہ ہمارے ادراک سے بھی پرے ہے۔ ان کی زندگی، ان کے سفرنامے، ان کا حلقۂ احباب اور ان سب سے بڑھ کر ان کا فضل و کمال ایک متجسس ذہن کی گواہی دیتے ہیں۔ ان کا شاہکار علمی کارنامہ ''الفاروق'' کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ مولانا کی دوسری اہم تصنیف ''شعرالعجم''، ہے، جو تاریخ شعریات ایران کے متعلق ہے، اس کے بارے میں ''لٹریری ہسٹری آف پرشیا'' کے مصنف ای.جی براؤن نے لکھا ہے کہ:

www.shibliacademy.org

”یہ اولین دور سے سترہویں صدی تک کے شعرائے ایران کا
بہترین تنقیدی تجزیہ ہے“۔

مولانا شبلی کو جو مسائل درپیش تھے ان میں سے ایک تعلیم سے متعلق جدیدیت کے اس مخصوص رجحان کے تناظر میں تھا جو برطانوی حکومت کے قیام کے بعد ہندوستان اور ہندوستانیوں پر تھوپ دیا گیا تھا۔ اس تبدیلی کا ایک ایسا گہرا نفسیاتی اثر ہوا جو احساس محرومی کا عکاس تھا۔ شبلی نے اس کرب کا اظہار اپنی ایک طویل نظم ”شہر آشوب اسلام“ میں کیا ہے۔ اس نظم کے آخری شعر سے احساس ناامیدی کی لے تیز اور نمایاں ہے ؎

جو ہجرت کرکے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن و امانِ شام و نجد و قیرواں کب تک

بہت سال بعد ایک بیرونی ہمدرد، ولفریڈ کینٹویل اسمتھ (Wilfred Cantwell Smith) نے اس سلسلے میں اپنا نقطۂ نظر بیان کرتے ہوئے کہا تھا:

"The fundamental malaise of modern Islam is a sense that something has gone wrong with Islamic history. The fundamental problem of modern Muslims is how to rehabilitate that history: to set it going again in full vigour, so that Islamic society may once again flourish as a divenely guided society should and must".

یہی وہ سوال تھا جس کا سامنا سرسید احمد خاں اور اس وقت کی بہت سی دیگر شخصیتوں نے کیا ہر چند کہ ان سب کے جواب مختلف تھے، لیکن مشتملات ایک ہیں۔ حرکت و عمل جلد ہی قنوطیت اور شکوے پر غالب آگئے۔ سرسید نے علی گڑھ میں ”محمڈن اینگلو اورینٹل کالج“ قائم کیا۔ مولانا شبلی نے ان کے اس مشن کے ساتھ سولہ برسوں تک کام کیا۔ دونوں کے پس منظر مختلف تھے۔ بعض مسائل پر ان کے خیالات ہم آہنگ تھے اگرچہ بعض مسائل پر وہ دونوں مختلف الخیال بھی تھے۔ مولانا نے ندوہ میں بھی اپنی علمی خدمات کو جاری رکھا اور بالآخر علم و فن کے لیے وقف اس معروف ادارے کی بنیاد رکھی۔

گذشتہ ایک صدی سے شبلی اکیڈمی نے علم و تحقیق، بطور خاص سیرت النبیؐ، اسلام کی

www.shibliacademy.org

ابتدائی تاریخ، قرآنیات، عہد وسطیٰ پر ترکیز کے ساتھ ہندوستانی تاریخ، اردو، فارسی اور عربی ادب اور ادبی شخصیات کے حوالے سے نہایت وقیع خدمات انجام دیں ہیں۔ اس کی مطبوعات کا مجموعہ متاثر کن ہے اور ماضی وحال کی علمی کاوشوں کو نذرانہ ہے۔

صاحبو!

اس ادارے اور اس جیسے بعض دیگر اداروں نے، بطور خاص اسلام کی تاریخ وثقافت کے میدان میں خود کو وقف کر رکھا ہے۔ ہندوستان اور ہندوستانی بجا طور پر اسے اپنی وراثت کا ایک اہم حصہ تصور کرتے ہیں۔ اسی طرح ان سے بھی یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس ورثہ کی حفاظت کریں اور اس کے فضل وکمال میں ایسا اضافہ کریں جو اس کی عظمت وشوکت کو بڑھائے۔ اس کے لیے بنیادی شرط تعلیم ہے جس میں ہم باوجود متواتر اور صحیح تشخیص کے پچھڑ گئے ہیں۔ ایک صدی قبل علامہ اقبال نے اس صورت حال کو دو اشعار میں بیان کیا تھا۔

آئینِ نو سے ڈرنا ، طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے ، قوموں کی زندگی میں

یہ کاروانِ ہستی ، ہے تیز گام ایسا
قومیں کچل گئی ہیں ، جس کی رواروی میں

پھر انہوں نے اصلاح کا نسخہ بھی پیش کیا تھا۔

اس دور میں تعلیم ہے امراضِ ملت کی دوا
ہے خونِ فاسد کے لیے تعلیم مثلِ نیشتر

اکتوبر ۱۹۴۷ء کے نامساعد ایام میں مولانا ابوالکلام آزاد نے ملت سے اپیل کی تھی کہ وہ بدلتے حالات سے خود کو ہم آہنگ کریں۔ ان کے ان الفاظ کو یاد کیے جانے کی ضرورت ہے:

”عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو۔ تبدیلیوں کے ساتھ چلو، یہ نہ کہو کہ ہم تغیر کے لیے تیار نہیں تھے“۔

گذشتہ ۶۷ سالوں کا جائزہ بتاتا ہے کہ ہم بھرپور طریقے سے اس چیلنج کا جواب نہیں دے پائے ہیں اور ہم اپنے ہم وطنوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چلنے میں ناکام رہے ہیں۔ ہم نے

www.shibliacademy.org

اپنی ناکامی کی وجہ روایت اور سماجی رسوم بتایا ہے۔نتیجتاً ہم سماجی، تعلیمی اور اقتصادی ہر سطح پر پس ماندگی کا شکار ہوتے چلے گئے۔ان تمام پر فتح پائی جاسکتی ہے،شرط ہے تو تنظیم اور کامیابی کے عزم کی۔

ہماری وسیع اور متنوع آبادی کا کوئی بھی حصہ بحیثیت شہری کے حکومت سے چار بنیادی مطالبات کے تقاضے کا حق رکھتا ہے:

۱-سماجی امن،تحفظ اور تشخص کی حفاظت (Identity)۔۲-مناسب تعلیم کے ذریعے ترقی اور (Empowerment)۔۳-روزگار اور سرکاری اسکیموں میں مناسب اور مساوی حصہ داری کیوں کر غیر مساوی معاشی مواقع غیر مساوی نتائج کا سبب بنیں گے اور نتیجتاً سیاسی قوت کے حصول میں عدم مساوات پیدا ہوگئی۔نیز ۴-فیصلہ سازی میں مناسب حصہ داری۔

مجھے معلوم ہے اور آپ سب بھی اس حقیقت سے بخوبی واقف ہوں گے کہ مذکورہ ان تمام امور کی حصولیابی میں کچھ کمیاں ہیں۔اصلی چیلنج یہ ہے کہ ملک کے قانون،حیات،عزت اور مساوات کے آئینی حقوق کے دائرے میں رہتے ہوئے ان کمیوں پر قابو پانا اور مساوی مواقع کو یقینی بنانے کے لیے سماجی اور تعلیمی طور پر پس ماندہ لوگوں کے لیے اثباتی اقدام اٹھائیں۔یہ حقوق کا مسئلہ ہے، خیرات کا نہیں۔ان کے لیے جدوجہد،صبر و تحمل کے دائرے میں رہتے ہوئے کی جانی چاہیے۔

''سب کے ساتھ،سب کا وکاس'' کا ہدف درست اور قابل قدر ہے۔اس کے لیے ایک مشترکہ نقطۂ آغاز اور مطلوبہ رفتار سے سب میں شانہ بہ شانہ چلنے کی صلاحیت ضروری ہے۔اس صلاحیت کو انفرادی و سماجی اقدامات نیز حکومتی سطح کے اقدامات کے ذریعے پیدا کرنا ہوگا جو زمینی سطح پر ثمر آور ہوں۔پروگرام بنائے گئے ہیں اب ان کو مکمل طور پر عملی جامہ پہنانے کی ضرورت ہے۔

میں شبلی اکیڈمی کی تقریب پر تہہ دل سے تہنیت پیش کرتا ہوں اور مجھے یہاں مدعو کرنے کے لیے انتہائی مشکور ہوں۔مجھے یقین ہے کہ ایک صدی مکمل کرنے کے بعد آنے والے سالوں میں یہ ادارہ اور بھی بامقصد پیش رفت کرے گا۔

تاریخ بتاتی ہے ضرورت پڑنے پر دانشور مشیر بھی بن جاتے ہیں۔شاید اس دانش گاہ کے لیے وقت کا تقاضہ ہے کہ یہ علم و دانش کے موتی بکھیرنے کے ساتھ ساتھ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے مناسب رہنمائی بھی فراہم کرے۔ جے ہند۔

www.shibliacademy.org

کلیدی خطبہ
شبلی صدی بین الاقوامی سمینار

منعقدہ ۲۹-۳۰/نومبر-یکم دسمبر ۲۰۱۴ء

پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی

علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) ایک ایسی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے کہ ممکن ہے اس میں بعض لوگوں کو تضادات نظر آئیں، لیکن دراصل شخصیت کی یہ رنگارنگی اسے جاذبیت عطا کرتی ہے۔ وہ بیک وقت عالمِ دین تھے اور فنون لطیفہ کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ معقولات سے خاص دلچسپی تھی، اس لیے علم کلام کی طرف توجہ مبذول فرمائی۔ اسی بنا پر پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے انہیں سب سے پہلا متکلم قرار دیا ہے۔ ساتھ ہی تاریخ وسوانح کے بھی دل دادہ تھے۔ راقم الحروف ان دونوں علوم کو ایک دوسرے سے جدا کر کے نہیں دیکھتا ہے۔ ان شعبوں میں ان کے فتوحات اتنے زیادہ ہیں کہ ان کے حبیب صادق اور معتقد مہدی افادی نے تو یہ کہہ دیا تھا کہ وہ تاریخ کے بغیر دو قدم نہیں چل سکتے۔ یوں بھی ان کی شبیہ سب سے بڑھ کر ایک مورخ ہی کی رہی ہے۔ البتہ ان کے شاگرد رشید مولانا سید سلیمان ندوی کا ارشاد ہے کہ وہ تاریخ ہی کے راستے سے علم کلام تک پہنچے تھے کیونکہ ان کی تاریخی کتب بھی کلامیت سے خالی نہیں۔ ہمارے نزدیک اس کی سب سے اچھی مثال ''الغزالی'' اور ''رومی'' ہیں۔ خطوط نویسی میں ان کا مقام بلاشبہ غالب کے بعد سب سے زیادہ بلند ہے۔ ان کے بعض خطوط میں ان کی انشاپردازی کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ اردو میں سفرنامہ لکھنے کی روایت ان سے پہلے سے موجود تھی لیکن ان کا سفرنامہ روم ومصر وشام اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ انہوں نے ان ممالک کو اس نظر سے دیکھا ہے کہ وہ اسلام کا دھڑکتا ہوا دل ہیں۔ اسلام

مدیر کانفرنس گزٹ، علی گڑھ۔

www.shibliacademy.org

کے وہ شیدائی تھے، اس لیے اسلام اور مسلمانوں پر مستشرقین اور بعض دیگر مورخین کے بے بنیاد اعتراضات سے تڑپ اٹھتے اور ان کی علمی طور پر تردید کرتے۔ یہ درست ہے کہ اس معاملے میں انہوں نے بعض اہل علم کے نزدیک حدود سے تجاوز کیا ہے۔ اسی لیے بعض گوشوں سے اعتراض کیا جاتا ہے کہ تاریخ میں ان کا رویہ دفاعی تھا۔ خاکسار راقم الحروف کو اس سے بس جزوی اتفاق ہے۔ ''جزیہ'' اور ''کتب خانہ اسکندریہ'' ان کے ایسے معرکہ آرا مقالات ہیں جن کا اردو ہی میں نہیں، دوسری زبانوں میں بھی جواب نہیں ہے۔ بالخصوص جزیہ کے سلسلے میں ان کا یہ نکتہ کہ اسلامی حکومت میں جو غیر مسلم فوجی خدمت پر آمادہ ہوں ان سے جزیہ ساقط ہو جاتا ہے ایک بڑے اتہام کی کیسی تسلی بخش تشریح ہے۔ الفاروق، المامون اور سیرۃ النبیؐ جلد اول اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان کتابوں میں علامہ شبلی کا نقطۂ نظر حقیقت پسندانہ ہے یا دفاعی؟ اگر یہ اور اس قسم کی دوسری تصانیف ساتھ ساتھ ردالزام بھی کر دیتی ہیں تو یہ علامہ کی ذہانت کا کرشمہ ہے۔

یہاں ایک امر خاص طور سے قابل غور ہے۔ خلفائے راشدین میں انہوں نے حضرت عمر فاروقؓ اور عباسی خلفاء میں مامون الرشید کا انتخاب کیوں کیا؟ من جملہ دیگر اوصاف کے حضرت عمرؓ کی قوت اجتہاد نہایت قوی تھی اور مامون الرشید نے مذاہب کے درمیان غیر جانب دارانہ موازنہ کی بنیاد رکھ کر آزادی فکر اور وسعت نظر کی بنیاد رکھی تھی۔

ان سب امور کے ساتھ علامہ کا حسن ذوق انہیں شاعری پر بھی مائل کرتا تھا اور انہوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کی ہے۔ اردو میں ان کی شاعری کی نوعیت قومی اور ملّی ہے اور فارسی میں زیادہ تر عشقیہ۔ عشق نہ دماغ کا خلل ہے اور نہ اس سے ابتذال کو منسوب کرنا صحت مند ذہن کی علامت ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ فارسی شاعری ہندوستان میں غالب پر نہیں، علامہ شبلی پر ختم ہوئی۔ ممکن ہے اس قول میں کسی قدر مبالغہ ہو لیکن یہ امر مسلم ہے کہ ان کے ذوق شعری ہی نے ان سے شعرالعجم جیسی بلند پایہ کتاب لکھوائی۔ اس کتاب میں تحقیقی نقطۂ نظر سے جو بھی کمیاں ہوں، لاریب اس سے ہندوستان میں فارسی شعر و ادب کا احیاء ہوا اور بقول پروفیسر آصف نعیم صدیقی، صدر شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، شعرالعجم میں فارسی اشعار کا جیسا بے مثال انتخاب ہے ایسا کسی اور جگہ تلاش کرنا بے سود ہے۔ نیز یہ کہ اشعار کی تشریح

www.shibliacademy.org

کا اتنا اعلیٰ معیار انہوں نے قائم کیا کہ اس کی پیروی بھی کوئی اور نہیں کرسکا۔

آگے بڑھنے سے پہلے پیچھے ہٹ کر یہ دیکھنا ضروری ہے کہ علامہ شبلی کو جو کمالات حاصل ہوئے ان کا منبع اللہ کی دین کے علاوہ اور کہاں کہاں ہے۔ علامہ اعظم گڑھ کے مردم خیز علاقے کے ایک موضع بندول میں یکم جون ۱۸۵۷ء کو تولد ہوئے۔ وہ نسباً راجپوت تھے، ان کے دادا شیوراج سنگھ مسلمان ہوگئے تھے اور سراج الدین نام اختیار کرلیا تھا۔ ان کے والد کا نام شیخ حبیب اللہ تھا۔ وہ زمیں دار تھے۔ پیشہ وکالت تھا۔ شبلی کی ابتدائی تعلیم بندول ہی میں ہوئی۔ ان کی ابتدائی درسگاہ مدرسہ ناصر العلوم تھا، پھر غازی پور بھیج دیے گئے۔ وہاں مدرسہ چشمۂ رحمت میں تعلیم حاصل کی اور پھر اعظم گڑھ واپس آ گئے اور مدرسہ علوم اسلامیہ میں داخلہ لے لیا۔ ان کے استادوں میں مولانا فاروق چریا کوٹی اور مولوی فیض اللہ قابل ذکر ہیں۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ بخششِ خداوندی کے بعد علامہ شبلی کی شخصیت کی تشکیل میں سب سے زیادہ مولانا فاروق چریا کوٹی کا ہاتھ ہے۔ معقولات کی طرف رجحان ہو یا فارسی شاعری کا ذوق یا موسیقی سے لگاؤ، یہ سب ان ہی کے لیے عطیات ہیں۔ استاد و شاگرد صبح کو سو کر اٹھتے ہیں۔ استاد (مولانا فاروق) سوال کرتے ہیں: شبلی، بھیرویں سنو گے؟ جس شاگرد کا استاد اسے علوم دینی اور منطق و کلام ہی کا درس نہیں دیتا ہے، صبح سویرے بھیرویں بھی سناتا ہے وہ شبلی نعمانی نہ بنتا تو اور کیا بنتا۔ اور پھر ایک مہذب اعلیٰ تعلیم یافتہ دوشیزہ کو موسیقی میں مہارت پیدا کرنے کا مشورہ نہ دیتا تو کیا کرتا۔

جب خورشید الاسلام نے کہا تھا کہ شبلی ہندوستان میں پہلے ''یونانی'' تھے تو غلط نہیں کہا تھا کیونکہ ان کی ذات میں ایک طرف یونان کی عقل و دانش اور منطق و فلسفہ اور دوسری طرف حسنِ شناسی اور ذوق لطیف کا اجتماع تھا اور ساتھ ہی وہ اسلام کے چشمۂ حیات سے سیراب ہوئے تھے۔ تب ہی تو جہاں انہوں نے علم کلام پر توجہ مبذول کی وہاں اردو میں خوب صورت خطوط لکھے اور فارسی میں جذبات انگیز شاعری کی۔ یونانی، چھینی اور ہتھوڑی سے پتھر کے حسین بت تراشتے تھے تو شبلی نے قلم سے دل نشین اور اثر آفریں الفاظ کا ذخیرہ مہیا کیا۔ ان کی فضیلت یہ بھی ہے کہ اسلام کے روئے تاباں کو اعداء کے ڈالے ہوئے گرد و غبار سے صاف کیا۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ شبلی اکہری شخصیت نہیں رکھتے تھے بلکہ ہشت پہلو شخصیت کے مالک تھے۔

www.shibliacademy.org

ابھی علامہ شبلی کے تحصیل علم کی داستان اعظم گڑھ اورغازی پور سے آگے نہیں بڑھی ہے۔ابھی تک ان پر مولانا فاروق چریا کوٹی کے اثرات کا ذکر ہوا ہے۔انہوں نے پہلے رام پور جا کر مولانا ارشاد حسین مجددی رام پوری سے فقہ اوراصول فقہ کی تحصیل کی اور پھر لاہور جا کر مولانا فیض الحسن سہارن پوری سے ادب کا درس لیا اور جب وہ سہارن پور منتقل ہوگئے تو شبلی بھی ان کے ساتھ وہاں چلے گئے۔بعدازاں وہ مولانا احمد علی محدث سہارن پوری کے درس میں شریک ہوگئے جہاں انہوں نے صحاح ستہ کی معروف ومستند کتاب جامع ترمذی کا درس لیا۔

علامہ شبلی کے خاندان میں وکالت کا پیشہ مقبول تھا، اس لیے انہیں بھی اسی راستے پر ڈالنے کی کوشش کی گئی لیکن اس پیشے کی خشکی ان کے تروتازہ دماغ کوراس نہ آئی۔انہیں تو قدرت نے اہم تر کاموں کے لیے منتخب فرمایا تھااوروہ کام انہوں نے مختلف طریقوں سے انجام دیے اور ایسے انجام دیے کہ ان کی صدسالہ برسی آج اس اہتمام سے منائی جارہی ہے۔

علامہ شبلی نعمانی کی کارکردگی کے مرکز چار رہے ہیں۔علی گڑھ،حیدرآباد، ندوۃ العلماء (لکھنؤ) اوروطن مالوف اعظم گڑھ۔وہ ۱۸۸۳ء میں محمڈن اینگلواورینٹل (ایم-اے-او) کالج میں فارسی وعربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔اس وقت ان کی عمر ۲۶ سال سے بھی کم تھی۔اس سے پہلے وہ علی گڑھ ۱۸۸۱ء میں آئے تھے اور انہوں نے علی گڑھ کے پیر جواں مرد سرسید احمد خاں (جو ان سے عمر میں چالیس برس بڑے تھے) کی شان میں عربی میں قصیدہ پیش کیا۔اس مرد پیر نے جوان العمر شبلی کی صلاحیت کو دوسری آمد (۱۸۸۳ء) میں کے موقع پر پرکھا اور اپنا عظیم الشان کتب خانہ ان کے حوالے کردیا کہ اس سے جی بھرکر استفادہ کریں۔شبلی نے علی گڑھ میں ۱۵ سال گزارے۔علی گڑھ سے ان کا معاملہ سیکھنے اور سکھانے کا رہا۔ایم-اے-او کالج کے قیام سے سرسید کا اولین مقصد مسلمانوں میں انگریزی زبان کے ذریعہ جدید علوم کا حصول تھا تا کہ ان میں روشن خیالی پیدا ہواور وہ مصاف حیات میں تیز گام ہوجائیں لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ وہ جو کچھ حاصل کریں مسلمان رہ کر حاصل کریں اور اس غرض سے انہوں نے اپنی درس گاہ میں جدید علوم کے ساتھ عربی، فارسی اور دینیات کی تعلیم کا بھی معقول انتظام کیا تھا۔مولانا شبلی علی گڑھ میں رہ کر اپنے ذہنی افق کو وسیع تر کرتے رہے اور دوسری طرف کوشش کرتے رہے کہ علی گڑھ میں

www.shibliacademy.org

صحیح اسلامی ماحول کی نشو ونما ہو۔وہ عربی کے استاد تھے،اس لیے ان کی خواہش تھی کہ جو طالب علم عربی پڑھتے ہیں وہ کتابی علم سے واقف ہونے کے ساتھ عربی بولنے اور لکھنے کی صلاحیت بھی اپنے اندر پیدا کریں،اس غرض سے انہوں نے لجنۃ الادب کی تاسیس فرمائی۔علی گڑھ میں پروفیسر آرنلڈ کی صحبت دونوں کے لیے مفید ثابت ہوئی۔علامہ کی متعدد اعلیٰ درجے کی تصانیف علی گڑھ کے دوران قیام میں شائع ہوئیں۔یہ تصانیف انہوں نے علی گڑھ کی نذر کر کے اس کے علمی خزانے میں گراں بہا اضافہ کیا اور مالی اعتبار سے بھی فائدہ پہنچایا۔ان سے زیادہ کون جان سکتا تھا کہ قرآن مجید مسلمانوں کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنی جسم کے لیے روح بلکہ اس سے بھی زیادہ کیونکہ روح تو بالآخر ایک دن جسم سے جدا ہو جاتی ہے،قرآن مجید اس دنیا اور اس دنیا دونوں میں مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا ضامن ہے۔چنانچہ انہوں نے کالج میں درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا جو بہت مقبول ہوا۔یہاں یہ عرض کرنا بے جا نہیں ہوگا کہ کالج کے مسلم یونیورسٹی بن جانے کے بعد یہی خدمت صدر شعبہ سنی دینیات مولانا سید سلیمان اشرف انجام دیتے رہے۔ان کے جانشین مولانا مفتی عبداللطیف بڑے حلقے میں تو درسِ قرآن نہیں دیتے تھے لیکن چند منتخب طالب علموں کو مستفیض فرماتے تھے۔ان کی قرآن فہمی اپنے وقت میں بے مثال تھی۔

علی گڑھ کا ایک اور ادارہ جس کے بانی سرسید ہی تھے علامہ شبلی کے فیض سے بہرہ ور ہوا۔یہ ادارہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہے جس کے سالانہ اجلاس متحدہ ہندوستان کے طول وعرض میں منعقد ہوتے تھے۔ان اجلاسوں کی افادیت میں علامہ شبلی کے خطبات اور نظموں نے بدرجہا اضافہ کر دیا تھا اور کانفرنس میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔

سرسید سے علامہ شبلی کے اختلافات کا ذکر اکثر کیا جاتا ہے۔پروفیسر شان محمد نے اپنے مضمون مطبوعہ ماہ نامہ تہذیب الاخلاق،علی گڑھ،بابت اکتوبر ۲۰۱۴ء میں لکھا ہے کہ بعض معاملات میں سرسید سے ان کے قریب ترین رفقاء کو بھی اختلافات تھے۔مولوی سمیع اللہ خاں کا اختلاف اتنا شدید تھا کہ انہوں نے سرسید کی وفات کے نو برس قبل سے ان سے ملاقات نہیں کی تھی۔اس میں استثناء حالی،محسن الملک اور وقار الملک کا بھی نہیں تھا۔فرق بس اتنا تھا کہ نواب وقار الملک بعض اوقات شدید زبان بھی اختیار کر لیتے تھے اور نواب محسن الملک اور حالی سرسید کے عز و وقار کو

www.shibliacademy.org

ہمیشہ ملحوظ نظر رکھتے تھے۔ اختلاف کے بڑے سبب دو تھے۔ کالج میں انگلش اسٹاف کا بڑھتا ہوا رسوخ اور سید محمود کی بد دماغی اور انگلش اسٹاف کے ساتھ ان کا تال میل۔ پروفیسر شان محمد نے یہاں تک لکھا ہے کہ کہا جاتا تھا کہ یہ انگلش اسٹاف درپردہ مسلمان طلبہ کو عیسائی بنانے کی کوشش بھی کرتا تھا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ علامہ شبلی کے معاملے میں اختلاف کے دو اضافی سبب بھی ہو سکتے تھے۔ دونوں کی سیاسی سوچ کا فرق اور علامہ کے نزدیک کالج میں صحیح دینی فضا کی کمی۔ سرسید ایک ایسا ادارہ چلا رہے تھے جس کے لیے ان کے پیش نظر آکسفورڈ اور کیمبرج کا معیار تھا، اسے چلانے اور ترقی دینے کے لیے ان کی رائے میں انگلش اسٹاف کی موجودگی اور حکومت وقت کا تعاون ضروری تھا۔ خود علامہ شبلی کو ندوۃ العلماء میں پہنچ کر حکومت سے سمجھوتہ کرنا پڑا تھا۔ تاہم ہمارا خیال ہے کہ علامہ شبلی بجا طور پر یہ سمجھتے تھے کہ اس معاملے میں حدود سے تجاوز کیا جا رہا ہے۔ وہ ۱۸۹۰ء کی دہے کے آغاز سے ذہنی طور پر علی گڑھ سے دور ہوتے گئے، پھر بھی سرسید کی زندگی میں رسمی لحاظ سے علی گڑھ سے وابستہ رہے۔ ۱۸۹۸ء میں ان کی وفات کے بعد وہ علی گڑھ رہنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ اس کا سبب سید محمود کی نخوت کے علاوہ علامہ شبلی کی یہ دوراندیشی بھی ہوسکتی ہے کہ سرسید کے جانشین ان کی جیسی ذہنی رفعت اور روشن خیالی سے عاری ہیں۔ وہ ان کی سیاسی پالیسی پر تو چلیں گے لیکن تعلیمی اور سماجی امور میں ان کی پیروی نہیں کرسکیں گے۔ ہوا بھی یہی، ۱۸۹۸ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیان علی گڑھ کی سیاست تو وہی رہی جس کی بنیاد سرسید نے رکھی تھی لیکن ان کے علمی مقاصد وہ پورے نہ کرسکا اور ان کی ذہنی بالیدگی اور وسیع النظری میں وہ بچھڑ گیا۔ اس میں واحد استثناء سرسید کے پوتے سرراس مسعود کا ہے جنھوں نے اپنے مسلم یونیورسٹی کے دور وائس چانسلری (۱۹۲۹-۱۹۳۴ء) میں اپنے دادا کی یاد تازہ کردی تھی۔

علی گڑھ سے جانے کے بعد علامہ شبلی نے کچھ وقت ندوۃ العلماء لکھنؤ اور وطن مالوف اعظم گڑھ میں گزارا۔ سلسلۂ تصنیف وتالیف اس وقت بھی جاری رہا۔ ۱۹۰۱ء میں وہ حیدرآباد پہنچ گئے اور ۱۹۰۵ء تک مقیم رہے۔ وہاں ان کے مشاغل کا دائرہ وسیع رہا، عملی اعتبار سے بھی اور تصنیف وتالیف کے لحاظ سے بھی۔ وہاں انہیں امور مذہبی کی نیابت کی پیش کش ہوئی جو انہوں نے کسی وجہ سے قبول نہیں کی۔ بالآخر ان کا تقرر سررشتۂ تعلیم کے ناظم کی حیثیت سے ہوگیا، لیکن ریاستی سیاست

www.shibliacademy.org

کے نشیب وفراز کی بنا پر یہ اِدارہ استقامت حاصل نہیں کر سکا۔ تاہم حیدرآباد میں رہ کر انہوں نے دوسروں کی تصانیف تو شائع کیں ہی، خود الغزالی، علم الکلام، الکلام اور موازنہ انیس و دبیر جیسی بلند پایہ کتابیں لکھیں اور چھپوائیں۔ انہیں تصنیفی کاموں کے لیے ریاست سے جو وظیفہ ملتا تھا اس کی وجہ سے یہ کتابیں سلسلہ آصفیہ میں شامل ہوئیں۔

وہ جہاں بھی رہے مدارس کے نصاب تعلیم میں اصلاح وتبدیلی کی طرف سے کبھی غافل نہیں رہے اور اس مقصد کے لیے ان کی نظر ہمیشہ ندوۃ العلماء پر مرکوز رہی۔ اس کے اجلاسوں میں شرکت کرتے اور تجاویز پیش فرماتے رہے۔ بالآخر ۱۹۰۵ء میں وہاں آ گئے اور اس کے معتمد تعلیم مقرر ہو گئے۔ وہ ۱۹۱۲ء تک اس عہدے پر سرفراز رہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا علامہ شبلی کی دلچسپی اور توجہ کا اصلی مرکز نصاب تعلیم میں تبدیلی کا مسئلہ تھا۔ وہ جملہ فنون آلیہ وعالیہ میں تبدیلی کے خواہاں تھے۔ مدارس میں بالعموم علوم آلیہ (یعنی صرف ونحو) اور معقولات کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی اور ان علوم میں بھی جو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں وہ اب وقت کا ساتھ دینے کے قابل نہیں رہ گئی تھیں۔ علامہ ان میں تبدیلی تو چاہتے ہی تھے، ان کا اصلی مقصد یہ تھا کہ علوم عالیہ (تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ اور اصول فقہ) اور ادب وانشاء پر خاص طور سے توجہ مبذول کی جائے۔ اور پھر مسئلہ تھا انگریزی کی تعلیم کا بلکہ علامہ کی نگہ دوررس تو سنسکرت کی تعلیم تک پہنچی ہوئی تھی۔ علامہ ندوۃ العلماء میں رہے تو یہی لڑائی لڑتے رہے۔ ان کی بعض باتیں مانی گئیں، زیادہ تر نہیں مانی گئیں۔

دیگر دینی وعربی درس گاہوں کے مقابلے میں بالخصوص ادب وانشاء اور جدید عربی کے معاملے میں جو امتیاز ندوۃ العلماء کو حاصل ہے اس میں بلاشبہ علامہ کی ابتدائی دور کی جدوجہد کو بہت دخل ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی رائے ہے کہ اس کا مقصد تبلیغی تھا یعنی مستشرقین نے انگریزی میں اسلام اور مسلمانوں پر جو اعتراضات کیے ہیں ان کی جواب دہی، لیکن راقم الحروف کا خیال ہے کہ یہ واحد مقصد نہیں ہو سکتا تھا۔ ان زبانوں میں جو علمی خزانے موجود تھے علامہ شبلی مدارس کے طلبہ پر ان کا انکشاف چاہتے تھے۔ ”اچھائی جہاں ملے اسے اختیار کرو“ پر ان کا گہرا عقیدہ تھا۔ خاکسار راقم الحروف کی رائے ہے کہ ہمارے اکابر کو اکثر ایسے رنگ میں پیش کیا جاتا

www.shibliacademy.org

ہے جوان کا اصلی رنگ نہیں ہوتا ہے۔علامہ شبلی کے ساتھ یہ شاید سب سے زیادہ ہوا ہے۔وہ عالم دین تھے لہٰذا انہیں بیشتر لوگ اسی رنگ میں رنگا ہوا دیکھنا چاہتے تھے جو ہم نے بالعموم علماء کے لیے اپنے ذہنوں میں تجویز کرلیا ہے اور جب دیکھتے ہیں کہ علامہ شبلی کا رنگ اس سے مختلف ہے تو ان کے مخالفین ان پر طرح طرح کے الزامات لگاتے ہیں اور معتقدین ان کے اصلی رنگ کو پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں یا پھر ان کی ایسی تاویلیں کرتے ہیں کہ علامہ کی تصویر بے رنگ ہو جائے۔ کوئی انہیں سرسید کا حریف بنا کر پیش کرتا ہے،کوئی ندوۃ العلماء میں ان کے اور دیگر علماء کے علمی یا نظریاتی اختلافات کو بڑھا چڑھا کر دکھاتا ہے،کوئی کہتا ہے کہ ان کی تصانیف کو ابھی سے لونی لگ گئی ہے،کوئی ان تصانیف کا واحد مقصد مستشرقین کی جواب دہی قرار دیتا ہے،کوئی ان میں تقویٰ کی کمی محسوس کرتا ہے اور بعض تو کھلم کھلا ان کی کردارکشی کی کوشش کرتے ہیں۔ ہماری رائے میں یہ نتیجہ ہے مکمل شخصیت کے بجائے آدھی ادھوری شخصیت کو نگاہ میں رکھ کر فیصلے سنا دینے کا۔

علامہ شبلی نعمانی کا ندوۃ العلماء میں رہ کر اصلاح نصاب کی کوشش کے علاوہ دوسرا بڑا کام رسالہ الندوہ کی ادارت تھا۔اس کی ادارت میں وقتاً فوقتاً ان کے شریک کار متعدد اہل علم رہے لیکن ادارت کی اصلی ذمہ داری ان ہی کے سر رہی۔اس رسالے نے اس دور میں جو شہرت و امتیاز حاصل کیا بعد میں اگر اس کا مثل بنا تو ان کے شاگرد رشید مولانا سید سلیمان ندوی کی ادارت میں نکلنے والا معارف۔معارف بھی اب اپنی زندگی کی پہلی صدی ختم کرنے کے قریب ہے لیکن الحمدللہ پابندی وقت کے ساتھ نکل رہا ہے اور بڑی حد تک اپنے معیار کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے ندوۃ العلماء کی ترقی کے لیے گوناگوں خدمات انجام دیں لیکن وہاں کے قدیم الخیال بزرگوں سے ان کا نباہ نہیں ہوسکا اور ۱۹۱۲ء میں انہی اسے چھوڑنا پڑا۔ ’’جدید‘‘ اور ’’قدیم‘‘ دونوں سے بددل ہو کر انہوں نے خود اپنے نگر میں اپنی بستی بسانے کا اہتمام کیا اور آج اسی بستی میں ان کی صد سالہ وفات کی تقریب منعقد ہو رہی ہے۔

علامہ شبلی کی تصانیف کا دائرہ علی گڑھ تا حیدرآباد تا لکھنؤ وسیع ہے اور انہوں نے،جیسا کہ عرض کیا گیا،مختلف علوم وفنون پر قلم اٹھایا ہے اور ان کا حق ادا کیا ہے۔یہ امر مختلف فیہ رہا ہے کہ ان کا اصلی کارنامہ علم کے کس شعبے سے تعلق رکھتا ہے۔علامہ کے دوست اور معتقد مہدی افادی کا کہنا

www.shibliacademy.org

تھا کہ ان کا اصلی موضوع تاریخ ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کا ارشاد ہے کہ وہ تاریخ کے ذریعہ علم کلام تک پہنچے کیونکہ ان کی تاریخی تصانیف میں بھی علم کلام کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ اس اعتبار سے درست ہے کہ علم الکلام اور الکلام کے علاوہ الغزالی اور رومی میں بھی کلامی مسائل زیر بحث آئے ہیں۔ پروفیسر ظفر احمد صدیقی کی رائے ہے کہ علامہ اصلاً متکلم ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ انہوں نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہو، ان کی انشاپردازی ہر جگہ نمایاں ہے۔ انشاپردازی کا اصلی جوہر تو بعض خطوط میں کھلتا ہے لیکن ان کی آخری تصنیف سیرۃ النبیؐ جلد اول میں بھی انشا کے اعلیٰ نمونے نظر افروز ہوتے ہیں۔ ظہور قدسی پر انہوں نے جس طرح روشنی ڈالی ہے متعدد اہل نظر کے نزدیک وہ ان کی انشاپردازی کا شاہکار ہے اور اردو ادب میں اس کی مثال ملنا دشوار ہے۔

علامہ شبلی جہاں رہے فرائض منصبی ادا کرنے کے علاوہ مختلف طریقوں سے علم و ادب کی آب یاری کرتے رہے اور تصنیفات و تالیفات سے وہاں کے علمی و ادبی خزانوں میں اضافہ کیا۔ علی گڑھ کے دوران قیام مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم پر رسالہ لکھا۔ یہ دراصل آل انڈیا محمڈن (اب مسلم) ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک سالانہ اجلاس کے لیے لکھا ہوا ان کا خطبہ ہے۔ علامہ کی دوسری تصنیف المامون تھی۔ یہاں بھی انھوں نے اپنی انفرادیت قائم رکھی۔ عوام اور خواص دونوں طبقے ہارون الرشید کے نام سے زیادہ واقف تھے۔ اس کے گرد مختلف قصے مشہور تھے۔ اس کی علم دوستی اور علماء نوازی، اس کی شان وشوکت اور داد و دہش نے ان قصوں کو جنم دیا تھا۔ راقم الحروف کی رائے میں سوانح لکھنے کے لیے علامہ شبلی نے مامون الرشید کا انتخاب اس لیے کیا کہ اس کی علم کی جستجو اور حق تک رسائی کے لیے اس کی کاوش انھیں بھا گئی۔ مولانا سید سلیمان ندوی کا خیال ہے کہ اس کی تصنیف کا باعث ہارون الرشید پر پامر کی تصنیف ہے جس میں اس نے ''اسلام کے خلاف زہر افشانی'' کی تھی۔ دراصل علامہ شبلی کے بیشتر معتقدین و مداحین نے انہیں اسی رنگ میں پیش کیا ہے کہ وہ ہاتھ میں قلم پکڑے ہوئے مستشرقین کی تاک میں بیٹھے رہتے تھے۔ جہاں کسی مستشرق کی یا وہ گوئی پر نظر پڑی جواب لکھنے کے لیے قلم سنبھال لیا۔ گویا علامہ شبلی کا قلم نہ ہوا سودا کا قلم دان ہوگیا۔ اسی قسم کے اظہار خیال نے بعض جدید تعلیم یافتہ حضرات کو موقع فراہم کیا ہے کہ وہ علامہ کی تاریخ نویسی کو دفاعی قرار دیں۔ علامہ کو مامون کی تلاش حق پسند آئی اور انہوں نے اس کی سوانح

www.shibliacademy.org

لکھنے کا قصد کرلیا۔اب اگر اس میں پامر کے الزامات کا جواب بھی آ گیا تو اس کا ایک مزید وصف ہوا۔اسے اس کی تصنیف کا اصلی سبب قرار دینا کیا ضروری ہے۔علامہ کی تیسری تصنیف سیرۃ النعمان (سوانح امام ابوحنیفہؒ) ہے جس نے انہیں محمد شبلی سے شبلی نعمانی بنا دیا۔مولانا سید سلیمان ندوی کا ارشاد ہے کہ انہیں یہ لقب ان کے استاد محترم مولانا فاروق چریا کوٹی نے عطا کیا تھا۔علامہ نے یہ لقب خود اختیار کیا ہو یا ان کے استاد کا عطیہ ہو،اس کا سبب بہر حال علامہ شبلی اور ان کے فاضل استاد مولانا چریا کوٹی کا امام اعظم کے تفقہ فی الدین کو قرار دیا جاسکتا ہے یعنی مسائل میں جتنی وسیع امام اعظم کی نظر تھی اور جیسا درک انھیں مسئلے کی تہہ تک پہنچ جانے کا حاصل تھا اس کی نظیر اور کسی فقیہ کے وہاں ملنا مشکل ہے۔

علامہ شبلی اپنے ترکی کے سفر پر علی گڑھ ہی کے دوران قیام میں ۱۸۹۲ء تشریف لے گئے۔ اس کا مقصد علم کی پیاس بجھانا تھا۔ہمیں حکم ہے **اطلبوا العلم ولو کان بالصین** ۔یہاں صین (چین) استعارہ ہے دور دراز مقامات سے۔مولانا سید سلیمان ندوی کا کہنا ہے کہ وہ الفاروق لکھنے کے لیے بے تاب تھے اور ان کا اصلی مقصد اس کے لیے مواد جمع کرنا تھا جہاں بھی دستیاب ہو۔ قسطنطنیہ کا کتب خانہ کل ہی نہیں، آج بھی علم کا بڑا ذخیرہ ہے اور قدیم تاریخ اور مخطوطات پر کام کرنے کے لیے آج بھی اس ذخیرے سے اہل علم مستفید ہوتے رہتے ہیں۔فرق صرف یہ ہے کہ اس وقت اس مقصد سے شدرحال کرنا پڑتا تھا اور آج سائنسی ایجادات کی بدولت گھر بیٹھے یہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔تاہم سفر کی اپنی برکات ہیں اور قرآن مجید میں بھی عبرت وموعظت کی خاطر **سیروا فی الأرض** کا حکم ملتا ہے۔سید صاحب کی یہ رائے بھی ہے کہ اس سفر کی ایک غایت بحالیِ صحت بھی تھی۔ہمیں اس سفر کی تفصیلات سے بحث نہیں ہے۔ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ اس سے ہمارے ہاتھ کیا لگا۔علامہ کو ضمنی فوائد بھی پہنچے،مثلاً انھوں نے کسی قدر ترکی زبان سیکھ لی۔ وہاں کے طرز تعلیم کا جائزہ لینے کا موقع ملا۔مولانا ندوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایم-اے-او کالج اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا معروف روزگار یونیفارم (ترکی ٹوپی اور ترکی کوٹ) سرسید احمد خاں نے علامہ شبلی ہی کی رائے کے مطابق اختیار کیا تھا اور یہ ثمر تھا علامہ کے سفر قسطنطنیہ کا۔وہاں رہ کر اور وہاں کے مناظر سے انسپی ریشن (Inspiration) حاصل کر کے علامہ کی فارسی شاعری کو بھی

www.shibliacademy.org

چار چاند لگ گئے، ترکی حکومت نے انہیں اپنے ایک بڑے اعزاز تمغۂ مجیدیہ سے سرفراز کیا۔

علامہ شبلی کو ترکی سے تو تمغۂ مجیدیہ مل ہی گیا تھا، سرسید نے سوچا ہوگا کہ برطانیہ کے اعزاز شمس العلماء سے بھی سرفراز ہو جائیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے ''حیات شبلی'' میں اس کا ایک سبب یہ بھی لکھا ہے کہ ترکی جانے، ''خلیفہ'' سے ملنے اور تمغۂ مجیدیہ سے سرفراز ہونے کے بہ سبب وہ برطانیہ کے حکام کی نظر میں مشکوک ہو گئے تھے۔ سرسید نے ان کا شک رفع کرنے اور علامہ کی وفاداری کا یقین دلانے کی غرض سے یہ کوشش کی تھی۔ بہرحال علامہ شبلی شمس العلماء بھی ہو گئے حال آں کہ اس سے پہلے بھی وہ کسی نیر تاباں سے کیا کم تھے۔

اب علامہ شبلی کا دل علی گڑھ سے اچٹ گیا تھا۔ اس کا ایک سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ ترکوں کی جنگ میں فتح کا جو جشن علی گڑھ میں منایا گیا اس میں علامہ شبلی نے تو دلچسپی لی لیکن سرسید نے اسے پسند نہیں کیا۔ اس دوران علامہ کسی نہ کسی طرح نبھاتے رہے لیکن جب دو، تین سفر حیدرآباد کے ہوئے تو وہاں انہیں اپنی دلچسپی کا سامان نظر آیا۔ انہوں نے دائرۃ المعارف کی کارکردگی کو بہتر بنانے کی بعض تجاویز پیش کیں جس کا اچھا اثر ہوا۔ آصف جاہ سادس میر عثمان علی خاں نے ایک سو روپے ماہوار تعلیمی وظیفہ مقرر کر دیا جس میں بعد میں آصف جاہ سابع میر عثمان علی خاں نے اتنا ہی اضافہ کر دیا۔

اس دوران علامہ شبلی الفاروق کی تصنیف میں سرگرداں رہے۔ جہاں جو مواد میسر آیا جمع کیا۔ یہاں تک کہ بعض نئی کتابوں کی اشاعت کا انتظار بھی کیا۔ اس کی تالیف میں چار برس صرف ہوئے اور جب وہ ۱۸۹۸ء میں شائع ہو کر آئی تو علامہ شبلی کا شاہ کار قرار پائی۔ اس کتاب کی تالیف، مولانا سید سلیمان ندوی کی روایت کے مطابق، تین مقامات پر ہوئی: علی گڑھ، اعظم گڑھ اور کشمیر۔ وہ اختتام کو کشمیر میں پہنچی۔ کون جانے اس کے حسن و طراوت میں کشمیر کا بھی حصہ نہیں ہے۔ یہ وہی سال ہے جب علامہ کا علی گڑھ سے تعلق منقطع ہوا۔ اس لیے علی گڑھ کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ علامہ کی کم از کم چار تصانیف میں حصہ دار ہے اگرچہ الفاروق طبع کان پور میں ہوئی ہے۔ حضرت عمرؓ فاروق کی ذات میں اللہ تعالیٰ نے خطابت، فراست، شجاعت، نظم و نسق کی صلاحیت جیسے اوصاف بیک وقت جمع فرما دیے تھے۔ ان کی قوت اجتہاد صدر اسلام میں بھی بے نظیر تھی۔ اس کا مطلب یہ

www.shibliacademy.org

ہے کہ اس وقت جب صحابہ کرامؓ بڑی تعداد میں موجود تھے، ابھی نبی کریمؐ کو دنیا سے تشریف لے جائے ہوئے زیادہ مدت نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی اجتہاد کی ضرورت پیش آ جاتی تھی اور اس ضرورت کو بالعموم حضرت فاروقؓ پورا فرماتے تھے۔ ایسی ذات گرامی کے سوانح لکھنے کے لیے شبلی ہی کا قلم درکار تھا اور انہوں نے اس کا حق پورا پورا ادا کیا ہے۔

اگر چہ حیدرآباد میں علامہ شبلی کا قیام مختصر رہا لیکن وہ ہمارے لیے اس بنا پر اہم ہے کہ اس دوران الغزالی، علم الکلام، الکلام، سوانح مولانائے روم اور موازنہ انیس و دبیر جیسی بیش بہا تصانیف وجود میں آئیں۔

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ علامہ شبلی کی علمی و ادبی حیثیت کے بارے میں شبلی شناسوں میں اختلاف رہا ہے۔ خاکسار راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ ان کی شخصیت کا اصلی کمال یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ اور علم کلام کو کس طرح باہم پیوست کیا ہے۔ اس کی بہترین مثال الغزالی ہے جو علم الکلام اور الکلام سے پہلے لکھی گئی ہے۔ امام غزالی متکلم تھے، اس لیے ان کے سوانح میں ان کی کلامی حیثیت پر گفتگو ناگزیر تھی۔ یہ تصنیف اور اس کے بعد کی تصانیف ماسوا سیرۃ النبیؐ کے قیام حیدرآباد کی یادگار ہیں۔ علامہ شبلی سے الغزالی کے لکھنے کی فرمائش سب سے پہلے سرسید احمد خاں نے کی تھی لیکن سوال یہ ہے کہ انہوں نے یہ فرمائش کیوں کی تھی؟ ہمارا خیال ہے کہ اس کا سبب خود سرسید کا علم کلام سے ذوق ہو سکتا ہے۔ اگر ان کی پوری مذہبی فکر کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ خود بھی متکلم ہی تھے۔ علم کلام ہے کیا؟ اسلامی فکر اور اپنے دور کی رائج فکر میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش۔ امام غزالی کا واسطہ یونانی فلسفے سے رہا تھا اور سرسید اور علامہ شبلی کا مغربی سائنس سے۔ اس لیے ان سب نے اپنے اپنے دور میں اپنے اپنے طور پر فلسفہ، سائنس اور مذہب میں رشتے تلاش کرنے کی کوشش کی۔ علامہ شبلی عالم دین تھے اور پھر علی گڑھ میں رہ کر علوم جدیدہ سے بھی کسی قدر واقفیت حاصل کر لی تھی۔ یہ بات پہلے بیان ہوئی ہے کہ ان کی شخصیت یک رخی نہیں تھی۔ انہیں علوم عقلیہ و نقلیہ سے یکساں دلچسپی تھی۔ چنانچہ اس مرحلے پر انہوں نے علم کلام کی طرف توجہ مبذول کی۔ اس وقت انہیں سرسید کی فرمائش یاد آئی ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے اس کام کا آغاز امام غزالی سے کیا۔

www.shibliacademy.org

مولانا سید سلیمان ندوی نے یہ اچھی بات لکھی ہے کہ جس طرح امام غزالی زندگی کے مختلف نشیب وفراز اور علم کے گونا گوں مراحل سے گزرکر علم کلام تک پہنچے تھے اسی طرح یہ کتاب (الغزالی) ان کی زندگی کے مختلف احوال وکوائف بیان کرنے کے بعد اپنے اصلی موضوع (علم کلام) اور امام غزالی کی متکلمانہ حیثیت پر اظہارِ خیال کرتی ہے۔

بقول سید صاحب جب وہ علم الکلام تصنیف کر رہے تھے اسی وقت سے الکلام کا مواد جمع کرنا شروع کردیا تھا۔ اس دوران انہوں نے دو ایک مضمون بھی لکھے تھے جن کا موضوع امام غزالی اور علم کلام تھا۔ اگر علم الکلام قدیم فلسفۂ کلام سے بحث کرتی ہے تو بقول خود ان کے الکلام اس کے جدید رخ سے۔ لیکن یہ جدید بھی آج کا قدیم ہی تھا۔ ایک بات اور ملحوظ نظر رہنی چاہیے اور وہ ہے معتزلہ سے علامہ کا شغف۔ اس موضوع پر ان کے دو ایک مضمون پہلے ہی شائع ہو چکے تھے۔ یہ تینوں کتابیں تقریباً ساتھ ساتھ چلتی رہیں اور آگے پیچھے شائع ہوئیں یعنی بیسویں صدی کے آغاز میں۔ اس وقت علامہ کی عمر ۴۵ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ دوران کے علوم عقلیہ سے شغف کا دور ہے۔ اس کا آغاز تو علی گڑھ ہی میں ہوگیا تھا، تکمیل قیام حیدرآباد کے دوران ہوئی۔ اگرچہ دونوں مقامات پر وہ بعض ذہنی الجھنوں میں مبتلا رہے۔

سوانح مولانائے روم کی طرف بھی وہ اسی لیے راغب ہوئے کہ وہ بظاہر ایک بڑے صوفی تھے لیکن علم کلام کا ذوق بھی انہیں ودیعت ہوا تھا اور ان کی مثنوی بھی اس سے خالی نہیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ مولانائے روم کے ایک بڑے شاعر ہونے میں کسی کو شبہ نہیں ہوسکتا ہے اور علامہ شبلی کا فارسی شاعری سے شغف معلوم ومعروف ہے۔ اس لیے انہیں مثنوی میں تصوف، کلام اور شاعری کے اعلیٰ نمونے یک جا نظر آئے اور اسی لیے وہ مثنوی اور صاحب مثنوی پر لکھنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس کتاب کا مطالعہ اس نیت سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ اس سے علامہ شبلی کی تنقیدی صلاحیت پر وافر روشنی پڑتی ہے۔

اس کتاب کی نگارش کا آغاز حیدرآباد میں ہوگیا تھا اور وہ منشی رحمت اللہ رعد کے مطبع سے چھپ کر ۱۹۰۴ء میں اس وقت آئی جب وہ حیدرآباد سے ندوۃ العلماء لکھنؤ آگئے تھے۔ حیات شبلی واوین کے استعمال سے خالی ہے، اس لیے یہ معلوم کرنا دشوار ہوجاتا ہے کہ کون سی

www.shibliacademy.org

عبارت مصنف محترم کی ہے اور کون سی کسی دوسرے اہل قلم کا اقتباس ہے۔ تاہم درج ذیل عبارت چاہے سید صاحب کی ہو یا مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی ہے مبنی بر حقیقت ''مبارک تھا وہ وقت جب ان (علامہ) کی توجہ تصوف کی طرف مائل ہوئی کیونکہ اسی توجہ کا بیش بہا نتیجہ وہ تصنیف (سوانح مولانائے روم) ہے جس پر ہم یہ ریویو لکھ رہے ہیں... صرف ایک تصوف کی کتاب کی حیثیت سے یہ دقیقہ سنجی علامہ شبلی کی نظر کے واسطے ودیعت تھی کہ مثنوی معنوی علم کلام کا بھی بہترین مجموعہ ہے''۔ گمان غالب ہے کہ یہ عبارت مولانا شروانی کے تبصرے کا حصہ ہے کیونکہ بعد میں سید صاحب نے مزید تشریح کی ہے کہ جس طرح عقلیات کی تلاش نے مولانا (شبلی) کو اِمام غزالی کی درس گاہ تک پہنچایا۔ امام غزالی کی تلاش ان کو مولانا روم کے آستانے پر لے آئی۔ گویا سید صاحب کا جو قول ہم نے پہلے کہیں نقل کیا ہے کہ علامہ تاریخ کے ذریعہ علم کلام تک پہنچے (اور پھر اس میں تصوف بھی شامل ہو گیا) برحق ہے۔

موازنۂ انیس و دبیر کا آغاز تو سوانح مولانائے روم سے پیشتر ہو گیا تھا لیکن وہ شائع ہوئی اس کے بعد۔ موازنہ کے بعد شعرالعجم لکھی گئی۔ اس کی بابت راقم الحروف کسی قدر اظہار خیال کر چکا ہے۔ یہاں یہ عرض کرتا ہے کہ علامہ کی ادبی تنقید کا نمونہ یہی دونوں کتابیں ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ شعرالعجم میں تنقید کے ساتھ فارسی شاعری کی تاریخ بھی آ گئی ہے۔ موازنہ میں علامہ نے میر انیس کو مرزا دبیر پر ترجیح دی ہے اور یہ ترجیح بالکل درست ہے کیونکہ انیس کے وہاں جو خیال بندی ہے اور الفاظ کے استعمال پر جیسی قدرت انھیں حاصل ہے دبیر وہاں تک نہیں پہنچے۔ تاہم انیس کا نقص یہ ہے کہ انھوں نے عراق کے ذکر میں شمالی ہند کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔

حیدرآباد میں علامہ نے جو دوسرے کارنامے انجام دیے ان کے اظہار کا یہ موقع نہیں، بہرحال ریاست کی سیاست سے علامہ کا خوگر ہونا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے ۱۹۰۵ء کے آغاز میں وہ حیدرآباد کی ملازمت سے مستعفی ہو کر وہاں سے چلے آئے۔

علامہ شبلی نعمانی کی خدمات کا دائرہ وسیع ہے۔ ان میں مختلف انجمنیں اور ادارے آ جاتے ہیں۔ ان میں انجمن ترقی اردو بھی شامل ہے جو اس وقت آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا ایک شعبہ تھا، وہ اس کے پہلے سکریٹری منتخب ہوئے تھے۔ اور ۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۵ء تک اس عہدے پر

www.shibliacademy.org

متمکن رہے۔اس دوران اردو کے تعلق سے جو عملی خدمات انہوں نے انجام دیں ان کا ذکر باعث طوالت ہے۔

علامہ شبلی کہیں بھی رہے ہوں اور کچھ بھی کرتے رہے ہوں، ندوۃ العلماء ان کے ذہن سے کبھی دور نہیں رہا۔ وہ جہاں بھی رہے اس کے سالانہ اجلاسوں میں برابر شریک ہوتے رہے۔ان کا خاص سروکار مدارس اسلامیہ کے نصاب سے بالعموم اور ندوۃ العلماء کے نصاب تعلیم سے بالخصوص رہا۔ان کا خیال تھا اور صحیح خیال تھا کہ مدارس اسلامیہ میں عربی بطور ایک کلاسیکل زبان کے پڑھائی جاتی ہے، زیادہ توجہ صرف ونحو اور علوم عقلیہ پر رہتی ہے۔جو علوم مقصود بالذات ہیں ان کی تدریس پر اتنا وقت صرف نہیں کیا جاتا ہے جتنا کرنا چاہیے۔

جب علامہ شبلی کو ۱۹۰۷ء میں پانوں کا حادثہ پیش آیا اس وقت وہ اعظم گڑھ میں شعرالعجم کی تالیف میں مشغول تھے۔ یہ حادثہ شدید تھا۔ اس کی تفصیلات بالعموم معلوم ہیں۔بعض اختلافات بھی رہے ہیں لیکن ہم ان تمام امور سے صرف نظر کر کے عرض یہ کرنا چاہتے ہیں کہ اتنا بڑا حادثہ بھی ان کے عزائم میں مزاحم نہیں ہوسکا اور نہ ان کے تصنیفی کام میں خلل ڈال سکا۔تھوڑی مدت تو وہ یقیناً فریش اور زیر علاج رہے۔ ۱۹۰۸ء سے پھر اپنے اسفار میں اور دیگر کاموں میں مشغول ہوگئے۔علاوہ تصنیف وتالیف کے ندوہ ان کی خاص توجہ کا مرکز تھا ہی۔اسی سال سرکار برطانیہ سے ان کا پچاس روپے ماہانہ وظیفہ مقرر ہوگیا۔جیسا کہ ہم نے پہلے بھی عرض کیا ہے، ادارے چلانے کے لیے حکومت وقت کا تعاون بہرحال ضروری ہوتا ہے۔دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اس سے مقصد اصلی میں خلل نہ پڑے۔ندوۃ العلماء سے حکومت کی بدگمانی کو دور کرنے کے لیے جو کدو کاوش کی گئی اس کی داستان طویل بھی ہے اور بدمزہ بھی۔بس اتنا مان لیجیے کہ اس دور کی حریت پسندی بھی کتنے قیود میں جکڑی ہوئی تھی اور ان زعماء کو دل کھول کر داد دیجیے جنھوں نے ان قیود کو نہ صرف ڈھیلا کیا بلکہ توڑ پھینکا۔

معاملہ صرف سرکار کے شکوک کو رفع کرنے اور اس سے مالی امداد اور اعزاز حاصل کرنے کا نہیں تھا، اپنوں کی ریشہ دوانیوں اور الزام تراشیوں سے عہدہ برآ ہونے کا بھی تھا۔اس کے علاوہ ندوۃ العلماء کی ہمہ جہت ترقی بھی ہمیشہ علامہ کے پیش نظر رہی اور اس کے سالانہ

www.shibliacademy.org

اجلاسوں میں شرکت کرکے اس کی شہرت اور وقار میں اضافہ کرتے رہے۔ندوۃ العلماء کے علاوہ دیگر تعلیمی اور ثقافتی اداروں سے بھی ان کا برابر واسطہ رہا اوران کی بھلائی کے لیے سخنے وقدمے (شکست پا کے باوجود) کوشاں رہے۔ایم-اے-او کالج سے عملی تعلق منقطع ہوجانے کے باوجود کالج کو یونیورسٹی بنانے کی کوششوں میں بھی دلچسپی لیتے رہے۔

علامہ شبلی نعمانی ۱۹۰۵ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد منتخب ہوگئے اوراس عہدے پر ۱۹۱۲ء تک فائز رہے،اب سے پہلے بھی انہیں یہ عہدہ پیش کیا گیا تھا لیکن وہ نہیں آ سکے تھے۔ اب امید تھی کہ انہیں اصلاح نصاب کا پورا موقع ملے گا لیکن ایسا نہیں ہوسکا کیونکہ بعض اکابر ندوۃ العلماء کا قدیم ذہن اس کے لیے تیار نہیں تھا۔تاہم آج ہمیں ندوۃ العلماء کے نصاب تعلیم اورطرز تدریس میں جوتازگی اور انفرادیت نظر آتی ہے اس کا آغاز سب سے زیادہ علامہ شبلی ہی کا مرہون منت ہے۔ہم اس سلسلے کے بعض دیگر نوعیت کے اختلافات کی تفصیل میں نہیں جائیں گے۔علامہ کی فکر جدید میں علی گڑھ کے اثر سے انکار ممکن نہیں۔لیکن غور طلب یہ امر ہے کہ ایک وقت آیا جب انہیں نصاب تعلیم میں انگریزی کی شمولیت کے معاملے میں علی گڑھ کے ایک نامور فرزند مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے رویے سے مایوسی ہوئی اوراس کا اظہار انہوں نے مولانا شروانی کے نام اپنے ایک خط میں کیا۔

مولانا سید سلیمان ندوی کی روایت ہے کہ علامہ شبلی کے مستقل طور پر ندوہ تشریف لانے سے سب سے زیادہ خوشی طلبہ کو ہوئی تھی۔علامہ نے وہاں آ کر سب سے پہلے توجہ بعض ہونہار طلبہ پر دی۔استاد کا ایک بڑا وصف یہ ہوتا ہے کہ طالب علم میں جو رجحان پائے،تقریر،تحریر، تدریس اس کی خاص طور پر ہمت افزائی کرے اوراسے بروئے کار لانے میں تعاون دے۔ علامہ بلاشبہ جوہر شناس تھے۔خود انہیں بھی جوہر شناس استاد ملے تھے اور علی گڑھ کا پیر جواں اس معاملے میں سب پر فوقیت رکھتا تھا۔علامہ کے اثر پذیر ذہن نے ان سب سے فیض حاصل کیا اور پھر نہ صرف در بے بہا ہوکر چمکے بلکہ دوسرے کتنوں کو چمکایا۔سید صاحب ہی کی ذات گرامی اس کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔نام اور بھی لیے جاسکتے ہیں لیکن تنگی وقت دامن گیر ہے۔تاہم مولانا عبدالسلام ندوی اور مولوی مسعود علی ندوی کا نام لینا ناگزیر ہے کیونکہ اس کے بغیر یہ ''تثلیث''

www.shibliacademy.org

مکمل نہیں ہوتی ہے۔علامہ نے اپنے شاگردوں کی تربیت کے وہ سب ذرائع استعمال کیے جو ضروری تھے۔سرائے میر ضلع اعظم گڑھ کا اسلامیہ مدرسہ، مدرسۃ الاصلاح بھی ان کی عنایت اور توجہ سے محروم نہیں رہا۔وہ تو یہ چاہتے تھے کہ یہ مدرسہ بیک وقت علوم دینی اور جدید تعلیم کا جامع ہو۔اپنے عزیز مولانا حمید الدین فراہی کو اس کی خدمت پر آمادہ کرنا بھی ان ہی کا کام تھا۔

مسلمانوں کے باہمی اختلافات کی کہانی بہت پرانی ہے۔اس اختلاف کی بنیاد خلیفۂ ثالث سیدنا عثمان غنیؓ کی شہادت سے پڑی۔ پھر یہ اختلاف مختلف ممالک اور مختلف شعبہ ہائے زندگی میں پھیل گیا۔ندوۃ العلماء اس سے کیسے دور رہ سکتا تھا، وہ بھی اس کی زد میں آیا اور افسوس کی بات یہ ہے کہ علامہ شبلی کو اس اختلاف یا سازش کا مرکز بنایا گیا۔ہم اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے کیونکہ یہ داستان بہت تلخ ہے۔تاہم یہ عرض کردیں کہ ان اختلافات کا آغاز علامہ کے معتمد تعلیم مقرر ہونے کے ساتھ ہی ہو گیا تھا، طبائع کا اختلاف بھی اور اصول ونظریات کا اختلاف بھی۔سب سے پہلے مولانا خلیل الرحمٰن سہارن پوری سے، جو اس وقت ندوہ کے عارضی ناظم تھے، متعدد معاملات میں ہوا۔ پھر مخالفین کی ایک جماعت بن گئی۔ یہ بات علامہ کے بعض مقلدین (مثلاً مولانا سید سلیمان ندوی) نے بھی تسلیم کی ہے کہ علامہ شبلی مذہبی معاملات میں اپنے دوسرے معاصر علماء سے پیچھے تھے لیکن یہ ایسا الزام ہے جو کسی رہبر یا مصلح پر اسی وقت لگایا جاتا ہے جب اس کے کاموں میں رخنہ ڈالنا مقصود ہوتا ہے۔اس الزام سے کون بچا ہے، سرسید، مولانا آزاد، علامہ اقبال؟ اور بات پچھلوں ہی کی نہیں، اگلوں کی بھی ہے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کو اپنے اقتصادی نظریات کی بنا پر گوشہ نشین ہونا پڑا تھا۔ علامہ شبلی ذکی الحس شخص تھے۔ انہوں نے اختلافات کی وجہ سے علی گڑھ کو چھوڑا تھا اور حیدرآباد کو بھی۔ وہ شاید ندوۃ العلماء کو پہلے ہی چھوڑ دیتے لیکن عام اساتذہ اور طلبہ میں ان کی مقبولیت اس درجہ تھی کہ وہ ان کے گلے کا ہار بن گئے۔ بالآخر ۱۹۱۲ء آتے آتے یہ اُبال اتنا بڑھ گیا کہ چھلک اٹھا یعنی علامہ نے ندوۃ العلماء سے رسمی تعلقات منقطع کر لیے۔ رسمی اس لیے کہ دلی تعلق بہر حال برقرار رہا۔ ۱۹۱۴ء میں، جب علامہ کی صحت بہت خراب تھی اور وہ اپنی زندگی کے آخری امور کی انجام دہی میں مشغول تھے، ندوۃ العلماء میں طلبہ نے بڑے پیمانے پر اسٹرائک کیا۔اس اسٹرائک کے تعلق سے بھی علامہ کو بدنام کرنے کی

www.shibliacademy.org

کوشش کی گئی لیکن انہوں نے بعض دیگر مسلم اکابر کے ساتھ مل کر مثبت رول ہی ادا کیا۔ مسلمانوں کے ایک خاص طبقے کا حربہ تکفیر ہوتا ہے، وہ علامہ پر بھی آزمایا گیا۔ اسٹرائک ختم ہونا تھا اور وہ ہوا لیکن علامہ شبلی کی وفات کے بعد۔

انھوں نے جو مذہبی خدمات انجام دیں ان میں وقف علی الاولاد کے سلسلے کی خدمات بہت اہم ہیں۔ بہت سے دوسرے معاملات کی طرح اس معاملے میں بھی اولیت کا مقام تو سرسید احمد خاں کو حاصل ہے۔ دوسرا نام سید امیر علی کا لیا جا سکتا ہے۔ اسے صحیح رخ پر لانے اور آگے بڑھانے میں علامہ شبلی کا حصہ گراں قدر رہا ہے۔ حکومت برطانیہ اسے ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ پہلی کوشش یہ تھی کہ یہ ثابت کیا جائے کہ یہ مسلمانوں کا مذہبی مسئلہ ہے۔ اس سلسلے میں مسٹر محمد علی جناح کی خدمات کا اعتراف ضروری ہے جنھوں نے اس مسئلے کو سنٹرل کونسل میں پیش کیا لیکن چونکہ وہ علم دین سے واقف نہیں تھے اس لیے مسئلے کو صحیح طریقے سے پیش نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا علامہ کا اور ان کا اختلاف رہا۔

اب سب طرف سے مایوس ہونے کے بعد امراض کے نرغے میں علامہ شبلی نے وطن مالوف اعظم گڑھ میں سکونت اختیار کی۔ علامہ شبلی کے ذہن میں اپنے وطن اعظم گڑھ میں کئی تعلیمی اور عملی منصوبے تھے لیکن وطن سے باہر رہنے کی وجہ سے وہ انہیں پورا نہیں کر سکے تھے۔ مثلاً وہاں کا نیشنل اسکول، جو اب جارج اسکول ہو گیا تھا، سے علامہ کو شروع سے دلچسپی تھی۔ وہ اب روبہ زوال تھا اور صرف مڈل اسکول ہو کر رہ گیا تھا۔ وطن واپسی کے بعد انھوں نے ان منصوبوں کی تکمیل کی طرف توجہ مبذول کی۔ کالج کی ترقی کے لیے وہ کوشاں ضرور رہے اور مختلف تدبیریں کرتے رہے لیکن موت نے انھیں زیادہ مہلت نہیں دی۔ بہرحال ان کی یاد میں شبلی کالج کا سنگ بنیاد ان کے حبیب صمیم نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے ہاتھوں ۳۱/ مارچ ۱۹۴۰ء کو رکھا گیا۔ اب مدت سے یہ کالج ترقی کر کے نیشنل شبلی کالج کے نام سے ڈگری کالج کی حیثیت سے تعلیمی خدمت انجام دے رہا ہے۔

ان سب کے علاوہ وہ دارالمصنّفین کا خاکہ بنانے میں مشغول رہے۔ دارالمصنّفین کے بارے میں ہم پہلے ہی اظہار خیال کر چکے ہیں۔ علامہ نے اسلام، علم اور مسلمانوں کی جو

www.shibliacademy.org

آ خری خدمت انجام دی وہ سیرۃ النبیؐ کی تصنیف ہے۔ابھی پہلا حصہ ختم کر کے دوسرے حصے تک پہنچے تھے کہ وقت موعود آ گیا اور ’’یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا‘‘۔ سیرۃ النبیؐ کی تکمیل کے لیے ان کی نظر تین مخلصین پر پڑی: مولانا حمیدالدین فراہی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سید سلیمان ندوی، لیکن دارالمصنّفین کے خاکے میں رنگ بھرنے کی مانند اس کام کی تکمیل بھی قدرت نے سید صاحب ہی کے لیے طے کر دی تھی اور انہوں نے یہ خدمت نہایت حسن وخوبی سے انجام دی۔ تاہم جلد اول کا شمار، کیا بلحاظ متن اور کیا باعتبار زبان، علامہ کی شاہ کار تصانیف میں ہوتا ہے۔ اگر زندگی مکمل کرنے کی مہلت دیتی تو شاید ایسی چیز وجود میں آتی جو علامہ کی جملہ تصانیف میں سب سے اونچا مقام پاتی۔ آخر عمر میں اعظم گڑھ میں سکونت اختیار کرنے کے بعد ان کے دو بڑے مشغلے تھے: سیرۃ النبیؐ اور دارالمصنّفین۔ لیکن اجل نے انھیں زیادہ مہلت نہ دی اور ۱۸؍نومبر ۱۹۱۴ء کو ان کی وفات ہوگئی۔ اللھم اغفر وارحم وانت خیر الراحمین۔

سیرت النبیؐ حصہ اول و دوم کا یادگار ایڈیشن

علامہ شبلی نعمانیؒ

شبلی صدی تقریبات کے موقع پر علامہ شبلی کی مایۂ ناز اور دارالمصنّفین کی قابل فخر پیش کش سیرۃ النبیؐ کو نہایت خوبصورت، نفیس ترین طباعت سے آراستہ کر کے خصوصی اشاعت کا اہتمام کیا گیا، چنانچہ سیرۃ النبیؐ کی دونوں ابتدائی جلدیں دیدہ زیب طباعت کے ساتھ شائع کی گئی ہیں، سردست یہ محدود تعداد میں ہیں لیکن یہ شبلی صدی تقریبات کی یادگار کے طور پر ہر صاحب ذوق کے لیے سرمایۂ چشم ودل ہیں۔

قیمت=/۲۰۰۰ روپے

www.shibliacademy.org

مصادر و مآخذ کے پارکھ شبلی

پروفیسر ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

شبلی کی عبقریت کی ایک عظیم الشان جہت ان کے موضوعات ومضامین کے مصادر پر عالمانہ گرفت تھی۔اس کی وسعت وہمہ گیری ان کے موضوعات کی مانند وسیع وعریض تھی اوران میں تمام علوم اسلامی سموئے گئے تھے۔وہ ان کے وسیع الجہت مطالعہ سے زیادہ ان کے ذہن رسا اورادراک بیکراں کی حیرت انگیز شہادت ہے۔ایک خاص موضوع پر خامہ فرسائی کرتے تو صرف اسی کے نہ ہو رہتے اور نہ ہی اس کے خاص مصادر تک محدود رہتے تھے، بحث واستدلال میں مختلف موضوعات کا ذکر آجاتا تو اس خاص مقام پر دوسرے علوم وفنون کے مصادر کا بھی ذکر کرتے اور نہ صرف ذکر کرتے بلکہ ان مصادر وآخذ پر وقیع علمی اور تنقیدی تبصرے بھی کرتے اور ان کے حسن وقبح کے پہلو اجاگر کرتے۔سنجیدہ علمی اور تحقیقی تصانیف ومقالات میں مصادر و مآخذ کا حوالہ ہی اردو میں شبلی کی دین ہے اوراس پر اضافات تو بے مثال عطایا ہیں۔اردو، فارسی اور عربی کے علاوہ انگریزی اور بعض دیگر زبانوں کے اہل علم وتحقیق کے لیے شبلی عطایائے مصادر سرمۂ بصیرت ہیں۔(۱)

ظاہر بیں اہل قلم کو غالباً یہ خیال ہوسکتا ہے کہ مصادر و مآخذ کا حوالہ، ذکر، اقتباس، نقدو تبصرہ آخری دور کا ارتقاء ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ان کی سنجیدہ تصنیفی زندگی میں اول سے آخر تک مصادر و مآخذ کی پرکھ، نقد وتجزیہ جاری وساری رہا۔ابتدائی تصانیف میں دیباچہ وتمہید میں متعلقہ مصادر و مآخذ کا ایک عمومی ذکر وتجزیہ ملتا ہے، جس میں اضافہ وارتقاء ہوتا رہا۔سیرۃ النبیؐ کے مقدمہ میں وہ ایک مبسوط ومدلل تحقیق بن گیا جس کی نظیر اب تک نہیں پیش کی جاسکی حالانکہ اب موادو تجزیہ

سابق صدر و ڈائریکٹر ادارہ علوم اسلامیہ، شاہ ولی اللہ دہلوی ریسرچ سیل، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

www.shibliacademy.org

وسیع تر ہو چکا۔ ذکر و نقد مصادر میں شبلی کا طریقہ بڑا متنوع ہے۔ عام علمی و تحقیقی تقاضوں کے مطابق وہ ہر بیان و تجزیہ کو مستند بناتے ہیں۔ تمہیدی بحث کے علاوہ وہ متن میں متعدد مآخذ کا حوالہ دیتے ہیں، ان کی مختلف و متضاد اور منکر روایات پر نقد و تبصرہ کرتے ہیں، حواشی میں حوالہ مصادر کے ان لازموں کی پابندی کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ مآخذ اور ان مولفین کی قدر و قیمت بھی بطور خاص آنکتے ہیں۔ اس مختصر مقالے میں چند خاص عناوین کے تحت شبلی کی عبقریت مصادر کی چند جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں، ورنہ وہ تو ایک خاص تحقیق کا موضوع ہے۔

دیباچہ و تمہید اور مقدمہ میں بحث مصادر: بلاشبہ بعض عربی فارسی اہل علم و تحقیق نے اپنے دیباچوں، تمہیدوں یا مقدموں میں اپنے مصادر سے تعرض کیا ہے۔ اسی اسلامی روایت سے تحریک لے کر شبلی نے اپنی علمی تحقیقات میں ان کے خاص موضوعات کے مصادر اصلی سے بحث کی ہے۔ اردو کی حد تک بلا ریب اور عربی فارسی تحقیقات کے میدان میں بھی کسی حد تک شبلی کی حوالہ نگاری جدید ترین روایت ہے۔ وہ مآخذ اصلی پر بحث ہی نہیں کرتے ان کی بنیاد پر تصنیف شدہ جدید تحقیقات کا بھی تجزیہ کر کے دونوں کا موازنہ بھی کرتے ہیں۔ دوسرے پہلوؤں اور جہتوں کا ذکر دوسرے عناوین کے تحت آتا ہے۔ سر دست دیباچہ و تمہید میں مصادر و مآخذ پر بحث شبلی پیش ہے:

المامون: بقول شارح و سوانح نگار شبلی المامون ۱۸۸۷ء میں نکلی، یہ مولانا کی پہلی مستقل تصنیف ہے۔ ان کا مزید بیان ہے کہ "المامون کی تصنیف کی تحریک میں مسٹر پامر کی کتاب ہارون الرشید کو بھی دخل ہے جس کو پڑھ کر مولانا کے دل میں المامون لکھ کر مسٹر پامر کے زہر کے لیے تریاق کا خیال آیا"۔ دوسرے خیال شارح سے اتفاق مشکل ہے کہ ہارون الرشید کی مستقل تصنیف شبلی اس کا تریاق بن سکتی تھی۔ المامون کی وجوہ تصنیف میں دوسرے علمی و تحقیقی تقاضے شامل تھے۔ (سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، اعظم گڑھ ۱۹۸۳ء، ۱۷۲-۱۷۳ (آئندہ صرف حیات شبلی)؛ شبلی المامون کو بہت سے مقامات پر مامون الرشید لکھتے ہیں جو ہارون الرشید کا ہم قافیہ ہے، شاید ان کا شاعرانہ ذہن غیر شعوری طور سے متاثر ہوا تھا۔ اصلاً ہر خلیفۂ عباسی کا اول اول ایک خلافت والا لقب ہوا کرتا تھا جو خلیفۂ عباسی تخت نشینی کے وقت اختیار کرتا تھا۔ جیسے اولین خلیفہ عباسی نے السفاح، دوم نے المنصور، سوم نے المہدی، چہارم نے الہادی اور پنجم نے الرشید اختیار کیا تھا۔

www.shibliacademy.org

ہارون الرشید کے فرزند عبداللہ اور جانشین دوم نے ''المامون'' کا لقب اختیار کیا۔ مامون الرشید کہنا بالکل صحیح نہیں ہے۔ شبلی کے اس شاعرانہ تسامح کو ان کے ناقلوں نے صحیح لقب خلافت سمجھ کر اختیار کیا جو بقول ابن خلدون نقل بلا عقل ہے۔ مثلاً سر سید نے المامون کے اپنے دیباچہ میں ''مامون الرشید ابن ہارون الرشید'' لکھا ہے، اگرچہ بعد میں صرف مامون پر اکتفا کیا ہے۔ شبلی کی تصنیف المامون کے کتابی تعارف میں مرتب و مرتبین نے مامون الرشید ہی کو ترجیح دی ہے۔ المامون، اعظم گڑھ ۱۹۵۷ء، ۵؛ شبلی کے قلم سے ''مامون الرشید'' کا ذکر بہت سے مقامات پر ہے: ۸-۱۰ و مابعد)

دیباچہ/تمہید میں شبلی نے عام مصادر و مآخذ کا عمومی جائزہ لینے کے بعد خاص تاریخی مآخذ کا ایک تجزیاتی نقد پیش کیا ہے۔ ''مامون الرشید کے تاریخی حالات کے متعلق عربی میں جس قدر مشہور اور مستند تاریخیں ہیں خوش قسمتی سے اکثر اس حصہ کی ترتیب کے وقت میرے استعمال میں ہیں۔ لیکن میں علانیہ اعتراف کرتا ہوں کہ موجودہ زمانہ میں تاریخ کا فن ترقی کے جس پایہ پر پہنچ گیا ہے اور یورپ کی دقیقہ سنجی نے اس کے اصول و فروع پر جو فلسفیانہ نکتے اضافہ کیے ہیں، اس کے اعتبار سے ہماری قدیم تصنیفات ہمارے مقصد کے لیے بالکل کافی نہیں''۔ اس کے بعد شبلی نے اسلامی تاریخ کی کتابوں میں سے ممتاز ترین کا ذکر کیا ہے: ''تاریخ کبیر ابوجعفر طبری (۲)، مروج الذہب مسعودی، کامل ابن الاثیر جزری، ابن خلدون، ابوالفداء، دول الاسلام ذہبی، تاریخ الخلفاء سیوطی، عیون والحدائق، اخبار الدول قرمانی، تاریخ ابن واضح کاتب عباسی، فتوح البلدان بلاذری، معارف ابن قتیبہ، اعلام الاعلام، النجوم الزاہرہ۔ یہ وہ مبسوط اور مستند تاریخیں ہیں جو اسلامی تاریخوں میں ممتاز خیال کی جاتی ہیں اور دولت عباسیہ یا خاص مامون الرشید کے حالات سے آگاہی کا ذریعہ ان سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتا ہے......'' (المامون، ۹-۱۰: شبلی متعدد مآخذ کے اصل نام و عنوان سے واقف ہونے کے باوجود اپنی سہولت کی خاطر مختصر نام لکھ دیتے ہیں جیسے طبری کی تاریخ کا اصل عنوان تاریخ الرسل والملوک ہے اور وہ تاریخ الطبری کے عنوان سے زیادہ مشہور ہے اور تاریخ ابن واضح تاریخ الیعقوبی کے نام سے۔ مذکورہ بالائی مصادر کے مولفین کا ذکر نہیں ہے۔ وہ اپنی دستیاب کتابوں کا ہی ذکر کرتے ہیں)

سیرۃ النعمان: بقول شبلی و سلیمان دوسری سنجیدہ تالیف ہے جو الفاروق کی تصنیف کے دوران کمال کو پہنچی۔ اپنے دیباچہ میں شبلی نے اس کی صراحت کے بعد لکھا ہے کہ ''امام ابوحنیفہ کو

www.shibliacademy.org

اسلام میں جو رتبہ حاصل ہے اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ جس کثرت سے ان کی سوانح عمریاں لکھی گئیں کسی کی نہیں لکھی گئیں ......اور ان ناموروں نے لکھیں جو خود اس قابل تھے کہ ان کی مستقل سوانح عمریاں لکھی جاتیں۔اس خصوصیت میں اگر کوئی شخص امام ابوحنیفہ کا ہمسر ہے تو صرف امام شافعی ہیں۔امام ابوحنیفہ کے حالات میں جس قدر کتابیں لکھی گئیں ان میں سے جس قدر ہم تحقیق کر سکے حسب ذیل ہیں:

۱-عقود المرجان،امام احمد بن محمد طحاوی۔۲-قلائد عقود الدرر والعقیان طحاوی جو عقود المرجان کا خلاصہ ہے۔۳-الروضۃ العالیۃ المنیفہ فی مناقب ابی حنیفۃ النعمان،طحاوی۔۴-مناقب النعمان امام محمد بن احمد بن شعیب م ۳۵۷/۹۶۷ء۔۵-مناقب النعمان شیخ ابوعبداللہ حسین بن علی الصمیری م ۴۳۶/۱۰۱۴ء۔۶-مناقب النعمان کے عنوان سے ابوالعباس احمد بن الصلت الحمانی م ۳۰۸/۱۹۲۰ء؛امام زمخشری م ۵۳۸/۱۱۴۳ امام موفق الدین بن احمد المکی الخوارزمی م ۵۶۸/۱۱۷۲؛امام مرغینانی م ۵۰۶/۱۱۱۲؛امام کردری م ۸۲۰/۱۴۱۷ء؛ابوالقاسم بن کاس،امام ابن العوام،امام السیواسی،امام عبدالقادر القرشی ۷۷۵/۱۳۷۳ء،امام محمد بن یوسف الدمشقی،امام ابن حجر مکی کے علاوہ دوسرے اہل علم کی متعدد کتابوں کا نام اور مختصر تعارف دیا ہے۔بعض کے عناوین میں تھوڑا سا اختلاف ہے یا اضافہ اور بعض کے دوسرے عناوین ہیں۔کل ۲۷ مصادر کی فہرست جدول میں پیش کی ہے۔(سیرۃ النعمان،اعظم گڑھ ۱۹۹۸ء،۳-۱۰ بقول مولانا ضیاء الدین اصلاحی یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۸۹۱ء میں شائع ہوئی تھی)

شبلی نے اعتراف کیا ہے کہ مذکورہ بالا کتب ہندوستان میں دستیاب نہ تھیں اور ان کے پاس عقود الجمان اور الخیرات الحسان موجود ہیں اور قلائد العقیان کا ایک عتیق نسخہ نظر سے گذرا ہے ”......عقود الجمان میری تالیف کا عام ماخذ وہی ہے“ (سیرۃ النعمان ۱۰-۱۱:”امام ابوحنیفہ کے حالات میں مستقل تصنیف تو مجھ کو ایک یہی مل سکی لیکن رجال و تاریخ کی مستند کتابیں ہیں جن میں امام کا ذکر ہے اکثر میری نظر سے گذریں جن میں تاریخ صغیر بخاری،معارف ابن قتیبہ،مختصر تاریخ خطیب بغدادی،انساب سمعانی،تہذیب الاسماء واللغات للنووی،تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی، دول الاسلام ذہبی،عبر فی اخبار من غبر للذہبی،تہذیب التہذیب حافظ ابن حجر عسقلانی،خلاصۃ

www.shibliacademy.org

تہذیب تہذیب الکمال للعلامہ صفی الدین الخزرجی خاصۃً قابل ذکر ہیں کیوں کہ یہ وہ کتابیں ہیں جن پر آج فن رجال کا مدار ہے اور حدیثوں کی تنقید کے لیے زیادہ تر انہیں تصنیفات کی طرف رجوع کیا جاتا ہے''۔ شبلی نے اس فہرست مآخذ میں بھی کئی کتابوں کے عناوین میں تبدیلی کر دی ہے۔ وہ بالعموم ''آل'' ساقط کر دیتے ہیں جیسے سمعانی کی الانساب کو انساب لکھا ہے جیسا کہ عام دستور بھی اب بن گیا ہے۔

الفاروق اگرچہ الغزالی سے پہلے کی تصنیف ہے لیکن بوجوہ اس کا بہت قریبی فنی ارتباط سیرۃ النبی سے ہے۔ اس لیے ان دونوں شاہکار تصانیف پر بحث بعد میں آتی ہے کہ ان دونوں میں فکر شبلی و طریق تحقیق قریب قریب یکساں ہے۔ الغزالی غالباً واحد تصنیف ہے جس کے مصادر پر بحث مختصر ترین ہے۔ غالباً اس بنا پر کہ وہ علم الکلام کا ایک باب ہے۔ ائمۂ علم کلام کی سوانح عمریاں ان کے منصوبے اور باب کا تیسرا حصہ ہے ''اس حصہ میں امام غزالی کی سوانح عمری شروع ہوئی تو بڑھتے بڑھتے ایک کتاب بن گئی''۔ لہٰذا اسے الگ سے شائع کر دیا کہ پوری کتاب کی تیاری میں وقت درکار تھا''۔ ''امام غزالی کی سوانح عمری میں کوئی مستقل کتاب تو غالباً لکھی نہیں گئی لیکن رجال اور تراجم کی کتابوں میں عموماً ان کے حالات کسی قدر تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔ ان میں سے ''تبیین کذب المفتری فیما نسب الیٰ ابی الحسن الاشعری'' اور ''طبقات الشافعیہ'' خاصۃ ذکر کے قابل ہیں۔''...... ان دونوں کتابوں کی قدر و قیمت آ نکنے کے بعد امام غزالی پر بعض یورپی تصانیف کا بھی ذکر کیا ہے کہ امام صاحب وہاں زیر بحث رہے تھے''۔ ان میں سے دو تصنیفیں میرے پاس موجود ہیں: ایک پروفیسر گوشی (Pr.Gosehe) کی کتاب الغزالی (Al-Gazali) اور پروفیسر مونک (S.Munch) کی کتاب ''الربط بین فلسفۃ الیہود والاسلام ......'' پہلی کتاب جرمن زبان میں تھی اس لیے اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ دوسری کتاب سے میں نے فائدہ اٹھایا ہے اور جا بجا اس کے حوالے دیئے ہیں......''۔ (الغزالی، اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء، ۲-۳؛ مکاتیب شبلی اعظم گڑھ ۱۹۶۶ء، ۱/۱۱۶:

''......امام غزالی کی لائف جس میں علم کلام پر پورا ریویو ہو، کیونکہ موجودہ علم الکلام کے موجد وہی ہیں......'' مکتوب بنام مولانا حبیب الرحمٰن شروانی مکتوبہ ۱۰؍ جولائی ۱۸۹۹ء و مابعد مکاتیب)

فارسی شعر کی جاذبیت اور ایرانی تمدن کی غالبیت کا ایک عمدہ اور مختصر تجزیہ کر کے تذکروں

www.shibliacademy.org

پر لکھا ہے کہ ''شعراء کے تذکرے بہت ہیں لیکن وہ درحقیقت بیاض اشعار ہیں جن میں شعراء کے عمدہ اشعار انتخاب کر کے لکھ دیے ہیں۔شعراء کے حالات اور واقعات کم اور نہایت کم ہیں اور شاعری کے عہد بعہد کے انقلابات اور ان کے اسباب کا تو مطلق ذکر نہیں''۔جدید یورپی کتابوں سے مدد نہ ملنے کا تذکرہ کیا ہے اور متعدد موانع راہ کا بھی۔پھر شعرالعجم کے مآخذ کی ایک فہرست بہ شکل جدول دی ہے۔جس میں نام کتاب، نام مصنف اور کیفیت کے خانے ہیں اور موخرالذکر میں مولفین کا تعارف بھی ہے اور ان پر تبصرہ ونقد بھی۔شبلی کی جدول شعرالعجم یہ ہے:

۱-لب اللباب،عوفی یزدی	۲-چہار مقالہ،نظامی عروضی سمرقندی
۳-تذکرہ دولت شاہ سمرقندی	۴-تاریخ آل غزنین بیہقی
۵-عرفات اوحدی	۶-میخانہ عبدالنبی فخرالزمانی
۷-تذکرۃ الشعراء،مرزا طاہر نصیرآبادی	۸-مآثر رحیمی،عبدالباقی نہاوندی
۹-مراۃ الخیال شیر خاں لودی	۱۰-ہفت اقلیم،امین رازی
۱۱-تذکرہ میر تقی کاشی	۱۲-تذکرہ سامی،سام میرزا صفوی
۱۳-ریاض الشعراء،والہ داغستانی	۱۴-سروآزاد،مولوی غلام علی آزاد
۱۵و۱۶-اوران کی دوکتب ید بیضا اور خزانۂ عامرہ	۱۷-مجمع النفائس،خان آرزو
۱۸-مجمع الفصحاء،ہدایت قلی خاں	۱۹-شعراء کے کلیات ودواوین کا عمومی ذکر

کیفیت کے خانے میں تعارف مولف کے علاوہ شبلی کا تبصرہ اہم ہے جیسے چہار مقالہ کو ''مختصر سا رسالہ قرار دینے کے باوجود نہایت مفید باتوں'' سے پُر بتایا ہے اور مولف کو باکمال شاعر قرار دیا ہے۔تذکرۂ دولت شاہ کو مشہور، دلچسپ اور مفید قرار دینے کے ساتھ ساتھ ''اکثر جگہ غلطیاں'' کی ہیں،لکھا ہے۔ہفت اقلیم کو ''مستند اور معتبر'' بتایا ہے۔شبلی کی مختصر کیفیات سے ان کا درجہ بھی متعین ہوتا ہے۔(شعرالعجم ،اعظم گڑھ ۱۹۷۲ء، ۱/۱-۶: اس کے بعد شعر فارسی اور ادب ایران پر یورپی مولفین ومحققین کی کتابوں کا ذکر کر کے ان کے فضل واحسان کا اعتراف کیا ہے جنھوں نے عمدہ مآخذ بھی چھاپے تھے۔ان میں شامل ہیں: وارمستیٹر ، والن ٹن زوکووسکی،نولدیکی، براؤن۔موخرالذکر کی خوب تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ ان میں بعض تصنیفات سے انہوں نے فائدہ اٹھایا ہے)

www.shibliacademy.org

الفاروق کی تمہید میں تاریخ کے عنصر کے تحت تاریخ شعر و تمدن کا ایک عمومی جائزہ اس کے ارتقاء کے لحاظ سے لیا ہے۔ تاریخ خلافت کو چونکہ سیرت نبوی سے ایک خاص فنی مناسبت اور ارتقائی نسبت ہے اس لیے عرب میں تاریخ نگاری کا ایک عام اور سرسری ارتقاء دکھایا ہے اور عرب جاہلی کی روایت ''ایام العرب'' کا ذکر کر کے اولین عرب تاریخی کتابوں کا ایک سلسلہ لکھا ہے۔ اس میں بادشاہانِ حیرہ کی تاریخی کاوشوں، ابن ہشام کی کتاب التیجان، عبید بن شریہ کی تاریخی کتب خاص کر کتاب الملوک واخبار الماضیین، عوانہ بن حکم م ۱۴۷/۶۴ ۷ اور دیگر ''حولیات نگاروں'' جیسے ابومخنف، کلبی وغیرہ اور سیرت نگاروں جیسے محمد بن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ اور واقدی کی کتب ورسائل کا مختصر ذکر کیا ہے اور پھر سیرت وحال صحابہ پر ایک مختصر فہرست دی ہے۔ ان میں نجیح مدنی، نصر بن مزاحم کوفی، سیف بن عمر الاسدی، معمر بن راشد کوفی، عبداللہ بن سعد زہری، ابوالبختری وہب بن وہب، ابوالحسن علی بن محمد المدائنی، احمد بن حارث خزاز، عبدالرحمٰن بن عبدہ، عمر بن شبہ کی کتابوں کا جدول میں ذکر کیا ہے اور ان پر تبصرہ بھی کیا ہے جو خاصے مختصر ہیں لیکن دلچسپ ہیں جیسے سیف بن عمر کو ''نہایت مشہور مورخ'' بتایا ہے اور معمر بن راشد کوفی کو امام بخاری کا استاد الاستاذ اور احمد بن حارث خزاز کو مدائنی کا شاگرد لکھا ہے۔ عبدالرحمٰن بن عبدہ ''نہایت ثقہ اور معتمد مورخ'' اور عمر بن شبہ ''مشہور مورخ'' تھے۔ شبلی نے یہ شکوہ بھی کیا ہے کہ ''اگرچہ یہ تصنیفات آج ناپید ہیں لیکن اور کتابیں جو اسی زمانے میں یا اس کے بعد قریب تر زمانے میں لکھی گئیں ان میں ان تصنیفات کا بہت کچھ سرمایہ موجود ہے'' پھر ان قدماء کی تصانیف کا ذکر مختصر تبصروں کے ساتھ کیا ہے۔ ان میں حسب ذیل شامل ہیں:

۱- ابن قتیبہ دینوری، کتاب معارف۔ ۲- ابوحنیفہ دینوری، الاخبار الطوال۔ ۳- ابن سعد، طبقات۔ ۴- احمد بن ابی یعقوب بن واضح، تاریخ یعقوبی۔ ۵- احمد بن یحییٰ بلاذری، فتوح البلدان اور انساب الاشراف۔ ۶- ابوجعفر محمد بن جریر طبری، تاریخ طبری۔ ۷- ابوالحسن علی بن حسین مسعودی، مروج الذہب اور کتاب التنبیہ والاشراف۔

ان میں سے متعدد پر شبلی کے تبصرے بہت اہم اور دلچسپ ہیں: ''ابن قتیبہ نہایت نامور اور مستند مصنف ہے اور محدثین بھی اس کے اعتماد و اعتبار کے قائل ہیں۔ کتاب المعارف مفید معلومات رکھتی ہے۔ ابوحنیفہ دینوری مشہور مصنف ہے تو ابن سعد نہایت ثقہ اور معتمد مورخ

www.shibliacademy.org

ہے اگر چہ اس کا استاد واقدی ضعیف الروایہ ہے...... یعقوبی کی کتاب شہادت دیتی ہے کہ وہ بڑے پایہ کا مصنف ہے۔ بلاذری وسعت نظر اور صحت روایت کی بنا پر محدثین کے گروہ میں بھی مسلم ہے۔طبری حدیث وفقہ میں بھی امام مانے جاتے ہیں اور مسعودی فن تاریخ کا امام ہے اور اسلام میں اس کے برابر کوئی وسیع النظر مورخ پیدا نہیں ہوا۔وہ دنیا کی اور قوموں کی تواریخ کا بھی بہت بڑا ماہر تھا۔اس کی تمام تاریخی کتابیں ملتیں تو کسی اور کی حاجت نہ ہوتی''۔

الفاروق کا دیباچۂ مآخذ دراصل سیرۃ النبی کے عظیم مقدمہ کا ہراول تھا۔ دونوں کے مباحث وافکار میں کافی یکسانیت ہے۔ بلاشبہ شبلی نے الفاروق میں جو تجزیہ مآخذ ومصادر کیا ہے اسی کو سیرۃ النبی کے مقدمہ میں زیادہ مفصل و مدلل بنادیا ہے۔مصادر سیرت میں بھی قدماء کا دور ہے اور اول دور میں تصنیفات لکھی تو گئیں مگر اب ناپید ہوگئیں البتہ ان کا مواد دوسرے دور کی کتب میں موجود ہے پھر قدماء اور متاخرین کی خصوصیات واکتسابات سے بحث کی ہے جس کی جگہ تنقیدی خانے میں آتی ہے اور ان کے افکار اور تجزیوں کی بھی۔ مقدمہ سیرۃ النبی میں ''فن سیرت کی ابتداء اور تحریری سرمایہ'' کے تحت زیادہ زور موخر الذکر یہ ہے کہ وہ کیسے وجود میں آیا تھا۔ مغازی کے عنوان سے ایام العرب اور غزوات پر بحث کرکے لکھا ہے کہ تصنیف وتالیف کی ابتدا سلطنت کی وجہ سے ہوئی'' اور اس میں امام زہری کے بیان کے علاوہ عبید بن شریہ، سعید بن جبیر، حضرت عمر بن عبدالعزیز وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔پھر مغازی پر خاص توجہ مبذول کی ہے۔امام زہری کی مغازی کو عہد وفن ساز کتاب قرار دیا ہے جس کے جلو میں موسیٰ بن عقبہ، محمد بن اسحاق، ابن ہشام، واقدی، ابن سعد، امام بخاری کی تاریخ کبیر وصغیر، طبری کی تاریخ کبیر کا ایک تنقیدی اور تجزیاتی بیان پیش کرکے تمام ابتدائی مولفین سیرت کی کتب کی فہرست بہ شکل جدول پیش کی ہے۔ حضرت عروہ بن زبیر سے محمد بن عائذ دمشقی کی مغازی تک اکتیس کتابوں کی جدول مع تبصرہ دی ہے۔اوران کو قدماء کی کتب قرار دیا ہے۔ان کے بعد کی تصنیفات خاص کر ان کی شروح پر ایک سیر حاصل فہرست بیانیہ انداز میں دی ہے، جن میں شامل ہیں: سہیلی کی روض الانف، سیرت دمیاطی، سیرت خلاطی، سیرت گازرونی، سیرت ابن ابی طے، سیرت مغلطائی، شرف المصطفیٰ نیشاپوری، شرف المصطفیٰ ابن جوزی، اکتفاء کلاعی، سیرت ابن عبدالبر، عیون الاثر ابن سید الناس،

www.shibliacademy.org

اس کی شرح نور النبراس، سیرت منظوم حافظ عراقی، مواہب اللدنیہ قسطلانی اور زرقانی علی المواہب اور سیرت حلبی۔ اصول روایت اور تحریر کے لحاظ سے خاص رجال کی کتابوں کا ذکر کیا ہے، جن میں مزی کی تہذیب الکمال، ابن حجر کی تہذیب التہذیب وغیرہ کا ذکر کرکے درایت کے ارتقاء سے بحث کی ہے۔اس کے بعد تبصرہ کے عنوان سے مآخذ سیرت کی فنی قدر و قیمت متعین کی ہے۔

سیرۃ النبی، اعظم گڑھ ۱۹۸۳ء، ۱/۱۲-۴۷ و مابعد؛ الفاروق ۲-۱۹: دونوں کتابوں میں تمام مباحث مشترک ہیں۔ سیرۃ النبی میں کچھ تفصیل ضرور آ گئی ہے اور بعض مباحث کا اضافہ بھی کیا ہے لیکن اسے ارتقاء فکر ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان دونوں کا تنقیدی و تقابلی موازنہ ایک دلچسپ تحقیق ہوگی، اسی طرح مقدمہ سیرۃ النبی کا اولین (Version) الہلال میں چھپا تھا، جس پر بعض تنقیدیں ہوئیں اور شبلی نے ان کے سبب بعض اصلاحات کیں اور کمی بیشی بھی کی۔ان کا تقابلی مطالعہ شبلیات کے لیے ضروری ہے۔ مذکورۂ بالا کتابوں کے ناموں میں شبلی نے کتر بیونت کی ہے جیسے الروض الانف، المواہب اللدنیہ وغیرہ کا الف لام ساقط کیا ہے۔

مآخذ و مصادر کی درجہ بندی: ایک وسیع المطالعہ عالم اور وسیع النظر مولف اور وسیع تر محقق کی حیثیت سے شبلی مآخذ و مصادر کی درجہ بندی، ان کی قدر و قیمت کے حساب سے کرتے ہیں۔ بالعموم سب جانتے ہیں کہ ہر فن و علم میں بعض مصادر اصلی ہوتے ہیں اور بعض مصادر ثانوی۔ موخر الذکر میں جدید کتب شامل نہیں۔ لیکن ان میں اصلی مصادر میں کون کون سے ایسے ہوتے ہیں جوام الکتاب ہوتے ہیں یا جن کو بنیادی کتب و مآخذ کا درجہ دیا جاتا ہے۔شبلی نے اپنی ہر تصنیف میں دیباچہ و تمہید میں بھی، مقدمہ و متن میں بھی اور کبھی کبھی حواشی و تعلیقات میں بھی ان مصادر اصلی کی درجہ بندی کی ہے اور ان کی وجوہ سے بھی بحث کی ہے۔

المامون کی فہرست مآخذ میں سے بعض پر حواشی لکھے ہیں اور ان میں ان مآخذ کی درجہ بندی اور قدر و قیمت مقرر کی ہے۔ طبری کی تاریخ کبیر کے بارے میں حاشیۂ شبلی ہے ”یہ نہایت مستند اور ضخیم تاریخ ہے، ابن اثیر و ابن خلدون اور ابوالفداء کا اصلی مآخذ یہی کتاب ہے...... بلاذری نہایت قدیم مورخ ہے، خلیفہ متوکل باللہ عباسی المتوفی ۲۴۷ھ کے عہد میں موجود تھا۔ اس کی تاریخ جرمنی میں چھپی ہے، تاریخ کامل مطبوعہ مصر کے حاشیہ پر اور نہایت مشہور و مفید تاریخ

www.shibliacademy.org

ہے‘‘۔(المامون ۱۰ حاشیہ ۳ وما بعد: خلیفہ متوکل کا سنۂ وفات غلط چھپا ہے جو کتابت کی غلطی ہے۔اصل سنۂ وفات ۲۴۷/۸۶۱ ہے)

سیرۃ النعمان کے مآخذ پر عام تنقیدی تبصرہ کے بعد لکھا ہے کہ ’’الخیرات الحسان اگرچہ اس وجہ سے کہ ابن حجر مکی طرف منسوب ہے، زیادہ مشہور ہے لیکن وہ کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے بلکہ تمام تر عقود الجمان کا خلاصہ ہے اور خود مصنف نے دیباچۂ کتاب میں اس کا اعتراف کیا ہے۔ قلائد العقیان کے دیباچہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ زیادہ قاضی صمیری (صیمری) کی تصنیف سے ماخوذ ہے۔عقود الجمان جو نہایت جامع اور مفصل کتاب ہے، حافظ ابو المحاسن محمد بن یوسف بن علی الدمشقی الصالحی نزیل برقوقیہ کی تصنیف ہے...... جو امام سیوطی کے شاگرد اور فن حدیث میں ممتاز ہیں اور وہ امام موفق خوارزمی کے خوشہ چیں تھے‘‘۔(سیرۃ النعمان ۱۰-۱۱)

مصادر و کتب کے اصل مآخذ/سرچشمے: علوم وفنون کے ارتقاء کی ایک عظیم مگر عجیب وغریب روایت یہ بھی ہے کہ متعدد عظیم کتب اور مآخذ اپنے سے قبل کسی ایک یا دو چار مآخذ ومصادر پر مبنی ہوتے تھے۔ یہاں اس روایت سے بحث نہیں ہے جو بعد کی کتابوں کو مآخذ بتاتی ہے، بلکہ اس روایت سے بحث ہے جو یہ سراغ لگاتی ہے کہ کسی عظیم الشان تالیف اور معرکہ آراء کتاب کا اصل ماخذ کیا تھا؟ نثر وشعر، علم وادب، تاریخ وسیرت اور متعدد دوسرے علوم وفنون اور ان کی بہت سی اصناف میں یہ ہوتا آیا ہے۔لیکن ان کا سراغ ایک صاحب علم وتحقیق ہی لگا سکتا ہے۔شبلی نے اپنے وسیع مطالعۂ مآخذ کے سبب متعدد سراغ لگائے ہیں۔

امام غزالی نے اپنی شاہکار تصنیف ’’احیاء علوم الدین‘‘، جس کو شبلی بالعموم ’’احیاء العلوم‘‘ لکھتے ہیں، میں یہ اعتراف کیا ہے کہ ان کے مصادر و مآخذ کون ہیں۔ان میں قرآن وحدیث کے علاوہ متعدد مآخذ وکتب اخلاق وتصوف کا نام بھی گنایا ہے۔شبلی نے تحقیق کی ہے کہ احیاء العلوم کے تین بنیادی مآخذ ہیں: ۱-امام قشیری کا رسالہ قشیریہ۔۲-شیخ ابو طالب مکی کی قوت القلوب اور ۳-امام راغب اصفہانی کی الذریعہ الی علم الشریعہ،قوت القلوب ان کا بنیادی سرچشمہ ہے اور بقول شبلی دونوں کا موازنہ کیا جائے تو ’’امام صاحب کی نسبت اس کو سرقہ کی بدگمانی ہوگی، دو دو چار چار سطروں میں ایک آدھ لفظ کا کہیں فرق ہو جاتا ہے۔بعض جگہ ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ اسی کا مرادف رکھ دیتے

www.shibliacademy.org

ہیں“۔دونوں کی بعض عبارتوں سے اپنے اس بیان موازنہ کو مستند و مدلل بنایا ہے اور نتیجہ نکالا ہے کہ احیاء العلوم بہت کچھ قوت القلوب، رسالہ قشیریہ، ذریعہ راغب اصفہانی سے ماخوذ ہے“ حاشیہ میں یہ مزید صراحت کی ہے کہ علامہ ابن السبکی نے رسالہ قشیریہ اور قوت القلوب کے مآخذ ہونے کا ذکر کیا ہے۔”ذریعہ کا مآخذ دونوں کتابوں کے مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے، کشف الظنون وغیرہ میں لکھا ہے کہ ذریعہ امام غزالی کے پیش نظر رہا کرتی تھی ......“۔(الغزالی،۵۰-۵۱،حاشیہ ۱)

شاہنامۂ فردوسی کا اصل ماخذ دقیقی کا شاہنامہ تھا۔جو نوح بن منصور کے عہد میں اس کی تحریک سے شروع کیا تھا۔شبلی نے لکھا ہے کہ ”فردوسی نے دقیقی کے اشعار کی مقبولیت سے متاثر ہو کر شاہنامہ لکھنا چاہا اور اس کو اپنا ماخذ و مثال بنایا“۔(شعرالعجم،۱/۷۰ و مابعد اور ۱/۱۰۰ و مابعد: شبلی نے ان عرب تاریخوں کو بھی شاہنامہ کا ماخذ بتایا ہے جو فارسی سے عربی میں ترجمہ ہوگئی تھیں یا عربی میں ہی لکھی گئیں تھیں ۱/۱۰۸ و مابعد، لیکن یہ عرب تواریخ معلومات و واقعات کے مآخذ تھیں، نظم کی نہیں تھیں)

قدیم مآخذ کی خامیاں: اپنے سرمایۂ علوم و فنون پر نازاں اور کارنامۂ اسلاف و اکابر پر فرحاں شبلی پارکھ و ناقد بھی تھے۔ وہ قدیم صالح اور جدید نافع کے قائل و علم بردار تھے، توازن و اعتدال کی اسی فطرت کی بنا پر وہ دونوں کی کھوٹ بھی ظاہر کرتے تھے۔قدیم مآخذ کی خامیوں سے وہ واقف تھے اور جدید مغربی تاریخ نگاری کے اصول و اعمال نے ان کو اور بھی دور بین بنادیا تھا۔ اسی لیے وہ قدیم مصادر سیرت و تاریخ اور دوسرے مآخذ علوم اسلامی کی خامیوں، کمزوریوں اور مجبوریوں کو بھی بیان کرتے تھے۔ان کی وجہ سے شخص و عہد کی بازیافت اور تصویر کشی میں جو دقتیں پیش آتی تھیں، ان کا برملا اظہار و اعتراف کرتے تھے۔

المامون کی فہرستِ مآخذ و مصادر اور ان کی ثنا خوانی کے بعد ان کی خامیوں کا ذکر بہت دور سے کرتے ہیں...... ”لیکن ان تمام تاریخوں کو پڑھ کر اگر یہ معلوم کرنا چاہو کہ فلاں عہد میں طریق تمدن اور طرز معاشرت کیا تھا، حکومت اور فصل مقدمات کے کیا آئین تھے، خراج ملک کیا تھا، فوجی قوت کس قدر تھی، ملکی عہدے کیا کیا تھے، تو ان باتوں میں سے ایک کا پتہ لگنا بھی مشکل ہوگا، خود فرماں روائے وقت کے طور و طریقے اور عام اخلاق و عادات کا اندازہ کرنا چاہو تو جزئی

www.shibliacademy.org

حالات اور مفید تفصیلیں نہ ملیں گی، جن سے اس کی اخلاقی تصویر ایک بار آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ جن واقعات کو بہت بڑھا کر لکھا ہے اور ہزاروں صفحے ان کی نذر کر دیے ہیں وہ صرف تخت نشینی، خانہ جنگیاں، فتوحات ملکی، اندرونی بغاوتیں عمال کے عزل و نصب کے حالات ہیں۔ یہ واقعات بھی کچھ ایسے عامیانہ طریقے پر جمع کر دیے ہیں کہ نہ ان کے اسباب و علل کا مرتب سلسلہ معلوم ہوتا ہے، نہ ان سے کسی قسم کے دقیق تاریخی نتیجہ مستنبط ہو سکتے ہیں''۔ پھر عہد المامون سے مثالیں دی ہیں۔ (المامون، ۱۰-۱۱: بغاوتوں کے اسباب، واقعات کا سلسلہ، فلسفیانہ نکتہ سنجی اور تاریخ کے نتائج کا استنباط وغیرہ کا ذکر ہے)

سیرۃ النعمان کے دیباچہ میں اہم ترین ماخذ کی فہرست کے ذکر اور ان کے عدم دستیابی کے شکوہ کے بعد شبلی نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ ''روم و مصر کے سفر میں مذکورہ بالا فہرست کی اکثر کتابیں میری نظر سے گذریں، لیکن مہتم بالشان اور مفید معلومات کے لحاظ سے کوئی کتاب ایسی نہ نکلی جس سے میری ناچیز تالیف میں معقول اضافہ ہوسکتا''۔ (سیرۃ النعمان، ۱۰، حاشیہ ا)

تاریخ کی تعریفات نقل کرنے کے بعد شبلی نے لکھا ہے کہ ''ان تعریفات کی بنا پر تاریخ کے لیے دو باتیں لازمی ہیں: ایک یہ کہ جس عہد کا حال لکھا جائے اس زمانے کے ہر قسم کے واقعات قلم بند کیے جائیں یعنی تمدن، معاشرت، اخلاق، عادات، مذہب ہر چیز کے متعلق معلومات کا سرمایہ مہیا کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ تمام واقعات میں سبب اور مسبب کا سلسلہ تلاش کیا جائے۔ قدیم تاریخوں میں یہ دونوں چیزیں مفقود ہیں''۔ اس کے بعد تفصیل سے بتایا ہے کہ ''یہ نقص صرف اسلامی تاریخوں تک محدود نہیں بلکہ کل ایشیائی تاریخوں کا یہی انداز تھا اور ایسا ہونا مقتضائے اسباب تھا'' کیونکہ تاریخ کا ارتکاز سلطان پر تھا (Rex-centric) جسے جدید اصطلاح میں کہا جاتا ہے۔ شبلی نے ایک قدم آگے بڑھ کر تمام قوموں میں تاریخ کے فن کو نا تمام رہنے کا دعویٰ کیا ہے جو صحیح ہے کیونکہ وہ مختلف فنون سے متعلق ہونے کے سبب مختلف خانوں میں بٹ جاتی تھیں اور صرف تاریخی مآخذ میں نہیں ملتی تھیں۔ (الفاروق، ۹-۱۱)

شبلی نے عام اسلامی تاریخی مآخذ کے بعد خاص الفاروق کے مآخذ سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ سوانح میں ہر قسم کے واقعات نہیں ملتے ''لیکن دوسری کتابوں سے ان کی تلافی کی جا سکتی

www.shibliacademy.org

ہے مثلاً طریق حکومت و آئین انتظام کے لیے ماوردی کی الاحکام السلطانیہ، مقدمۂ ابن خلدون اور کتاب الخراج سے، خاص صیغۂ قضا کے لیے محمد بن خلف الوکیع کی اخبار القضاۃ سے، اولیات فاروقی کے لیے عسکری کی کتاب الاوائل و محاسن الوسائل وغیرہ سے، خطبات کے لیے العقد الفرید اور البیان والتبیین سے، ابن جوزی کی سیرۃ العمرین سے اخلاق و عادات اور شاہ ولی اللہ کی ازالۃ الخفا سے ان کی فقہ و اجتہاد کے بارے میں معلومات مل سکتی ہیں۔ (الفاروق، ۱۳-۱۴)

ابتدائی تصانیف کے علاوہ شبلی نے قدیم مآخذ کی خامیوں کا ذکر بعد کی کتابوں خاص کر سیرۃ النبیؐ میں بھی کیا ہے۔ شبلی کو بہر حال یہ اعتراف ہے کہ قدیم مآخذ کے مولفین اپنے زمانے کے روایتی طرز ترسیل کے اسیر تھے اور اس میں معذور بھی تھے۔ دور جدید میں شبلی نے جدید تاریخی اصول نگارش سے کام لیا اور تاریخ کو روایت و واقعات کے تجزیہ دونوں سے مربوط کر دیا۔ قدیم مآخذ و مصادر کی خرابیوں میں سے چند اور بھی ہیں جن کی طرف شبلی نے اشارتاً انگلی اٹھائی ہے۔ وہ بہر حال ایک رہنما اصول ہے۔

مآخذ و مصادر کا تقابلی موازنہ: سیرت نبوی اور اسلامی تاریخ کے مصادر و مآخذ پر شبلی نے خاص توجہ محض اپنی شیفتگیٔ فن کے سبب کی ہے۔ اس کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ وہ تعداد میں زیادہ ہیں اور ان کا ارتقائے فنی بھی ہر دور میں ہوتا رہا اور زوال فن بھی بعد میں ہوا۔ الفاروق اور سیرۃ النبیؐ کے مباحث مآخذ میں شبلی نے ارتقاء کے ادوار قائم کیے ہیں اور زوال کے دور کا سراغ بھی لگایا ہے۔ چوتھی صدی / دسویں صدی تک کے زمانے کو شبلی قدماء کا دور قرار دیتے ہیں جو بہر حال تمام تالیفی خرابیوں کے باوجود ارتقائے فن کا دور تھا۔ ''پانچویں صدی کے آغاز سے متاخرین کا دور شروع ہوتا ہے جو فن تاریخ کے تنزل کا پہلا قدم ہے۔ متاخرین میں اگرچہ بے شمار مورخ گذرے جن میں سے ابن الاثیر، سمعانی، ذہبی، ابوالفداء، نوری، سیوطی وغیرہ نے نہایت شہرت حاصل کی لیکن افسوس ہے کہ ان لوگوں نے تاریخ کے ساتھ من حیث الفن کوئی احسان نہیں کیا، قدماء کی جو خصوصیات تھیں کھو دیں اور خود کوئی نئی بات نہیں پیدا کی''۔ اس کے بعد شبلی نے قدماء کی خصوصیات اور متاخرین کی خرافات کا تقابلی مطالعہ کیا ہے جو مصادر و مآخذ میں ایک نئی چیز ہے۔ (الفاروق، ۸: اس سے قبل کی تصانیف میں بھی شبلی نے اسلامی تاریخوں کے

www.shibliacademy.org

ادوار وارتقاء کا ذکر کیا ہے لیکن وہ مختصر ہے)

سیرۃ النبی کے مقدمہ میں تبصرہ کے عنوان سے بحث کی ہے کہ ''سیرت پر اگر چہ آج بھی سینکڑوں تصنیفیں موجود ہیں لیکن سب کا سلسلہ جا کر صرف تین چار کتابوں پر منتہی ہوتا ہے: سیرت ابن اسحاق، واقدی، ابن سعد، طبری۔ ان کے علاوہ جو کتابیں ہیں وہ ان سے متاخر ہیں اور ان میں جو واقعات مذکور ہیں زیادہ تر ان ہی کتابوں سے لیے گئے ہیں...... ان میں سے واقدی تو بالکل نظر انداز کر دینے کے قابل ہے۔ محدثین بالاتفاق لکھتے ہیں کہ وہ خود اپنے جی سے روایتیں گھڑتا ہے، اور حقیقت میں واقدی کی تصنیف خود اس کی شہادت دیتی ہے...... واقدی کے سوا باقی اور تینوں مصنّفین اعتبار کے قابل ہیں''۔ شبلی نے بڑی تفصیل سے ابن اسحاق کے رواۃ کو ضعیف قرار دیا ہے''، بکائی اگر چہ رتبہ کے شخص ہیں تاہم محدثین سے فروتر ہیں...... ابن سعد کی نصف سے زیادہ روایتیں واقدی کے ذریعہ سے ہیں اس لیے ان روایتوں کا وہی رتبہ ہے جو خود واقدی کی روایتوں کا ہے۔ باقی رواۃ میں سے بعض ثقہ ہیں اور بعض غیر ثقہ، طبری کے بڑے بڑے شیوخ مثلاً سلمہ ابرش، ابن سلمہ وغیرہ ضعیف الروایہ ہیں......''۔ (سیرۃ النبی ۱ر ۴۸-۴۹ وما بعد: مکاتیب میں فن سیرت کی صرف تین کتب کو بنیادی مآخذ بتایا ہے: ابن ہشام، ابن سعد، طبری، ۱ر۲۰۱)

الفاروق کے خاص مآخذ و مصادر کی بحث میں حضرت شاہ ولی اللہ کی کتاب ازالۃ الخفا میں فقہ واجتہادِ عمری کو خراج عقیدت یوں پیش کیا ہے کہ ''شاہ صاحب نے...... اس مجتہدانہ طریقے سے بحث کی ہے کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں''۔ شبلی نے حضرت شاہ کی کتابوں سے خاص کر ازالۃ الخفا سے بہت استفادہ کیا ہے، اگر چہ تصوف فاروقی کا باب نظر انداز کر دیا ہے۔ دوسری طرف محبّ طبری کی کتاب ریاض النضرہ اور شاہ ولی اللہ صاحب کا اسے ماخذ قرار دینے کے بعد یہ تبصرہ بھی کیا ہے کہ ''اس میں نہایت کثرت سے موضوع اور ضعیف روایتیں مذکور ہیں اس لیے میں نے دانستہ اس سے احتراز کیا......''۔ (الفاروق، ۱۴ وما بعد: شبلی نے ان ہی اسباب سے ریاض النضرہ کے علاوہ ابن عساکر اور حلیۃ الاولیاء وغیرہ کی روایتوں کو نظر انداز کرنے کی بات کہی ہے (۱۷) کیونکہ یہ روایتیں صحیح نہ تھیں'' جو حلیۃ الاولیاء، ابن عساکر، کنز العمال، ریاض النضرۃ وغیرہ میں

www.shibliacademy.org

مذکور ہیں بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ چونکہ اس قسم کی روایتیں عموماً گرمی محفل کا سبب ہوتی تھیں اور عوام ان کو نہایت ذوق سے سنتے تھے اس لیے ان میں خود بخود مبالغہ کا رنگ آتا گیا۔ اس کی تصدیق اس سے ہوتی ہے کہ جو کتابیں زیادہ مستند اور معتبر ہیں ان میں یہ روایتیں بہت کم پائی جاتی ہیں ......"۔ (شبلی کا یہ تبصرہ دلچسپ ہے جس پر بحث تنقیدی حصہ میں آتی ہے)

شبلی نے الفاروق کے مقدمہ اول میں اور سیرۃ النبیؐ کے مقدمۂ مفصل میں یہ اصول مقرر کیا ہے کہ درایت کی بنا پر جب تنقید وتبصرہ کا استعمال محدثین ومورخین نے کیا "تو جس قدر ان میں تنقید ہوتی گئی اسی قدر مشتبہ اور مشکوک باتیں کم ہوتی گئی ہیں، فدک، قرطاس، سقیفہ بنی ساعدہ کے واقعات ابن عساکر، ابن سعد، بیہقی، مسلم، بخاری سب نے نقل کیے ہیں لیکن جس قدر ان بزرگوں کے اصول اور شدت احتیاط میں فرق مراتب ہے اسی نسبت سے روایتوں میں مشتبہ اور نزاع انگیز الفاظ کم ہوتے گئے، یہاں تک خود مسلم و بخاری میں فرق مراتب کا یہ اثر موجود ہے، چنانچہ اس کا بیان ایک مناسب موقع پر تفصیل سے آئے گا"۔ مولانا شبلی کا یہ تنقیدی تجزیہ ان کی دقت نظر کو تو اجاگر کرتا ہے ہی اس سے زیادہ صحیحین کی احادیث کے تقابلی مطالعہ کی دعوت دیتا ہے اور بلاشبہ مسلم میں یہ فرق نظر آتا ہے۔ (الفاروق، ۱۶: شبلی نے بعد میں جدید کتب تاریخ سے بھی بحث کی ہے کہ وہ فلسفہ اور انشاپردازی سے مرکب ہیں ...... لیکن مورخ کا اصلی فرض یہ ہے کہ وہ سادہ واقعہ نگاری کی حد سے تجاوز نہ کرنے پائے"۔ مورخ کے فرائض میں وہ بہر حال تجزیہ شامل کرتے ہیں)

سیرۃ النبیؐ میں شبلی نے اصول روایت ودرایت سے بحث کر کے سیرت وحدیث کے بنیادی مصادر کا تقابل وموازنہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ جن کتابوں میں ان کو نظر انداز کیا گیا اسی قدر ان میں ضعیف بلکہ موضوع روایات جمع ہو گئیں اور جس قدر ان میں ان اصول کو برتا گیا ان میں صحت واعتبار کا معیار بلند تر ہوتا گیا، یہی وجہ ہے کہ حدیث کی اہم ترین کتب میں وہ معیار بلند ترین ہے۔ (سیرۃ النبیؐ ۱/۴۹-۷۱ ومابعد: اس بحث میں متعدد کتابوں سے مثالیں اور بحثیں دی گئی ہیں جو بلندتر اور فروتر کا تقابل میں)

مصادر و مآخذ کے تقابلی مطالعۂ شبلی کی ایک جہت یہ ہے کہ وہ متن میں یا حواشی میں

www.shibliacademy.org

مختلف مصادر کی معلومات دیتے ہیں۔ پھر ان میں تطبیق دیتے یا ان کی تشریح و تعبیر کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ وہ کسی ایک یا زیادہ مآخذ کی معلومات کی انفرادیت بتاتے ہیں۔ طریق حوالہ میں یہ بات المامون کے حوالے سے گذر چکی کہ شبلی دو تین مآخذ کی معلومات کا فرق بتاتے ہیں جیسے تقسیم مملکت کے معاہدوں کی عبارتوں کا فرق ازرقی کی کتاب اخبار مکہ اور یعقوبی کی تاریخ کے حوالے سے بتایا ہے۔ ایسے حواشی یا متون کے بیانات المامون میں کافی ہیں۔ (المامون، ۳۱ حاشیہ ۱، ۹۰-۹۱ حاشیہ ۱: شبلی کی تطبیق، ترجیح یا استرداد روایات و مآخذ کی یہ جہت بہت اہم ہے)

الغزالی میں شبلی نے اس طریق تجزیہ و تنقید کو اور وسعت دی کہ اب ان کی فکر و نگارش دونوں پختہ تر ہوگئی تھیں۔ مثلاً امام غزالی نے اپنی کتاب منقذ من الضلال میں تین سو کو طلبہ بتایا ہے جبکہ علامہ مرتضیٰ حسینی کو وہ مدرس نظر آئے۔ شبلی نے یوں تطبیق دی کہ امام غزالی سے جو طلبہ تعلیم پاتے تھے وہ فارغ التحصیل ہوتے تھے اس لیے ان کو مدرس بھی کہا جا سکتا ہے اور طالب علم بھی۔ ان میں امراء رؤسا کی تعداد کا ذکر صرف علامہ مرتضیٰ نے کیا ہے"۔ اسی طرح امام غزالی کے سفر شوق و محبت کے بارے میں لکھا ہے کہ مورخین نے اس کے حالات مختلف طور سے بیان کیے ہیں اس لیے میں نے خود امام صاحب کی تحریر پر اعتماد کیا ہے جو ان کی خودنوشت المنقذ من الضلال میں ہے"۔ مخالفین امام غزالی کی یورش پر شبلی کا حاشیۂ بحث تنقیدی شاہکار ہے۔ ایسے تقابلی مطالعات شبلی مختلف روایات و واقعات کے ضمن میں ملتے ہیں۔ (الغزالی ۱۲، ۱۷ حواشی: ۲۲ حاشیہ)

الفاروق، سیرۃ النعمان اور سیرۃ النبی میں بھی اور ادبی شاہکاروں شعر العجم وغیرہ میں بھی یہی جہت ملتی ہے۔ مثلاً سیرۃ النعمان میں امام ابو حنیفہ کی صحابہ کرامؓ سے براہ راست حدیث روایت نہ کرنے کی مختلف روایات و آراء کا ذکر کرکے واضح کرتے ہیں کہ حدیث کی روایت کے لیے بڑی عمر یعنی بیس سال کی عمر ارباب کوفہ کے نزدیک ضروری تھی اس لیے امام موصوف نے ان سے روایت حدیث نہیں کی، وہ ان روایات کی تردید بھی کرتے ہیں جو امام موصوف کی تابعیت کی صرف اس عدم روایت کے سبب کرتی ہیں۔ مرض وفات میں رسول اکرم ﷺ کے واقعہ قرطاس پر شبلی کی بحث روایات کے محاکمہ اور تجزیہ پر مبنی ہے اور خاصی جاندار ہے۔ الفاروق میں رسول اکرم ﷺ کی وفات پر حضرت عمرؓ کے اضطراب و خطبہ کی بحث میں بھی شبلی نے اس

www.shibliacademy.org

جہت نگارش کا مظاہرہ کیا ہے۔ سیرۃ النبیؐ میں شبلی نے تو قدم قدم پر مختلف روایات کے اختلاف میں تطبیق دیے، ترجیح دینے یا متعدد کو مسترد کر دینے کا اصول برتا ہے۔ جیسے اولین سفر شام میں نبوی رفقاء، بحیرا راہب کا قصہ، حضرت زینب سے شادی اور متعدد دوسرے واقعات سیرت۔ (سیرۃ النعمان، ۱۸-۱۹، نیز ۲۶-۲۷، ۳۲، ۴۵ و مابعد؛ الفاروق، ۵۴-۵۸، مضمون خاکسار خطبہ فاروقی پر معارف اعظم گڑھ، جون ۲۰۰۷ء؛ سیرۃ النبی ۱/۱۷۸-۱۸۱، ۴۴۱ و مابعد)

(الف) مصادر اصلی کا تنقیدی تجزیہ: مآخذ و مصادر کی خامیوں کے ساتھ ساتھ ان کا تنقیدی تجزیہ بھی سامنے آ جاتا ہے کہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ المامون اور سیرۃ النعمان اور بعض دیگر سوانح عمریوں میں شبلی نے بار بار یہ صراحت کی ہے کہ سوانح و حالات شخصی میں تو ان قدیم مصادر سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اور انہوں نے بھی اٹھایا ہے کہ ان میں ہی ضروری معلومات و روایات ملتی ہیں۔ لیکن دوسرے حصۂ بحث میں وہ مصادر نا کافی ہیں کیونکہ ان میں وہ معلومات ہوتی ہی نہیں جن کی ضرورت محقق کو ہوتی ہے۔ المامون کے دوسرے حصہ کے لیے درکار مباحث اور ان کے لیے معلومات کی تشنگی یا فقدان پر شبلی کے اعتراضات گذر چکے۔ سیرۃ النعمان میں لکھتے ہیں کہ ”میری کتاب کا پہلا حصہ جس میں امام ابو حنیفہؒ کے عام حالات ہیں انہی تصنیفات سے ماخوذ ہیں لیکن دوسرا حصہ جس میں امام صاحب کے طرز اجتہاد و اصول استنباط سے بحث ہے اس کے لیے یہ تمام دفتر بیکار تھا۔ کیونکہ قدیم زمانے میں سوانح عمریوں کا یہ ڈھنگ ہی نہ تھا کہ حالات زندگی کے ساتھ اس شخص کی تصنیفات یا مسائل سے بھی بحث کرتے۔ مناظرہ اور مذہبی حمایت کے پیرایہ میں البتہ ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ ان مسائل اور تصنیفات پر تفصیلی ریویو لکھا جا سکتا ہے“۔ پھر انہوں نے ابن ابی شیبہ کے اعتراضات، قاسم بن قطلو بغا (م ۸۷۹/۱۴۷۴) کے جوابات، شمس الائمہ کردری کے جواب منخول، شیخ اکمل الدین البابرتی (م ۷۸۶/۱۳۸۴) اور شیخ ابو عبداللہ جرجانی (م ۳۹۷/۱۰۰۷) کی مستقل کتابوں کے علاوہ مورخ سبط ابن جوزی کی الانتصار لامام ائمۃ الامصار اور ان کی دوسری تالیف، جس کے بارے میں صاحب کشف الظنون کا تبصرہ ہے کہ ”یہ کتاب اپنے باب میں بے نظیر ہے“، ”عمر الموصلی کی تصنیف الانتصار والترجیح اور قاضی ابو جعفر احمد بن عبداللہ کی سب سے مفصل کتاب الابانۃ ہے، کا ذکر کیا ہے اور ان کی عدم

www.shibliacademy.org

دستیابی کا شکوہ کیا ہے اور علامہ کردری کے رسالہ کو غنیمت جانا ہے، بعض بعض باتیں اس رسالہ سے لی ہیں، باقی میرا تتبع اور تحقیق ہے......''۔ (سیرۃ النعمان، ۱۱-۱۳: تنقید و تجزیہ کتب و مصادر میں شبلی دو طرح کے طریقے اختیار کرتے ہیں: ایک اپنی رائے دیتے ہیں دوسرے کسی پیش رو صاحب نظر کی رائے نقل کر کے اس سے استناد کرتے ہیں جیسا کہ ان کے تمام پیش رو محدثین و مورخین کا طریقہ تھا۔ شبلی کا ایک تیسرا طریقۂ تصحیح و روش نقد یہ ہے کہ وہ بسا اوقات پیش رو کی رائے کو مسترد بھی کر دیتے ہیں)

الغزالی کی سوانح کے دو مآخذ پر شبلی نے ناقدانہ اور عالمانہ تجزیہ لکھا ہے جو اگرچہ مختصر ہے: پہلی کتاب علامہ ابن عساکر دمشقی مشہور محدث کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب اصل میں امام اشعری کے حالات میں ہے، لیکن اشاعرہ میں جو لوگ مشاہیر تھے ان کا بھی تذکرہ ہے۔ اس تقریب سے امام غزالی کے حالات بھی لکھے ہیں۔ اور چونکہ عبدالغافر فارسی کے حوالے سے لکھے ہیں جو خود امام غزالی کے ہم عصر تھے، اس لیے جس قدر لکھا ہے حرف حرف سند کے قابل ہے......'' دوسری کتاب علامہ ابن السبکی کی تصنیف ہے جو مشہور محدث تھے۔ یہ کتاب اس جامعیت سے لکھی گئی ہے کہ مجموعی حیثیت سے رجال کی کوئی کتاب اس کی ہمسری نہیں کر سکتی۔ امام غزالی کا حال جس قدر اس کتاب میں ہے کسی کتاب میں اس سے زائد کیا اس کے برابر بھی نہیں مل سکتا۔ اس لیے میں نے سوانح عمری کے متعلق زیادہ تر ان ہی دونوں کتابوں پر مدار رکھا۔ باقی امام صاحب کے اصول اور مسائل تو اس کے لیے خود امام صاحب کی تصانیف کافی تھیں جس کا بہت بڑا ذخیرہ میرے پاس موجود تھا''۔ (الغزالی، ۲: امام موصوف کی احیاء العلوم کے سہ گانہ مآخذ پر شبلی کا تبصرہ بہت دلچسپ ہے''قوت القلوب میں اگرچہ اخلاق کے تمام ابواب کی سرخیاں قائم کی ہیں تاہم وہ ایک واعظانہ تصنیف ہے۔ ذریعہ میں فلسفہ کی کچھ کچھ جھلک پائی جاتی ہے لیکن وہ اس قدر کم ہے اور کمی کے ساتھ اس پر مذہبی روایات کی اس قدر تہیں چڑھ گئی ہیں کہ دیکھنے والے کو نظر نہیں آسکتیں'' الغزالی، ۴۶)

سیرت و سوانح کے علاوہ شبلی نے تاریخ ادب و شعر میں مآخذ و مصادر کا اسی طرح تنقیدی تجزیہ کیا ہے۔ اپنی مایہ ناز تاریخ فارسی شعر ''شعر العجم'' میں شبلی نے مصادر و مآخذ اور ان کی روایات و

www.shibliacademy.org

اخبار کا ایسا ہی عالمانہ تجزیہ کیا ہے، مجمع الفصحاء ہدایت قلی خاں کو ''زمانہ حال کا سب سے مستند تذکرہ قرار دیا ہے''۔ (۱۵/۱) وہ قاچاری عہد کی فارسی تالیف ہے۔ سلطان محمود غزنوی کے علم و فضل پر بحث میں شبلی نے لکھا ہے کہ ''جواہر مضیئہ، جو فقہائے حنفیہ کے حالات میں ایک مستند کتاب ہے، اس میں اس کو فقہاء میں شمار کیا ہے کہ فقہ میں خود اس کی ایک مبسوط تصنیف موجود ہے (شعر العجم ۵۱/۱) شاعر عنصری کے دیوان مروجہ میں ۱۷۲ اشعار ہیں جبکہ تذکرہ دولت شاہ میں ان کی تعداد ۱۸۰ لکھی ہے۔ (۵۹/۱: نیز ۶۷/۱، ۸۴ و مابعد)

سیرۃ النعمان، الفاروق اور سیرۃ النبی کے متعدد مآخذ و مصادر اور ان کی بہت سی روایات کا تنقیدی تجزیہ ملتا ہے۔ شبلی امام ابوحنیفہ کے امام باقر اور امام جعفر صادق دونوں کے شاگرد ہونے اور ان سے مستفید ہونے کے قائل ہیں اور اسی بنا پر امام ابن تیمیہ کے خیال و تجزیہ پر نقد کیا ہے کہ ان کا خیال صحیح نہیں۔ اسی طرح تاریخوں سے ثابت ہونے کا ذکر کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے فن حدیث میں امام اوزاعی کی شاگردی کی۔ (سیرۃ النعمان، ۴۰-۴۱ و مابعد۔ شبلی کے اس خیال سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا جیسا کہ بعض علمائے احناف کا خیال ہے کہ ان کے لحاظ سے استفادہ دوسری چیز ہے؛ الفاروق، ۶۰ و مابعد، خلافت صدیقی پر بحث شبلی، فتح الباری، مسند ابویعلیٰ وغیرہ پر بحث، فتوحات فاروقی میں مختلف مآخذ میں تطبیق و ترجیح۔ سیرۃ النبی ۲۴۰/۱ و مابعد، الغرانیق العلی کی بحث میں حاشیہ اور متن دونوں میں طبری، ابن سعد اور اکثر تاریخوں کا تنقیدی تجزیہ کیا ہے)

مآخذ پر اہل علم کی آراء کا تنقیدی جائزہ: اصل مآخذ و مصادر کی روایات و معلومات قبول کرنے اور ان کو صحیح سمجھنے کا رجحان ایک طرح سے فطری بھی ہے۔ قاری و مولف اپنے مصادر خاص کر ثقہ اور معتبر مولفین کی کتب و تحقیقات کو احترام و محبت کی بنا پر بھی قبول کر لینا چاہتا ہے۔ کسی خاص مصدر و ماخذ کے بارے میں کسی پیش رو صاحب علم کی رائے اور اس کے مصدر و ماخذ کی ثقاہت بھی اس کی قبولیت کی راہ ہموار کرتی ہے۔ مگر صاحبان علم و فراست صرف صحیح رائے کو قبول کرتے ہیں اور جو تبصرے اور بیانات ان کے خیال و تحقیق میں غلط ہوتے ہیں ان کو مسترد کرتے ہیں۔ شبلی ان ہی عظیم ترین صاحبان بصیرت میں شامل تھے جو مآخذ پر اہل علم و فن کی آراء سے اختلاف کرتے اور ان کو غلط بھی بتاتے ہیں۔ ان کا فیصلہ محض اپنی فکر و خیال کو صحیح ٹھہرانے کے لیے

www.shibliacademy.org

نہیں ہوتا تھا بلکہ صحیح تاریخ نگاری کے لیے ہوتا تھا اور اس کے لیے دلائل و شواہد دیتے تھے۔ وہ دو طریقوں سے تنقید کرتے تھے: ایک واقعہ اور روایت کی تصحیح کی خاطر اور دوسرے خود کسی خاص ماخذ کی توثیق و تضعیف کی بنا پر، صاحب کشف الظنون ایک عظیم آماخذ نگار اور علوم وفنون کے پارکھ تھے۔ ان کے بیانات و واقعات اور آماخذ کے بارے میں رائے سے اختلاف کیا مثلاً مشہور حکیم فارابی کی ایک تالیف کے واقعہ کو منصور بن نوح کے عہد سے صاحب کشف الظنون نے منسوب کیا اور لکھا کہ یہ واقعہ اکثر کتابوں میں اسی طرح آیا ہے۔ شبلی نے فارابی (م ۳۳۹ھ/۹۵۰) اور منصور (م ۳۵۰/۹۶۱) کے سنین وفات کے تفاوت کی بنا پر اس کو مسترد کر دیا کہ وہ پہلے کا واقعہ ہے اور صاحب کشف الظنون کا خیال و بیان صحیح نہیں ہے (شعر العجم ۲۳/۱، حاشیہ ۱) شعر العجم میں متعدد مقامات پر کئی پیش رو صاحبان علم اور ناقدین آماخذ سے شبلی نے اختلاف کر کے ان کی غلطی واضح کی ہے۔ (۱۸۹/۱-۱۹۰، حاشیہ ۱، حکیم سنائی کے توبہ اور قصیدہ نگاری سے احتراز کا واقعہ، نفحات الانس کی روایت پر استدراک فرشتہ؛ اور متعدد دوسرے)

تاریخی تصانیف میں بھی شبلی کے نقد ماخذ و اہل علم کی یہ جہت موجود ہے بلکہ وہ بسا اوقات خاصی تند و تیز ہو جاتی ہے۔ امام ابن تیمیہؒ نے حضرت جعفر صادق کے استاذ امام ابوحنیفہ کی روایات و آماخذ سے انکار کیا ہے، شبلی نے اسے ''ابن تیمیہ کی گستاخی اور خیرہ چشمی'' قرار دیا ہے۔ مسند خوارزمی کو مسند امام ابوحنیفہ قرار دینے سے شبلی نے آماخذ پر نقد کیا ہے اور شاہ ولی اللہ پر اس بنا پر نقد کیا ہے کہ انہوں نے ذرا سختی کی اور اسے ضعیف قرار دیا۔ (سیرۃ النعمان، ۴۱، ۱۰۶؛ نیز ۱۰۸: ابو مطیع بلخی پر کتب رجال کے ''سخت ریمارک'' سے کلیۃً عدم اتفاق؛ فقہ اکبر امام ابوحنیفہ کی تصنیف نہیں وغیرہ) الفاروق اور سیرۃ النبیؐ میں شبلی نے متعدد ماہرین کے تجزیہ آماخذ سے اختلاف کیا ہے۔ الغزالی، علم الکلام وغیرہ میں بھی اس کے شواہد موجود ہیں۔ مثلاً الفاروق میں محبّ طبری کی روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ اپنے افسروں کو عیسائیوں کے ملازم رکھنے سے منع کرتے تھے افسوس ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی ان روایتوں کو قبول کر لیا لیکن جس شخص نے محبّ طبری کی کتاب (ریاض النضرۃ) دیکھی ہے وہ پہلی نظر میں سمجھ سکتا ہے کہ ان کی روایتوں کا کیا پایہ ہے۔ ۲۶۲/۲)

قدیم آماخذ اور نئی کتب کا موازنہ: قدیم سے معاصر تک اور معاصر سے جدید اور جدید تر

www.shibliacademy.org

تک کاروان علم و تحقیق کا سفر جاری رہتا ہے اور وہ بے بہا اضافات کرتا ہے۔شبلی اپنے علم و تفقہ اور ذہن و ادراک کی قوتوں کی بنا پر ان کا بخوبی علم رکھتے تھے اور قدیم و جدید کا موازنہ بھی برابر کرتے رہتے تھے۔مآخذ کی حد تک ان کی تمام تصنیفات میں اس قدیم و جدید موازنے کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جو موازنہ انیس و دبیر کی طرح دلچسپ ہے۔المامون، سیرۃ النعمان، الغزالی، الفاروق، سیرۃ النبی، شعرالعجم، علم الکلام اور متعدد دیگر کتب میں قدیم و جدید کا موازنہ کیا ہے۔ مآخذ کی قدر و قیمت اور معلومات اور نئی تحقیقات و کتب کی تشریحات کا بھی مقارنہ ملتا ہے اور مآخذ و مصادر کی باہمی قیمت کا بھی۔مثلاً شعرالعجم میں شعر کی تعریف پر قدیم خاص کر عرب و ایرانی اکابر اور جدید فلسفی جان اسٹوارٹ مل کے افکار کا موازنہ ہے۔آخر میں شبلی کا محاکمہ ہے کہ ’’مل صاحب کی یہ تعریف اگرچہ نہایت باریک بینی پر مبنی ہے لیکن اس سے شاعری کا دائرہ نہایت تنگ ہو جاتا ہے اور اگر اسی کو معیار قرار دیا جائے تو فارسی اور اردو کا دفتر بے پایاں بالکل بیکار ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ شعر کا دائرہ نہ اس قدر تنگ ہے جیسا مل صاحب کرنا چاہتے ہیں اور نہ اس قدر وسیع جیسا ہمارے علمائے ادب نے کیا ہے‘‘۔(شعرالعجم ۱۰/۱-۱۳ و مابعد: اسی کے بعد مولانا حمیدالدین فراہیؒ کی جمہرۃ البلاغہ سے شعر کی حقیقت نقل کی ہے اور اسے نہایت نکتہ سنجی کا بیان اور کتاب کو نادر بتایا ہے۔اس سے قبل یورپی محققین وارمسیٹر، والٹن زوکوسکی، نولد یکی اور سرگور اوسلی اور براؤن کی فارسی تحقیقات کی داد دی ہے جن کا ذکر دیباچہ کے مآخذ میں آچکا ہے۔دوسری جدید تحقیقات کا بھی حوالہ ہے)

الغزالی میں احیاء العلوم اور یورپی فلسفی ڈیکارٹ کے فلسفہ کے موازنے پر جارج ہنری لوئس کا تبصرہ نقل کیا ہے کہ ’’اگر ڈیکارٹ (یورپ میں اخلاق کے فلسفہ جدید کا بانی خیال کیا جاتا ہے) کے زمانے میں احیاء العلوم کا ترجمہ فرنچ زبان میں ہو چکا ہوتا تو ہر شخص یہی کہتا کہ ڈیکارٹ نے احیاء العلوم کو چرالیا ہے‘‘۔(الغزالی، ۴۷ بحوالہ تاریخ فلسفہ ۵۰/۲ لندن) الغزالی میں متعدد دوسرے اہل قلم کی تحقیقات و آراء کا ذکر کیا ہے کہ وہ بوجوہ امام موصوف سے شیفتگی رکھتے تھے اور ان پر بہت کام بھی کیا ہے۔سیرۃ النعمان میں معاصر عالم علامہ عبدالحئی فرنگی محلی اور بعض دوسرے عرب و ہندی علماء کی تحقیقات پیش کر کے ان کا موازنہ بھی کیا ہے۔اسلامی فقہ بالخصوص حنفی فقہ کی

www.shibliacademy.org

تدوین میں مستشرقین کے ایک بڑے گروہ نے جن میں شیلڈن ایموز (Sheldon Amos) شامل ہیں۔ رومن لا سے ماخوذ بتانے کی کوشش کی ہے، شبلی نے اس پر سخت نقد کر کے دونوں طرح کے مآخذ کا تحقیقی موازنہ کیا ہے (۴۶، ۲۰۲ و مابعد)۔ الفاروق اور سیرۃ النبی میں مستشرقین کی تحقیقات کی داد بھی دی ہے، موازنہ بھی کیا ہے اور ان کے افکار و تعبیرات پر سخت نقد بھی کیا ہے۔

جدید تحقیقات کی نارسائی: قدیم و جدید مصادر اور اصل و ثانوی مآخذ کا تقابلی مطالعہ بھی شبلی کا ایک پسندیدہ ترین موضوع ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنے زیر بحث مضمون و موضوع کے تمام مصادر کو بغور پڑھتے اور ان کی قدر و قیمت آنکتے تھے۔ انہوں نے جہاں جدید تحقیقات خاص کر مغربی کتب و مقالات کی عالمانہ اور منصفانہ کاوشوں کی داد دی ہے وہیں ان کی علمی بے بصیرتی اور تحقیقی نارسائیوں پر گرفت بھی کی ہے اور قدیم و جدید دونوں کی متعصّبانہ نگارشات پر سخت نقد کیا ہے۔ شبلی کی اس جہت نقد و محاکمہ سے علوم و فنون کے تمام گوشے منور ہیں اور وہ ان کی منصفانہ تحقیق کے شاہد بھی ہیں۔

مثلاً فارسی ادبیات میں شبلی نے پروفیسر براؤن اور سرجان مالکم اور بعض دوسرے اہل قلم پر سخت نقد کیا ہے۔ موخرالذکر نے اپنی تاریخ ایران میں یہ عمومی خیال واقعہ بنا کر پیش کیا ہے کہ عرب مسلم فاتحوں نے ایران کی فتح کے دوران تمام ایرانی تہذیب و تمدن کے آثار کو برباد کر دیا اور ان کی قدیم کتابوں کو جلا کر خاک کر دیا اور خود ایران کی تاریخ و تہذیب پر کچھ نہیں لکھا۔ چار سو برس کے بعد سامانیوں میں منصور اول یا منصور ثانی نے اپنے اسلاف کے کارناموں کو اجاگر کیا کہ وہ بہرام چوبین کی نسل میں تھے۔ شبلی نے لکھا ہے کہ مالکم کا ایک حرف بھی صحیح نہیں ہے۔ ایرانی تہذیب و تمدن کے بارے میں عرب مسلم خلفاء کے دور ہی میں کام شروع ہوا۔ خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے میر منشی جبلہ بن سالم نے متعدد ایرانی کتب کا عربی میں ترجمہ کیا، اسی طرح کے کام بہرام بن مروان اور عبداللہ بن المقفع نے تاریخ فارس پر اور انتظام سلطنت پر کتابوں کا ترجمہ کیا۔ اس کے بعد شبلی نے متعدد کتابوں کی فہرست دی ہے اور ثابت کیا ہے کہ طبری، مسعودی، ابوحنیفہ دینوری، یعقوبی وغیرہ نے ایران کی مبسوط تاریخیں مرتب کیں اور بڑا سرمایہ پیدا کر دیا۔ اور یہی سرمایہ تاریخی پہلے دقیقی کے شاہنامہ قدیم کے لیے پھر فردوسی کے شاہنامہ مشہور کا بنیادی مصدر

www.shibliacademy.org

وماخذ بنا۔ پروفیسر براؤن پر اس شعر ناشناسی کے لیے نقد کیا ہے جو انہوں نے فردوسی کے شاہنامہ پر خامہ فرسائی کے دوران دکھائی ہے۔ (شعر العجم ۱۰۲/۱ وما بعد: یہ طویل بحث ہے لیکن عرب خلفاء وامراء اوران کے اہل علم کی بازیافت تہذیب ایران کی مساعی کا عظیم مرقع ہے۔ براؤن کا تبصرہ ہے کہ ''فردوسی کے بعد جو شعراء پیدا ہوئے وہ شاعرانہ خیالات اور شوکت الفاظ دونوں حیثیت سے فردوسی سے بالاتر ہیں''۔ ''فردوسی کے کمال شاعری کے منکر'' کے جواب میں شبلی نے صرف ایک فارسی شعر نقل کردیا ہے جو رگِ جان کے لیے نشتر ہی ہے۔ شعر العجم ۱۲۳/۱۔ فردوسی کے بارے میں شبلی کا ایک چبھتا ہوا تبصرہ ہے: ''......فردوسی کا ماخذ زیادہ تر ایران کی وہ تاریخیں ہیں جو عربی میں ترجمہ ہوگئی تھیں لیکن فردوسی کا قومی غرور عرب کے احسان کو گوارہ نہیں کرتا''۔ ۱۰۸/۱۔ شعر العجم میں ایسے تبصرے بہت ہیں)

تاریخ نویسی کی حرکیت وارتقاء: انسانی تہذیب وتمدن کے تسلسل وارتقاء سے گہری واقفیت کے سبب شبلی مختلف زمانوں کے مذاق سے بھی آگاہ تھے۔ اسی بنا پر وہ یہ بھی برملا اعتراف کرتے ہیں کہ ''اس سے میرا یہ مقصد نہیں کہ اگلے مصنفوں کی کوشش پر نکتہ چینی کروں، ان لوگوں نے جو کچھ کیا موجودہ اور آیندہ نسلیں ہمیشہ اس کی ممنون رہیں گی لیکن زمانہ کا ہر قدم آگے ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ترقی کی جو حد کل مقرر ہوچکی تھی آج بھی قائم رہے گی۔ اس کے علاوہ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ ہر زمانہ کا مذاق مختلف ہوتا ہے۔ جن باتوں کو قدما نے اس خیال سے نظر انداز کردیا کہ یہ جزئی اور عام معمولی باتیں تصنیف کی متانت کے شایان نہیں آج انہی کی تلاش ہے کہ اس عہد کی عام معاشرت اور طرز زندگی کا ان سے اندازہ کیا جائے ......'' شبلی نے المامون کے دوسرے حصہ میں اسی کو اپنایا ہے۔ (المامون، ۱۱)

المامون، سیرۃ النعمان، الغزالی، الفاروق حتی کہ سیرۃ النبیؐ میں بھی شبلی نے تاریخ نویسی کی حرکیت وارتقاء سے بحث کی ہے۔ ان تمام تصانیف کے حصہ اول میں ان کے اشارات وبیانات بہت واضح ہیں اور دوسرے حصہ میں ان کا ذکر یا اثر ملتا ہے۔ قدیم مآخذ وصاحبان فکر میں شبلی نے مورخ مسعودی اور امام فلسفہ تاریخ ابن خلدون کو تاریخ کے مدام حرکی اور ترقی پذیر ہونے کا پارکھ بتایا ہے لیکن ان کا زیادہ سے زیادہ خراج تحسین جدید یورپی تحقیقات اور مغرب کے تاریخی ارتقاء کو

www.shibliacademy.org

پیش کیا جاتا ہے کہ جدید تاریخ نگاری کے وہی بانی ہیں۔ قدیم مآخذ و مصادر کی خامیوں پر بحث میں شبلی نے اپنے تتبع و تحقیق کا ذکر بہت فخر و ناز سے کیا ہے اور اس کا سہرا جدید اصول کے سر باندھا ہے۔ شبلی کا یہ اعتراف حق ہے۔ خاص طور سے اصول سیرت نگاری اور قواعد تاریخ نویسی میں شبلی نے ان ''غیروں'' سے بہت کچھ سیکھا اور اپنی کتابوں کی تالیف میں ان کو برتا۔ اس احسان وعطیہ کا ذکر شبلی بار بار کرتے ہیں۔ اسے شبلیات کے حوالے سے دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ شبلی نے نہ صرف تاریخ نویسی کی حرکیت مسلسل اور ارتقائے پیہم کو آگے بڑھایا ہے بلکہ اپنے معاصروں اور جانشینوں کو سبق بھی سکھایا ہے۔ مورخ مسعودی اور فلسفی مورخ ابن خلدون کے فلسفہ تاریخ اور اصول تاریخ وتہذیب سے اکتساب فیض کا اعتراف مغربی علماء کو بھی ہے۔ ان جدید اصول تاریخ نویسی اور سیرت نویسی سے بالعموم مشرقی اور روایتی اہل قلم اعتنا نہیں کرتے جس کے سبب وہ تجزیہ وتحلیل سے عاری رہ جاتے ہیں۔

جدید تاریخی اصول کا ارتقاء: شبلی کا تاریخی شعور اور حرکیت تاریخ کا ادراک بڑا پختہ تھا اگر چہ وہ تربیت کے لحاظ سے مورخ نہ تھے۔ قدیم مصادر اور جدید یورپی تحقیقات دونوں پر ان کی گہری نظر تھی اور اسی نے ان کو تاریخ نگاری کی بے مثال بصیرت بخشی تھی۔ وہ امام تاریخ وسماجیات ابن خلدون کا زیادہ نام تو نہیں لیتے لیکن وہ ان کی تاریخی فکر اور سماجی تجزیے سے پوری طرح متاثر تھے۔ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ ''تاریخ عالم کا ہر واقعہ بہت سے مختلف واقعات کے سلسلے میں بندھا ہے، ان ہی ریشہ دوانیوں کا پتہ لگانا اور ان سے فلسفیانہ نکتہ سنجی کے ساتھ تاریخی نتائج مستنبط کرنا یہی چیز ہے جو علم تاریخ کی جان اور روح ہے اور یورپ کو اس فن کے متعلق جس اختراع وایجاد پر زیادہ تر ناز ہے، وہ اسی طلسم کی پردہ کشائی ہے......''۔ (المامون، ۱۱)

سبب ومسبب کا پتہ لگانا اور علت ومعلول کا سلسلہ سمجھنا اور سمجھانا فکر شبلی کا ایک بہت پسندیدہ اصول تاریخ ہے۔ المامون، الغزالی، الفاروق اور سیرۃ النبیؐ میں اور بعض دوسری تاریخی کتب وسوانح میں بھی وہ اس پر خاصی بحث کرتے ہیں۔ مورخ کے فرائض میں وہ ایک جگہ اس کا بنیادی فرض یہ بتاتے ہیں کہ وہ سادہ واقعہ نگاری کرے اور اس میں فلسفہ وفکر کی آمیزش نہ کرے مگر اسی کے ساتھ وہ مختلف مآخذ کی مختلف اور متصادم روایات واخبار میں تجزیہ وتحلیل اور تتبع وتحقیق کا

www.shibliacademy.org

بھی اصول اپنانے کو کہتے ہیں۔ کیونکہ ان کے بغیر مواد سے تاریخی استنباط نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی شخصیت و سیرت کی تعمیر اور عہد و تہذیب کی بازیافت کی جا سکتی ہے۔ شبلی اسی بنا پر تمام دستیاب مآخذ کی روایات و اخبار کے تفحص و تلاش کو بھی جدید تاریخی اصول میں شمار کرتے ہیں اور اہم سمجھتے ہیں۔ صرف تاریخی مصادر و مآخذ پر اسی بنا پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ متعدد دوسرے مآخذ و کتب سے بھی مواد لیتے ہیں جو تہذیب و تمدن کے لیے ضروری ہیں۔ الفاروق میں مآخذ و مصادر پر ان کی مدلل بحث نے بالآخر سیرۃ النبیؐ کے عظیم مقدمۂ تاریخ کی شکل میں ارتقاء کیا جواب تک غیر معمولی ہے۔ ان جدید اصول تاریخ کے لحاظ سے شبلی نے سوانح کی تصانیف میں حصہ اول میں بھی فائدہ اٹھایا ہے اور دوسرے حصے تو انہیں پر مبنی ہیں۔ ان میں قرآن و حدیث، فقہ و کلام، شعر و ادب اور متعدد دوسرے علوم اسلامی کے ضروری مواد کو تجزیہ و تحلیل سے گزارا ہے۔

شبلی حوالۂ کتب کے متعدد طریق: مآخذ و مصادر کے حوالے اور کبھی کبھی اقتباسات اور ان کے تراجم دینے کے مختلف طریقے شبلی نے اختیار کیے ہیں۔ ان کے زمانے اور مذاق کے لحاظ سے وہ جدید ترین نظام حوالہ (Reference System) ہے اور خاصا قابل تقلید ہے۔ ان کا ایک عام طریق متن میں مآخذ و مولفین کا مجموعی حوالہ دینے کا طریقہ ہے کہ مورخین، تذکرہ نگار، محدثین کا بیان ہے۔ دوسرا خاص طریق حوالہ ہے جس کے مطابق وہ متن میں شروع یا درمیان پیراگراف میں کسی ایک یا زیادہ مآخذ کا نام لیتے ہیں۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ متن میں اپنی زبان میں پورا بیان، واقعہ یا معاملہ لکھ جاتے ہیں اور حاشیہ میں اس کا ایک یا زیادہ مآخذ بتاتے ہیں۔ چوتھے طریقۂ شبلی میں متن و حواشی دونوں کے بیانات اور اقتباسات میں وہ مآخذ و مولفین پر نقد و تبصرہ کرتے ہیں۔ اس نظام حوالہ کی مثالیں ان کی تمام کتابوں میں موجود ہیں اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ ان سے پورا حوالہ مآخذ چھوٹ گیا تو ان کے جامع سید سلیمان ندوی نے یا دوسرے مرتبین و ناشرین نے اس کا اضافہ کر دیا اور اس اضافہ کی تصریح بھی کر دی۔ بہرحال بہت سے ایسے مقامات آہ و فغاں بھی ہیں جہاں شبلی اور ان کے جامعین و ناشرین نے حوالہ نہیں دیا اور دیا تو ناقص دیا۔ (المامون: متن میں حوالہ ماخذ: ۲۵: اصمعی نے لکھا، متن و حواشی میں ایسے حوالوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ہر کتاب میں ہے۔ حوالے ندارد: ۳۷-۵۹ و مابعد: متعدد ابواب وفصول

www.shibliacademy.org

میں ماٰخذ کے حوالے متن میں ہیں نہ حواشی میں)

(سیرۃ النعمان ۴۰-۴۱ وما بعد میں امام ابوحنیفہؒ کے حضرات باقر و جعفر صادق کے شاگرد ہونے پر بحث تیز و تند میں کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ الغزالی، الفاروق اور سیرۃ میں بھی متون اور حواشی میں حوالے موجود ہیں اور بہت سے مقامات پر ندارد ہیں۔ یہی دوسری کتب کا حال ہے)

شبلی کے نظام حوالہ میں ایک دلچسپ جہت یہ بھی ہے کہ وہ دو یا دو سے زیادہ ماٰخذ کی معلومات کا تقابل بھی کرتے جاتے ہیں مثلاً ہارون الرشید عباسی نے اپنے تینوں فرزندوں میں سلطنت کی تقسیم سے متعلق جو معاہدہ لکھا تھا اس کا متن ملتا ہے۔ شبلی نے لکھا ہے کہ ''ازرقی نے اپنی تاریخ مکہ میں ان دونوں معاہدوں کو بتمامہا نقل کیا ہے جبکہ یعقوبی نے اپنی تاریخ میں قدرے اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے''۔ (المامون، ۳۱، حاشیہ ۱) شبلی کا ایک اور دلچسپ تقابلی حوالہ ہے کہ ''مصنف عیوان والحدائق، کامل، ابن خلدون، ابوالفداء کسی نے نہیں کہا کہ طاہر کیوں کر مرا مگر عربی مورخین کی یہ عام عادت ہے کہ وہ واقعات کو بالکل سادہ لکھتے ہیں اور اس بات سے بحث نہیں کرتے۔ صرف ابن خلکان ایک شخص ہے جس نے اس واقعہ کی پوری تفصیل لکھی ہے اور چونکہ اس نے نہایت معتبر تاریخ کا یعنی ہارون بن عباس بن مامون الرشید کی تاریخ کا حوالہ دیا ہے میں نے اس موقع پر جو کچھ لکھا ہے اسی سے لکھا ہے''۔ (المامون، ۹۰-۹۱)

شخص وعہد کی بازیافت میں تجزیاتی مطالعۂ مصادر: شخصی سیرت ہو یا عہد کی بازیافت یا تہذیبی و معاشرتی زندگی کی تصویرکشی قدیم ماٰخذ بقول شبلی بالکل غیر مفید ہیں۔ البتہ ان کی روایات و اخبار اور معلومات کی بنا پر تحلیل و تجزیہ کے ذریعہ ان سے استفادہ کیا جاسکتا ہے اور بالعموم کیا بھی گیا ہے۔ شبلی نے جدید فن سیرت و تاریخ کے ارتقاء اور یورپی طریق تجزیہ و نگارش کے اس باب خاص میں کارسازی کے قائل ہیں۔ ان جدید اصول تاریخ نگاری کی رہنمائی میں اور اپنی تجزیاتی و تنقیدی فکر کی ہدایت میں انہوں نے سیرت و سوانح میں دوسرا باب لکھا ہے۔ اول باب میں جہاں سیدھی اور سادی سوانح لکھنے کا معاملہ ہے وہ قدیم ماٰخذ کی روایات کو خاصا مفید پاتے ہیں کہ وہ اصل معلومات ہیں۔ دوسرے باب میں وہ قدیم تواریخ و مصادر کی خامیاں پاتے ہیں اور ان کے ذکر میں انہوں نے اپنی دقتوں کا بھی بیان پیش کیا ہے۔ اپنی تمام کتابوں میں وہ

www.shibliacademy.org

تہذیب و معاشرت کے باب دوم میں بالخصوص اور سوانح و واقعات کے باب اول میں بالعموم اپنے طریق کا ذکر کرتے ہیں۔

المامون کے بارے میں رقم طراز ہیں: ''......میں نے اس کتاب کے دو حصے کیے، پہلے حصہ میں وہی معمولی واقعات ہیں جو عموماً تاریخوں میں مل سکتے ہیں یعنی مامون کی ولادت، ولی عہدی، تخت نشینی، خانہ جنگیاں، بغاوتیں، فتوحات ملکی اور وفات۔ دوسرے حصہ میں ان مراتب کی تفصیل ہے جن سے مامون کے پولیٹکل انتظامات اور سوشل حالات کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے۔ اگرچہ اس خاص حصہ کی ترتیب کے وقت واقعات کی تلاش و جستجو میں، میں خاص تاریخی تصنیفات کا پابند نہ تھا، تراجم، طبقات، مقامی جغرافیے، سفرنامے، نقشہ جات غرض جہاں سے جو بات ملی اخذ کی، تاہم اس بات کی سخت احتیاط کی کہ جو کچھ لکھا جائے نہایت صحیح اور مستند تاریخی روایتوں سے لکھا جائے......''۔ المامون کے دوسرے حصہ کی تمہید میں قدیم مورخوں کی خامیوں کا شکوہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ دوسری قسم کے حالات کے لیے بھی گو مجھ کو ہزاروں ورق الٹنے پڑے ہیں لیکن جو سرمایہ جمع ہوگیا ہے میں اس کو بہر حال کافی خیال کرتا ہوں اور قدماء کا مشکور ہوں کہ جو کچھ ہے ان ہی کا ہے...... یہ حضرات ریزہ چینی اور مختلف پریشان اور گمنام موقعوں سے پتہ لگانے کی محنت پھر بھی میرے لیے چھوڑ گئے''۔ (المامون، ۱۱، اور ۱۲۴-۱۲۵)

اصلاً تاریخ، تہذیب و معاشرت کی بازیافت و تعمیر کا کام مورخ کو اپنے تجزیاتی مطالعہ مصادر سے کرنا ہوتا ہے۔ شبلی نے المامون سے سیرۃ النبیؐ تک کے مراحل تصنیف میں اس سے بے مثال اور جرأت مندانہ کام لیا اور روایت پرستوں کے ہدف بنے۔ حالانکہ ان ناقدوں اور شبلی شکنوں نے بھی ان کے طریق تحقیق و نگارش سے فائدہ اٹھایا مگر محسن کی احسان شناسی سے گریز کیا۔ الغزالی میں دونوں مباحث یا اجزائے کتاب میں شبلی نے تجزیاتی و تنقیدی مطالعہ مصادر سے بخوبی کام لیا اور مجموعی تجزیاتی مطالعہ پیش کیا۔ سوانح و حالات غزالی میں مختلف مصادر سے معلومات ہی جمع نہیں کیں بلکہ ان کے اختلاف و تنوع کو تطبیق بھی دی یا ان کی تنقید و تصحیح بھی کی۔ حصہ دوم میں امام موصوف کی تصنیفات ان میں اصل اور منسوب تالیفات کی بحث اور ان کی خصوصیات اور ان کے افکار کے ابواب اسی تجزیہ پر مبنی ہیں۔ ان میں تجزیہ و تتبع کے ساتھ مصادر و مآخذ کی

www.shibliacademy.org

وسعت کا بھی دخل خاص ہے کہ وہ تاریخی کتب کے علاوہ دوسرے علوم اسلامی کے مآخذ ہیں۔ (الغزالی، ۱-۳۰، ۳۱ تا اواخر، بالخصوص ۱۲، ۱۷ وغیرہ اوران کے حواشی، ۴۸ و مابعد احیاء العلوم کی خصوصیات وغیرہ)

سیرۃ النعمان میں بھی شبلی نے اسی طرح اول و دوم حصوں کا فرق بتایا ہے کہ اول امام ابوحنیفہؒ کے عام حالات ان ہی تصنیفات سے ماخوذ ہیں لیکن دوسرا حصہ جس میں امام صاحب کے طرز اجتہاد و اصول استنباط پر بحث ہے، اس کے لیے یہ تمام دفتر بیکار تھا...... انہوں نے مناظرہ اور نقد کی کتابوں سے مدد لی ہے۔ ''باقی میرا تتبع اور تحقیق ہے جس کے لیے خوش قسمتی سے حدیث وفقہ کا بڑا ذخیرہ میرے پاس مہیا تھا''۔ اس کے بعد اپنا طرز تحقیق و نگارش بیان کیا ہے۔ تمہید کے علاوہ دوسرے حصہ میں بالخصوص اور اول حصہ میں بالعموم مصادر کا تجزیاتی مطالعہ موجود ہے۔ (سیرۃ النعمان، ۱۱-۱۳، مثلاً امام صاحب کے جد امجد زوطی بن ماہ کے غلام نہ ہونے پر بحث: ۱۴-۱۷؛ صحابہ سے امام کی روایت نہ لینے کی بحث: ۱۸-۲۲؛ امام موصوف کی تابعیت پر بحث؛ حضرت امام کے اکتساب علوم حدیث وفقہ اور شیوخ وغیرہ پر بحث)

الفاروق اور سیرۃ النبیؐ دونوں میں اسی طرح اول و دوم حصے ہیں جو بالترتیب سادہ واقعات اور بازیافت عہد پر مبنی ہیں۔ الفاروق میں فتوحات کے اسباب و نتائج کے تجزیہ، ملکی، مالی اور فوجی انتظامات کے علاوہ اخلاق و کمالات پر بحث میں مصادر کا تجزیہ کیا ہے۔ سیرۃ النبیؐ کی اول و دوم جلدوں میں یہی طریق تفحص و تحقیق اختیار کیا ہے اور واقعات کے تجزیہ اور سیرت و کردار کی تعمیر میں تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔ ان دونوں عظیم ترین شاہکاروں کے اول حصہ میں بھی شبلی کا تجزیاتی مطالعہ مصادر اور تنقید معلومات واخبار کے بہت سے نقوش ہیں۔ سیرۃ النبیؐ کی جلد دوم کے مباحث اسلام کی امن کی زندگی، وفود عرب، عبادات، معاملات، متروکات، شمائل، معمولات وغیرہ زیادہ مآخذ کے تجزیہ پر مبنی ہیں۔ (الفاروق، ۱-۲۰۲، اور ۲ تا آخر: فتوحات پر ایک اجمالی نگاہ، نظام حکومت کے مختلف صیغے، تعلیم و دینی کام، امامت واجتہاد وغیرہ؛ سیرۃ النبیؐ ۱/۱۰۷-۱۹۹ و مابعد؛ ۲/۱-۱۲۹ و مابعد: تاسیس و تکمیل شریعت کے ابواب ۱۰۰-۱۵۰، معمولات و مجالس وغیرہ ۲۱۲-۲۳۵)

کلمات تنقید و تبصرہ: یہ عجیب و غریب حقیقت اور طرفہ تماشائے تحقیق ہے کہ اصول سازی

www.shibliacademy.org

جتنی آسان و عام ہے ان کا اطلاق اتنا ہی مشکل، فلسفہ تاریخ وسماجیات کے امام ابن خلدون اپنے مقدمۂ تاریخ میں اصول وقواعد نگاری کے لیے ہر دور میں مقبول، محترم اور ممدوح رہے، لیکن اسلام کی تاریخ نگاری میں ان کو برت نہ سکے اور بلانقد و تجزیہ نگارش واقعات وسوانح کی بنا پر مورد الزام ہی بنے۔ ان سے فروتر تاریخ نگاروں نے ان سے پہلے کے ادوار میں بھی اور بعد کے زمانوں میں بھی خلاف اصول نگاری کے مجرم قرار دیے گئے۔ مورخ مسعودی کی تعریف وتحسین امام ابن خلدون نے بھی کی ہے اور دوسرے تجزیہ نگاروں اور ناقدوں کے ساتھ شبلی نے بھی کی ہے۔ مگر ان پر بھی امام فلسفہ تاریخ کی شدید تنقیدیں ملتی ہیں اور ان کے سوا دوسرے امامانِ تاریخ طبری، یعقوبی وغیرہ بھی ہدف دشنام ہیں۔ شبلی پر بھی ان کے وضع کردہ اصول وقواعد تاریخ نگاری کی خلاف ورزی کرنے کی بنا پر بھی اور دوسری تسامحات کی بنا پر بھی نقد ہوا ہے۔ (ابن خلدون، مقدمہ، مطبع مصطفیٰ محمد مصر، غیر مورخہ، ۳-۵ ومابعد نیز مقدمہ فی فضل علم التاریخ الخ اور اس کی متعدد فصول ۹-۳۵)

نقد شبلی کی ایک صورت شبلی شکنی کی ہے جو شخصی دشمنی اور اداری ومسلکی عصبیت کی مکروہ وجوہ سے کی گئی ہے۔ دوسری خالص علمی تنقید اور تحقیق تصحیح ہے جس کو دستاویز درست کرنے کے فقرہ سے یاد کیا جاسکتا ہے کہ اخلاص وانصاف پر مبنی ہے۔ شبلی کی تمام نگارشات علمی پر نقد ہوا ہے اور اسلامی تاریخ وعبقریات کی سوانح کے حوالے سے اس میں بوجوہ شدت بھی آئی ہے۔ مآخذ و مصادر کے مطالعہ اور تحقیق میں شبلی نے بے مثال بصیرت اور عمیق دقت نظر اور وسیع فکر وتحقیق کا قدم قدم پر ثبوت دیا ہے۔ بلاشبہ شبلی نے اپنی تاریخی نگارشات خاص کر الفاروق اور سیرۃ النبیؐ میں مصادر و مآخذ سے ہزاروں صفحات کا عطر کشید کیا ہے۔ معلومات کے علاوہ تحقیق وتفتیش کی ایک عظیم الشان روایت کا مینارہ تعمیر کیا ہے جس کی چوٹی پر وہ اور اس کے سایے میں ناقدین کھڑے نظر آتے ہیں۔ مآخذ ومصادر کی درجہ بندی، ان کی تنقیدی وتحقیقی حیثیت، ان کی علمی وفنی قدر و قیمت اور ان کی بنیادی وثانوی حیثیت کا پتہ لگایا ہے۔ معلومات وروایات کی تنقیح وتحلیل کر کے ان سے شخص وسیرت، سوانح وعہد کی تصویر کشی کرنے میں کمال کا کارنامہ انجام دیا ہے۔ جدید عہد میں ان کا عظیم ترین اور رجحان وشخصیات ساز کارنامہ یہ ہے کہ وہ ریزہ ریزہ معلومات جمع کر کے

www.shibliacademy.org

ان کا تجزیہ کرتے ہیں اور اسلاف و عبقریات کی شخصیت و کردار کو منور کرتے اور عہد کی تہذیب و تمدن اور معاشرت و حیات کو از سر نو زندہ کر کے دکھلا دیتے ہیں۔

تسامحات شبلی میں ان کے قائم کردہ اصول وضوابط کے مطابق ان کے اپنے فطری رجحان اور عہد کے مذاق کا دخل اہم تر ہے۔ وہ شخصی طور سے طرف دار حضرت امیر علیہ السلام اور ثناخوانِ خاندان امیر تھے اور ان کے ماحول اور عہد کا وہ عام و محبوب مذاق بھی تھا۔ معروف خاندان اہل بیت کی محبت و طرف داری میں وہ بھی اموی خلافت اور اموی عبقریات و خلفاء کے مخالف و دشمن بھی تھے۔ خلفائے راشدین میں شامل اموی خلیفہ سوم حضرت عثمان بن عفانؓ کے باب میں بھی وہ طرف داری و جانب داری سے زیادہ مخالفت میں بہہ گئے۔ اموی خلفاء اور حکمراں طبقہ کے ساتھ ساتھ ان کے خواص، علماء اور دوسرے اسلامی معالم حتی کہ علوم وفنون کے ساتھ بھی انصاف نہ کر سکے۔ ایسی تمام روایات و اخبار اور آثار و انوار انہوں نے بلا تکلف نظر انداز کر دیں جو اموی خلافت و خلفاء و امراء کی حسنات پیش کرتی ہیں۔ وہ مصادر و مآخذ کی ان گنت روایات کا تجزیہ و تنقیدی مطالعہ نہیں کر سکے جو معتبر و مستند کتب حدیث و سیرت سے بھی مستند ہوتی ہیں۔ شبلی نے الفاروق میں حضرت عمر بن خطاب عدویؓ اور خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق تیمیؓ کی حد تک ضرور معاندین خلافت کا مقابلہ کیا مگر خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ اور بعد کے اموی خلفاء کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر، نگارش اور مطالعہ مصادر خالص غیر تحقیقی ہے۔ المامون میں حضرت عثمانؓ کی خلافت کے انتخاب پر وہ حضرت امیر کی محبت کا مظاہرہ جس طرح کرتے ہیں وہ تمام مصادر کے اتفاق و اجماع کے خلاف خالص غیر تاریخی ہے۔ خلفائے اسلام میں خلفائے راشدین اربعہ کے علاوہ وہ دوسرے تمام اموی خلفاء، عباسی خلفاء اور ان کے اعیان دولت کے بارے میں اپنے جانب دارانہ زاویۂ نگاہ کے پابند ہونے کے سبب ان کے باب میں انصاف نہیں کر سکے اور نہ ان کے لیے احترام کا صیغہ استعمال کر سکے۔ وہ خود فقر و زہد اور تصوف و رہبانیت کے ایسے قائل نہ تھے مگر ان کے تقویٰ وطہارت کے جبر میں خلفاء و امراء کو محض دنیا دار سمجھتے تھے۔ بلا شبہ اموی خلفاء و امراء اور ان کے عباسی جانشین صحابی خلفائے راشدین کی مانند نہ تھے مگر وہ عظیم اسلامی حکمراں تھے جن کا بدل نہ مل سکا۔ سیرۃ النعمان میں ان کا ایک بیان کس قدر خطرناک غیر تاریخی ہے اس کا

www.shibliacademy.org

انداز ہ اس کو غور سے پڑھنے اور اس کے نتائج سمجھنے سے ہوتا ہے۔‘‘......امام ابوحنیفہ لاکھ مجتہد اور فقیہ ہوں لیکن فضل و کمال میں ان کو حضرت جعفر صادق سے کیا نسبت؟ حدیث وفقہ بلکہ تمام مذہبی علوم اہل بیت کے گھر سے نکلے......‘‘۔شبلی نے امام ابن تیمیہ پر گستاخی اور خیرہ چشمی کا الزام صرف اس لیے لگا دیا کہ وہ امام ابوحنیفہ کے حضرت جعفر صادق کے شاگرد ہونے کی روایات کو مسترد کرتے تھے۔خود شبلی نے جعفر صادق اور ان کے والد ماجد کی استاذی کے بارے میں کوئی حوالۂ ماخذ نہیں دیا۔اگرچہ شبلی خلافت پر استحقاقِ آل ابی طالب کے نظریے کے قائل نہ تھے تاہم وہ اموی وعباسی خلفائے کرام کے مقابلے میں ان کی فضیلت و امامت اور استحقاق کے قائل ضرور تھے اور اس خیال خام کے لیے وہ تمام مصادر کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

عام مصادر و مآخذ کی روایات واخبار میں بھی شبلی بسا اوقات عمومی آراء اور مشہور نظریات میں بہہ جاتے ہیں۔امام سیرت محمد بن عمر واقدی کی شخصیت و کردار اور ان کی عطایائے تاریخ کے بارے میں شبلی کا نقطۂ نظر عامیانہ ہے۔مآخذ ومصادر کی بہت سی روایات واخبار ان کو اپنے زمانے کا ’’امیر المومنین فی الحدیث‘‘ اور امام وقدوۂ سیرت وتاریخ بتاتے ہیں۔متعدد محدثین اور بہت سے مورخین وعلماء نے ان کی تصحیح ،تعریف وتحسین ہی نہیں کی ان کی روایات واخبار سیرت کو معتبر سمجھا ہے۔شبلی نے ان کو محض اس لیے مورد دشنام بنایا کہ متعدد محدثین اور ناقدین فن رجال نے ان کے بارے میں جرح کی ہے جسے شبلی نے محدثین کا ’’بالاتفاق فیصلہ‘‘ بتا دیا ہے۔ان کا دوسرا الزام یہ ہے کہ امام واقدی جزئیات بیان کرتے ہیں جو چشم دید رواۃ بھی نہیں بیان کر سکتے۔ حالانکہ یہی جزئیات نگاری دوسروں کے ہاں بھی ہے، دوسرے جزئیات و روایات کی تائید و توثیق مسند احمد بن حنبل جیسی کتب سے بھی ہوتی ہے۔مصادر سیرت وتاریخ میں خاص کر الفاروق وسیرۃ النبیؐ میں شبلی دوسروں کی طرح ناقدین اور علمائے رجال پر تکیہ کلی کرتے ہیں۔امام ابن خلدون نے مورخ مسعودی کی تعریف وتحسین کے ساتھ ان کی کتابوں میں بھی اغلاط کا سراغ لگایا ہے اور واقدی کے ساتھ رکھا ہے جبکہ شبلی ان کے مداح ہیں۔وہ بالعموم مصادر کی متنی تحقیق وتفتیش نہیں کرتے اور کرتے ہیں تو صرف جزوی طور سے جب وہ کسی واقعہ پر بحث کرنا چاہتے ہیں۔متنی تحقیق مصادر میں ان جیسے عظیم محقق وجستجو نگار کا سب سے بڑا تسامح وہاں نظر آتا ہے جہاں وہ

www.shibliacademy.org

اصل مولفین کی تنقید و تضعیف کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مثلاً امام ابن اسحاق و امام ابن ہشام نے سیرۃ نبوی میں متعدد روایات و اخبار کو مجروح وضعیف یا غیر معتبر بتایا ہے، مگر شبلی ان کو صحیح روایات و اخبار سمجھ کر نقل کرتے ہیں اور ان کی بنا پر شخص، سیرت، کردار اور عہد کی غلط تصویر کشی کرتے ہیں۔ بنو امیہ اور بنو ہاشم کے درمیان خاندانی رقابت اور قبائلی عصبیت کا عامیانہ نظریہ قبول کر کے جاہلی، نبوی اور اسلامی ادوار میں واقعات بیان کرتے ہیں جن میں اموی اسلام دشمنی اور ہاشمی عداوت کی کہانیاں ملتی ہیں اور دونوں کے باب میں صحیح و معتبر روایات نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اموی خلفاء کے علماء و محدثین پر مظالم خاص کر امام ابو حنیفہؒ و امام مالکؒ پر زیادتیوں کا سلسلہ عباسی خلفاء تک دراز کیا ہے جو بلا نقد ہے۔ بسا اوقات وہ اپنے ممدوح کی تعریف میں ادھوری روایت قبول کر لیتے ہیں اور اس کی تصحیح نہیں کرتے جیسے صرف تین خلفائے اسلام کے حافظ قرآن ہونے کی روایت سیوطی۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے ناقدین خاص کر قاضی ابن ابی لیلیٰ کے اختلاف میں وہ بالعموم اپنے ممدوح کی طرفداری میں غلط رخ اپناتے ہیں کہ ان کا اختلاف تعبیر و تشریح مآخذ کا تھا، اظہار حق و اصرار بر باطل کا نہ تھا۔ ایسی مثالیں بہت ہیں جن میں تجزیہ نہیں کیا گیا۔

فقیہ و غیر فقیہ صحابہ و تابعین اور عمر دراز و نوجوان صحابہ و رواۃ میں شبلی فرق کرتے ہیں اور راہِ اعتدال سے ہٹ جاتے ہیں۔ اس میں سب سے زیادہ مراسیل صحابہ کی بحث میں شبلی کا موقف زیر بحث آتا ہے جو جمہور علماء و محدثین کے موقف سے اکثر الگ ہوتا ہے۔ شبلی نے الفاروق، سیرۃ النبیؐ اور سیرۃ النعمان وغیرہ میں متعدد مقامات پر اپنے زور بیان و جوش استدلال کا مظاہرہ کیا ہے۔ موخر الذکر میں رفع یدین اور ترک رفع یدین کی بحث میں بالترتیب حضرات عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ کی احادیث کے اختلاف پر حضرت ابن عمرؓ کی روایت و حدیث کو محض ان کی نوخیز جوانی کے سبب مسترد کر دینا بڑی زیادتی ہے کہ وہ سنن نبوی کے عظیم ترین عالم تھے۔ شبلی کی نظر سے اصل معاملہ اوجھل رہا کہ دونوں احادیث صحیح ہیں اور دونوں سنتیں ہیں اور وہ سنتوں کے تنوع کا معاملہ ہے۔ حدیث قرطاس میں بھی ان کا حضرت ابن عباسؓ پر نقد ان کی کم عمری اور غیر موجودگی کی بنا پر اسی طرح قابل گرفت ہے اگرچہ ان کا موقف صحیح ہے لیکن کمسن صحابہ کی روایات میں ضعف کے احتمال کا نظریہ شبلی کسی طرح قابل قبول نہیں جیسا کہ وہ سیرۃ

www.shibliacademy.org

النعمان وسیرۃ النبی وغیرہ میں لکھتے ہیں۔ کمزور روایات کی حلیۃ الاولیاء جیسی کتابوں میں کثرت کا سبب محض گرمی محفل نہ تھی جیسا کہ شبلی استدلال ہے، وہ اصلاً قصاص کا طرز تھا، قصہ گویوں کے علاوہ صوفی اہل قلم پر تصوف کی کراماتی تاثیر اور چھاپ کا اثر تھا۔ نقد روایات سے کمزور روایات کم ضرور ہو جاتی ہیں لیکن اصلاً صحیح روایات واحادیث کا التزام صحت کا معیار بلند کرتا ہے۔ بخاری و مسلم میں فرق مراتب کا نظریہ شبلی شخصی عطیہ ہے، شاہ ولی اللہ موطا کو اصل کتاب سمجھتے ہیں۔

آخذ و مصادر کے مباحث میں اوران کی روایات واخبار کے قبول ورد میں اوران کے تجزیہ وتحلیل میں شبلی بہرحال عبقری ہیں۔ ان کے تسامحات وتعبیرات اور بعض خامیوں کے باوجود شبلی نے مآخذ و مصادر اسلامی کا ناقدانہ تجزیہ اور استعمال کیا ہے۔ مختلف مصادر سے خاص کر دوسرے فنون وعلوم کے مصادر سے متعلقہ روایات واخبار چن لینا اوران کا موقع ومحل پر استعمال کرنا ان کا عظیم ترین کارنامہ ہے۔ مصادر اوران کی روایات کا اس طرح جمع کرنا اوران کا تجزیہ وتحلیل کرنا اور ضروری کو لینا ان کے معاصروں کو تو کیا ان کے بیشتر جانشینوں اور خوشہ چینیوں کو بھی نہیں معلوم ہے۔ ان کا سب سے عظیم وقابل تقلید وصف روایات واخبار کے تجزیہ کرکے شخص وسیرت اور عہد و زمانے کی بازیافت ہے۔ اس کا بھرپور مظاہرہ انہوں نے اپنی تاریخی تالیفات کے دوسرے حصہ میں کیا ہے۔ وہ صرف اس بنا پر ممکن ہوا کہ انہوں نے جدید مغربی اصول تاریخ نگاری سے بھرپور استفادہ کیا اوران کو اسلامی تاریخ نگاری کے اصول سے آمیخت کرکے تاریخ نگاری کا وہ معتدل و متوازن چلن نکالا جو قدیم وجدید کا جامع ہے اور تاریخ کی صحیح تعبیر پیش کرتا ہے۔ اس میں واقعات کے سلسلے کا ایک دوسرے سے ارتباط کا نظریہ شبلی اوران میں علت ومعلول، سبب ومسبب کا تفاعل خاص ہے۔ امام طبری کو شبلی نے کئی مقامات پر محدث طبری بجا طور سے کہا ہے اوران کی حدیث و تاریخ کی اجتماعیت نے ان کو واقعات کے اسباب کا ذکر کرنے کا طریقہ بخشا تھا۔ شبلی نے متاخرین میں ابن کثیر وغیرہ کا ذکر نہیں کیا اور نہ ان کے کارنامے کا کہ وہ حدیث وتاریخ کے مصادر کو جمع کرتے ہیں۔ بہرحال ان جامع کتب حدیث وسیرت وتاریخ اوران سے زیادہ ابن خلدون وشاہ ولی اللہ کے فلسفۂ تاریخ نے ان کو جدید دور میں تجزیاتی مطالعہ کا امام بنا دیا ہے۔

www.shibliacademy.org

علامہ شبلی نعمانیؒ اور علم حدیث

ڈاکٹر تقی الدین ندوی

ہندوستان میں علم حدیث کا مقام حضرت شاہ ولی اللہؒ (ت ۱۱۷۶ھ) کے بعد اتنا بلند ہو گیا تھا کہ کوئی دوسرا اسلامی ملک اس کی ہم سری کا دعویٰ نہیں کر سکتا، حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بعد ان کے صاحبزادگان اور شاگردوں نے ان کے سلسلہ کو جاری رکھا اور آگے بڑھایا اور خاص طور سے ان کے صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے اپنے شاگردوں کی بڑی جماعت چھوڑی، جن میں حضرت شاہ محمد اسحاق صاحبؒ محدث دہلوی کو درس حدیث میں اپنا جانشیں بنایا، انھوں نے حدیث شریف کی جو وراثت حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے پائی تھی اس کو ہندوستان میں انھیں کے مسند درس پر بیٹھ کر عام کیا، پھر حرمین شریفین کا سفر کرکے اس عظیم دولت کو وہاں پر لٹایا، حضرت شاہ محمد اسحاقؒ کے شاگردوں نے ان کے بعد علم حدیث کی بڑی خدمت انجام دی، تدریسی میدان میں بھی، اور تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی۔

علامہ شبلی نعمانیؒ نے حضرت شاہ محمد اسحاقؒ کے شاگردوں کا زمانہ پایا، عربی مدارس میں تعلیم حاصل کی، اور اپنے خاص استاذ علامہ فاروق چریاکوٹیؒ (ت ۱۹۰۹ء) سے فیضیاب ہوئے، جن کو معقول و ادبیات اور منقول میں کامل دستگاہ حاصل تھی، اس زمانہ میں تمام علوم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد آخری منزل علم حدیث کے حصول کی ہوتی تھی، چنانچہ اس زمانے کے دستور کے مطابق انھوں نے ہر فن کے اہل کمال کی طرف رجوع کیا، فن ادب کے لیے مولانا فیض الحسن سہارنپوریؒ (ت) سے جا کر استفادہ کیا، فقہ اور اصول فقہ کے لیے مولانا عبدالحئیؒ فرنگی محلیؒ اور دیگر علماء کے خرمنوں سے خوشہ چینی کی، اور علم حدیث کی تحصیل کے لیے انھوں نے اپنے

جامعہ اسلامیہ، و مرکز الشیخ ابی الحسن ندوی، مظفر پور، اعظم گڑھ۔

www.shibliacademy.org

زمانہ کے عظیم محدث حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ جو حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحبؒ کے خاص شاگرد اور تربیت یافتہ تھے کی خدمت میں حاضری دی۔

حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری اپنے زمانہ میں علم حدیث کے امام مانے جاتے تھے، آپ نے ہندوستان میں مولانا وجیہ الدین صدیقی سہارنپوری اور مولانا عبدالحئی بڈھانوی جو حضرت شاہ عبدالقدرؒ کے شاگرد تھے ان دونوں سے حدیث شریف پڑھنے کے بعد ۱۲۶۱ھ میں مکہ مکرمہ کا سفر کیا اور حضرت شاہ محمد اسحاقؒ جو ہجرت کرکے مکہ مکرمہ تشریف لے جا چکے تھے ان کی خدمت میں جا کر ان سے دوبارہ حدیث کی کتابیں پڑھیں اور ان کی خدمت میں دوسالہ قیام کے بعد سند واجازت لے کر ہندوستان واپس آئے، ہندوستان واپسی کے بعد درس وتدریس کے علاوہ مولانا نے اپنے استاد کی وصیت کے مطابق حدیث کی قلمی کتابوں کو سخت جاں فشانی اور محنت سے تحقیق وتصحیح کے ساتھ طبع کرکے عام کیا، چنانچہ دنیا میں سب سے پہلی مرتبہ ۱۲۶۵ھ میں جامع ترمذی کو اپنے حاشیہ کے ساتھ شائع کیا جب کہ پہلی مرتبہ مصر میں یہ کتاب ۱۲۹۲ھ میں شائع کی گئی، اسی طرح بخاری شریف کی تصحیح وتحشیہ میں مولانا نے دس سال بسر کیے، مولانا اپنے ساتھ بخاری کے دس قلمی نسخے مکہ مکرمہ سے لائے تھے، ان نسخوں سے مقارنہ ومقابلہ وتحشیہ کے بعد ۱۲۶۷ھ میں بخاری شریف کی جلد اول اور ۱۲۷۰ھ میں جلد ثانی شائع کی، جب کہ مصر میں اس کے تقریبا ۳۰ سال بعد یہ کتاب شائع ہو سکی، اس لیے دنیا میں ان دونوں کتابوں کے شائع کرنے کی اولیت کا سہرا حضرت محدث سہارنپوری کے سر ہے، افسوس کہ ان کا قیمتی کتب خانہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں لٹ گیا۔ مولانا نے کلکتہ کا بھی سفر کیا اور وہاں کے قیام میں بھی درس کا سلسلہ جاری رہا، کلکتہ سے واپس ہوئے تو سہارنپور میں مستقل قیام فرمایا، آپ کا درس کبھی اپنے گھر پر اور کبھی مدرسہ مظاہر علوم میں ہوتا تھا، تقریبا ۳۲ سال تک ان کا یہ فیض جاری رہا، انھوں نے ان کتابوں کے علاوہ بھی متعدد کتابوں کی اشاعت فرمائی۔

علامہ شبلی نعمانیؒ جب ان کی بارگاہ میں پہنچے تو ان سے بخاری شریف کامل اور ترمذی کا اکثر حصہ پڑھا، اسی دوران مولانا شبلی کے والد نے اپنے اعزہ کے ساتھ حج بیت اللہ کا ارادہ فرمایا، مولانا کو بھی اس سفر کا شوق دامن گیر ہوا، ادھر حدیث رسول کی کشش تھی ادھر حج اور روضۂ رسول

www.shibliacademy.org

کی، مولانا نے خود اپنے شیخ کو رہبر بنایا اور ان سے مشورہ چاہا، ان کے شیخ نے فرمایا: ''پڑھنا تو ہر وقت ہوسکتا ہے، پر یہ سفر ہر وقت میسر نہ ہوسکے گا'' چنانچہ مولانا نے بھی عزم سفر کرلیا اور حرمین کے لیے روانہ ہوگئے، مولانا کی عمر اس وقت ۱۹ سال کی تھی۔

۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۶ء میں مولانا حاجیوں کے قافلہ کے ساتھ حجاز مقدس کے لیے روانہ ہوئے، حضرت مولانا احمد علیؒ کی صحبت نے علامہ شبلی میں ایسا ذوق پیدا کردیا کہ مدینہ منورہ حاضری پر وہاں کتب خانوں کی بھی سیر کی اور خاص طور سے فرماتے ہیں کہ ان کی نظر فنون حدیث کے ذخیرہ پر تھی، اور جو ذخیرہ ان کو وہاں نظر آیا وہ کہیں میسر نہ ہوا، ان کتابوں میں حافظ مغرب علامہ ابن عبدالبر مالکی (ت ۴۶۳ھ) کی موطا کی عظیم الشان شرح ''التمہید'' بھی تھی، علامہ شبلی فرماتے ہیں کہ: اس کتاب کا قلمی نسخہ دیکھا، الحمدللہ آج یہ کتاب ۲۴ جلدوں میں طبع ہوکر منصۂ شہود پر آچکی ہے، اس واقعہ سے علامہ شبلی کے علمی وحدیثی ذوق کا پتہ چلتا ہے۔

علامہ شبلیؒ نے نہ تو مستقل حدیث کا درس ہی دیا اور نہ ان کی کوئی مستقل تصنیف حدیث کے موضوع پر ہے، البتہ حدیث پاک کا جو ذوق ان کے اندر محدث سہارنپوریؒ کی صحبت سے پیدا ہوا اس کا اثر ان کی جملہ مولفات میں نظر آتا ہے، اور سیرۃ النبیؐ میں تو وہ سراپا محدثانہ شان میں نظر آتے ہیں۔

علامہ شبلی میں فقہ حدیث، رجال حدیث اور علوم حدیث اور ان کے متعلقات کا بھی ذوق پیدا ہوگیا تھا، اس کا اندازہ آگے چل کر ان کی مولفات: ''اسکات المعتدی''، ''سیرۃ النعمان''، ''الفاروق'' اور ''سیرۃ النبیؐ'' سے ہوتا ہے، ''سیرۃ النبیؐ'' کے مقدمہ میں انھوں نے فنون حدیث کے متعلق روایت ودرایت کے جو اصول وقواعد بیان فرمایا ہے وہ عالمانہ ومحققانہ ہیں، ملاحظہ ہو چند عناوین: کتب حدیث وسیرت میں فرق مراتب، فن سیرت میں محدثین کی مسامحت، تصانیف سیرت میں کتب حدیث کی طرف سے بے اعتنائی، فن تاریخ وروایت پر خارجی اسباب کا اثر، قیاس ودرایت، محدثین اور درایت حدیث، روایت بالمعنی، اخبار آحاد۔

علامہ شبلی کی حدیث پاک سے شغف کا اندازہ ان کی شاہکار تصنیف ''سیرۃ النبیؐ'' سے ہوتا ہے، جس میں ان کا محدثانہ کمال وتبحر جھلکتا ہے، مولانا شبلی نے سیرت کو مستقل ایک فن مانا

www.shibliacademy.org

ہے اور اسے بعینہٖ فن حدیث نہیں مانتے اور فن سیرت میں صحیح روایات کا التزام نہیں کیا گیا، جیسا کہ حافظ زین الدین عراقی لکھتے ہیں:

ولیعلم الطالب ان السیرا　　تجمع ما صح وما انکرا

اس لیے کتب سیرت صحیح ومنکر حدیثوں کا مجموعہ ہوتی ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ سیرت کی کتابوں کو محدثین کے وضع کردہ مقاییس ومزایین پر پرکھ کر دیکھا جائے، اس لیے کتب سیرت کتب احادیث سے کم رتبہ ہیں، البتہ ان میں جو تنقید وتحقیق کے معیار پر اترے وہ قابل قبول ہیں۔

چنانچہ انھوں نے سیرۃ النبیؐ کی ابتداء میں ایک مبسوط ومفصل مقدمہ تحریر کیا ہے، جو فن حدیث وسیرت کے متعدد اصولی وبنیادی مباحث پر مشتمل ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حدیث واصول حدیث اور اسماء الرجال پر ان کی بڑی گہری نظر ہے، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ان اصولی مباحث کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

نتائج مباحث مذکورہ:　　۱- سب سے پہلے واقعہ کی تلاش قرآن مجید میں، پھر احادیث صحیحہ میں، پھر عام احادیث میں کرنی چاہیے، اگر نہ ملے تو روایات سیرت کی طرف توجہ کی جائے۔ ۲- کتب سیرت محتاج تنقیح ہیں اور ان کے روایات واسناد کی تعقید لازم ہے۔ ۳- سیرت کی روایتیں بہ اعتبار پایہ صحت، احادیث کی روایتوں سے فروتر ہیں، اس لیے بہ صورت اختلاف، احادیث کی روایات کو ہمیشہ ترجیح دی جائے گی۔ ۴- بہ صورت اختلاف روایات احادیث، ارباب فقہ وہوش کی روایات کو دوسروں پر ترجیح ہوگی۔ ۵- سیرت کے واقعات میں سلسلہ علت ومعلول کی تلاش نہایت ضروری ہے۔ ۶- نوعیت واقعہ کے لحاظ سے شہادت کا معیار قائم کرنا چاہیے۔ ۷- روایت میں اصل واقعہ کس قدر ہے؟ اور راوی کی ذاتی رائے وفہم کا کس قدر جزء شامل ہے۔ ۸- اسباب خارجی کا کس قدر اثر ہے؟ ۹- جو روایت عام وجوہ عقلی، مشاہدہ عام، اصول مسلمہ اور قرائن کے خلاف ہوگی، لائق حجت نہ ہوگی۔ ۱۰- اہم موضوع پر مختلف روایات کی تطبیق وجمع سے اس کی تسلی کر لینی چاہیے کہ راوی سے ادائے مفہوم میں تو غلطی نہیں ہوئی ہے۔ ۱۱- روایات آحاد کو موضوع کی اہمیت اور قرائن حال کی مطابقت کے لحاظ سے قبول کرنا چاہیے۔

ان اصول کے تحقیق وتفصیل کے بعد نظر آسکتا ہے کہ اسلامی فن روایت عقل ودرایت

www.shibliacademy.org

کی نگاہ کس قدر بلند پایہ ہے؟ علمائے حدیث نے تصحیح روایت کے لیے کتنی محنت و جانفشانی، کتنی دیدہ ریزی اور کتنی دقت رسی صرف کی ہے۔

اب ہم یہاں سے سیرۃ النبیؐ کے بعض مباحث کا جائزہ پیش کررہے ہیں جس سے علامہ شبلی کی محدثانہ شان کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

تنقید احادیث: علامہ شبلی نے سیرت کے مختلف واقعات کی تنقید و تنقیح فرمائی ہے۔

بحیرا راہب کا قصہ: علامہ شبلی فرماتے ہیں: ''یہ روایت مختلف پیرایوں میں بیان کی گئی ہے، تعجب یہ ہے کہ اس روایت سے جس قدر عام مسلمانوں کو شغف ہے، اس سے زیادہ عیسائیوں کو ہے، سرولیم میور، ڈریپر، مارگولیتھ وغیرہ سب اس واقعہ کو عیسائیت کی فتح عظیم خیال کرتے ہیں اور اس بات کے مدعی ہیں کہ رسول اللہؐ نے مذہب کے حقائق و اسرار اسی راہب سے سیکھے اور جو نکتے اس نے بتادیے تھے انہی پر آنحضرتؐ نے عقائد اسلام کی بنیاد رکھی۔ اسلام کے تمام عمدہ اصول انہی نکتوں کے شروح اور حواشی ہیں۔

عیسائی مصنّفین اگر اس روایت کو صحیح مانتے ہیں تو اس طرح ماننا چاہیے جس طرح روایت میں مذکور ہے، اس میں بحیرا کی تعلیم کا کہیں ذکر نہیں، قیاس میں بھی نہیں آسکتا کہ دس بارہ برس کے بچے کو مذہب کے تمام دقائق سکھادیے جائیں اور اگر یہ کوئی خرق عادت تھا، تو بحیرا کے تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت ناقابل اعتبار ہے، اس روایت کے جس قدر طریقے ہیں سب مرسل ہیں، یعنی راوی اول واقعہ کے وقت خود موجود نہ تھا اور اس راوی کا نام نہیں بیان کرتا جو شریک واقعہ تھا۔

اس روایت کا سب سے زیادہ مستند طریقہ یہ ہے جو ترمذی میں مذکور ہے، اس کے متعلق یہ باتیں قابل لحاظ ہیں۔

۱- ترمذی نے اس روایت کے متعلق لکھا ہے کہ ''حسن اور غریب ہے اور ہم اس حدیث کو اس طریقہ کے سوا کسی اور طریقہ سے نہیں جانتے، حسن کا مرتبہ صحیح حدیث سے کم ہوتا ہے اور جب غریب ہو تو اس کا رتبہ اس سے بھی گھٹ جاتا ہے''۔

www.shibliacademy.org

۲- اس حدیث کا ایک راوی عبدالرحمٰن بن غزوان ہے، اس کو بہت سے لوگوں نے اگرچہ ثقہ بھی کہا ہے، لیکن اکثر اہل فن نے اس کی نسبت بے اعتباری ظاہر کی ہے، علامہ ذہبی میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں کہ ''عبدالرحمٰن منکر حدیثیں بیان کرتا تھا، جن میں سب سے بڑھ کر منکر وہ روایت ہے جس میں بحیرا کا واقعہ مذکور ہے''۔

۳- حاکم نے مستدرک میں اس روایت کی نسبت لکھا ہے کہ ''یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرائط کے مطابق ہے'' علامہ ذہبی نے تلخیص المستدرک میں حاکم کا یہ قول نقل کر کے لکھا ہے کہ ''میں اس حدیث کے بعض واقعات کو موضوع، جھوٹا اور بنایا ہوا خیال کرتا ہوں''۔

۴- اس روایت میں مذکور ہے کہ حضرت بلالؓ اور ابوبکرؓ بھی اس سفر میں شریک تھے حالانکہ اس وقت بلالؓ کا وجود بھی نہ تھا اور حضرت ابوبکرؓ بچے تھے۔

۵- اس حدیث کے اخیر راوی ابوموسیٰ اشعری ہیں، وہ شریک واقعہ نہ تھے اور اوپر کے راوی کا نام نہیں بتاتے، ترمذی کے علاوہ طبقات ابن سعد میں جو سلسلۂ سند مذکور ہے (وہ مرسل یا معضل ہے، یعنی جو روایت مرسل ہے اس میں تابعی جو ظاہر ہے کہ شریک واقعہ نہیں ہے، کسی صحابی کا نام نہیں لیتا ہے اور جو روایت معضل ہے، اس میں راوی اپنے اوپر کے دو راوی جو تابعی اور صحابی ہیں دونوں کا نام نہیں لیتا ہے)۔

۶- حافظ ابن حجر اس حدیث کو صحیح تسلیم کرتے ہیں، لیکن چونکہ حضرت ابوبکرؓ اور بلالؓ کی شرکت بداہتاً غلط ہے، اس لیے مجبوراً اقرار کرتے ہیں کہ اس قدر حصہ غلطی سے روایت میں شامل ہو گیا ہے۔

اسی طرح ملاحظہ ہو قس بن ساعدہ کے قصے کی تنقید، ورقہ کے تسکین دینے کی روایت کی تنقید، فتح مکہ کے بعد چند اشخاص کے قتل کا حکم، حضرت زینبؓ کے نکاح کا معاملہ وغیرہ۔

بعض واقعات وروایات کی تردید: سیرت کے بعض ایسے واقعات ہیں جن کی علامہ شبلی نے تردید کی ہے اس کی چند مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:

ریحانہ کا غلط واقعہ: اسیران بنو قریظہ میں سے ایک ریحانہ نامی خاتون کو حضورؐ نے اپنے حرم میں داخل فرما لیا جس کی وجہ سے آپؐ کی ذات کو طعن کا نشانہ بنایا گیا ہے، لیکن علامہ نے اس

www.shibliacademy.org

واقعہ کی سختی سے تردید فرمائی ہے، فرماتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ سرے سے یہ واقعہ ہی غلط ہے، ریحانہ کے حرم میں داخل ہونے کی جس قدر روایتیں ہیں سب واقدی یا ابن اسحاق سے ماخوذ ہیں، لیکن واقدی نے بہ تصریح بیان کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے ان سے نکاح کیا تھا، ابن سعد نے واقدی کی جو روایت نقل کی ہے اس میں خود ریحانہ کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں جن کا ترجمہ ہے: پھر آپ نے مجھ کو آزاد کر دیا اور مجھ سے نکاح کر لیا''۔

مزید تحقیق کے بعد فرماتے ہیں:

''حافظ ابن مندہ کی عبارت سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ نے ان کو آزاد کر دیا تھا، اور وہ اپنے خاندان میں جا کر بیویوں کی طرح پردہ نشین ہو کر رہیں، ہمارے نزدیک محقق واقعہ یہی ہے، اور اگر مان لیا جائے کہ وہ حرم نبوی میں آئیں تب بھی قطعاً وہ منکوحات میں تھیں، کنیز نہ تھیں''۔

اسی طرح سفر ہجرت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''مشہور ہے کہ جب کفار غار کے قریب آئے تو خدا نے حکم دیا، دفعتاً ببول کا درخت اگا اور اس کی ٹہنیوں نے پھیل کر آنحضرتؐ کو چھپا لیا، ساتھ ہی دو کبوتر آئے اور گھونسلا بنا کر انڈے دیے، حرم کے کبوتر انھیں کبوتروں کی نسل سے ہیں، یہ تمام روایتیں غلط ہیں''۔

اور پھر ان روایتوں کی سند پر گفتگو فرمائی ہے۔

غزوات کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''خیبر کے واقعات میں ارباب سیر نے ایک سخت غلط روایت نقل کی ہے اور وہ اکثر کتابوں میں منقول ہو کر متداول ہو گئی ہے، یعنی یہ کہ اول آپ نے یہود کو اس شرط پر امن عام دیا تھا کہ کوئی چیز نہ چھپائیں گے، لیکن جب کنانہ بن ابی الحقیق نے خزانہ بتانے سے انکار کیا تو آپؐ نے حضرت زبیر کو حکم دیا کہ سختی کر کے اس سے خزانہ کا پتہ لگائیں، حضرت زبیر چقماق جلا کر اس کے سینے کو

www.shibliacademy.org

داغتے تھے، یہاں تک کہ اس کی جان نکلنے کے قریب ہوگئی، بالآخر آپؐ نے کنانہ کو قتل کرادیا اور تمام یہودی لونڈی غلام بنا لیے گئے۔ اس روایت کا اس قدر حصہ صحیح ہے کہ کنانہ قتل کردیا گیا، لیکن اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ خزانہ بتانے سے انکار کرتا تھا، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ کنانہ نے محمود بن مسلمہ کو قتل کیا تھا، طبری میں اس کی تصریح ہے''۔

روایات صحیحہ کی ترجیح: محدثین کا طریقہ ہے کہ جب ایک ہی مفہوم کی مختلف روایتیں سامنے ہوتی ہیں تو ان کے درمیان ترجیح کی کوشش کرتے ہیں، علامہ شبلی نے بھی محدثین کے طرز پر ترجیح کے طریقہ کو اختیار فرمایا ہے، ملاحظہ ہو: مرحب کا قاتل کون تھا، علامہ شبلی فرماتے ہیں:

''ابن اسحاق، موسی بن عقبہ اور واقدی کا بیان ہے کہ مرحب کو محمد بن مسلمہ نے مارا تھا، مسند احمد اور نووی شرح صحیح مسلم میں بھی ایک روایت ہے، لیکن صحیح مسلم اور حاکم میں حضرت علی کو مرحب کا قاتل اور فاتح خیبر لکھا ہے اور یہی اصح الروایات ہے''۔

اسی طرح ہجرت مدینہ کے موقع پر حضرت ابوایوب انصاری کے گھر قیام کرنے کے تعلق سے ''وفاء الوفاء'' کی روایت کے مقابلہ صحیح مسلم کی روایت کو ترجیح دیا ہے، اذان کے مسئلہ میں بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''صحیح بخاری کی روایت کے مقابلہ میں کسی روایت کو ترجیح نہیں دی جاسکتی''۔

اختلاف واضطراب روایت کا ذکر: حضرت صفیہ کے واقعہ کی تحقیق: ''حضرت صفیہ کی نسبت بعض کتب حدیث وسیر میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ آنحضرتؐ نے پہلے ان کو دحیہ کلبی کو دیا تھا، پھر کسی نے ان کے حسن کی تعریف کی تو ان سے مانگ لیا اور اس کے معاوضہ میں ان کو سات لونڈیاں دیں، مخالفین نے اس روایت کو نہایت بدنما پیرایہ میں ادا کیا ہے، اور جب اصل روایت میں اتنی بات موجود ہے تو ظاہر ہے کہ مخالف اس سے کہاں تک کام لے سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت صفیہ کا یہ واقعہ حضرت انس سے منقول ہے، لیکن خود حضرت انس سے متعدد روایتیں ہیں اور وہ باہم مختلف ہیں''، اس کے بعد ان مختلف روایتوں کا ذکر کیا ہے اور اس کی توجیہ فرماتے ہیں: ''یہ ظاہر ہے کہ حضرت صفیہ خاندان کے تباہ ہونے کے بعد خاندان

www.shibliacademy.org

سے باہر بیوی یا کنیز بن کر رہتیں، وہ رئیس خیبر کی بیٹی تھیں، ان کا شوہر بھی قبیلۂ نضیر کا رئیس تھا، باپ اور شوہر دونوں قتل کیے جا چکے تھے، اس حالت میں ان کے پاس خاطر، حفظ مراتب اور رفع غم کے لیے اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہ تھی کہ آنحضرتؐ ان کو اپنے عقد میں لے لیں۔ حسن خلق، رحم اور مصیبت زدہ کی چارہ نوازی کے علاوہ سیاسی اور مذہبی حیثیت سے بھی یہ کارروائی نہایت موزوں اور بجا تھی''۔

الفاظ احادیث کی تحقیق: علامہ شبلی نے اپنی کتاب میں بعض مقامات پر الفاظ حدیث کی تشریح و تحقیق بھی کی ہے جو علمائے حدیث کا طریقہ ہے چنانچہ لفظ ''غنیمت'' کی تشریح میں لکھتے ہیں: ''چونکہ لوٹ میں زیادہ تر بکریاں ہاتھ آتی تھیں اور بکری کو عربی میں ''غنم'' کہتے ہیں اس لیے لوٹ کے مال کو عربی میں غنیمت کہنے لگے، اس لفظ نے پھر یہ وسعت حاصل کی کہ قیصر و کسریٰ کا تاج و تخت لٹ کر آیا تو اسی نام سے پکارا گیا''۔ سید صاحب نے حاشیہ میں لکھا ہے: ''یہ مصنف کی ذاتی تحقیق ہے جو کتب لغت سے ہاتھ نہیں آئی''۔

لفظ ''قراریط'' کی تحقیق اس طرح پیش کی ہے فرماتے ہیں: ''بخاری نے کتاب الاجارہ باب رعی الغنم علی قراریط میں آنحضرتؐ کا قول نقل کیا ہے کہ: ''میں قراریط پر مکہ والوں کی بکریاں چراتا تھا''، قراریط کے معنی میں اختلاف ہے، ابن ماجہ کے شیخ یعنی سوید بن سعید کی رائے ہے کہ قراریط قیراط کی جمع ہے اور قیراط درہم یا دینار کے ٹکڑے کا نام ہے، اس بنا پر ان کے نزدیک حدیث کے معنی یہ ہیں کہ آنحضرتؐ اجرت پر لوگوں کی بکریاں چراتے تھے، اسی بنا پر بخاری نے اس حدیث کو باب الاجارہ میں نقل کیا ہے، لیکن ابراہیم حربی کا قول ہے کہ قراریط ایک مقام کا نام ہے جو اجیاد کے قریب ہے، ابن جوزی نے اس قول کو ترجیح دی ہے، علامہ عینی نے اس حدیث کی شرح میں یہ بحث تفصیل سے لکھی ہے اور قوی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ابن جوزی کی رائے صحیح ہے، نور النبراس میں یہ بحث اور زیادہ تفصیل سے ہے اور اسی رائے کو ترجیح دی ہے۔

یہ چند مثالیں علامہ شبلی کی حدیث و اصول حدیث اور اسمائے رجال وغیرہ علوم سے غیر معمولی وابستگی کا پتہ دیتی ہیں۔

حضورؐ کی ذات گرامی سے عشق و محبت: علامہ شبلی عشق نبویؐ میں سرشار تھے اور یہ کیفیت

www.shibliacademy.org

مطالعہ حدیث اور دراسہ سنت نبوی سے پیدا ہوئی تھی اور اسی نے ان کو باب رسول پر ڈال دیا تھا، سیرت کی تصنیف کے وقت جو کیفیت ان پر طاری تھی سید صاحب نے اس کی تصویر کشی اس طرح کی ہے:

> ''۱۹۱۰ء سے جب وہ ہر طرف سے سمٹ کر سرکار رسالتؐ کے آستانہ پر حاضری کے لیے بے تاب ہو رہے تھے ان کی ساری ذہنی توجہ دوسرے علمی و کلامی مباحث سے ہٹ کر صرف ایک مرکز پر مجتمع ہو گئی تھی، شب و روز ہیں اور کتب احادیث و سیرت کا مطالعہ، تعلیمات نبوی کی ترتیب، اخلاق نبوی کی تحریر، سوانح نبوی کی تلاش اور سیرت نبوی کی نادر کتابوں کی جستجو، جہاں بیٹھتے، کھری چارپائی ہو یا چٹائی ہو، ہر طرف حدیث کی کتابوں اور سیرت کے نسخوں کا ڈھیر ہوتا اور ان ہی درباریوں کی ہم نشینی میں ان کا سارا وقت گزر جاتا اور خوش ہوتے کہ اب وہ ہیں اور دربار رسالت کا آستانہ، چنانچہ سوتے جاگتے، چلتے پھرتے یہی ایک خیال ان پر چھایا رہتا تھا، یہی ان کی مجلس گفتگو تھی، اسی کے لیے خط وکتابت تھی''۔

یہ جذبات واحساسات حدیث نبوی سے اشتغال کی برکت سے ان کے قلب میں موجزن ہوئے اور اسی جذبۂ عشق سے سرشار ان کے وہ اشعار ہیں جو سیرت کی تصنیف کے وقت تحریر فرمائے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ولادت باسعادت کے وقت کی تحریر عشق نبوی میں ڈوبی ہوئی ہے۔

اور اسی سبب سے اللہ تعالی نے انھیں اتنا عظیم الشان کارنامہ انجام دینے کی توفیق عطا فرمائی، اس لیے شبلی کی سیرۃ النبی ہم سے مطالبہ کر رہی ہے کہ اس دور پرفتن میں باب رسول کی طرف علمی و عملی طور پر رجوع کریں اور دنیا کے سامنے حضورؐ کی سیرت کا عملی نمونہ پیش کریں، جن کی ذات گرامی رحمۃ للعالمین ہے اور جن کے اخلاق و کردار اور عبادات و معاملات کے نمونے اس کتاب میں پیش کیے گئے ہیں۔

www.shibliacademy.org

پاکستان میں شبلی شناسی کی
روایت کا ادبیاتی واسلوبیاتی تناظر

ڈاکٹر طاہر تونسوی

مولانا شبلی نعمانی (۳؍جون ۱۸۵۷ء۔ وفات ۱۸؍نومبر ۱۹۱۴ء) کی تمام عمر غالب کے اس شعر کے مصداق قرار دی جاسکتی ہے:

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی ، نغمۂ شادی نہ سہی

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء آزادی کی جدوجہد کا سال ہے اور ۱۹۱۴ء جنگ عظیم اول کا منظرنامہ تشکیل دیتا ہے۔ اس حوالے سے شبلی نعمانی اپنی ۵۷ سالہ زندگی میں جن نشیب وفراز سے گزرے اور انھوں نے جو ہنگامہ خیز زندگی بسر کی، وہ عظیم الشان بھی ہے اور فقید المثال بھی اور پھر اپنی جگہ اہمیت کے ساتھ ساتھ افادیت کی حامل بھی ہے۔ میرے نزدیک اگر کوئی بڑا آدمی نزاعی نہ ہو تو پھر اس کا وجود بھرپور معنویت کا استعارہ نہیں بن سکتا، بلکہ وہ:

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یونہی تمام ہوتی ہے

کے مصداق عام آدمی ہی رہ جاتا ہے، اس پس منظر میں مولانا شبلی نعمانی ایک نامور سیرت نگار، لائق تقلید سوانح نگار، منفرد مورخ، جید عالم دین، صاحب اسلوب نقاد اور خوش فکر

پاکستان۔

www.shibliacademy.org

شاعر تھے اور جمالیاتی و روحانی پس منظر میں بھی ان کی شخصیت جاندار بھی تھی اور شاندار بھی۔ یحییٰ اعظمی نے صحیح کہا ہے:

کہیں صدیوں میں ہوتا ہے یہ فیضِ خاصِ ربانی
نہیں اٹھتے ہمیشہ دہر میں شبلی نعمانی

اس حوالے سے انھوں نے مولانا شبلی کی ولادت باسعادت کو اللہ تعالیٰ کا خاص فیض بتایا ہے۔ مولانا کے علمی کارناموں اور دینی خدمات کو دیکھتے ہوئے یہ دعویٰ صحیح معلوم ہوتا ہے، لیکن اس دعویٰ کی دلیل کے لیے مولانا کی پوری زندگی کی علمی و ادبی مصروفیات کو پیش کرنا ہوگا اور ان کے ذہن کے تمام ارتقائی مدارج کا جائزہ لینا ہوگا۔

یوں دیکھیں تو اس سارے عرصے میں انھوں نے جو ہنگامہ خیز زندگی بسر کی، وہ عظیم الشان بھی ہے اور فقید المثال بھی کہ عشق مجازی سے لے کر عشق حقیقی تک کے تمام مراحل انھوں نے طے کیے اور اردو ادب کو وہ سب کچھ عطا کیا، جو اس کا حق تھا اور پھر ایسی راہیں متعین کیں، جن پر چل کر اردو ادب نے مضامین و اسلوب دونوں اعتبارات سے اپنا لوہا منوایا اور اس کے لیے وہ شبلی نعمانی کا مرہونِ منت ہے اور رہتی دنیا تک رہے گا۔ بقول غالب:

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو بات کہ غالب مرے اشعار میں آوے

اور یہی صورت حال مولانا شبلی نعمانی کی نثر میں بھی ہے اور ان کی شاعری میں بھی!!

مجھے اپنی بات اس اعتراف کے ساتھ شروع کرنا ہے کہ پاکستان میں ۱۹۴۷ء سے لے کر ۲۰۱۴ء تک شبلی شناسی کی روایت کا گراف نہ تو اونچا ہے اور نہ ہی یہاں کوئی معرکۃ آلارا تحقیقی و تنقیدی کام ہوا ہے یہ الگ بات کہ پاکستانی ناشرین نے شبلی نعمانی کی کتابیں شائع کر کے اپنا کاروبار خوب چمکایا ہے اور میرے لیے یہ بھی حوصلہ افزا بات ٹھہرتی ہے، تاہم علمی و ادبی سطح پر اس کی مقدار بہت کم ہے، تاہم یہ بات اس لیے مستحسن ہے کہ جو کچھ بھی ہوا ہے، وہ اپنی اہمیت اور افادیت کے اعتبار سے قابل ستائش ضرور ہے۔ لمحہ موجود تک شبلی پر جو اشاریے ترتیب دیے گئے ہیں، وہ اس بات کی شہادت دینے کے لیے کافی ہیں کہ پاکستانی دانشوروں نے شبلی کو بھلایا نہیں ہے، اس لیے

www.shibliacademy.org

بھی کہ اردو کے عناصر خمسہ میں ان کا نام سرفہرست ہے اور ان کی عظمت کی آئینہ داری بھی کرتا ہے۔ دینی ادب کے تناظر میں شبلی کی تصانیف ایک ایسا منظر نامہ تشکیل دیتی ہیں، جو لازوال بھی اور ابدی خصوصایت کی حامل بھی اور یہ بڑی خوش آئند بات لگتی ہے۔

سیرۃ النبی، الفاروق، المامون، سیرۃ النعمان ان کی روشن مثالیں ہیں؛ البتہ ادبی منظر نامہ، جسے روشن تر ہونا چاہئے تھا، ویسا نہیں ہے؛ تاہم شعر العجم، موازنہ انیس و دبیر شبلی کی انفرادیت اور علمی قدر و قیمت میں اضافہ کا باعث ہیں۔ موازنہ انیس ودبیر متنازعہ سہی، مگر وہ بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے اہم ہے اور اس سلسلے میں بحث و تمحیص کے جو در کھلے ہیں، وہ اس کی اہمیت کی واضح دلیل ہیں۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شبلی کی بنیادی حیثیت اور اہمیت سوانح نگار کی ہے اور انھوں نے مولانا حالی کی تحریر کردہ سرسید احمد خاں کی سوانح حیات ''حیات جاوید'' کو مدلل مداحی بھی کہا تھا، تاہم مولانا شبلی نعمانی نے فن سوانح نگاری کو عروج تک پہنچا دیا۔ بقول مظہر مہدی:

> ''حالی کے ہم عصر شبلی نے فن سوانح نگاری کو نئی آب و تاب بخشی، انھوں نے المامون، الفاروق، سیرت النعمان، الغزالی اور سیرت النبی جیسی بلند پایہ سوانح عمریاں لکھیں۔ ان میں ''الفاروق'' اور ''سیرت النبی'' کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ الفاروق میں شبلی نے اس تاریخی ماحول اور سیاسی پس منظر کی عکاسی کی ہے، جس میں حضرت عمر فاروقؓ کی شخصیت کی تشکیل اور کردار کی تعمیر ہوئی تھی۔ کسی مذہبی شخصیت اور وہ بھی ''اسلامی ہیرو'' کی حیثیت رکھنے والے فرد کو اپنا موضوع بنانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ شبلی نے عمر فاروقؓ کے ہم مرتبہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ کے درمیان توازن قائم رکھا ہے اور کسی کا قد چھوٹا کیے بغیر اپنے ہیرو کی مرکزی حیثیت برقرار رکھی ہے۔ شبلی کی تحریر کردہ دوسری اہم سوانح ''سیرت النبیؐ'' ہے، جس کی وہ صرف دو جلدیں ہی مکمل کر سکے۔ ان کی وفات کے بعد سیرۃ النبیؐ کی بقیہ جلدیں ان

www.shibliacademy.org

کے شاگرد سید سلیمان ندویؒ نے پوری کیں۔ سیرۃ النبیؐ میں جدید سوانحی اصولوں کو مدنظر رکھا گیا ہے اور مغربی ناقدین اسلام نے پیغمبر اسلام پر جو اعتراضات کیے تھے، ان کا مدلل جواب بھی دیا گیا ہے اس سوانح میں پیغمبر اسلام کے اخلاق، عادات اور حالاتِ زندگی کو مفصل اور مدلل انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ شبلی کے خطوط میں ادبیت، عالمانہ شکوہ اور جذبات کا اظہار ملتا ہے اور ایجاز و اختصار کے ساتھ سادگی اور پرکاری کا احساس ہوتا ہے۔ وہ خطوط میں فارسی اور اردو کے اشعار بھی نقل کرتے ہیں اور بعض اوقات اپنا کلام بھی''۔(۲)

اس طویل اقتباس میں آخری جملے میرے موضوع سے لگا کھاتے ہیں، تاہم یہ حوالہ بھی ضروری تھا اور اس کے تناظر میں ان کے ادبی اسلوب اور طرز تحریر کی عکاسی ہوتی ہے۔ اقبال شبلی سے کس درجہ متاثر تھے، اس ضمن میں ڈاکٹر محمد ریاض کا مقالہ اقبال اور شبلی (۳) بہت اہم ہے۔ جسے میں نے اپنی کتاب ''اقبال اور مشاہیر'' (۴) میں بھی شامل کیا ہے۔ وہ شبلی کی فکرانگیز اور تحقیقی کتب کا تاثر کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''سوانح مولانا روم کا کوئی حوالہ اقبال کے ہاں موجود نہیں، اگرچہ این میری شمل کا خیال ہے کہ رومی مفکر و متکلم کی طرف اقبال کی غیر معمولی توجہ اسی کتاب نے متوجہ کرائی تھی۔ شبلی کی یہ کتاب بار اول اگست ۱۹۰۲ء میں کانپور سے شائع ہوئی تھی اور اس کا فارسی ترجمہ ۱۹۵۳ء میں تہران میں چھپا۔ شبلی نے عام روش سے ہٹ کر پہلی بار رومی کی متکلمانہ حیثیت پر روشنی ڈالی۔ شبلی کی اردو اور فارسی شاعری بھی قابل ملاحظہ ہے، خصوصاً اسلامی تاریخی واقعات پر مبنی نظمیں ...... اقبال نے شبلی کی ان نظموں کی تعریف کی اور اس قسم کے موضوعات پر انھوں نے خود بھی طبع آزمائی کی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تاریخی واقعات کو نظم کرنے اور ہنگامی واقعات کے بارے میں قطعات لکھنے کے نقطۂ نظر سے اقبال کے پیش رو

www.shibliacademy.org

شبلی ہی نظر آتے ہیں''۔

اسی طرح سید افتخار حسین شاہ کی کتاب ''اقبال اور پیروی شبلی'' (۵) بھی اسی موضوع کا احاطہ کرتی ہے وہ رقم طراز ہیں:

''میں شبلیات اور اقبالیات کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اقبال اپنی زندگی اور نظریات کے اعتبار سے مجموعی صورت میں اردو اور فارسی کے پیش رو شاعروں اور نثر نگاروں میں سب سے زیادہ جس کے قریب نظر آتے ہیں، وہ شبلی ہیں''۔

ص ۱۰ سے ۴۴ صفحات پر مشتمل اس مضمون میں کئی حوالوں سے علامہ اقبال کے شبلی نعمانی سے متاثر ہونے کے حوالے مل جاتے ہیں، اس تناظر میں درج ذیل اقتباس کا اندراج بے جانہ ہوگا:

''آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جو اجلاس ۱۹۱۱ء میں مولانا شاہ سلیمان پھلواری کی صدارت میں منعقد ہوا تھا، اس میں اقبال کو ملت کی طرف ترجمان حقیقت کا خطاب پیش کیا گیا تھا۔ اس جلسے میں سجاد حیدر یلدرم کی درخواست پر مولانا شبلی نے علامہ اقبال کو پھولوں کا ہار پہنایا اور سامعین کے سامنے یہ ارشاد فرمایا ''رسم کوئی معمولی رسم نہیں ہے اور اس کو محض تفریح تصور نہ کرنا چاہیے۔ ہم مسلمانوں کا یہ شعار رہا ہے کہ ہم جس قدر قوم کی دی ہوئی عزت اور خطابات کی قدر کرتے رہے ہیں، اتنی کسی اور کی عزت کی شہرت ہمارے لیے ناموں کی نہیں ہوئی۔ محقق طوسی وغیرہ کو اس زمانے کے سلاطین نے بڑے بڑے خطابات دیے، لیکن آج سوا کتابوں کے اوراق کے، کسی زبان پر نہ چڑھ سکے، لیکن قوم کی طرف سے محقق کا جو خطاب دیا گیا تھا، وہ آج تک زبان زد خاص و عام ہے۔ جو عزت قوم کی طرف سے آج ڈاکٹر اقبال کو دی جاتی ہے، وہ ان کے لیے بڑی عزت اور فخر کی بات ہے اور حقیقت میں وہ اس عزت کے مستحق ہیں۔ ڈاکٹر اقبال کا

www.shibliacademy.org

علم، ادب اور ان کی شاعری کا مقابلہ غالب کی شاعری سے کیا جائے تو
مبالغہ نہیں ہوسکتا''۔(ص ۴۲۔۴۱)

اس پس منظر میں یہ بات بڑی اہم ہے کہ اقبال شبلی کے انتقال کے بعد اپنے علمی منصوبوں کی تکمیل کے لیے ان کی کمی کو شدت سے محسوس کرتے تھے اور سید سلیمان ندوی کو احساس دلاتے رہتے تھے کہ وہ اس کمی کو پورا کریں، مثلاً ایک خط میں انھیں لکھتے ہیں:

''اس وقت سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہ اسلامی کی ایک مفصل تاریخ لکھی جائے۔ اس بحث پر مصر میں ایک چھوٹی سی کتاب شائع ہوئی تھی، جو میری نظر سے گزری ہے، مگر افسوس کہ بہت مختصر ہے اور جن مسائل پر بحث کی ضرورت ہے، مصنف نے ان کو نظر انداز کردیا ہے۔ اگر مولانا شبلی زندہ ہوتے تو میں ان کو ایسی کتاب لکھنے کی درخواست کرتا۔ موجودہ صورت حال میں سوائے آپ کے، اس کام کو کون کرے گا''۔

شبلی کی عظمت کا احساس اور اس عقیدت کا اظہار مکتوبات اور دوسری تحریروں کے علاوہ اس نظم میں بہت نمایاں ہے، جو ''شبلی اور حالی'' کے عنوان سے بانگِ درا میں بدیں صورت موجود ہے۔ یہ شعر دیکھیے:

شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہلِ گلستاں
حالی بھی ہوگیا سوئے فردوس رہ نورد

ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنی کتاب ''سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء کی نثر کا فکری اور فنی جائزہ'' (۶) میں شبلی کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے، جس کی ترتیب کچھ یوں ہے۔

چوتھا باب	سوانح نگار شبلی ص ۱۲۷ تا ۱۴۳
پانچواں باب	تاریخی سوانح عمریاں اور تاریخ، شبلی ص ۱۴۷ تا ۱۸۲
چھٹا باب (ا)	ادبی تنقید شبلی ۱۹۴ تا ۲۰۱
ضمیمے (ب)	سرسید کا اثر ادبیات اردو پر ص ۲۶۲ تا ۲۶۴
ضمیمہ (د)	شبلی کے تصنیفی کام کی مجموعی قدر و قیمت ص ۳۰۵ تا ۳۱۰

www.shibliacademy.org

اس ضمن میں ڈاکٹر سید عبداللہ کا مضمون ''شبلی فکر جدید سے کیوں کر روشناس ہوئے'' اورینٹل کالج میگزین لاہور۔ڈاکٹر سید عبداللہ کی درج ذیل آراء خاصی وقیع ہیں:

اردو ادب میں انھوں نے وہ مقام حاصل کیا، جس میں ان کی یکتائی کو ان سے کوئی چھین نہیں سکتا۔(ص ۳۱۰)

رفقاے سرسید میں ایک ایسا شخص بھی ہے، جو سرسید سے متاثر ہونے کے باوجود ان کے بعض تصورات کا سب سے بڑا باغی بھی ہے، یعنی شبلی۔شبلی کا درجہ عقل پسندی کی تحریک میں وہی ہے، جو معتزلہ اور متکلمین میں امام ابوالحسن اشعری کا ہے۔شبلی نے سرسید کی ہمہ گیر عقل پسندی کو معتدل بنانے کی کوشش کی ہے اور عقل ووجدان کے درمیان ایک معقول رابطہ پیدا کرنے کی سعی کی۔(ص ۲۶۲)

شبلی کے اسلوب بیان کی نمایاں صفت اس کی وہ قوت اور جوشِ بیان ہے، جو ان کے احساس کمال اور احساس عظمت کی پیداوار ہے۔(ص ۱۷۷)

شبلی کا طرہ یہ ہے کہ ان میں کامل بے ساختگی کے باوجود تجمل کا ایک خاص انداز اور حسن کی ایک خاص شان پائی جاتی ہے۔شبلی کی حسن کاری بے عیب ہے۔(ص ۱۷۸)

شبلی تنقید میں بھی صدر نشین بزم ہیں، ان کی کتاب شعرالعجم فارسی شاعری کی تاریخ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے تنقیدی تصورات کے لیے بھی ایک کتاب حوالہ ہے، اس کے بعد موازنہ انیس ودبیر کا نمبر آتا ہے۔مہدی حسن کی رائے میں شعرالعجم تنقید عالیہ کا بہتر سے بہتر نمونہ ہے، بلکہ انھیں اصرار ہے کہ صرف اردو لٹریچر میں نہیں، بلکہ مشرق کی کسی زبان میں اس پایہ کی تصنیف موجود نہیں اور یہ دنیا کی سب سے شیریں زبان کے جذباتی لٹریچر کا ایک خوبصورت مرقع ہے۔(ص ۱۹۴)

www.shibliacademy.org

شبلی علوم اسلامیہ کے ماہر تھے اور قدرت کی طرف سے مجتہدانہ صلاحیتیں لے کر آئے تھے۔ میری رائے میں ان کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے قدیم علوم سے دلچسپی پیدا کی اور روایات تاریخ کو نئے ماحول میں زندہ کرتے ہوئے ہندوستان میں ایک زندہ اور جاندار علمی تحریک کی بنیاد رکھی۔ نئی قومی زندگی کے پیدا کرنے اور اس کو صحیح تاریخی بنیادوں پر قائم کرنے میں شبلی کا بہت بڑا حصہ ہے اور ندوۃ العلماء اس کا بڑا مظہر ہے۔ ان کی علمی روایات کو ان کے رفقا نے ان کے بعد بھی زندہ رکھا، چنانچہ دارالمصنّفین آج بھی زندہ ہے اور اس کا علمی سرمایہ ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اور ان کا وہ عظیم اسلوب بیان بھی جو ان کے بلند مطالب کا متحمل ہو سکا۔ ان کے بقا اور دوام کا ضامن رہے گا۔ (ص ۳۰۹)

ڈاکٹر سخی احمد ہاشمی نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ ''شبلی کا ذہنی ارتقاء''، جو انھوں نے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی نگرانی میں پایہ تکمیل کو پہنچایا تھا، بلا شبہ خاصی محنت اور دقت نظر سے لکھا ہے اور اس کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں سنہ وار شبلی کی ذہنی نشو و نما اور اس کے ارتقائی مراحل کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے؛ چنانچہ ۱۸۸۱ء سے لے کر ۱۹۱۴ء تک شبلی نعمانی جس ذہنی کشمکش اور مصاف زیست کے گراں قدر لمحوں میں تحریری عمل سے گزرتے رہے، اس کی روداد اس مقالے میں موجود ہے۔ اس پس منظر میں انھوں نے مکاتیب شبلی باقیات شبلی اور کلیات شبلی سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے۔ ان کے بقول:

مولانا جب تک شعرالعجم کے کوچے میں رہے، فارسی غزلوں میں بھی اپنے جوہر دکھاتے رہے۔ شعرالعجم کی بہار ختم ہوئی تھی تو مولانا کی فارسی شاعری نے بھی خزاں کا منہ دیکھا۔ اس کے بعد مولانا نے کبھی اتفاقیہ ہی فارسی میں اشعار کہے، ورنہ اب وہ اردو شاعری کی طرف متوجہ ہو چکے تھے اور ابھی اس میں جوہر دکھانا باقی تھا۔ چونکہ زندگی کی مہلت کم سے کم ہوتی جا رہی تھی، اس لیے اردو شاعری میں کوئی خاص پابندی نظر نہیں آتی ہے یعنی

www.shibliacademy.org

ایک ہی وقت میں سیاسی شاعری، اخلاقی شاعری اور مذہبی شاعری پر فکر سخن کرتے ہیں۔ کان پور کے سلسلے میں سب سے موثر نظم ایک پُر اثر مرثیہ ہے، جس میں شہیدوں کی تفصیل ہے۔ اس کو پڑھ کر پتھر دل بھی تڑپ جاتے ہیں۔ (ص۷۳۹)

اس طرح مسلم لیگ اور عدل جہانگیری، خون کے چند قطرے، پا بہ زنجیران کانپور بڑے پایے کی نظمیں ہیں۔ اس سلسلے میں مولانا ابوالکلام آزاد کی یہ رائے بڑی اہم ہے، ''ہندوستان میں فارسی شاعری غالب پر نہیں ان پر (شبلی) پر ختم ہوئی۔'' (ص۷۴۳)

اپنی معرکۃ الارا کتاب ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' (۷) میں ڈاکٹر سلیم اختر رقم طراز ہیں:

شبلی کئی معاملوں میں حالی کے برعکس تھے، شاید وہ تمام عمر سرسید کے نظریات کے دائرہ میں محبوس نہ رہ سکے۔ وہ جذباتی بھی تھے اور جو شیلے بھی، شاعر بھی تھے اور عالم بھی؛ گویا انتہا پسند شبلی کا دل جذبات کی آماج گاہ بنا تو دماغ فلسفہ اور منطق کا مسکن۔ اس اجتماع ضدین نے ان کی شخصیت کو جس نفسیاتی کشمکش میں مبتلا کیے رکھا، اس کا نفسیاتی مطالعہ بہت دلچسپ ہوسکتا ہے۔

شبلی نے عربی فارسی کے علاوہ اپنے وقت کے اعلیٰ اساتذہ کے ادبیات اور معقولات ومنقولات کے درس ہی نہ لیے، بلکہ علی گڑھ میں پروفیسر آرنلڈ سے مغربی فلسفہ کے علاوہ فرانسیسی بھی سیکھی۔ انگریزی سے واقف تھے، اس لیے سرسید کے کتب خانہ سے خوب استفادہ کیا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حالی کے مقابلے میں شبلی کا مطالعہ وسیع ہی نہ تھا، بلکہ متنوع بھی تھا۔ گو انھوں نے زیادہ شہرت سوانح کتب اور تاریخ میں تحقیقی مضامین سے پائی، لیکن وہ اچھے نقاد بھی تھے، بلکہ تحسین شعر اور شاعری سے متعلق مسائل کی تفہیم میں حالی سے بڑھ جاتے ہیں؛ البتہ جذباتیت کے باعث

www.shibliacademy.org

تنقیدی آرا میں افراط وتفریط کا شکار ہو جاتے ہیں، جس کی بدترین مثال ''موازنہ انیس و دبیر ہے۔ گو''موازنہ''اردو میں تقابلی تنقید کی اولین کوشش ہونے کی وجہ سے تاریخی اہمیت اختیار کر لیتا ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ غیر جانب دارانہ رویہ برقرار نہ رکھ سکے اور یوں انہیں کے حق میں ڈنڈی مار گئے؛ البتہ پانچ جلدوں پر مشتمل ''شعرالعجم''(ص ۳۲۹) فارسی شاعری کی تاریخ ہی نہیں، بلکہ چوتھی جلد میں شعر شاعری محاکات، تخیل، جذبہ اور شاعری اور ماحول کے تعلق پر ژرف نگاری پر مبنی خیالات کا اظہار کیا چنانچہ تخیل پر شبلی نے حالی سے کہیں بہتر بحث کی ہے۔

تاریخی مباحث اور سوانحی کتب میں نقطۂ نظر کے ساتھ ساتھ مواد کی فراہمی بھی اساسی اہمیت رکھتی ہے شبلی کی تصانیف دیکھ کر قدم قدم پر ان کی محنت اور جستجو کا احساس ہوتا ہے۔ شبلی کی جوشیلی طبیعت کا اظہار ان کے اسلوب سے بھی ہوتا ہے، چنانچہ جہاں کہیں بھی جوش کے مواقع ملتے ہیں، وہ عبارت کو پُر جوش بنا دیتے ہیں، لیکن محمد حسین آزاد کی طرح انھیں محض رنگینی عبارت کا شوق نہیں۔ بحیثیت مجموعی عبارت متانت کا رنگ لیے اور عالمانہ شان کی حامل ہے۔(ص ۳۳۰)

ڈاکٹر جمیل جالبی ''تاریخ ادب اردو'' کی جلد چہارم (۸) میں لکھتے ہیں:

شبلی کی نثر نگاری میں قوتِ تخیل نے ایسی کشش اور حسن پیدا کر دیا ہے کہ ان کی تحریریں، جب کہ علم بے حد ترقی کر چکا ہے اور شبلی کی استنباطی (deductive) منطق کی جگہ ''تجربہ'' کو بنیادی اہمیت دینے والی استقرائی (inductive) منطق نے لے لی ہے، آج بھی تازہ و زندہ ہیں۔ شبلی اپنی قوتِ تخیل اور قوتِ استدلال سے اپنے طرزِ ادا میں ایسا مناسب رنگ بھر دیتے ہیں کہ طالبِ ادب کے لیے آج بھی اس میں کشش و دلچسپی موجود رہتی ہے۔ اردو زبان و ادب کی تاریخ میں وہ زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔(ص ۱۱۰۷)

www.shibliacademy.org

پروفیسر سحر انصاری اپنے مضمون ''شبلی اور عہد حاضر'' (۹) میں لکھتے ہیں۔

شبلی ذہنی طور پر ہمارے عہد سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں کہ انھوں نے انتہا پسندی کے دور میں اعتدال اور انتشار فکر کے عہد میں توازن کی ایک اعلیٰ مثال پیش کی، جس کا گواہ ان کی تصانیف کا تنوع اور معیار ہے۔ (ص ۱۴۷)

حیدرآباد دکن میں آل انڈیا اردو کانگریس جولائی ۱۹۴۴ء میں منعقد ہوئی تھی، اس کا خطبہ صدارت سجاد ظہیر نے دیا اور اسی میں شبلی کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا:

شبلی کی عظمت کا راز کیا ہے؟ وہ اسلامیان ہند کی تہذیبی زندگی کے اس موڑ کے رہنما ہیں، جہاں پر سرسید کا بنایا ہوا راستہ تاریخی اعتبار سے ختم ہوتا ہے اور وہ شاہراہ آزادی شروع ہوتی ہے، جس پر ابوالکلام آزاد، محمد علی، مختار احمد انصاری اور خود علامہ اقبال جیسی مقتدر ہستیاں گامزن نظر آتی ہیں۔ (ص ۱۶۹)

ڈاکٹر خالد ندیم میرے نزدیک تحقیقی وتنقیدی اعتبارات سے منفرد خصوصیات کے حامل ہیں کہ وہ جس بھی موضوع کو ہاتھ میں لیتے ہیں، اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر اسے زمین سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں تک لے جاتے ہیں اور کسی لمحے بھی اپنی گرفت کو ڈھیلا نہیں ہونے دیتے اور مستند حوالہ جاتی بنیادوں پر نتائج کی عمارت استوار رکھتے ہیں۔ سرسید اور ان کے نامور رفقا خاص طور پر ان کے مطالعات کا موضوع ہیں اور پھر محقق ونقاد کا مکمل گھیراؤ کر لیتے ہیں، پھر ان کی گرفت مضبوط بھی ہوتی ہے؛ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر خالد ندیم ان نابغہ روزگار شخصیات کے سحر سے باہر نہیں نکل سکے اور پھر یوں ہوا کہ انھوں نے ''شبلی کی آپ بیتی'' مرتب کر ڈالی اور عجز وانکسار سے شبلی کا یہ شعر بھی حوالے کے طور پر درج کر دیا ہے:

صریر خامۂ شبلی کی آتش فشانی
یہ مان لیجیے کہ ہے بھی پر اس میں دم کیا ہے

اس اعتراف پر کیا تبصرہ کیا جا سکتا ہے، اس لیے کہ علامہ شبلی میں دم بھی ہے اور خم بھی۔

www.shibliacademy.org

اگر ایسا نہ ہوتا تو محمد امین زبیری، وحید قریشی، شیخ محمد اکرام اور اس قبیل کے "شبلی شناسوں" کی ضرورت باقی نہ رہتی؛ تاہم میرے نزدیک دوسروں کے نہاں خانہ دل میں جھانکنے کا کیا جواز ہوسکتا ہے، مگر چونکہ ایسا ہوتا ہے، اس لیے یہ ادبی تاریخ کا، بلکہ سوانحی اور ذاتی زندگی کے شب و روز کا آئینہ خانہ بھی ہے۔ ڈاکٹر خالد ندیم نے سنہ وار شبلی کی مصاف زیست کو جانچنے اور ناپنے کی سعی کی ہے اور وہ اس میں پوری طرح کامیاب وکامران ہیں کہ انھوں نے ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک شبلی کے ستاون برسوں کی رام کہانی انہی کی زبانی رقم کر دی ہے؛ خاص طور پر سفر نامہ روم ومصر و شام کے مندرجات سے جس طرح انھوں نے استفادہ کیا ہے، اس کی بدولت حیاتِ شبلی کی اہمیت اور افادیت میں اور بھی اضافہ ہوا ہے۔

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے معارف ماہ اکتوبر ۲۰۱۴ء شذرات میں لکھا ہے:(۱۰)

اردو زبان میں کسی مصنف کے خطوط اور اس کی تحریروں کی مدد سے اس کی آپ بیتی مرتب کرنے کی روایت اب ایک حد تک مستحکم ہو چکی ہے۔ علامہ شبلی نے اپنی مختصر فرصت حیات میں جو علمی دینی اور ملی خدمات انجام دیں، اس کی پوری تفصیل "حیاتِ شبلی" میں موجود ہے۔ حیاتِ شبلی کو اردو کے سوانحی ادب میں جو مقام اور مرتبہ حاصل ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں؛ لیکن اپنی تمام تر عظمت و جامعیت کے باوجود حیاتِ شبلی کی نوعیت علامہ شبلی کی سوانح حیات کی ہے، آپ بیتی کی نہیں۔ سرگودھا یونیورسٹی میں اُردو زبان وادب کے استاد ڈاکٹر خالد ندیم صاحب ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے خود شبلی کے الفاظ میں شبلی کی آپ بیتی ترتیب دینے کا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے مکاتیب کے علاوہ علامہ کی دوسری تصنیفات سے بھی پورا استفادہ کیا ہے۔ اس کام میں ان کو جو عرق ریزی کرنی پڑی ہوگی، اس کا اندازہ کتاب کی سرسری ورق گردانی سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں ایک غیر معمولی زندگی کا ایک جیتا جاگتا مرقع سامنے آ گیا ہے۔ یہ کتاب دارالمصنّفین سے شائع کی جارہی ہے۔ شبلی صدی تقریبات کے موقع پر شبلی کے قدردانوں کے لیے اس

www.shibliacademy.org

سے بہتر تحفہ نہیں ہوسکتا۔(ص ۲۴۲)

اسی حوالے سے ڈاکٹر عبدالحق کے تحریر کردہ دیباچہ ''تبریک'' ۲۰؍ستمبر ۲۰۱۴ء کے آخری جملے لائق توجہ ہیں:

> شبلی شناسی کی صدی میں ڈاکٹر خالد ندیم کی یہ کاوش (شبلی کی آپ بیتی) قابل قدر مثال ہے۔قلم کے شذرات سے قبائے زندگی کی ترتیب تطہیر نشاطِ کار جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ انہی کا کام ہے یہ، جن کے حوصلے ہیں زیاد۔

ڈاکٹر خالد ندیم کا مضمون ''شبلی، اقبال اور عطیہ فیضی، ایوان اردو دہلی کے اکتوبر ۲۰۱۴ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے، جس میں انہوں نے کمال دانش مندی سے اس موضوع کو تحقیقی اور تنقیدی دونوں اعتبارات سے سمیٹا ہے۔اسی طرح ''شبلی کے خطوط سرسید کے نام' دوسرا اہم مضمون ہے، جو اردو دنیا دہلی کے اکتوبر ۲۰۱۴ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے، جو ۳۲ تا ۳۵ یعنی چار صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ فاضل مضمون نگار نے یہ اعتراف کیا ہے کہ ان خطوں سے اگرچہ سرسید اور شبلی کے تعلقات کے تمام نشیب وفراز نمایاں نہیں ہوتے، تاہم لب و لہجے کے تغیرات کا اندازہ ضرور ہوجاتا ہے۔ ان خطوں سے سرسید کے دل میں شبلی کی اہمیت، سرسید سے مخاطب ہوتے ہوئے شبلی کا انکسار، اہل خانہ اور افراد خاندان سے متعلق معلومات، ترکی کے کتب خانوں کا کسی قدر احوال، کتب کی دستیابی، معتزلہ سے ان کی دلچسپی، قسطنطنیہ میں مشاہیر سے ملاقاتوں، ترک تعلیمی اداروں کی صورتحال، وطن میں عزیزوں اور دوستوں سے ان کے قلبی تعلق، تمغہ ملنے پر اظہار مسرت اور امتیاز حاصل کرنے کی خواہش اور سرسید سے تعلقات میں درآنے والی خلیج کا اظہار ہوتا ہے۔(اردو دنیا دہلی اکتوبر ۲۰۱۴ء)

ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر سلیم اختر نے شبلی کو سرسید سے الگ تھلگ نظریاتی شخصیت قرار دیا ہے اور بعض خیالات کے تناظر میں بہت بڑا باغی قرار دیا ہے اور ان کے نظریات کے دائرے میں محبوس نہ رہنے کا تذکرہ بھی کیا ہے، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ڈاکٹر عباس حیدر زیدی نے علامہ شبلی نعمانی کے فن سوانح نگاری تحقیقی مطالعہ کے موضوع پر پی ایچ ڈی کا مقالہ

www.shibliacademy.org

تحریر کیا ہے۔اس میں انھوں نے سرسید اور شبلی کے تعلقات اور اختلافات کی نوعیت کے بارے میں مستند حوالوں سے جو نتیجہ نکالا ہے،وہ کچھ اس طرح سے ہے:

> شبلی اور سرسید کے اختلافات کے حوالے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ شبلی کے سرسید سے اختلافات ذاتی نوعیت کے نہ تھے، بلکہ اجتماعی نوعیت کے تھے۔ اگر کوئی فرق تھا بھی تو وہ فکری حوالے سے تھا۔شبلی حنفی مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے، لہٰذا مذہبی معاملات میں ان کا سرسید سے اختلاف مسلک کے زیر اثر تھا۔(ص ۷۶)

بہر حال اس کی نوعیت کچھ بھی ہو، وہ ہر حوالے سے انفرادی شخصیت کے حامل تھے۔ مولانا حالی نے شبلی کو جو خراج پیش کیا ہے،وہ اپنی جگہ ہر حوالے سے اہم ہے۔

ادب اور مشرقی تاریخ کا ہو دیکھنا مخزن
تو شبلی سا وحیدِ عصر و یکتائے زمن دیکھیں

مولانا شبلی نعمانی نے موازنہ انیس و دبیر لکھ کر ایک طرح انیس شناسی کی بنیاد ڈال دی تھی، ان کے بعد مسعود حسن رضوی ادیب نے بھی شبلی کی طرح انیس شناسی کی آخری حدوں کو چھوا۔ علی جواد زیدی لکھتے ہیں:

> مسعود صاحب بیسویں صدی کے ''انیسیے'' تھے۔آپس میں لڑانے کے لیے نہیں، بلکہ وہ انیس کے کھلم کھلا طرف دار تھے اور دبیر کو ان کے مرتبے کا شاعر نہیں سمجھتے تھے۔اس معاملے میں وہ شبلی کے ہم نوا تھے۔کسی بات میں بھی دبیر کی فوقیت تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔(۱۱)

یہ کتاب یوں بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ اس کے تناظر میں شبلی کی کتاب ''موازنہ انیس و دبیر'' کی آرا درست اور مناسب معلوم ہوتی ہیں۔شبلی نے موازنہ میں انیس کو بہتر شاعر ثابت کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> الفاظ میں فصاحت، سلاست، روانی، بندش میں چستی اور چستی کے ساتھ بے تکلفی، دلآویزی اور برجستگی، لطیف اور نازک تشبیہات اور استعارات،

www.shibliacademy.org

اصول بلاغت کے مراعات-- ان تمام اوصاف میں سے کون سی چیز مرزا دبیر میں پائی جاتی ہے۔ فصاحت ان کے کلام کو چھو کر نہیں گئی۔ بندش میں تعقید اور اخلاقی تشبیہات اور استعارات اکثر دور از کار بلاغت نام کو نہیں۔ کسی چیز یا کیفیت یا حالت کی تصویر کھینچنے سے وہ بالکل عاجز ہیں۔ خیال آفرینی اور مضمون بندی البتہ ہے، لیکن اکثر جگہ اس کو سنبھال نہیں سکے۔(۱۲)

گویا دوسرے لفظوں میں یہ ساری خصوصیات میر انیس کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ مسعود حسن رضوی ادیب نے بھی شبلی کی طرح میر انیس کے کلام کے حوالے سے اس کی عظمت کا لوہا منوایا ہے۔ (۱۳)

اہل نقد و نظر کی مستند آرا کی روشنی میں جہاں شبلی شناسی کی روایت کا پتہ چلتا ہے، وہاں ان کی تحقیقی و تنقیدی بصیرت و بصارت کے حوالے سے ان کے ادبیاتی و اسلوبیاتی تناظر کی ایک واضح تصویر بھی سامنے آ جاتی ہے اور یہ بات بھی کھل کر سامنے آتی ہے کہ ناقدین نے شبلی نعمانی کا کھل کر اعتراف کیا ہے اور واضح الفاظ میں ان کی عظمت کو تسلیم بھی کیا ہے۔ اس پس منظر میں یہاں یہ بات نامناسب نہیں ہوگی کہ حافظ محمود شیرانی نے سرمایہ اردو کے نام سے امتحان میٹریکولیشن کے لیے جو اردو نصاب مرتب کیا تھا، وہ پہلی بار ۱۹۴۷ء میں دوسری بار ۱۹۴۸ء میں، تیسری بار ۱۹۵۱ء اور چوتھی بار ۱۹۵۳ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کی جانب سے شائع ہوا تھا اور اس میں سرسید اور شبلی نعمانی کو شامل نہیں کیا گیا۔ میرے نزدیک اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اس لیے کہ سرسید اور شبلی دونوں کی اُردو ادب کی مختلف جہات کی جو قدر و قیمت ہے میں وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ اس حوالے سے غالب کا یہ شعر شبلی نعمانی کی عظمت و افادیت کے لیے مناسب ہے:

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق، اے خضر!
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

حوالے اور حواشی:

(۱) نوائے حیات از یحییٰ اعظمی، بحوالہ شبلی کا ذہنی ارتقاء از ڈاکٹر سید یحییٰ احمد ہاشمی، ص ۲۱۔

www.shibliacademy.org

(۲) مظہر مہدی، بیسویں صدی میں اردو سوانحی ادب (سوانح نگاری خودنوشت سوانح نگاری مکاتیب اور سفرنامے) مشمولہ بیسویں صدی میں اردو ادب مرتبہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ساہتیہ اکادمی نئی دہلی، ۲۰۰۲ء ص ۳۴۲۔۳۴۳۔۳۴۵۔

(۳) اقبال اور شبلی از ڈاکٹر محمد ریاض، ماہِ نو، لاہور، مئی ۱۹۷۷ء۔

(۴) اقبال اور مشاہیر ترتیب وتہذیب طاہر تونسوی، سنگ میل پبلی کیشنز چوک، اردو بازار لاہور، ۱۹۷۸ء۔

(۵) اقبال اور پیروی شبلی از سید افتخار حسین شاہ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۷۷ء۔ اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۷۸ء۔

(۶) ڈاکٹر سید عبداللہ، سرسید احمد خان اوران کے نامور رفقا کی نثر کا فکری اورفنی جائزہ، مکتبہ کارواں کچہری روڈ لاہور، دوسری بار ۱۹۶۵ء۔

(۷) ڈاکٹر سلیم اختر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ آغاز سے ۲۰۱۰ تک، تیسواں ایڈیشن، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۳۔

(۸) ڈاکٹر جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو (جلد چہارم) مجلس ترقی ادب لاہور، ۲۰۱۲ء۔

(۹) ''تنقیدی افق'' پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی، فروری ۲۰۱۴ء۔

(۱۰) یہ کتاب اب شائع ہو چکی ہے۔

(۱۱) اس پس منظر میں میری مرتبہ کتاب (رزم نامہ انیس ودبیر، تالیف: سید مسعود حسن رضوی ادیب، اظہار سنز اردو بازار لاہور، ۲۰۰۶ء) دیکھی جاسکتی ہے۔

(۱۲) نیا دور، لکھنؤ مسعود حسن رضوی نمبر، مارچ اپریل، ۱۹۷۷ء، ص ۱۳۔

(۱۳) موازنہ انیس ودبیر از شبلی نعمانی، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۲ء، ص ۲۵۶، مجلس ترقی ادب، کلب روڈ لاہور، ۱۹۷۱ء۔

www.shibliacademy.org

فارسی شاعری کی تاریخ میں علامہ شبلی کے امتیازات

شریف حسین قاسمی

اوایل کی اسلامی تہذیب و تمدن کا یہ ایک امتیاز تھا کہ بڑی تعداد میں اس نے ایسے افراد کو جنم دیا جنھوں نے علم و معارف کے مختلف میدانوں میں اپنے انمٹ نقوش چھوڑے۔ ایک ہی عالم علم و معرفت کے مختلف پہلوؤں، تاریخ، تصوف، علم و ادب اور علوم اسلامی پر اس انداز و تبحر کے ساتھ تحقیقی، تنقیدی اور ادبی کام انجام دیتا تھا کہ جیسے ان تمام علوم و فنون کا وہ بہ یک وقت ماہر اور متخصص ہے۔ عالم اسلام پر منگولوں کے حملے اور اس کی تباہ کاریوں نے ہماری تہذیب اور تاریخ کے اس امتیاز پر بھی کاری ضرب لگائی۔

علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی کی اس عبقری شخصیت کا نام ہے، جس نے متنوع اور کثیر الجہات موضوعات پر اس طرح قلم اٹھایا کہ جیسے ان میں سے ہر موضوع پر انہیں اختصاصی تبحر حاصل تھا۔ اس طرح حضرت علامہ شبلی نے ہمارے ان عظیم دانشوروں، علما، فضلا اور ادبا و شعراء کی یاد تازہ کر دی جو منگولوں کے حملوں سے پہلے کے دور میں ہمارے مفاخر میں شمار ہوتے ہیں۔

شبلی کے اس امتیاز کا اعتراف کیا گیا ہے اور وہ اس طرح کہ انہیں ہمارے صاحب نظر فضلا نے خراج عقیدت و تحسین پیش کیا۔ ان کی کتابیں تسلسل کے ساتھ بار بار شائع ہوتی رہیں۔ آپ کی ہر کتاب پر تبصرہ کیا گیا اور حقیقت یہ ہے کہ شبلی کی علمی و ادبی فکر کو سمجھنے اور سمجھانے کا کام خود شبلی کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا تھا جو آج تک جاری ہے۔ شبلی کے کارناموں پر جو کام انجام دیے گئے ہیں، ان میں بعض تنقیدی نوعیت کے بھی ہیں۔ شبلی پر لکھنے والوں میں ان کے حامی و ہم خیال

دہلی۔

www.shibliacademy.org

بھی ہیں اور مخالف بھی۔ اس طرح شبلی کی حیات اور کارناموں پر ایک قابل قدر سرمایہ موجود ہے۔ ان سے شبلی کی کاوشوں کے معیار و منہاج کو سمجھنے میں مدد و راہنمائی ملتی ہے۔

شبلی نے علم و ادب کے متنوع اور رنگا رنگ پہلوؤں پر اظہار خیال کیا ہے۔ وہ ادیب، انشاپرداز، شاعر، ناقد ہیں اور متکلم و معقولی بھی، مورخ اور سوانح نگار کی حیثیت سے بھی ان کے بلند مقام کا تعین ہو چکا ہے۔ انہوں نے فارسی ادب پر گراں قدر تصانیف یادگار چھوڑی ہیں اور پیغمبر اسلامؐ کے سیرت نگار کے طور پر ان کی مساعی جمیلہ کی ہر طرف سے قدر دانی کی گئی ہے۔

راقم فارسی کا ایک طالب علم ہے، اس لیے میں نے یہ کوشش کی ہے کہ حضرت علامہ کو فارسی زبان و ادب سے جو تعلق خاطر تھا، اس پر اختصار سے اپنے خیالات کا اظہار کروں، اس کے سوا میں کچھ کر بھی نہیں سکتا۔

فارسی زبان و ادب کا ذوق شبلی کو اپنے والد شیخ حبیب اللہ (م ۱۹۰۰ء) سے ورثے میں ملا تھا۔ یہ فارسی کا صاف ستھرا اور پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔

شعرالعجم جلد چہارم میں شبلی نے ایک واقعہ بیان کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے والد نے شعر و شاعری کا اچھا ذوق پیدا کرنے میں ان کی راہنمائی کی تھی۔ شبلی لکھتے ہیں:

میرا طالب علمی کا زمانہ تھا کہ ایک دن ایک صحبت میں کسی نے کلیم کا یہ شعر پڑھا:

سر بہ بستان چوں دھد جلوۂ یغمائی را　　اول از سرو کند جامۂ رعنائی را

والد مرحوم بھی تشریف رکھتے تھے۔ میں نے کہا کپڑا اتارنے کو جامہ کشیدن بھی کہتے ہیں، اس لیے شاعر "کند کے بجائے کشد کہتا تو زیادہ فصیح ہوتا۔ جامہ کندن تو صحیح ہے فصیح نہیں، سب چپ ہو گئے۔ والد مرحوم نے ذرا سوچ کر کہا: نہیں، یہی لفظ شعر کی جان ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق باغ میں جب غارت گری کی شان دکھاتا ہے تو پہلے سرو کی رعنائی کا لباس اتار لیتا ہے، لباس اتارنے کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ مثلاً کوئی شخص گرمی وغیرہ کی وجہ سے کپڑا اتار کر رکھ دے یا اس کا نوکر اتار لے۔ دوسرے یہ کہ سزا کے طور پر کسی کے کپڑے اتروا لیے جائیں، یا نچوا لیے جائیں۔ فارسی میں ان کے لیے دو مختلف لفظ ہیں، جامہ کشیدن اور جامہ کندن

چوں کہ یہاں مقصود یہ ہے کہ معشوق ذلت کے طور پر سرو کا کپڑا اتار لیتا ہے، اس لیے

www.shibliacademy.org

یہاں جامہ کندن کا لفظ جامہ کشیدن سے زیادہ موزوں ہے۔

شعرالعجم میں بعض دیگر اندراجات سے بھی پتا چلتا ہے کہ شبلی طالب علمی کے زمانہ آغاز ہی سے فارسی ادب سے وابستہ رہے۔ان کے اپنے بیانات سے پتا چلتا ہے کہ جہاں انہوں نے معقولات کی طرف خاص توجہ دی، وہیں فارسی زبان اورادب خاص طور پر فارسی شاعری بھی ان کے پسندیدہ مضامین میں شامل رہے۔اس سلسلے میں شبلی کے اساتذہ مولانا محمد فاروق چریا کوٹی (م۱۹۰۹ء) اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری (م ۱۸۸۷ء) کی کوششوں کو بھی خاص دخل تھا۔ مولانا محمد فاروق نہ صرف شعروشاعری کا اچھا ذوق رکھتے تھے، فارسی کے قادرالکلام شاعر تھے، بلکہ موسیقی سے بھی خوب آشنا تھے۔سید سلیمان ندوی صاحب نے لکھا ہے کہ ”مولوی (فاروق) صاحب اکثر رات کے تیسرے پہر (شبلی کو) اٹھا دیتے اور پوچھتے شبلی! بھیروی سنو گے؟ پھر گا کر بتاتے۔

شیخ محمد اکرام اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

مولانا کے مذاق شعرگوئی کی اصلاح وتربیت اس وقت ہوئی جب وہ مولانا فاروق کے حلقۂ درس میں آئے ......۔مولانا محمد فاروق نہایت شستہ فارسی شعر کہتے تھے،موسیقی کے بھی ماہر تھے۔ان کی صحبت میں مولانا کو فارسی شعرگوئی کا پاکیزہ مذاق حاصل ہوگیا اور یہ امر قابل ذکر ہے کہ ان کے اس زمانے کے فارسی اشعار، اردو اشعار سے بہتر ہیں۔ (شبلی نامہ،ص ۲۵)

شبلی نے پروفیسر آرنلڈ سے بھی کسب فیض کیا تھا۔یہ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں سے واقف اور صاحب ذوق وصاحب تصنیف تھے۔

شبلی کو غیر معمولی حافظہ ودیعت ہوا تھا۔اس وجہ سے فارسی اور اردو کے ہزاروں اشعار ان کے ذہن وحافظہ میں مستحضر تھے۔شبلی انہیں برجستہ اور برمحل پڑھتے اور لکھتے ہیں۔

شعروشاعری سے شبلی کی دلچسپی اور ذہنی مناسبت کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ ایک بار موسم برسات میں گنگا میں کشتی کے سفر کے دوران یہ طے پایا کہ اس تفریح کے دوران شعرو شاعری کا مشغلہ رہے گا اور حسب حال اشعار پڑھے جائیں گے، یعنی کوئی شعر موسم برسات اور ابر و باد و برق و رعد کے تلازمے سے خالی نہ ہوگا۔ چنانچہ رعد (ایک ہم راہ شاعر کا نام) سے

www.shibliacademy.org

شاعری کا آغاز ہوا......تیس منٹ کے بعد یکا یک بارش شروع ہوگئی اور گنگا کا پانی بڑھنے لگا مشاعرہ بدستور گرم رہا اور جس قدر اشعار پڑھے گئے، وہ فارسی میں تھے، مولانا شبلی نے جس قدر اشعار پڑھے ان میں کوئی ایسا نہ تھا جو سمندر، دریا، ملاح، تلاطم کے الفاظ سے خالی ہو...... بارہ بجے تک لطف صحبت رہا۔(شمس العلماء پروفیسر شبلی نعمانی، از عبدالرزاق کانپوری)

شبلی نے موسیقی سے اپنی آشنائی کے بارے میں لکھا ہے:

گانا میں خود نہیں جانتا، لیکن سمجھ سکتا ہوں۔یعنی جو گانا خلاف موسیقی ہوگا، میں بتا سکوں گا کہ خلاف قاعدہ ہے، بمبئی میں اس فن کو مطلق نہیں جانتے، یہاں تک کہ جن کا یہ پیشہ ہے، وہ بھی محض جاہل ہیں۔(خطوط شبلی، مرتبہ محمد امین زبیری)

شبلی کی فارسی غزلیات نہایت مترنم ہیں۔اس امر کے التزام میں کوئی شک نہیں کہ موسیقی سے ان کی واقفیت کارفرما رہی ہے۔شبلی کی دیگر تصانیف کے علاوہ سوانح مولانا روم، الغزالی، فارسی خطوط اور پھر شعرالعجم فارسی زبان وادب سے ان کے ذہنی تعلق اور دلچسپی کی ترجمان ہیں۔شبلی کی سوانحی نوعیت کی ان دونوں کتابوں کے بارے میں اتفاق رائے سے یہ کہا گیا ہے کہ ان میں واقعات کی تحقیق، ان کی ترتیب اور دروبست، اخذ نتائج وغیرہ ہر ایک بات قابل تعریف ہے۔

مزید براں شبلی جہاں کہیں جس کسی کتاب خانے میں تشریف لے گئے، وہاں انہوں نے عربی مآخذ کے علاوہ فارسی مخطوطات کا بھی دلچسپی سے مطالعہ کیا۔شبلی ترکی گئے تھے وہاں انہوں نے کتاب خانے دیکھے۔وہاں محفوظ علمی ذخائر سے بہت خوش ہوئے۔جس کا اظہار انہوں نے اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔ایک کتاب خانے میں شبلی نے خسرو دہلوی کی نثری معرکۃ الآرا کتاب اعجاز خسروی کا ایک نادر اور ممتاز نسخہ دیکھا۔شبلی اس کا تعارف کرائے بغیر نہ رہ سکے اور لکھا:

اعجاز خسروی کا ایک عجیب وغریب نسخہ ہاتھ آیا، امیر کی وفات کے دس برس بعد کا لکھا ہوا ہے، نہایت صحیح اور سرتا پا محشی ہے اور کمال یہ کیا ہے کہ لفظی رعایت میں ایک لفظ کے کئی ٹکڑے میں بھی کوئی رعایت ہے تو اس قدر ٹکڑا سرخ لکھا ہے۔مثلاً باغ کی رعایت میں ''بو'' کا لفظ آگیا ہے تو ''بو'' سرخ لکھا ہے۔تمام کتاب میں یہ التزام ہے۔اس قدر دیدہ ریزی شاید خود مصنف نے کی ہوگی۔

www.shibliacademy.org

پھر وہ مزید اطلاع دیتے ہیں کہ:

ہاں مرزا کامران کا دیوان، اکبری کتب خانہ کا نہایت مستند دیکھا۔ شاہ جہاں اور جہاں گیر کے خاص ہاتھ کی تحریر ہے۔

یہ سب فارسی ادب سے ان کے شغف اور تعلق کا ثبوت ہے۔

شبلی کی فارسی سے فطری مناسبت کا اس امر سے بھی پتا چلتا ہے کہ انہوں نے سب سے پہلا خط ۱۲۸۹/۳-۱۸۷۲ کو اپنے والد بزرگوار کو فارسی ہی میں لکھا اور شاعری بھی فارسی ہی میں شروع کی اور اپنے زمانے میں رائج تمام ہی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی جیسے غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، مسدس، ترکیب بند، قطعات، رباعیات وغیرہ۔ شبلی کے فارسی اور اردو مطبوعہ کلام سے علم ہوتا ہے کہ انہوں نے فارسی میں کوئی ۱۶۷۳/ اور اردو میں ۱۳۷۹/ شعر کہے یعنی فارسی میں زیادہ اشعار ان کے ذہن وقلم نے صفحۂ قرطاس پر ثبت کیے۔

شبلی کی فارسی اور اردو شاعری پر جن صاحبان ذوق ونظر نے قلم اٹھایا ہے، ان کا خیال ہے کہ شبلی کا فارسی کلام بعض لحاظ سے اردو کلام سے بہتر و برتر ہے۔

مضمون آفرینی، خیال بندی، تمثیل، مبالغہ آرائی، ایہام اور مناسبات لفظی پر شبلی کی کوئی خاص توجہ نہیں، جب کہ یہ بعض ہندوستانی فارسی شعرا کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ شبلی کے فارسی کلام میں موسیقیت، روانی، سادگی اور لطف زبان، خصوصیات کلام میں شامل ہیں۔ اسی طرح شبلی اپنی فارسی غزلیات میں لاابالی پن اور شوخی طبیعت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان کے ہاں تفکر، فلسفہ، سنجیدگی اور ٹھہراؤ کا فقدان ہے۔ وہ اپنی غزلیات میں عاشق و رند ہیں۔ وہ اکثر اکہرے تجربات وخیالات کے اظہار پر قناعت کرتے ہیں اور شاید یہ ایک وجہ ہے کہ انہوں نے شعرالعجم میں بیدلؔ کے کلام پر اظہار رائے سے اغماض کیا کہ بیدل کا کلام شبلی کی شاعرانہ ترجیحات سے بالکل مغایر ہے۔

شبلی کی غزل کی ان ہی خصوصیات کے پیش نظر یہ کہا گیا ہے کہ ان کی غزل مسرت بخش ضرور ہے لیکن بصیرت افروز ہونے کا وصف ان میں مفقود ہے۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیے:

چند بیہودہ بہ بند غم دنیا باشم   زین پس با قدح و بادہ و مینا باشم
جبہہ سای حرم کعبہ چو بودم یک چند   بردر بتکدہ ہم ناصیہ فرسا باشم

www.shibliacademy.org

(میں کیوں بلاوجہ دنیا کے جھمیلوں میں پھنسا رہوں، اس کے بعد بس قدح و بادہ و مینا سے سروکار رکھوں گا۔ میں ایک زمانے تک حرم کعبہ پر سجدہ کرتا رہا، اب بتکدہ پر بھی ماتھا ٹیکوں گا)

من کہ در سینہ دلی دارم و شیدا چکنم		میل با لالہ رخان گر نکنم تاچہ کنم
ساغر بادہ و طرف چمن ولالہ رخی		چوں بہ اینہا فتدم کار، بفرما چہ کنم

(میرے پہلو میں ایک دل ہے، جو شیدا ہے، عشق پیشہ ہے، اس لیے اگر لالہ رخوں کی طرف التفات نہ کروں تو کیا کروں۔ ساغر، چمن اور لالہ رخ سب موجود ہیں، جب ان ہی سے سروکار ہے تو اب بتاؤ کیا کروں، سوائے عشق و عاشقی کے)

ایسے ہی اشعار کے پیش نظر شبلی نے کئی جگہ لکھا ہے کہ زیادہ شوخ اور آزاد اشعار قلم سے نکل گئے ہیں، یا غزلیں زیادہ شوخ ہو گئیں جو شاید ایک پنجاہ سالہ مصنف کے چہرے پر نہ کھلیں۔ لیکن اس تذبذب کی حالت سے جو ان کی علمی و دینی شخصیت کا ردعمل تھا، شبلی کو حافظ کے اس مصرع نے باہر نکالا:

ہر گہ کہ یاد روی تو کردم، جوان شدم

شبلی کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی اور کبھی موجودگی میں بھی ان کے کلام پر اعتراض کیا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں شبلی نے مولوی محمد سمیع کے نام اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ:

"چہ کنم ردیف کی غزل پر یہاں ایک لطیفہ ہوا۔ چند لڑکوں نے کہا کہ استاد کی غزل پر غزل لکھی، اس سے کیا حاصل؟ ھمتا ے فلک نہ ہوگا بادل، میں نے کہا: دریا نہیں کار بند ساقی، غرض میری اور علی حزیں کی غزل خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز، مصنف قید سرنامہ اور نیر دہلوی کے پاس بہ غرض محاکمہ ارسال کی گئی۔ یہ وہی نیر ہیں جن کو غالب نے لکھا ہے:

مجھ سے تمہیں نفرت سہی، نیر سے لڑائی

فارسی نہایت عمدہ کہتے ہیں اور غالب کے تلمیذ ارشد ہیں۔ دونوں نے تسلیم کیا کہ اہل زبان کا کلام ہے۔ نیر نے تو بہت تعریف لکھی اور لکھا کہ سلف

www.shibliacademy.org

کے کلام کا ہم پلہ ہے (مولوی محمد سمیع کے نام)''۔

شعروشاعری سے متعلق شبلی کے یہ بیانات بھی قابل توجہ ہیں، وہ فرماتے ہیں:

میں نظم پر باوجود ہزاروں شعر کہنے کے، بالکل قادرنہیں، یعنی بغیر کسی فوری تاثر ایک حرف نہیں لکھ سکتا۔ بارہا احباب نے فرمائشیں کیں اور کئی کئی دن طبیعت پر زور ڈالا، لیکن کچھ کہہ نہ سکا۔

وہ اس بارے میں مزید لکھتے ہیں:

میری شاعری محض عطایی ہے، نہ کبھی اس میں اشتغال رہا، نہ برسوں کچھ کہنے کا اتفاق ہوا اسی ضمن میں شبلی کا یہ جملہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں:

شعروشاعری پر اب میرا قابو نہیں، بلکہ میں اس کے قابو میں ہوں۔

فارسی شاعری پر حضرت علامہ کی پانچ جلدوں میں کتاب شعرالعجم ایک ایسا کارنامہ ہے، جسے شروع ہی سے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ایک کتاب کے دو حصے ہیں۔ایک فارسی شعرا کے سوانحی کوائف پر مشتمل ہے، یہ نسبتاً مختصر ہےاور بیشتر فارسی کے بہ آسانی دستیاب شعراء کے تذکروں اور چند دوسرے مآخذ سے ماخوذ ہے۔ دوسرا حصہ فارسی شعرا کے کلام سے بحث کرتا ہے، جو مفصل تر، تنقیدی اور مصنف کا اصل کارنامہ ہے۔اس کی پہلی اور دوسری جلد کے پیش تر سوانحی حصہ پر استاد محمود شیرانی مرحوم (م ۱۲ر ربیع الاول ۱۳۶۶ھ) نے تنقید شعرالعجم میں تبصرہ کیا ہے۔ یہ لب و لہجے کے اعتبار سے شدید ہے، لیکن بہرحال اپنے مطالب اور تاریخی مباحث کے لحاظ سے گراں قدر ہے۔تنقید شعرالعجم کے مقدمے میں شیرانی صاحب نے حضرت علامہ کی علمی، ادبی اور تنقیدی بصیرت کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ یہ طویل ہے لیکن ایک محقق ادب کے یہ الفاظ ہماری توجہ کے مستحق ہیں:

علامہ شبلی مرحوم زمانہ حال کے ان چند مستند افاضل میں سے ہیں جن کا وجود مسلمانوں کے لیے ہمیشہ مایۂ ناز رہے گا۔ان کی متعدد تصنیفات نے آسمان علم پر ان کو آفتاب بنا کر چمکایا ہے۔ مرحوم کا شماران خوش نصیب مصنّفین میں کیا جاسکتا ہے جن کے فرزندان روحانی نے ان کے دوران حیات میں قرار واقعی قدر و منزلت حاصل کر لی ہے جس کے حقیقت میں وہ مستحق ہیں۔

www.shibliacademy.org

مرحوم نے تاریخ نگاری کی بنیاد ایسے زمانے میں ڈالی جب فن تاریخ کا شوق ہمارے دل سے محو ہو چکا تھا۔ اردو زبان تاریخی کتابوں سے بالکل تہی مایہ تھی اور ملک کا مذاق نہایت پستی کی حالت میں تھا ایسے جمود کے وقت میں ان کے قلم نے اس فن کے احیا میں وہ زبردست اور قابل قدر خدمت کی جو صدیوں تک یادگار رہے گی۔

تاریخ میں ان کی وسعت معلومات کا اندازہ مرحوم کی ان متعدد اور مختلف النوع تصانیف سے لگایا جاسکتا ہے جو اردو ادبیات کی چیدہ اور منتخب کتابوں میں مانی جاتی ہیں۔

فارسی نظم کی تاریخ میں اردو زبان کی بے بضاعتی محسوس کر کے علامہ نے شعرالعجم تصنیف کی۔ اس موضوع پر اب تک فارسی اور اردو میں جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں، شعرالعجم ان میں بغیر کسی استثنا کے بہترین تالیف مانی جاسکتی ہے۔ ملک نے بھی اس کی قدر کرنے میں حوصلے سے کام لیا۔ چنانچہ اس وقت تک متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ (تنقید شعرالعجم: پروفیسر محمود خاں شیرانی، انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی، ۱۹۴۲ء)

محمود شیرانی صاحب نے جن پہلوؤں پر تنقید کی ہے، مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے ان کا ذکر اور اس بارے میں یہ دفاعی وضاحت کی ہے:

شعرالعجم شعرا کے اسماء، القاب، سنین وسال اور امرا وسلاطین کی تنقیدی تاریخ نہیں، بلکہ فارسی شاعری کا تنقیدی تبصرہ ہے۔ شعرالعجم میں ہر شاعر کا تذکرہ اور سوانح پہلی چیز نہیں، دوسری چیز ہے، اس کی پہلی چیز ہر شاعر کا شاعرانہ کمال اور سخنوری کا معنوی جوہر ہے۔ غرض وہ جسم ومادہ کی تاریخ نہیں، بلکہ روح ودماغ کی تاریخ ہے۔

ہمارے دور کے معروف ومعتبر فارسی کے محقق پروفیسر نذیر احمد مرحوم نے بھی شیرانی صاحب کے شعرالعجم پر اعتراضات کا جواب دیا ہے اور ان الفاظ میں شبلی کی مدافعت کی ہے:

محقق یا مورخ کے پیش نظر جو مآخذ نہ ہوں اور اگر چہ ان مآخذ کی روشنی میں ان کے نتائج ناقص ہوں تو اس سے مورخ ومحقق پر اعتراض لازم نہیں آتا۔ ہمارے محققین اکثر اس نکتہ سے غفلت برتتے ہیں۔ شیرانی صاحب کی تحریروں میں بعض جگہ ہیں یہ نقص نظر آتا ہے۔ اگر یہ نکتہ پیش نظر ہوتو تحقیق میں جو تلخی پیدا ہو جاتی ہے وہ ختم ہو جائے۔ (تحقیقی مطالعہ، حافظ محمود شیرانی، پروفیسر نذیر احمد

www.shibliacademy.org

ہمارے دور کے ایک دوسرے معروف محقق پروفیسر سید امیر حسن عابدی صاحب نے اس مسئلہ پر ایک دوسرے ہی انداز سے اظہار خیال کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

اگر علامہ شبلی کے کارنامے عالم وجود میں نہ آتے تو حافظ محمود شیرانی جیسی عظیم شخصیتیں بھی عالم وجود میں نہ آتیں۔ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ علامہ نے جلایا تھا، اس کی روشنی میں دوسرے چراغ جلے ہیں۔ (تحقیقی مطالعہ، حافظ محمود شیرانی، پروفیسر نذیر احمد، ص۲۵۲)

سید صاحب، پروفیسر عابدی اور پروفیسر نذیر احمد صاحب کی ان وضاحتوں سے بہر حال شیرانی صاحب کی تنقید شعر العجم کی نہ اہمیت و مناسبت کم ہوتی ہے اور نہ اس کی ضرورت سے انکار کیا جاسکتا ہے۔ یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ تنقید شعر العجم کے منظر پر آنے کے بعد بھی شعر العجم کی مقبولیت میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ اس کی وجہ پر اختصار سے عرض کرنا اس وقت مقصود ہے۔

شعر العجم صرف اردو ہی میں نہیں فارسی میں بھی فارسی شاعری پر تنقیدی رویے سے لکھی جانے والی اپنے دور کی سب سے پہلی مفصل کتاب ہے۔

فارسی شاعری کی طرز و اسلوب کی بنیاد پر باقاعدہ بیسویں صدی کے اوائل میں طبقہ بندی کی گئی اور اسے سبک خراسانی، سبک عراقی اور سبک ہندی کے بنیادی عنوانات دیے گئے۔ شعر العجم میں فارسی شاعری کے مختلف ادوار میں طرز و اسلوب کو ان ناموں سے تو زیر بحث نہیں لایا گیا، لیکن شروع سے ہندوستان میں مغل دور تک کے فارسی شعرا کے کلام پر جس طرح قدما، متوسطین اور متاخرین کے عنوانات سے دیدہ ریزی اور ادبی ذوق کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور مختلف ادوار کے شعرا کے کلام پر ان کے اسلوب و طرز شاعری پر جو اظہار خیال کیا گیا ہے، وہ اس سے کوئی خاص مختلف نہیں جو فارسی شاعری کے اسالیب پر جدید ایرانی ناقدین شعر و ادب نے پیش کیا ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ اس میدان میں شعر العجم کے مباحث نقش اول کا درجہ رکھتے ہیں۔

علامہ شبلی نے اپنی اس کتاب میں فارسی شاعری کے بارے میں چند ایسے پہلوؤں پر نسبتاً مفصل اور مدلل بحث کی ہے، جن پر یا ان سے پہلے کسی کی توجہ اس طرف مبذول نہیں ہوئی تھی۔ یا ان پر صرف اشارتاً کچھ جملے شعرا کے تذکروں میں سپرد قلم ہو گئے تھے۔

www.shibliacademy.org

فارسی شاعری میں واقعہ گوئی یا معاملہ بندی کے بارے میں فارسی کے چند تذکروں میں کچھ اشارے ملتے ہیں۔ واقعہ گوئی یعنی ان واقعات اور معاملات کا بیان جو عشق و عاشقی میں پیش آتے ہیں۔ سعدی کو اس کا موجد بتایا گیا ہے اور امیر خسرو نے اس پر معتد بہ اضافہ کیا اور شبلی کے بقول صفوی عہد کے میرزا اشرف جہان قزوینی نے اسے ایک مستقل صنف سخن بنا دیا۔ شبلی نے اس سلسلے میں جو توضیحات پیش کی ہیں، وہ فارسی شاعری میں معاملہ بندی کے باب میں منفرد ہیں۔ شعرالعجم کا فارسی ترجمہ ہو چکا ہے اور بہت پہلے ہوا تھا اس لیے ایرانی فضلا اس کا مطالعہ کر سکتے تھے۔ اس وجہ سے قیاس چاہتا ہے کہ فارسی میں معاملہ بندی پر جسے ایرانی وقوع گوئی کے عنوان سے جانتے ہیں، ایک مفصل کتاب وقوع گوئی در شعر فارسی کے محرک شعرالعجم کے اس ضمن میں مباحث کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

عرض کر دوں کہ یہاں شبلی نے غزل اور وقوع گوئی میں نازک فرق کو واضح کیا ہے جو علامہ شبلی کی دقیقہ رس طبیعت پر غماض ہے۔ وہ لکھتے ہیں غزل گو اور وقوع گویوں میں یہ فرق ہے کہ وقوع گو شعرا ہوس پرست اور بازاری معشوقوں کے عاشق ہوتے ہیں اور اسی قسم کے واقعات اور خیالات باندھتے ہیں، بہ خلاف اس کے متغزلین کا معشوق شاہد بازاری نہیں ہوتا اور نہ ان پر عشق مبتذل اور اوباشانہ ہوتا ہے۔

فیضی اور ان کے چھوٹے بھائی ابوالفضل کی بلند علمی و ادبی حیثیت کو سب نے متفقہ طور پر مانا ہے لیکن ان پر آزاد خیال ہونے اور مذہب سے منحرف ہونے پر شدید تنقیدیں کی گئی ہیں۔ انہیں ملحد، بے دین، زندیق اور کافر تک کہا گیا ہے۔ اس کام میں ان کے معاصر اور بعد کے لکھنے والے دونوں شامل ہیں۔ علامہ شبلی نے فیضی پر عائد کیے گئے اعتراضات نقل کیے ہیں اور پھر مختلف مآخذ اور خود فیضی کی تحریروں سے بڑی حد تک ان کا شافی جواب دیا ہے۔ فیضی پر اعتراضات کے جوابات شعرالعجم کا ایک امتیاز ہے۔

فیضی کی علمی و ادبی فضیلت، علم و ادب سے دلچسپی، شعر و ادب کی سرپرستی، شاعرانہ خصوصیات، درویش پرستی، معاملات زندگی میں وسیع النظری پر علامہ نے گراں قدر روشنی ڈالی ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ:

www.shibliacademy.org

سچ تو یہ ہے کہ فیضی کی مذہبی آزادی کے بارے میں ہم جو کچھ سنتے ہیں، تصنیفات میں تو وہ ملائے مسجد ہی نظر آتا ہے۔

شعرالعجم پر ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا ہے کہ حضرت علامہ نے بغیر کسی تحقیق کے اپنے مآخذ پر بھروسہ کرلیا اور اس طرح روایتی اشتباہات اس کتاب میں در آئے۔ یہ بات چند مقامات پر صحیح ہے، لیکن شبلی نے اپنے مآخذ کے مشتملات کو تحقیق و استدلال کی کسوٹی پر کسا بھی ہے۔ ابوالفضل نے فیضی کی مثنویوں کے بارے میں لکھا ہے کہ سب مثنویاں پوری ہوئیں لیکن کوئی عینی شہادت پیش نہیں کی بلکہ فیضی کے اشعار سے استدلال کیا ہے، لیکن جو شعر استدلال میں نقل کیے ہیں، ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا۔ اشعار یہ ہیں:

زین ہفت رباط و چار منزل		بندم بہ جمازہ پنج محمل
آں چار حروف ہفت خرگاہ		کامد درد میان نیمہ راہ
چندیں اگرم اماں دہد بخت		یک یک بہرم بپایۂ تخت
گر نشکندم سپہر پیماں		بلقیس برم بر سلیماں

شعرالعجم میں ہزاروں فارسی اشعار شواہد کے طور پر نقل ہوئے ہیں۔ علامہ نے ان میں بڑی تعداد میں اشعار کے اردو ترجمے اور دقیقہ سنجی سے ان کی شرح کی ہے۔ یہ ترجمے اور تشریحات بڑے کام کے ہیں، اس لیے کہ ہم ان سے فارسی شعر کو سمجھنے اور ان کی تشریح کا طریقہ اور فن سیکھتے ہیں۔ نظیری کا یہ ایک شعر حضرت علامہ نے نقل کیا ہے:

اثر عتاب بردن ز دل ہم اندک اندک		بہ بدیہہ آفریدن بہ بہانہ ساز کردن

اس کی تشریح کرتے ہیں کہ:

وہ بھی لطف کا کیا موقع ہوتا ہے جب دو یک دل دوست آپس میں مل بیٹھتے ہیں، گفتگو چھیڑتے ہیں، پرانے تذکرے ہوتے ہیں، شکایتیں شروع ہوتی ہیں۔ ایک دوست روٹھا ہوا ہے، دوسرا اس کو اس طرح آہستہ آہستہ مناتا جاتا ہے کہ جب وہ کوئی شکایت پیش کرتا ہے تو یہ جھٹ کوئی تاویل گڑھ لیتا ہے، فوری تاویل کرنے کے لیے ”بہ بدیہہ آفریدن“ کس قدر موزوں لفظ ہے جو ایک بڑے خیال کو کس قدر مختصر لفظ میں ادا کردیتا ہے، ”ز دل ہم“ اور ”اندک اندک“ کی

www.shibliacademy.org

ترکیب کس قدر واقعہ کی تصویر کھینچ دیتی ہے۔

اب حافظ شیرازی کے اس شعر کی تشریح ملاحظہ فرمائیے:

قند آمیختہ با گل نہ علاج دل ماست   بوسہ ای چند بیامیز بہ دشنامی چند

معشوق سے کہتے ہیں کہ پھول میں جو قند ملا لیتے ہیں (یعنی گل قند) یہ میرے دل کا علاج نہیں، علاج کرتا ہے تو گالیوں میں چند بوسے ملالو۔

اس سادہ ترجمے کے بعد اس کی تشریح کرتے ہیں کہ:

اس طرز ادا کی بلاغتوں پر لحاظ کرو، اول تو کلام کا ایک بڑا حصہ غیر مذکور ہے، یعنی عاشق بیمار ہے، معشوق کو معلوم ہوا کہ عاشق بیمار ہے اور دل کی بیماری ہے، اس بنا پر وہ گل قند لایا ہے اور عاشق کو دیتا ہے، یہ سب جملے غیر مذکور ہیں لیکن خود بخود سمجھ میں آتے ہیں، پھر گل قند کو گل قند نہیں کہا بلکہ اس کی ترکیب بیان کی ہے، ان کو ''آمیختن'' کے لفظ سے بیان کیا ہے، اس سے اس قوت متخیلہ کا اظہار ہوتا ہے جو ہر چیز کو مجسم کر کے دکھا دیتی ہے، اس کے علاوہ چونکہ معشوق سے گل قند کی فرمائش ہے، اس لیے وہی لفظ استعمال کیا ہے جو گل قند کے لیے کیا جاتا ہے، بوسہ اور دشنام دونوں کی ایک ہی مقدار بیان کی ہے، یعنی ''چند'' جس سے یہ غرض ہے کہ اس گل قند کی ترکیب میں یہ ضرور ہے کہ دونوں اجزاء ہم وزن ہوں یعنی جتنی گالیاں ہوں اتنے ہی بوسے بھی ہوں۔

صائب تبریزی کے احوال و آثار پر اظہار خیال کرتے وقت شبلی نے صائب کی ایک اخلاقی خوبی کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ اس کی اہمیت و مناسبت زیادہ روشن ہوگئی ہے۔شبلی نے بڑی حد تک صحیح لکھا ہے کہ شعرائے ایران کی عام عادت ہے کہ وہ ہندوستان، یہاں کی تاریخی اور ثقافتی خصوصیات اور وافر نعمتوں کی تعریف کرتے نہیں تھکتے، لیکن امیر خسرو کے علاوہ ہندوستانی فارسی شعرا کو خاطر میں نہیں لاتے۔شاید ہی کوئی مستند ایرانی شاعر ہو جس نے کبھی کسی ہندوستانی شاعر کا نام لیا ہو۔یہ صائب تبریزی کی پاکیزہ خوئی، منکسر المزاجی اور حق شناسی تھی کہ اس نے ہندوستانیوں کا نام بھی اپنے مقطعوں میں لیا اور ان کی غزلوں پر غزلیں کہیں اور اس طرح انہیں خراج تحسین پیش کیا جیسے غنی، فیضی، حاذق وغیرہ۔

صائب کے کلام کے خصائص بیان کرنے کے بعد شبلی کہتے ہیں کہ میرزا کا اپنا انداز گو

www.shibliacademy.org

خاص ہے (یعنی مثالیہ پر اصرار) اور وہ شاعری کا معمولی درجہ ہے لیکن چونکہ اس کا مذاق نہایت صحیح تھا، اس نے دوسرے شعرا کے بلند اور نادر اشعار انتخاب کیے ہیں۔شبلی نے صائب کی اس بیاض کے دو نسخے دیکھے تھے۔ ایک حیدرآباد میں اور دوسرا خود شبلی کی لائبریری کی زینت تھا۔ حیدرآباد کے قلمی نسخے کو میرزا صائب کے ایک شوقین شاگرد نے ایران میں نہایت اہتمام سے تیار کرایا تھا۔اس کے بعد حضرت علامہ اس نوعیت کے انتخابات کی اہمیت ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ شعرائے عرب میں ابوتمام ایک مشہور شاعر گذرا ہے جو متنبّی کا ہم پلہ خیال کیا جاتا ہے۔اس نے ایک مجموعہ، انتخاب کیا تھا جو حماسہ کے نام سے مشہور ہے اور فن ادب کی جان ہے، اہل فن کا بیان ہے کہ ابوتمام کی شاعری کا کمال جس قدر اس انتخاب سے معلوم ہوتا ہے۔خود اس کے دیوان سے ظاہر نہیں ہوتا۔

بقول شبلی میرزا صائب کے انتخاب کا بھی بعینہٖ یہی حال ہے، جس شاعر کے جتنے اشعار انتخاب کر دیے ہیں، وہی اس کے تمام دیوان کا عطر ہے۔

ابو طالب کلیم شاہجہاں کے دربار کا ملک الشعراء تھا۔شبلی نے اس کے کلام میں متعدد ہندوستانی الفاظ ڈھونڈ نکالے اور پھر بجا طور پر لکھا کہ یہ ابوطالب کا ایک مستحسن قدم ہے ورنہ اور ایرانی شعرا تو اس کو گناہ سمجھتے تھے۔عرفی عمر بھر ہندوستان میں رہا لیکن عمر بھر میں صرف ایک ہندی لفظ جھکڑ زبان سے نکلا، وہ بھی اس طرح بدل کر کہ گویا فارسی ہے۔

یہ بھی ایک امتیاز ہے شعرالعجم کا کہ اس میں شبلی نے بعض شعرا کے کلام کا تقابلی مطالعہ کیا ہے، اس نوعیت کے مطالعے کے نتائج ایک ایک دو دو جملوں میں چند تذکروں میں نظر آتے ہیں اور پھر مدلل بھی نہیں لیکن شبلی نے نسبتاً مفصل اور مدلل انداز میں یہ اہم کام انجام دیا ہے اور ان کے نتائج دل لگتے ہیں، اس کام میں شبلی کا اپنا ذوق وسلیقہ، شعر منہ سے بولتا نظر آتا ہے، مزید برآں اس نوعیت کا بہت سے فارسی شعراء کے کلام کا مطالعہ شعرالعجم سے پہلے ندرت ہی سے کہیں نظر آتا ہے۔

شبلی، ابوطالب کلیم جس کی جدت آفرینیاں بقول شبلی استعجاب کے قابل ہیں اور طالب آملی کے کلام کے بارے میں فرماتے ہیں:

اس زمانے میں قصائد کا کمال صرف مبالغہ، تشبیہ، حسن تعلیل اور مغالطۂ شعری پر محدود

www.shibliacademy.org

تھا اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ اوصاف کلیم کے قصیدوں میں نہایت افراط اور نہایت وسعت کے ساتھ پائے جاتے ہیں، اس کے ہاں ترکیبوں کا سلجھاؤ، روزمرہ کی صفائی، محاورات کی برجستگی و شگفتگی اور روانی بھی اس حد تک ہے کہ اس کے ہم عصروں میں نہیں ہے، طالب آملی سے وہ جدت استعارات اور شوخی میں کم ہے لیکن اور اوصاف میں اس سے بہت آگے ہے۔

حضرت شبلی حاجی محمد جان قدسی کے کلام کے بارے میں لکھتے ہیں:

قدسی کے کلام میں عرفی کا زور اور طالب آملی کی جدت استعارات نہیں ہے لیکن متاخرین میں جس کو مضمون آفرینی کہتے ہیں، قدسی نے اس کے دریا بہا دیے ہیں۔

غزل کے ارتقا پر گفتگو کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں سلمان اور خواجو کی کوششوں کا ذکر کیا ہے اور پھر ان دونوں کے مقابلے میں حافظ شیرازی کی فوقیت پر ان کے ساحر قلم سے یہ جملے نکلے:

سلمان اور خواجو دونوں تصوف سے محروم تھے۔ اس لیے ان پھولوں میں رنگ تھا، بو نہ تھی۔ سلمان اور خواجو زندہ ہی تھے کہ خواجہ حافظ نے غزل گوئی شروع کی اور اس جوش سے یہ نغمہ چھیڑا کہ زمین سے آسمان تک گونج اٹھا۔

صوفیانہ شاعری پر اظہار نظر کر رہے ہیں اور خسرو دہلوی اور حسن دہلوی کی غزل کی بنیادی خصوصیت کا ذکر کرتے ہیں کہ:

عراقی کے بعد محمود شبستری، امیر خسرو اور حسن صوفیانہ شاعری میں مشہور ہوئے لیکن خسرو اور حسن کے کلام میں مجاز کا رنگ اس قدر غالب ہے کہ ان کی شاعری کو عشقیہ شاعری کہنا زیادہ موزوں ہے۔

ایران اور ہندوستان میں جن صاحبان نظر نے سبک ہندی (ہندوستانی اسلوب شعر) پر تحقیقی کام کیا ہے ان کا ماننا ہے کہ ہندوستان میں فارسی شعرا نے مضمون آفرینی اور خیال بندی کے پھیر میں پڑ کر زبان اور محاورہ بندی کی طرف واجب توجہ کرنی چھوڑ دی تھی۔ شبلی نے بھی اس پہلو کو اجاگر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ناصر علی، غنی، بیدل اسی چکر میں پڑ کر لطف زبان سے بیگانہ ہو گئے۔

میں آخر میں شبلی کے معاصر معروف پادری جان مالکم (۱۹۱۱ء) کا حضرت علامہ کی علمی وادبی فتوحات کے بارے میں یہ بیان نقل کرنا چاہتا ہوں:

www.shibliacademy.org

جن صاحبوں نے علامہ ممدوح کی بیش بہا تصانیف تاریخ علم کلام، الفاروق، الغزالی، شعر العجم، موازنہ انیس و دبیر و مجموعۂ رسائل شبلی کا مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ اردو زبان میں یہ تصانیف بہ لحاظ عالمانہ ومحققانہ وفلسفیانہ استدلال و انداز کے کسی مستند یورپی تصنیف سے کم نہیں ہیں۔ علامہ ممدوح کی تصانیف کی سب سے بڑی خصوصیت فلسفیانہ تحقیق و تدقیق، مضبوطی رائے و منطقیانہ استدلال ہے، ان میں ایک قسم کی ارجنالٹی یعنی جدت بھی ہے اور طرز ادا میں دل آویزی اور عام فہمی کا خیال ملحوظ رکھا گیا ہے۔

ایرانی فضلا نے فارسی ادب کی تاریخ پر متعدد کتابیں شائع کی ہیں۔ ان میں سب سے مفصل ذبیح اللہ صفا کی کتاب تاریخ ادبیات در ایران ہے۔ یہ سترہ اٹھارہ جلدوں میں ہے۔ سعید نفیسی نے دو جلدوں میں تاریخ نظم و نثر در ایران و در زبان فارسی لکھی ہے۔ جلال الدین ہمائی ایک دوسرے معروف ایرانی استاد اور دانشور ہیں، جنھوں نے تاریخ ادبیات ایران دو جلدوں میں شائع کی ہے۔ ان کے علاوہ بھی چند دیگر تصانیف اس موضوع پر ایران سے شائع ہوئی ہیں۔ لیکن یہ سب علامہ شبلی کی شعر العجم کے بعد منظر عام پر آئی ہیں۔ خود علامہ شبلی کی زندگی ہی میں ایڈورڈ براؤن نے اس موضوع پر اپنی اہم کتاب انگریزی میں لکھی اور علامہ نے اسے دیکھا اور پڑھوا کر سنا۔

شعر العجم کا ۱۹۰۹ سے ۱۹۱۹ تک فارسی میں ترجمہ ہوا۔ اس سے پہلے ۱۳۰۴ سے ۱۳۰۶ھ تک افغانی فضلا نے اس کا ترجمہ کیا اور کابل سے شائع کیا۔ ایک اور افغانی استاد سرور گویا نے بھی اس کی تیسری جلد کا ۱۳۱۵ھ میں ترجمہ کیا اور کابل سے شائع کیا۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ فارسی کے ایرانی اساتذہ شعر العجم سے واقف تھے اور یہ کتاب ان کے مطالعے میں رہی لیکن ایرانیوں نے اپنی متذکرہ بالا تصانیف میں شعر العجم سے استفادہ کا ذکر نہیں کیا۔ اس کے باوجود قوی امکان ہے کہ شعر العجم ایران میں فارسی ادب کی تاریخ پر قلم اٹھانے والوں کے لیے کم از کم ایک محرک ضرور ثابت ہوئی۔

ایک معروف ایرانی استاذ زین العابدین موتمن نے اپنی کتاب شعر و ادب فارسی کے مقدمہ اور دیگر مقامات پر بھی صراحت سے اقرار کیا ہے کہ فارسی ادب کی تاریخ لکھنے والے ایرانی مصنّفین نے شعر العجم سے استفادہ کیا ہے اور شعر العجم بے شک اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ خود زین العابدین موتمن نے اپنی اس کتاب میں شعر العجم کو اپنا رہنما بنایا ہے۔ وہ مقدمہ میں لکھتے ہیں:

www.shibliacademy.org

دراین مقام شایستہ است نام دوتن از محققان و دانش مندان خارجی یعنی پرفسور ادوارد برون مستشرق معروف انگلیسی و پرفسور شبلی نعمانی صاحب کتاب شعرالعجم با تجلیل وتکریم یاد شود چہ اینان درحقیقت ایں باب را در ادبیات فارسی گشودہ و راہنمائی شایستہ دانشمندان ومحققان ایرانی درو ادی تحقیقات وتتبعات علمی وفنی شدہ اند۔

یہ مناسب موقع ہے کہ دو غیر ایرانی دانشوروں اور محققین یعنی معروف انگریز مستشرق ایڈورڈ براؤن اور صاحب شعرالعجم پروفیسر شبلی نعمانی کا احترام اور قدردانی کے طور پر نام لیا جائے، اس لیے کہ ان دونوں ہی نے فارسی ادب میں اس دروازے (یعنی فارسی ادب کی تاریخ لکھنے) کو کھولا ہے اور ایرانی دانشمند اور محققین کی علمی وفنی، تحقیق وجستجو کی وادی میں مناسب راہنمائی کی ہے۔

اسی طرح دانشنامۂ زبان وادب فارسی درشبہہ قارہ میں علامہ شبلی پر جو مقالہ ہے، اس میں بھی شعرالعجم کی بعض انفرادی خصوصیات کا ذکر ہے۔اس مقالہ کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایے:

بیشترین اہمیت کتاب بہ خاطر نقد ہای ادبی آں است۔مثلاً برداشت ہا وتحلیل ہایی از اشعار فردوسی، مقایسۂ شیوۂ داستان سرایی فردوسی ونظامی، تطبیق اصول داستان سرایی شاہنامہ با جدیدترین نظریہ ہا دراین باب ومقایسۂ میان شاعران فارسی زبان مانند سعدی وحافظ در غزل سرایی از نمونہ ہای باارزش وبااہمیت ایں کتاب است کہ درنوع خود بی نظیراست شبلی درمباحث بلاغتی نیز مطالعۂ فراوان داشتہ است، زیرامطالبی کہ دراین بادہ درجلد چہارم آوردہ، بادیدی تازہ وشرح ہا ومثال ہای کاملاً ابتکاری است۔

اس کتاب (شعرالعجم) کی اہمیت بیشتر اس میں ادبی تنقید کی بنا پر ہے۔مثلاً فردوسی کے اشعار سے نتائج اخذ کرنا، ان پر تبصرہ، فردوس اور نظامی کے داستان سرایی کے فن کا ایک دوسرے سے مقابلہ ومقایسہ، شاہنامہ میں داستان سرائی کے اصول کے اس باب میں جدیدترین نظریوں سے تطبیق، فارسی کے شعرا مثلاً سعدی اور حافظ کی غزسرایی کا موازنہ، شعرالعجم کے قیمتی، اہم اور اپنی نوعیت کے بے نظیر حصے ہیں۔شبلی کا علم بلاغت کا مطالعہ بھی وسیع تھا۔اس بارے میں جو مباحث شعرالعجم کی چوتھی جلد میں شامل ہیں، ایک نئے زاویے کا پتا دیتے ہیں، اشعار کی شرحیں اور شعرا کے کلام سے مثالیں اور شواہد مکمل طور پر اچھوتے موضوعات ہیں۔

www.shibliacademy.org

تحقیق منسوبات اور علامہ شبلی نعمانی

ظفر احمد صدیقی

علامہ شبلی نعمانی اردو میں تحقیق اور تنقید دونوں کے بنیاد گزاروں میں ہیں۔ان کی تنقیدی کاوشیں ''موازنۂ انیس ودبیر'' اور ''شعرالعجم '' کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔اس لیے اردو تنقید کے ارتقا میں ان کا ذکر عام طور پر کیا جاتا ہے۔لیکن ان کے تحقیقی مباحث چونکہ ان کی تصانیف اور مضامین ومقالات میں بکھرے ہوئے ہیں۔اس لیے ان کی طرف لوگوں کی توجہ کم ہے اس عدمِ التفات کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کی تحقیق کے موضوعات ادبیات کے دائرے میں محدود نہیں، بلکہ وہ سیرت وسوانح، تاریخ وتمدن اور فلسفہ وکلام کے ابواب تک پھیلے ہوئے ہیں۔

تحقیق کے شعبوں میں ایک اہم شعبہ تحقیق منسوبات بھی ہے۔اس کے تحت کسی کلام یا تصنیف کی نسبت کی تحقیق کی جاتی ہے۔اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ایک یہ کہ اصل شاعر یا مصنف کے بجائے کسی اور کی طرف کلام یا کتاب منسوب ہو جائے اور محقق صحیح نسبت واضح کردے۔دوسرے یہ کہ اصل انتساب کو زمانۂ مابعد میں کسی وجہ سے رد کر دیا جائے۔پھر بعد کا محقق صحیح صورتِ حال کا تعین کردے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اردو میں تحقیق منسوبات سے متعلق اولین تحریر علامہ شبلی نعمانی کی ہے۔انھوں نے اپنی تصنیف 'الغزالی' میں ایک عنوان قائم کیا ہے ''امام غزالی کی مجوث فیہ تصنیفات'' پھر اس عنوان کے تحت ان کتابوں کا ذکر کیا ہے جن کی امام کی طرف نسبت میں شکوک وشبہات کا اظہار کیا گیا ہے۔ہم آئندہ صفحات میں ہر کتاب سے متعلق ضروری مباحث پیش کرتے ہیں۔

سلسلۂ زیر بحث کی پہلی کتاب ''المنخول فی علم الاصول'' ہے جسے اختصار کے

پروفیسر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

www.shibliacademy.org

طور پر 'منخول' بھی کہتے ہیں۔علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ یہ کتاب اصولِ فقہ میں ہے۔صاحب کشف الظنون نے اس کا اندراج "ردّ أبی حنیفة" کے نام سے کیا ہے اور "قلاید العقیان" کے مصنف کا قول نقل کیا ہے کہ وہ امام غزالی کی نہیں بلکہ محمود معتزلی کی تصنیف ہے۔شمس الائمۃ کَردری نے اس کا رد بھی لکھا ہے۔(۱)

علامہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ جن لوگوں نے امام غزالی کی طرف اس کتاب کی نسبت میں شبہے کا اظہار کیا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ اس کتاب میں امام ابوحنیفہؒ پر سخت نکتہ چینی کی گئی ہے اور یہاں تک کہا گیا ہے کہ ان کے ۹۰ فیصد مسائل غلط ہیں۔حالانکہ امام غزالی نے اپنی معرکہ آرا تصنیف، احیاء علوم الدین، میں امام ابوحنیفہؒ کی نہایت مدح کی ہے۔ان حضرات کا یہ بھی کہنا ہے کہ ائمۂ دین کو برا کہنا امام غزالی کی شان سے یوں بھی بعید ہے۔اس لیے ''منخول'' امام غزالی کی تصنیف نہیں ہوسکتی۔

اس بحث میں علامہ شبلی کی راے یہ ہے کہ ''منخول'' امام غزالی ہی کی تصنیف ہے اور اس کی نسبت میں شک وشبہ کرنے والوں کا خیال درست نہیں۔اپنے موقف کے اثبات میں علامہ نے جو دلائل پیش کیے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱- رجال وتاریخ کی تمام کتابوں میں یہ کتاب امام غزالی ہی کی طرف منسوب کی گئی ہے۔

۲- امام غزالی اپنے ابتدائی دور میں نہایت جاہ پسند، خود پرست اور مغرور تھے۔اس وقت ان کا مزاج مجادلہ پسند اور نکتہ چیں واقع ہوا تھا۔لیکن اخیر میں ان کے حالات تبدیل ہوگئے اور وہ کچھ سے کچھ ہوگئے۔''منخول'' اسی ابتدائی دور کی تصنیف ہوگی۔

۳- تیسری دلیل کے طور پر علامہ لکھتے ہیں: ''ہم نے اس کتاب کو دیکھا ہے۔خود اس کی طرز عبارت بتاتی ہے کہ وہ نشۂ شباب کے زمانے کی تصنیف ہے۔''

علامہ کی پہلی دلیل کی تائید میں یہ ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ابن الجوزی (ف ۵۹۷ھ) نے 'المنتظم فی تاریخ الملوک والأمم' میں، ابن خلکان (ف ۶۸۱ھ) نے 'وفیات الاعیان' میں، تاج الدین ابن السبکی (ف ۷۷۱ھ) نے 'طبقات الشافعیة الکبری' میں، ابن الملقن (ف ۷۹۰ھ) نے 'طبقات الشافعیة' میں اور بدرالدین عینی (ف

www.shibliacademy.org

۸۵۵ھ) نے 'عقد الجمان' میں 'المنخول' کا شمار امام غزالی کی تصانیف کے ذیل میں کیا ہے۔ لہٰذا علامہ کا یہ کہنا بجا ہے کہ رجال و تاریخ کی کتابوں میں یہ کتاب امام غزالی ہی کی طرف منسوب کی گئی ہے۔(۲)

علامہ کی دوسری اور تیسری دلیل کے حوالے سے یہ عرض کرنا ہے کہ صاحب 'الأعلام' خیرالدین الزرکلی کی اطلاع کے مطابق 'المنخول' ۱۹۸۰ء تک غیر مطبوعہ تھی۔(۳) اسی طرح 'سیرۃ الغزالی' کے مصنف عبدالکریم عثمان نے بھی اس کو غیر مطبوعہ بتاتے ہوئے یہ اطلاع دی ہے کہ اس کا قلمی نسخہ دارالکتب المصریۃ میں محفوظ ہے۔(۴) لہٰذا یہ بات قابل داد اور لائق تحسین ہے کہ علامہ شبلی نے ۱۹۰۴ء کے آس پاس ایسی کم یاب قلمی کتاب کا نہ صرف مطالعہ کرلیا تھا بلکہ اس کی طرزِ عبارت میں غور کرکے یہ اندازہ بھی لگا لیا تھا کہ یہ نشۂ شباب کے زمانے کی تصنیف ہے۔ علامہ کی تائید ابن الجوزی(۵) اور ابن السبکی(٦) کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ غزالی نے یہ کتاب اپنے استاد امام الحرمین عبدالملک جوینی کی حیات میں لکھی تھی۔ امام الحرمین کا سال وفات ۴۷۸ھ ہے۔ اس وقت غزالی کی عمر ۲۸ سال تھی۔

اس کتاب میں جہاں تک امام ابوحنیفہؒ پر نکتہ چینی کا تعلق ہے تو حافظ ذہبی نے بھی اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ 'سیر أعلام النبلاء' میں لکھتے ہیں: ''غزالی کی 'المنخول' کے اواخر میں ایک امام کے بارے میں ایسا ناپختہ کلام مندرج ہے جس کا یہاں ذکر کرنا میں مناسب تصور نہیں کرتا''۔(۷) 'سیر أعلام النبلاء' کے مرتب و مدون شعیب الأرنؤوط اپنے حاشیے میں لکھتے ہیں:

> ذہبی کی اس عبارت میں ''امام'' سے ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ مراد ہیں۔
>
> ذہبی کو یہ حق ہے کہ وہ امام ابوحنیفہ کے بارے میں غزالی کے اس کلام کو ناپختہ اور ادھ کچرا کہیں۔ کیونکہ اس پر علمیت کے آثار مفقود ہیں۔ یہ کلام غزالی سے اس وقت صادر ہوا جب کہ وہ جدل و مناظرہ کے علوم اور طالب علمانہ لذتوں میں مشغول تھے۔ اس لیے کہ انھوں نے 'المنخول' اپنی علمی زندگی کے آغاز میں تصنیف کی ہے۔ اس کتاب کی زیر بحث فصل کا بیشتر حصہ ان کے استاد امام الحرمین

www.shibliacademy.org

> کی کتاب 'مغیث الحق فی ترجیح القول الأحق' کے فقروں سے ماخوذ ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جسے امام الحرمین نے دوسرے مذاہب کے مقابلے میں مذہب شافعی کو راجح قرار دینے کے لیے تصنیف کیا تھا۔ اس میں غلیظ تعصب اور امام ابوحنیفہ کی شان میں قبیح گستاخی پائی جاتی ہے۔، جس کے سننے سے کان بہرے ہو جاتے ہیں اور جس سے ذوق سلیم نفرت محسوس کرتا ہے۔ وہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی طرف علمائے محققین التفات نہیں کرتے۔ امام کوثری نے 'احقاق الحق' کے نام سے اس کا رد لکھا ہے۔ جو چاہے اس کی طرف مراجعت کر سکتا ہے''۔(۸)

اس سلسلے کی آخری بات یہ ہے کہ عہد حاضر کے علمائے عرب و عجم اب 'المنخول' کو امام غزالی ہی کی تصنیف سمجھتے ہیں۔ امام غزالی کی ایک اور تصنیف 'المستصفیٰ من علم الأصول' کے مرتب و مدون نجویٰ ضو کی اطلاع کے مطابق 'المنخول' دار الفکر، دمشق سے ڈاکٹر محمد حسن ھیتو کی تحقیق سے ۱۹۹۷ء سے قبل شائع ہو چکی ہے۔(۹) اس کا عام ایڈیشن انٹرنیٹ پر بھی دست یاب ہے۔ راقم نے اسی سے استفادہ کیا ہے۔

اس سلسلے کی دوسری کتاب 'المضنون به علی غیر أهله' ہے۔ اس کا موضوع علم کلام ہے۔ اس کے بارے میں علامہ شبلی لکھتے ہیں: ''اس کتاب کی نسبت محدث ابن الصلاح اور علامہ ابن السبکی کا دعویٰ ہے کہ امام کی تصنیف نہیں ہو سکتی۔ دلیل یہ ہے کہ اس کتاب کا مصنف قدم عالم، انکار علم جزئیات اور نفی صفات کا قائل ہے اور ان میں سے ہر عقیدہ کفر کا مستوجب ہے''۔

راقم حروف عرض کرتا ہے کہ علامہ شبلی کا یہ بیان دراصل علامہ مرتضیٰ زبیدی بلگرامی کی 'اتحاف السادۃ المتقین بشرح إحیاء علوم الدین' سے ماخوذ ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان کا پورا بیان نقل کر دیا جائے۔ وہ اپنی شرح کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> ''ابن السبکی کہتے ہیں کہ ابن الصلاح نے ذکر کیا ہے کہ یہ کتاب امام غزالی کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ معاذ اللہ کہ یہ ان کی ہو۔ ابن الصلاح نے اس کے گھڑی ہوئی ہونے کی وجہ بھی بیان کی ہے۔ ابن السبکی کہتے ہیں کہ ابن الصلاح نے

www.shibliacademy.org

جو کچھ کہا وہ حق اور درست ہے۔ اس کتاب میں عالم کے قدیم ہونے کی تصریح اور جزئیات سے متعلق علم قدیم کی نفی کی گئی ہے۔ امام غزالی ان میں سے ہر ایک بات کے قائل کی تکفیر کرتے ہیں اور یہی تمام اہل سنت کا مسلک ہے۔ اس لیے یہ کس طرح مان لیا جائے کہ وہ خود ان باتوں کے قائل ہیں۔ زبیدی کہتے ہیں کہ یہ کتاب میرے پاس موجود ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ ''مسامرہ''(۱۰)، میں لکھا ہوا ہے کہ یہ علی بن خلیل السبتی کی تصنیف ہے۔ اسی طرح صاحب 'تحفة الارشاد' (۱۱) نے بھی تصریح کی ہے کہ غزالی کی طرف اس کتاب کی نسبت جعلی ہے۔ ابوبکر محمد بن عبداللہ المالقی متوفی ۷۵۰ھ نے اس کے رد میں ایک کتاب لکھی ہے''۔(۱۲)

اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ ابن الصلاح اور ابن السبکی کی طرح مرتضیٰ زبیدی نیز بعض دیگر اہل علم بھی امام غزالی کی طرف 'المضنون' کی نسبت کو درست نہیں سمجھتے۔ لیکن جہاں تک علامہ شبلی کا تعلق ہے تو وہ 'المنخول' کی طرح 'المضنون' کو بھی امام غزالی ہی کی تصنیف سمجھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے دلائل حسب ذیل ہیں:

۱- رجال کی تمام مستند کتابوں میں 'المضنون' کو غزالی کی تصنیف شمار کیا گیا ہے۔

۲- خود امام غزالی نے 'جواهر القرآن' میں جو ان کی مسلمہ تصنیف ہے اس کتاب کا ذکر کیا ہے۔

۳- اس کتاب کی امام صاحب کی طرف نسبت کے انکار کے لیے صرف یہ قرینہ کافی نہیں کہ اس کتاب میں بعض ایسے مسائل مذکور ہیں جو ابن الصلاح اور ابن السبکی کے نزدیک موجب کفر ہیں۔ کیونکہ خود ''احیاء العلوم'' میں بہت سی باتیں مذکور ہیں جو بعضوں کے نزدیک کفر کی مستوجب ہیں۔

۴- سب سے آخر میں علامہ لکھتے ہیں: ''لطف یہ ہے کہ یہ مسائل 'مضنون به علی غیر أهله' میں سرے سے مذکور ہی نہیں۔ علامہ ابن الصلاح و ابن السبکی نے معلوم نہیں کن الفاظ سے یہ مسائل مستنبط کیے۔ یہ کتاب شائع ہو چکی ہے اور ہر شخص خود دیکھ کر اس کا فیصلہ کر سکتا ہے''۔

یہاں علامہ شبلی کی پہلی دلیل کے متعلق یہ عرض کرنا ہے کہ 'المنخول' کے برخلاف 'المضنون' کا شمار امام غزالی کی مشہور تصانیف میں نہیں ہوتا۔ اس لیے ابن خلکان کی 'وفیات

www.shibliacademy.org

الاعیان‘ صلاح الدین صفدی کی ’الوافی بالوفیات‘ اور یافعی کی ’مرآۃ الجنان‘ کے علاوہ تراجم و تاریخ کی بیشتر کتابوں میں امام غزالی کی تصانیف کے ذیل میں ’المضنون‘ کا ذکر نہیں ملتا۔ابن صلاح ،ذہبی ،ابن سبکی اور زبیدی نے غزالی کی طرف نسبت کے انکار کے ساتھ ذکر کیا ہے۔اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ رجال کی تمام مستند کتابوں میں ’المضنون‘ کو غزالی کی تصنیف شمار کیا گیا ہے۔

جہاں تک ’جواھر القرآن‘ میں ’المضنون‘ کے ذکر کا تعلق ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہاں بھی علامہ شبلی سے کچھ تسامح ہوگیا ہے۔راقم نے ’جواھر القرآن‘ کو بالاستیعاب دیکھا ہے اس میں ’المضنون‘ کا ذکر کہیں نہیں آیا ہے۔اس کتاب کے مبحث ثانی علوم اللباب میں امام غزالی نے اپنی درج ذیل تصانیف کے نام درج کیے ہیں:

الرسالۃ القدسیۃ ، الاقتصاد فی الاعتقاد ، المستظھری ، تھافۃ الفلاسفۃ ، حجۃ الحق ، قواصم الباطنیۃ ، مفصل الخلاف ، محک النظر ، معیار العلم ۔(۱۳)

البتہ علامہ شبلی کا یہ معارضہ نہایت قوی ہے کہ اس کتاب میں وہ مسائل سرے سے مذکور ہی نہیں جن کی بناپر امام غزالی سے اس کتاب کی نسبت کا انکار کیا جارہا ہے۔عصر حاضر کے مصنّفین میں عبدالکریم عثمان کی بھی یہی رائے ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ’’اس نام کی جو کتاب ہمارے سامنے موجود ہے اس میں ایسا کچھ نہیں پایا جاتا جس کی وجہ سے امام غزالی کی طرف اس کی نسبت میں شک کیا جائے‘‘۔(۱۴) راقم نے خود بھی اس کتاب کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ علامہ شبلی کا بیان بالکل درست ہے۔اس میں مذکورالصدر مسائل مذکور نہیں۔

اس سلسلے کی آخری بات یہ ہے کہ عرب علما اور محققین ’المضنون‘ کی نسبت کے بارے میں آج بھی مختلف الراے ہیں ۔ چنانچہ زکی مبارک ،ڈاکٹر عنانی ،عامر نجار،عبدالرحمٰن بدوی اور سعید عودہ امام غزالی کی طرف اس کی نسبت کو درست نہیں سمجھتے ۔اس کے برخلاف ڈاکٹر صلیبہ، ڈاکٹر عیاد،سلیمان دنیا اور عبدالکریم عثمان اسے غزالی ہی کی تصنیف مانتے ہیں۔(۱۵)

سلسلۂ زیر بحث کی تیسری کتاب ’النفخ و التسویۃ‘ ہے۔اس کا اصل نام

www.shibliacademy.org

'المضنون الصغیر' ہے۔'مجموعة رسائل الامام الغزالی، مرتبہ ابراہیم امین محمد میں یہ 'الأجوبة الغزالية في المسائل الأخروية' کے نام سے شامل ہے اسے کتاب کے بجائے رسالہ کہنا چاہیے۔ کیونکہ یہ محض دس صفحات پر مشتمل ہے۔ علامہ شبلی نے اس کی نسبت سے متعلق بہت مختصر گفتگو کی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> شرح احیاء العلوم میں علامہ مرتضیٰ حسینی نے اس کتاب کو جعلی قرار دیا ہے۔لیکن کسی قسم کی کوئی دلیل نہیں پیش کی۔ نہ کسی اور شخص کا قول اس کی تائید میں نقل کیا ہے۔

ممکن ہے یہ رسالہ علامہ شبلی کو دستیاب نہ ہوسکا ہو اور اسی بنا پر انہوں نے اختصار سے کام لیا ہو۔ سعید عودہ نے اکتوبر ۲۰۰۹ء میں اس رسالے سے متعلق ایک مضمون 'نظرات في كتاب المضنون الصغير' کے عنوان سے لکھا ہے، جو انٹرنیٹ پر دست یاب ہے۔

سعید عودہ 'المضنون به علی غیر أهله' کی طرح 'المضنون الصغیر' کو بھی جعلی کتاب تصور کرتے ہیں۔ انہوں نے مقدمۂ رسالہ نیز فصل ثانی، ثالث، رابع، خامس اور سادس کے اقتباسات پیش کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ امام غزالی نے یہ کتاب خود نہیں لکھی ہے، بلکہ ان سے کچھ سوالات کیے گئے ہیں جن کے انھوں نے جوابات دیے ہیں ۔ یہ رسالہ انھیں سوالات و جوابات کا مجموعہ ہے۔ چونکہ سائل اور مرتب رسالہ دونوں مجہول ہیں۔ اس لیے غزالی کی طرف اس کی نسبت بھی مشکوک ہے۔ سعید عودہ نے اس کتاب کے مواد و مشتملات کو بھی نشانۂ تنقید بنایا ہے۔ راقم نے امام غزالی کے اصل رسالے اور سعید عودہ کے مضمون دونوں کا مطالعہ کیا ہے۔ ہمارے خیال کے مطابق سعید عودہ کے پیش کردہ تمام مباحث مزید غور وفکر کے محتاج ہیں۔ ان کی بنیاد پر نہ تو اس رسالے کو جعلی کہا جاسکتا ہے اور نہ یہ دعویٰ کیا جاسکتا کہ اس کے مشتملات عقائد اہل سنت والجماعت کے برخلاف ہیں۔

اس سلسلے کی آخری کتاب 'سر العالمین و کشف مافی الدارین' ہے۔ علامہ شبلی کے نزدیک یہ کتاب بے شبہ جعلی ہے اور امام غزالی کی طرف غلط طریقے سے منسوب کردی گئی ہے۔ علامہ کے دلائل حسب ذیل ہیں:

www.shibliacademy.org

۱-اس کتاب کی طرز عبارت اور انداز تحریر امام صاحب کے طریقۂ تحریر سے بالکل الگ ہے۔

۲-جعل بنانے والے نے جا بہ جا امام الحرمین کی استادی کا ذکر کیا ہے۔لیکن یہی امر کتاب کے جعلی ہونے کی کافی دلیل ہے۔کیونکہ امام صاحب کی یہ خاص عادت ہے کہ وہ اپنے اساتذہ اور شیوخ کا مطلق ذکر نہیں کرتے۔

یہاں پہلی بات یہ عرض کرنی ہے کہ 'سر العالمین' مطبوعہ کتاب ہے۔یہ ۱۳۸۵ھ/ ۱۹۶۵ء میں نجف اشرف،ایران سے بھی چھپ چکی ہے اور 'مجموعة رسائل الغزالي' میں بھی شامل ہے۔اس کے مطالعے سے علامہ شبلی کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے کہ اس کا انداز تحریر امام غزالی کے انداز تحریر سے بالکل مختلف ہے۔علامہ کا یہ کہنا بھی درست ہے کہ جعل بنانے والے نے امام الحرمین کی استادی کا ذکر کیا ہے۔لیکن یہ ذکر جا بہ جا نہیں،پوری کتاب میں صرف ایک جگہ،مقالہ تاسعہ،میں آیا ہے۔امام غزالی نے 'المنخول' کے آخر میں بھی امام الحرمین کا ذکر ایک یا دو بار کیا ہے۔اس لیے محض اس بنیاد پر اس کتاب کو جعلی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ہمارے خیال میں جعل بنانے والے کی اصل چالاکی یہ ہے کہ اس نے اس کتاب میں امام غزالی کی کتابوں کے حوالے بہ کثرت دیے ہیں اور اس طرح یہ تاثر دینا چاہا ہے کہ یہ کتاب اصلی ہے۔

دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ علامہ شبلی نے اس کتاب کے مواد و مشتملات کے حوالے سے کوئی گفتگو نہیں فرمائی۔حالانکہ اس کا جعل اس کے مشتملات ہی سے ظاہر ہوتا ہے۔بہرحال علامہ کے موقف کی تائید میں عرض کیا جاتا ہے کہ یہ کتاب ترتیب خلافت کے سلسلے میں عموماً اور حضرت عمرؓ کے سلسلے میں خصوصاً شیعی نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتی ہے۔حالانکہ امام غزالی کا اہل سنت والجماعت سے ہونا متفق علیہ ہے۔چنانچہ حافظ ذہبی نے سیر أعلام النبلاء میں امام غزالی کے تذکرے میں لکھا ہے کہ ابوالمظفر سبط ابن الجوزی نے اپنی کتاب 'ریاض الافهام في مناقب أهل البيت' میں 'سر العالمین' سے متعدد ایسے اقتباسات نقل کیے ہیں جو فرقۂ امامیہ کے مزعومات کی ترجمانی کرتے ہیں۔پھر آخر میں سبط ابن الجوزی کی رائے نقل کی ہے کہ اگر یہ خیالات امام غزالی کے ہیں تو امید کی جاتی ہے کہ انھوں نے ان سے توبہ کرلی ہوگی،ورنہ اس کا بھی امکان ہے کہ یہ کتاب جعلی ہو اور غزالی کی طرف غلط طریقے سے منسوب کردی گئی ہو۔

www.shibliacademy.org

اس کتاب سے متعلق جدید تحقیقات بھی علامہ شبلی کے موقف کی تائید کرتی ہیں۔ تہران سے شائع ہونے والے رسالہ ''معارف'' شمارہ جنوری ۱۹۹۱ء میں علی رضا ذکاوتی قراگزلو کا ایک مضمون شائع ہوا ہے، جس کا اردو ترجمہ سندھ یونیورسٹی، جام شورو، پاکستان کے سابق استاد ڈاکٹر نجم الاسلام مرحوم نے کیا تھا۔ یہ مجلۂ تحقیق، جام شورو کے شمارہ ۱۰۔۱۱ میں شامل ہے۔ اس مضمون کے اہم نکات یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

۱- کتاب 'سر العالمین و کشف مافی الدارین' کے بارے میں اب غالب نظریہ یہ ہے کہ محمد غزالی کی طرف اس کے انتساب کو رد کرتے ہیں۔

۲- مسئلے کو جو چیز حساس بناتی ہے یہ ہے کہ 'سر العالمین' کے لکھنے والے کا اعتقاد تشیع پر ہے اور اگر اس کتاب کو غزالی سے منسوب کر دیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آخر عمر میں غزالی کو تسنن میں اصرار پر پشیمانی ہے۔

۳- مرحوم جلال ہمائی ان میں سے ہیں جو اس کتاب کے غزالی سے انتساب کو قطعی طور پر رد کرتے ہیں۔ مسلم یہ ہے کہ کتاب 'سر العالمین' کو عمداً غزالی کے نام سے گھڑا گیا ہے اور شہرت دی گئی ہے اور مقاصد کچھ اس قبیل کے ہیں کہ غزالی کو باطنیہ اور شیعہ کا طرف دار بنا کر پیش کیا جائے یا ان کو جعل، خرافات اور اعتقادِ موہومات کے ذریعے بے اعتبار کیا جائے۔

۴- اس کتاب میں کلمۂ ''عشق'' عرفانی معنوں میں لایا گیا ہے اور کلمۂ ''مشاہدہ'' بھی اس طرح استعمال ہوا ہے کہ جیسا کہ فارسی ادبیات میں استعمال ہوتا ہے۔ نیز ''طائفۂ الٰہیہ'' اور ''قیل و قال'' جیسی ترکیبیں استعمال کی گئی ہیں۔ اسی طرح کلمۂ ''قدم'' بیت الخلاء کے معنوں میں آیا ہے جو عربی قدیم و فصیح سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔ ان سب سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا مصنف کوئی ایرانی عربی نویس ہے۔(۱۶)

علی رضا ذکاوتی کے پیش کردہ نکات کے بعد راقم عرض کرتا ہے کہ 'سر العالمین' کے 'مقالۂ تاسعہ' میں مصنف کی طرف سے دعویٰ کیا گیا ہے کہ اس نے بوعلی ابن سینا کی کتاب 'الموسیقی' کی شرح 'کتاب السبیل لابناء السبیل' کے نام سے لکھی ہے۔(۱۷) یہ بیان بھی اس کتاب کے جعلی ہونے کے من جملہ شواہد میں سے ایک شاہد ہے۔ اس لیے کہ امام غزالی نے

www.shibliacademy.org

فن موسیقی میں سرے سے کوئی کتاب ہی نہیں لکھی، چہ جائیکہ وہ ابن سینا کی کتاب موسیقی کی شرح لکھیں۔ پھر ان کی تصانیف کی فہرست میں 'السبیل لأبناء السبیل' نام کی کوئی کتاب بھی شامل نہیں۔ بلکہ ان کے سوانح نگار موسیقی سے ان کی واقفیت کا کوئی ذکر بھی نہیں کرتے۔ لہٰذا علامہ شبلی کا یہ موقف بالکل درست ہے کہ یہ کتاب جعلی ہے۔

گذشتہ صفحات میں جو کچھ عرض کیا گیا اس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ علامہ شبلی اردو میں تحقیق منسوبات کے بنیادگزاروں میں ہیں اور یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ امام غزالی کی بعض تصنیفات کے سلسلے میں انھوں نے نفیاً یا اثباتاً جو موقف اختیار کیا تھا وہ صائب اور درست تھا۔ کیونکہ متقدمین ومتاخرین علما اور محققین کے بیانات اور تحقیقات سے ان کے موقف کی تائید ہوتی ہے۔

حواشی

(۱) صاحب کشف الظنون کی اصل عبارت یہ ہے: قال صاحب قلائد العقیان هو لیس لحجة الاسلام، بل هو علی ماکتب فی حاشیة نسخة منه لمحمود الغزالی، شخص من المعتزله، وقد أدی ذلك شمس الأئمة الکردری إلی التعصب إلی أن ردّه ...... وإن کان هو لحجة الاسلام فمن تالیفاته فی أول طلبه لأنه خلاف مافی الاحیاء من مناقبه (کشف الظنون عن أسامی الکتب والفنون، کاتب چلپی، استنبول ۱۹۴۱ء، ۱/ ۸۳۷)۔ قلائد العقیان فی محاسن الأعیان کے مصنف کا نام فتح بن خاقان اشبیلی ہے (بہ حوالہ معجم المطبوعات العربیة: ۲/ ۱۴۳۴۔۱۴۳۵)۔ (۲) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو 'سیرة الغزالی وأقوال المتقدمین فیه، عبدالکریم عثمان، دارالفکر، دمشق، بدون سنة۔ (۳) الأعلام، خیرالدین الزرکلی، المجلد السابع، دارالعلم للملایین، بیروت، الطبعة الخامسة ۱۹۸۰ ص ۲۲۔ (۴) سیرة الغزالی، ص ۱۲۵۔ (۵) المنتظم فی تاریخ الملوك والأمم، ابوالفرج ابن الجوزی، دائرة المعارف العثمانیة، حیدرآباد ۱۳۵۹ ہج، ص ۱۶۸۔ (۶) طبقات الشافعیة الکبری، تاج الدین عبد الوهاب بن علی السبکی، المجلد السادس، تحقیق عبدالفتاح محمد الحلو، محمود محمد الطناحی، دار إحیاء الکتب العربیة، القاهرة، بدون سنة، ص ۲۲۵۔ (۷) سیر أعلام النبلاء، شمس الدین محمد بن أحمد الذهبی، المجلد التاسع عشر، تحقیق شعیب الأرنؤوط، الطبعة الأولی ۱۹۸۴م ص ۳۴۴۔ ذہبی کی اصل عبارت یہ ہے: "وفی أواخر المنخول للغزالی کلام فجّ فی إمام

www.shibliacademy.org

لاأری نقله هنا"۔(۸) ایضاً بہ حوالہ بالا۔اصل عبارت حسب ذیل ہے:

والمراد بالإمام أبو حنيفة رحمه الله وحق للذهبی أن ينعت كلامه بأنه فجّ،فإنه ليس عليه أثارة من علم ، وقد صدر عنه حين كان متلبسا بعلوم الجدل وحظوظ طلبة العلم ، فإنه صنف المنحول فی أول حياتة العلمية .ومعظم مافی هذا الفصل من فقر مأخوذة من كتاب شيخه إمام الحرمين 'مغيث الخلق فی ترجيح القول الأحق ،الذی ألفه فی ترجيح مذهب الشافعی علی غيره من المذاهب ،وفيه من التعصب الفظيع ،والحط الشنيع علی الإمام أبی حنيفة رحمه الله ماتصم عنه الأسماع ، وتنبو عنه الأذواق .وهو مما لايلتفت إليه عند المحققين من العلماء ذوی النصفة ،وقد صنف الإمام الكوثری فی الردعليه كتاب 'احقاق الحق' فليرجع إليه من شاء ۔

(۹)المستصفیٰ من علم الاصول ، ابوحامد الغزالی،تحقیق،نجویٰ ضوّ داراحیاء التراث العربی،بیروت ۱۹۹۷ص۱۰۔(۱۰)'المسامرة' محی الدین بن عربی کی تصنیف ہے۔زبیدی نے اس کا ذکر مقدمۂ شرح احیاءالعلوم میں غزالی کی تصنیف 'منهاج العابدين ' کے تعارف میں کیا ہے۔(بہ حوالہ سیرۃ الغزالی ص ۱۹۵)۔(۱۱)تحفة الإرشاد إلی سبيل الرشاد ،اسماعیل بن أبی بکر معروف بہ ابن المقری (ف ۸۳۷ھ) کی تصنیف ہے۔زبیدی نے اس کا ذکر مقدمۂ شرح احیاءالعلوم کے ابتدائی صفحات میں کیا ہے۔(بہ حوالہ سیرۃ الغزالی ص۱۵۳)۔(۱۲) بہ حوالہ سیرۃ الغزالی ص۱۹۷۔(۱۳)جواهر القرآن ، أبو حامد الغزالی ، المبحث الثانی ، علوم اللباب ، ص۲۰۔

(۱۴)سیرۃ الغزالی ص۷۲۔اصل عبارت یہ ہے:"والكتاب الذی بين أيدينا بهذا العنوان لا يحتوی بشيئی من هذالقبيل " ۔(۱۵)تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: نظرات فی كتاب المضنون الصغير،سعیدعودۃ۔ (۱۶)' کچھ سرالعالمین کے غزالی سے انتساب کے بارے میں'علی رضا ذکاوتی فراگزلو،مترجم ڈاکٹر نجم الاسلام، تحقیق،شمارۂ خاص (۱۱۔۱۰)۹۷۔۱۹۹۶ء ص۴۰۷۔۴۱۰۔(۱۷)اس موقع کی اصل عبارت یہ ہے:'ولكن المغنی عالماً بطريق الأغانی ،مطلعاً علی كتاب الموسيقی الموضوع للرئيس أبی علی بن سينا ، وقد شرحناه فی كتاب السبيل لأبناء السبيل " (سرالعالمين ،مشمولہ مجموعة رسائل الغزالی ص۴۹۰)

www.shibliacademy.org

علامہ شبلی کے ایام علی گڑھ کی اولین تصنیف
''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم''۔ایک تعارفی مطالعہ

پروفیسر ظفرالاسلام اصلاحی

علامہ شبلی نعمانیؒ (۱۸۵۷۔۱۹۱۴ء) ممتاز سیرت نگار، عظیم مفکر، ماہر تعلیمات اور نامور اہلِ قلم کی حیثیت سے کافی مشہور ہیں۔ان کی علمی زندگی کے مختلف ادوار ہیں جو اعظم گڑھ، علی گڑھ، حیدرآباد، لکھنؤ اور اعظم گڑھ میں گذرے، لیکن اس اعتبار سے ان کے ایّام علی گڑھ خاص اہمیت رکھتے ہیں کہ ان کی متعدد وقیع ومقبول تصانیف اسی دور کی یادگار ہیں۔(بلا شبہ سیرۃ النبیؐ ان کی شاہکار تالیف ہے، اس کا موازنہ ان کی کسی دیگر کتاب سے نہیں کیا جا سکتا)۔علامہ شبلی نے علی گڑھ میں ایم۔اے۔او کالج کے ایک نامور استاد کی حیثیت سے تقریباً ۱۵ برس بسر کیے۔یہاں تدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف کا مشغلہ بھی جاری رہا(۱)۔انھوں نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا، ان میں مسلمانوں کی تعلیم بھی شامل ہے(۲)۔زیر مطالعہ کتاب کا تعلق اسی موضوع سے ہے اور یہ اس لحاظ سے خاص اہمیت کی حامل ہے کہ یہ صاحب کتاب کے ایام علی گڑھ کی اولین نثری تصنیف ہے۔یہاں یہ واضح رہے کہ کالج سے وابستگی کے بعد علامہ شبلی کی اولین مطبوعہ تصنیف ''مثنوی صبح امید'' ہے جو ۱۸۸۶ء میں شایع ہوئی۔اسے ان کے شاگرد عزیز مولانا سید سلیمان ندویؒ نے بجا طور پر ''علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کا خوش آئند مرقع'' قرار دیا ہے(۳)۔زیر تعارف رسالہ اصلاً سرسید احمد خاں کی تحریک پر پہلے مقالہ کی صورت میں مسلم ایجوکیشنل کانفرس کے اجلاس دوم (منعقدہ ۲۷/دسمبر ۱۸۸۷ء بہ مقام بارہ دری، قیصر باغ، لکھنؤ) کے لیے تیار کیا گیا تھا اور جب کانفرنس کے

شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

www.shibliacademy.org

اجلاس میں یہ مقالہ پیش کیا گیا تو کافی پسند کیا گیا اور پورے ملک میں اس کا شہرہ پھیل گیا۔ بقول مولانا سید سلیمان ندوی ''مسلمانوں کے کانوں میں اپنے بزرگوں کے کارناموں کی یہ پہلی آواز آئی اور سارے ملک میں اس خطبہ کی دھوم مچ گئی۔ یہی وہ مطلع ہے جس سے علامہ شبلی کی شہرت کا آفتاب سب سے پہلی دفع طلوع ہوا'' (۴)۔ بعد میں یہ مقالہ سرسید کی خاص دلچسپی سے کتابی صورت میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔

یہ مختصر کتاب (مشتمل بر ۸۰ صفحات) ''بہ قامت کہتر و بہ قیمت مہتر'' کی مصداق ہے۔ اس کتاب کی پہلی اہمیت اس کی ترتیب وطباعت کے پس منظر سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس کی مختصر وضاحت یہ ہے کہ تعلیم کی اشاعت بالخصوص مسلمانوں کے تعلیمی مسائل کا حل سرسید مشن کا مرکزی نکتہ تھا۔ اسی مشن کو مزید آگے بڑھانے اور اس کے تئیں قوم کو بیدار کرنے کے لیے انہوں نے ۱۸۸۷ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانگریس (جو بعد میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے معروف ہوئی) قایم کی۔ علامہ شبلی اس کے سرگرم کارکنوں میں سے تھے۔ اس کی سرگرمیاں شروع ہونے کے بعد بانیِ محترم نے اپنے حلقۂ میں اہل علم اور قوم کے بہی خواہوں سے یہ فرمایش کی کہ وہ تعلیم سے متعلق موضوعات پر کانفرس کے آئندہ سالانہ اجلاس میں پیش کرنے کے لیے اپنی نگارشات تیار کریں۔ علامہ شبلی نے اپنے لیے ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' موضوع منتخب کیا (۵)۔ سرسید نے نہ صرف اسے پسند کیا، بلکہ صاحب مقالہ کے نام کے ساتھ یہ اعلان بھی شائع کرادیا کہ وہ کانفرنس کے آئندہ لکھنؤ میں منعقد ہونے والے اجلاس میں اس موضوع پر مقالہ پیش کریں گے۔ علامہ شبلی نے ۸رمئی ۱۸۸۷ء کو اپنے ایک عزیز کو خط لکھتے ہوئے اس اشتہار کی اطلاع دی اور یہ عزم بھی ظاہر کیا کہ وہ پوری محنت سے جی جان لگا کر یہ مقالہ تیار کریں گے۔ وہ اپنے ایک عزیز اور محبوب شاگرد مولوی محمد سمیع کو نینی تال (جہاں وہ سرسید کے ساتھ سکونت پذیر تھے) سے لکھتے ہیں: محمڈن تعلیمی مجلس اس سال لکھنؤ میں ہوگی، اشتہار میں شایع کیا گیا ہے کہ شبلی ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم پر'' ایک وسیع مضمون پڑھیں گے۔ شاید یہ مضمون میں جی جان سے لکھوں اور گراں مایہ لکھوں (٦)۔ مزید براں سرسید نے اس مقالہ کی تیاری اور آئندہ اجلاس میں پیش کیے جانے کی اطلاع مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے تمام ممبران کو فرداً فرداً بھی خط کے ذریعہ دی (۷)۔ کچھ عرصہ

www.shibliacademy.org

بعد جب اسے مکمل کر کے سر سید کی خدمت میں پیش کر دیا تو انہوں نے اس موقع پر یہ تاثر بھی ظاہر کیا کہ بہت سے احباب نے اجلاس کے لیے مقالہ لکھنے کا وعدہ کیا تھا، مولانا شبلی اسے پورا کر کے قرآن کریم کی اس آیت (والموفون بعهدهم اذا عاهدوا) کا مصداق بن گئے (۸)۔ اجلاس میں پیش کیے جانے کے بعد جب اس مقالہ کو عام پسندیدگی و مقبولیت ملی تو سر سید نے بڑے اہتمام سے اسے کتابی صورت میں قومی پریس لکھنؤ سے جون ۱۸۸۸ء میں طبع کرایا۔ اس رسالہ کی طباعت میں اہتمام اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے اولین مراحل جنوری ۱۸۸۸ء میں شروع ہو گئے تھے اور یہ اصلاً جون میں طبع ہوا۔ علامہ شبلی اپنے بھائی (محمد اسحاق) کو ایک خط (مکتوبہ ۱۴؍جنوری ۱۸۸۸ء) میں اس کی طباعت شروع ہونے کی اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کانگریس (مسلم ایجوکیشنل کانفرنس) بے مثل اور توقع سے زیادہ کامیاب رہی۔ افسوس کہ تم نہیں تھے، مگر اکبر حسین (مشہور شاعر اکبر الہ آبادی) سے تاکید کی تھی کہ تمام حالات سے تم کو اطلاع دیں گے۔ میرا مضمون علاحدہ چھپ رہا ہے، چھ جز کی ضخامت ہو گی۔ قصیدہ اس مضمون اور روئداد دونوں کے ساتھ چھپے گا'' (۹)۔ سر سید کی نگاہ میں اس کی قدر و قیمت اس بات سے اور واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے اس رسالہ کی مطبوعہ کاپیاں کانفرنس کے تمام ممبروں کو ارسال کرنے کا اہتمام کیا اور انہیں اس سے مطلع کرتے ہوئے یہ لکھا: ''لاجواب مضمون مولوی محمد شبلی صاحب کا جو مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم پر تھا وہ تیار ہو گیا ہے اور ممبروں کی خدمت میں روانہ کر دیا گیا ہے'' (۱۰)۔ بعض قرائن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سر سید اس کی کاپیاں کالج کے بہی خواہوں کو وقتاً فوقتاً بھیجتے رہے۔ نومبر ۱۸۸۹ء میں جب نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا ممبر بننے کی خواہش ظاہر کی تو اس پر دلی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے سر سید نے جوابی خط میں انہیں کانفرنس کی سرگرمیوں کی تفصیلات سے آگاہ کیا اور خط کے ساتھ انہیں یہ رسالہ بھیجتے ہوئے یہ تحریر فرمایا:

''مولوی شبلی صاحب نے تاریخانہ مضمون گذشتہ تعلیم مسلمانان پر اختیار کیا۔ وہ رسالہ مرسل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نہایت عمدہ اور مفید چیز تیار ہو گئی'' (۱۱)۔ یہاں یہ ذکر بھی اہمیت سے خالی نہ ہو گا کہ یہ رسالہ جون ۱۸۸۸ء میں طبع ہوا اور تقریباً ایک ماہ کے اندر ہی سر سید نے اس پر تفصیلی ریویو لکھا جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے شمارہ ۱۰؍جولائی، ۱۸۸۸ء میں شایع ہوا۔ یہ تبصرہ بہت جامع

www.shibliacademy.org

ہےاوراس سے زیر بحث رسالہ کی قدر و قیمت اورزیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ یہاں اس کا ایک حصہ نقل کرنا برمحل معلوم ہوتا ہے۔سرسید رقم طراز ہیں:

''گو یہ رسالہ صرف اسّی صفحہ کا ہے،مگر مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم کے حالات کا ایسا جامع ہے کہ بڑی کتابوں میں بھی یکجا اس قدر حالات نہیں مل سکتے۔ مصنف نے خود ایک جگہ لکھا ہے کہ اس امر کے لیے''جس قسم کے ضروری حالات درکار ہیں یعنی فلسفۂ یونانی وغیرہ کے ترجمے، مترجموں اور تصنیفات کے نام، اسلامی دارالعلوم اور مدرسوں کے تفصیلی طریقے، نصاب تعلیم،غرض اس قسم کے حالات مجھ کو کسی مستقل تصنیف میں نہیں ملے''۔ اور درحقیقت جہاں تک کہ کتابیں معلوم ہیں ان میں اس ترتیب وتفصیل سے حالات نہیں ملتے ہیں۔مگر ہم مصنف کی کوشش بلیغ اور تلاش وسیع کی تعریف کرتے ہیں کہ اس نے متفرق اور پریشاں مقامات سے چن چن کر ان حالات کو جمع کیا ہے۔کبھی خلفائے بنی امیہ اور عباسیہ کی تاریخوں کو ڈھونڈنا پڑا،کبھی امراء کے حالات کو ٹٹولنا،کبھی علماء کے طبقات کی تاریخ پڑھنی پڑی اور کبھی شعراء کی۔انگریزی مصنفوں کی تصنیفات میں سے جو کچھ ملا اس کو بھی دامن پھیلا کر احسان مندی سے لینا پڑا اور آخر کار اپنے ارادہ میں کامیاب ہوا''۔(۱۲)

اس سے اہم بات یہ کہ اس رسالہ میں علامہ شبلی نے سرسید کی قایم کردہ سائنٹفک سوسائٹی کی کارکردگی پر بعض پہلو سے نقد کیا تھا۔سرسید نے اسے نہ صرف بسروچشم قبول کیا بلکہ اسی ریویو میں یہ بھی لکھا:''مصنف نے نہایت سچا اور واقعی اعتراض ہماری سائنٹفک سوسائٹی پر کیا جس کو ہم کسی طرح نظرانداز نہیں کرسکتے''(۱۳)۔سچ یہ کہ آج کے دور میں اپنی تقریر یا تحریر پر کسی (جب کہ معترض خورد ہے) کے نقد واعتراض کو اس صاف گوئی سے قبول کرنے کی مثال کہاں ملتی ہے۔ افسوس کہ بعض حضرات نے علامہ شبلی کے اس علمی اعتراض کو ان کے اور سرسید کے مابین اختلاف کی ابتداء سے منسوب کردیا ہے،جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔مزید براں سرسید کی نگاہ میں اس رسالہ کی قدرو قیمت اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اس کی طباعت کے بعد انسٹی ٹیوٹ گزٹ

www.shibliacademy.org

کے متعدد شماروں میں اپنے نام سے اشتہار شایع کرتے رہے اور شایقین یا خریداروں کو متوجہ کتنے کے لیے ہر اشتہار میں با قاعدہ یہ تفصیل دیتے رہے کہ بہ یک وقت ایک سے نو کا پیاں، دس کا پیاں اور بیس کا پیاں خریدنے پر کیا رعایتی قیمت ہوگی اور اشتہار کے آخر میں معلن (سرسید) کی جانب سے یہ نوٹ بھی رہتا تھا جن صاحب کو خریداری منظور ہو رقم سے طلب فرمائیں (۱۴)۔ اس دور میں بعض دیگر رسائل میں بھی اس رسالہ پر تبصرے شایع ہوئے۔ جب ماہنامہ دلگداز (لکھنؤ) میں اس پر تبصرہ لوگوں کی نظر سے گذرا تو اس کی شہرت و مقبولیت اور زیادہ بڑھ گئی۔ مولانا عبدالحلیم شرر کے الفاظ میں: ''یہ لکچر مسلمانوں کی نظر میں ایک نئی اور بہت ہی دلچسپ چیز تھا۔ چنانچہ جب اس پر دلگداز میں ریویو ہوا تو کوئی نہ تھا جو اس کے دیکھنے کا مشتاق نہ ہوا ہو''۔ (۱۵)

ان تمام باتوں سے قطع نظر حقیقت یہ کہ اس رسالہ کی اصل قدر و قیمت اس کے مشتملات کے مطالعہ کی روشنی میں واضح ہوگی۔ اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ علامہ شبلی کی ایام علی گڑھ کی اولین علمی کاوش موضوع کی اہمیت، مباحث کی وسعت و جامعیت، تحقیق کے معیار اور زبان و بیان کی عمدگی کے اعتبار سے امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ سرسید نے اسے بجا طور پر ''لاجواب'' اور ''بے نظیر'' مضمون سے تعبیر کیا ہے (۱۶)۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ مقالہ یا رسالہ مورخانہ ہے یہ بات بخوبی معروف ہے کہ سیرت و تاریخ علامہ شبلی کا پسندیدہ موضوع تھا۔ ان کی تمام مشہور تخلیقات (بالخصوص عہد علی گڑھ سے تعلق رکھنے والی) اس کی شاہد ہیں۔ مثال کے طور پر المامون، سیرۃ النعمان، سفرنامہ روم و مصر و شام، الفاروق، الجزیہ، کتب خانہ اسکندریہ، اسلامی شفاخانے اور حقوق الذمیین کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ علامہ شبلی کی جانب سے مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم کے موضوع پر مقالہ لکھنے کی تجویز پیش کرنے کے بعد ہی (یعنی تیار شدہ حالت میں اسے دیکھنے سے پہلے ہی) سرسید نے اسے ''تاریخانہ مضمون'' قرار دے دیا تھا جیسا کہ اس سلسلہ میں کانفرنس کے ممبران کو مرسلہ ان کے اطلاع نامہ سے واضح ہوتا ہے (۱۷) اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ علامہ شبلی نے سرسید سے اس موضوع پر مقالہ تحریر کرنے کا ارادہ ظاہر کرتے ہوئے اس کا خاکہ یا آوٹ لائن بھی پیش کیا تھا۔ بہر حال اس کی تاریخی نوعیت مسلم تھی۔ اس پر مزید ثبوت مولانا عبدالحلیم شرر کے اس رسالہ کے بارے میں اس بیان سے ملتا ہے۔

www.shibliacademy.org

علی گڑھ میں علامہ شبلی کے تصنیفی مشاغل کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: ''اب سید صاحب کے توجہ دلانے سے وہ تاریخی تنقید و تحقیق میں مصروف تھے جس کا سب سے پہلا نمونہ ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' پر ان کا لکچر تھا جسے انہوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے یا تیسرے اجلاس میں پیش کیا تھا'' (۱۸) یہاں یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ علامہ شبلی نے اپنی معروف کتاب ''علم الکلام'' (شایع شدہ ۱۹۰۲ء) کے دیباچہ میں بڑے واضح انداز میں اپنی اب تک کی تصانیف کی تاریخی نوعیت واضح کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''میں نے ابتدائے زمانہ تصنیف سے اپنی تصنیفات کا موضوع تاریخ قرار دیا ہے۔ اب تک جو چیزیں میرے قلم سے نکلیں اور شایع ہوئیں وہ تاریخی ہی تھیں'' (۱۹)۔ ان سب کے علاوہ یہ بھی پیش نظر رہے کہ مقالہ کے عنوان میں لفظ ''گذشتہ'' خود اس کی تاریخانہ نوعیت کی طرف اشارہ کر رہا ہے اور اہم بات یہ کہ اس کے مشتملات پر نظر ڈالنے سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے۔

اس رسالہ پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں درج ذیل مسائل زیر بحث آئے ہیں:

۱- مسلمانوں نے خود سب سے پہلے کن کن علوم کو ایجاد کیا اور ان کی ترویج و ترقی میں قرآن کا کیا کردار رہا ہے۔

۲- دیگر قوموں کے کن کن علوم سے مسلمانوں نے استفادہ کیا اور پھر اپنی کاوشوں سے انہیں کس قدر ترقی دیا۔

۳- عباسی دور میں اہل اسلام میں عقلی و سائنسی علوم کو رواج دینے کے لیے کیا تدابیر اختیار کی گئیں۔

۴- یونانی، فارسی و سنسکرت کی کن کن کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا گیا، ان کے مترجم کون تھے اور کن خلفاء کے زمانہ میں یہ کام ہوا۔

۵- اسلامی تاریخ کے اولین ادوار میں کون کون مدارس اور کہاں قایم ہوئے، ان کے بانی کون تھے اور کن خلفاء یا سلاطین کے عہد میں یہ قایم کیے گئے۔

۶- ان مدارس میں کون اساتذہ مقرر تھے، ان کے پرنسپل کون تھے، کون کون سے مشہور

www.shibliacademy.org

علماء ان مدارس سے فیض یاب ہوئے، اساتذہ کی تنخواہوں اور طلبہ کو وظائف دینے میں کتنی رقوم خرچ ہوتی تھیں۔

۷-ان مدارس میں منہج تدریس کیا تھا اور ان کی درسیات میں کون کون سی کتابیں شامل تھیں۔

سرسید نے اس رسالہ پر اپنے ریویو کی ابتدا میں چند جملوں میں اس کے مباحث کا جو خلاصہ بیان کر دیا ہے وہ بہت جامع ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''مصنف نے نہایت خوبی سے یہ بتایا ہے کہ اسلام نے ابتدا میں کون سے علوم پیدا کیے اور کن کن کو ترقی دی، وہ کس طرح پھیلے اور کس طرح تعلیم ہوتی رہی۔ پھر بنی امیہ اور بنی عباس نے کیا کیا، کس طرح یونانیوں کے علوم اپنے یہاں لائے اور پھر کس طرح ان کو ترقی دے کر ایسے اعلیٰ درجہ تک پہنچایا کہ اگر یونانی بھی زندہ ہوتے تو وہ یہ دیکھ کر متعجب ہو جاتے اور دیکھتے کہ یہ وہی علوم ہیں جو ان کے زمانہ میں مثل بیضۂ مرغ کے تھے، مگر اب اس میں کیسے خوب صورت اور خوش رنگ بال و پر کے بچّے پیدا ہو گئے ہیں۔ ان علوم کا بھی اس میں اشارہ ہے جن کے لیے مسلمان کسی دوسری قوم کے احسان مند نہیں ہیں بلکہ خود ہی ان کے موجد ہیں''۔(۲۰)

یہاں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ اس کتاب کے مشتملات کا ایک اہم پہلو (جیسا کہ اوپر کے اقتباس سے بھی ظاہر ہوتا ہے) اس مسئلہ پر روشنی ڈالنا تھا کہ مسلمانوں نے جب دوسری قوموں سے کچھ علوم حاصل کیے اس وقت ان کی نوعیت کیا تھی اور پھر انہوں نے اپنی دلچسپی اور محنت و لگن سے انہیں کس قدر ترقی دیا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلی کو یہ احساس تھا کہ وہ اس مسئلہ کو اچھی طرح واضح نہیں کر پائے ہیں۔ اسی لیے انہوں نے اس موضوع پر نہ صرف تفصیل سے روشنی ڈالنے، بلکہ ایک مستقل رسالہ تصنیف کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ وہ مذکورہ بیان پر حاشیہ میں لکھتے ہیں: ''اگر زمانہ نے مساعدت کی تو ان تمام باتوں کی تفصیل اس طرح پر جس سے صاف ظاہر ہو جائے کہ مسلمانوں کو جب یہ علوم ملے تھے تو کیا تھے اور ان کی کوششوں نے ہر ایک علم کو کس قدر آگے بڑھا دیا ایک مستقل رسالہ لکھوں گا اور شاید اسی انجمن کے کسی دوسرے جلسے میں اس کے پیش

www.shibliacademy.org

کرنے کا اتفاق ہو(ش)‘‘(۲۱) بہر حال ان تفصیلات سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ’’مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم‘‘ کے مباحث کتنے مفید ہیں اور اس رسالہ نے کتنے دوسرے اہم مباحث کے دروازے کھول دیے۔

اس رسالہ میں علوم وفنون کی اشاعت میں مسلمانوں کی خدمات اوران کے قدیم نظام تعلیم پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ شبلی نے جن نکات پر خاص زور دیا ہے وہ یہ ہیں:

متعدد علوم کی ایجاد اوران کے فروغ میں قرآن کریم کا خاص دخل رہا ہے۔

علوم وفنون کے حصول میں غیر قوموں سے استفادہ میں اہل اسلام نے کوئی شرم نہیں محسوس کی اوران سے جو کچھ سیکھا اس کا پوری طرح اعتراف کیا۔

مسلمانوں نے یونانیوں یا دوسروں سے جن علوم کو حاصل کر کے اپنے یہاں رواج دیا انہیں ترقی دے کر اعلیٰ مقام تک پہنچا دیا۔

اسلامی معاشرہ میں تعلیم کی ترویج میں مدارس کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے اور اسلامی تاریخ کا کوئی دور بھی ان سے خالی نہیں رہا ہے۔

ماضی میں مسلم حکمرانوں اوراصحاب ثروت نے مدارس کے قیام وانصرام میں بڑی فیاضی سے وسائل صرف کیے ہیں۔

زیر مطالعہ رسالہ کا ایک اہم پہلو اس کا تحقیقی انداز ہے۔ واقعہ یہ کہ اس کے موضوع پر مآخذ کی کمیابی یا ان میں متعلقہ مواد کے بکھرے ہونے کے باوجود علامہ شبلی نے جس طرح مختلف النوع کتب سے ریزہ ریزہ کرکے مواد جمع کیا اورانتہائی معلوماتی ومعیاری مقالہ تیار کر دیا وہ یقیناً قابل قدر ہے۔ اس رسالہ کے مآخذ میں (جیسا کہ اوپر سرسید کے ریویو کے حوالے سے واضح کیا گیا) مختلف نوعیت کی کتابیں شامل ہیں، مثلاً خلفاء وسلاطین کی تاریخ، علماء ومصنّفین کی سوانح عمریاں، منظوم تالیفات اور یونانی علوم وفنون سے متعلق انگریزی تصانیف۔ علامہ شبلی نے متعلقہ مآخذ کی تلاش میں کس قدر جستجو کی اور کہاں کہاں سے مواد لے کر جمع کیا، سرسید نے اپنے ریویو میں اس کی عکاسی علامہ شبلی ہی کی زبانی ایک مصرعہ سے کی ہے:

تمتع زہر گوشۂ یافتم زہر خرمنے خوشہ یافتم(۲۲)

www.shibliacademy.org

یہاں یہ ذکر بھی اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ سر سید نے اس کے مآخذ کے تنوع و وسعت پر جو تبصرہ کیا ہے وہ بالکل صحیح ہے، جیسا کہ اس کے مراجع پر نظر ڈالنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان میں تاریخی کتب شامل ہیں اور علماء و امراء پر سوانحی تالیفات بھی، شعراء کی تخلیقات اور انگریزی مصنّفین کی تصانیف بھی۔ دوسرے یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ علامہ شبلی نے ان مآخذ سے صرف نقالی نہیں کی ہے بلکہ ان کے بیانات پر جا بجا محاکمہ بھی کیا ہے، جیسا کہ رسالہ کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ رسالہ کے مآخذ پر ایک سرسری نظر ڈالنے پر یہ حقیقت میرے سامنے آئی کہ اس کی تیاری میں ۴۱ کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے جن میں عربی کی ۳۴، فارسی کی ۱۳ اور انگریزی کی ۴ کتابیں شامل ہیں۔ ان میں ۳۳ کتب کا ذکر باقاعدہ حواشی کی صورت میں ہے اور بقیہ متن کے اندر مندرج ہیں۔ مزید یہ کہ بیشتر مآخذ کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اس سلسلہ میں مزید یہ کہ علامہ شبلی نے باقاعدہ حواشی کی صورت میں حوالہ دینے کا اہتمام کیا ہے۔ اس سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ علامہ شبلی نے ۱۹ ویں صدی عیسوی میں ریفرنسینگ کا وہ طریقہ اختیار کیا جسے بیسویں یا اکیسویں صدی کی دین سمجھا جاتا ہے۔ یہ ساری باتیں درحقیقت علامہ شبلی کے وسعت مطالعہ، تحقیقی ذوق اور تنقیدی زاویہ نظر کی آئینہ دار ہیں۔ بلاشبہ اس میں علی گڑھ کے جدید علمی ماحول کے اثرات سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔

ان سب کے علاوہ زبان و بیان کے لحاظ سے بھی زیر تعارف رسالہ کی اپنی خصوصیت ہے۔ زبان کی سادگی و دلکشی کے ساتھ اس کے اسلوب میں جو تاثیر ہے اور اس وقت کی ترقی پذیر اردو میں ایک خالص علمی موضوع پر اظہار خیال کے لیے جو انداز بیان اختیار کیا ہے وہ بھی اہمیت سے خالی نہیں۔ رسالہ کے اس پہلو کو نمایاں کرتے ہوئے سید صباح الدین عبدالرحمٰن رقم طراز ہیں: ''یہ (مقالہ) اس وقت پڑھا گیا، جب اردو کی نثر نگاری کی تاریخ لمبی نہیں تھی، لیکن اس کے اسلوب میں جو طاقت و توانائی تھی اس سے پتہ چل رہا تھا کہ ادب و انشاء کی بازیگری اور محض مدعا نگاری سے بہت آگے بڑھ کر علمی خیالات کے اظہار کے لیے جو زبان چاہیے وہ گویا حاصل ہو رہی ہے'' (۲۳) ان سب سے اہم بات یہ کہ انیسویں صدی عیسوی کی اردو میں عام طور پر جو تکلف و تصنع پایا جاتا تھا، علامہ شبلی کے ایام علی گڑھ کی یہ اولین نثری تصنیف اس سے پاک ہے۔

www.shibliacademy.org

علامہ شبلی کے زیر تعارف مقالہ یا رسالہ کی مقبولیت پر یہ امر بھی شاہد ہے کہ مصنف گرامی کے مقالات و مضامین کے مختلف مجموعوں میں یہ مکمل طور پر یا اس کا ایک حصہ شامل کیا گیا۔ اس کی تفصیلات اس طور پر ہیں:

۱- رسائل شبلی: مرتبہ شبلی نعمانی، مطبع العلوم علی گڑہ، بدون تاریخ، ص ۲۶۴-۳۰۱۔

۲- انتخاب رسائل شبلی: ایوان اردو، پٹنہ، ۱۹۶۲ء۔

۳- مقالات شبلی (جلد سوم): مرتبہ سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ۱۹۵۵ء، ص ۱-۷۷۔

۴- انتخاب مقالات شبلی: مرتبہ علاء الدین خالد، اردو اکیڈمی، کراچی، ۱۹۶۰ء۔

۵- انتخاب مقالات شبلی: مرتبہ رضی کاظمی، اردو پبلشرز، لکھنؤ، ۱۹۷۳ء۔

۶- انتخاب مضامین شبلی: مرتبہ رشید حسن خان، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۷۲ء۔ (۲۴)

اس ضمن میں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مقالات شبلی (جلد سوم) میں ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' کے ذیلی عنوان ''مدرسے اور دارالعلوم'' کو علیحدہ مقالہ کی صورت میں مرتب کیا گیا ہے (۲۵)۔ اس سے عام قاری کو یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ مذکورہ مقالہ سے الگ کوئی اور مقالہ ہے، جب کہ یہ (مدرسے اور دارالعلوم) اصل مقالہ (مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم) کا ایک حصہ ہے، جیسا کہ اس کے رسالہ کی صورت میں مطبوعہ نسخہ (قومی پریس، لکھنؤ، ص ۱-۸۰) سے صاف واضح ہوتا ہے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ مقالات شبلی (جلد سوم) کے آئندہ ایڈیشن میں پورے مقالہ کو ایک عنوان کے تحت شایع کیا جائے اور ''مدرسے اور دارالعلوم'' اس کی ذیلی سرخی کے تحت مرتب کیا جائے۔

آخری بات یہ کہ اس رسالہ سے ایک قیمتی سبق بھی ملتا ہے اور وہ ہے کسی مسئلہ یا معاملہ میں (تقریر یا تحریر کسی میں بھی) اپنی کم علمی، غلطی یا غلط معلومات کا احساس ہونے پر بلا تکلف اپنی غلطی یا غلط بیانی کا اعتراف کرنا اور صحیح بات واضح کرنا۔ زیر مطالعہ رسالہ میں علامہ شبلی نے دو مقام پر اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے اور غالباً یہ بات ان پر اس وقت منکشف ہوئی جب وہ اپنے مقالات و مضامین کا پہلا مجموعہ ''رسائل شبلی'' کے نام سے مرتب کر رہے تھے اور اس دوران انہوں

www.shibliacademy.org

نے اپنی گذشتہ تحریروں پر نظر ثانی کیا۔اس کی تفصیلات درج ذیل ہیں:

الف: اس رسالہ میں ''اسلامی مدارس اور دارلعلوم'' کی سرخی کے تحت ایک جگہ ترکی میں مدارس کے نظام پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ رقم فرمایا:

''ترکوں کے عہد میں (مدارس میں اساتذہ کی) تنخواہیں بیش قرار تھیں۔ بڑے بڑے مدرسوں میں مدرس کو اکثر ساٹھ یا اسّی درہم روزانہ ملتے تھے''۔(۲۶)

مقالات شبلی میں اس پر حاشیہ میں وضاحت کرتے ہیں:

''ترکی کے سفر میں مجھے اس رائے سے رجوع کرنا پڑا۔درہم جس چیز کا نام ہے،اس سے (ترکی میں) مراد وہ سکہ ہے جس کو آجکل قرش کہتے ہیں اور یہ کل ۲/ کا ہوتا ہے۔اس حساب سے یہ تنخواہیں بیش قرار نہیں رہتیں''۔(۲۷)

ب: دوسرے ہندوستان میں مدارس اسلامیہ کی تاریخ سے بحث کرتے ہوئے عہد اسلامی یا وسطیٰ کے ہندوستان کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

''ہندوستان کے تذکرے میں ہم کو بے خطر کہنا چاہیے کہ اس سرزمین پر شاید ایک بھی علمی عمارت (یعنی مدرسہ کی شکل میں) نہیں قایم ہوئی''۔(۲۸)

اس عبارت پر حاشیہ میں اپنی تحقیق کی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میری یہ تحقیق صحیح نہیں ثابت ہوئی۔ ہندوستان میں بہت سے مدارس تعمیر ہوئے تھے،گو اب ان کا نام ونشان باقی نہیں رہا''۔(۲۹)

ناچیز کے خیال میں علامہ شبلی کا یہ اعتراف ایک بہت بڑی حقیقت کا اعتراف ہے جو نہ صرف یہ کہ تحقیق کے دروازے کھولتی ہے بلکہ تحقیق وتصنیف کے میدان میں علمی دیانت داری کی فضا بھی پروان چڑھاتی ہے۔علامہ شبلی کی جانب سے اعتراف حقیقت کی یہ مثالیں اس لحاظ سے بہت قیمتی ہیں کہ آج کے دور میں اس طرح کی مثالیں شاذ ونادر ہی سامنے آتی ہیں یا دوسرے لفظوں میں اس وقت بہت کم ایسے محققین ومصنّفین ملتے ہیں جو اپنی تحقیقی وتصنیفی کاوشوں میں کسی غلطی یا خامی سے باخبر ہونے پر کھلے دل سے اس کے اعتراف کی جرأت کرتے ہوں۔اللہ کرے ہمیں علامہ شبلی

www.shibliacademy.org

جیسے ممتاز اسکالرس ونامور اہل قلم کی قایم کردہ اس روایت کو اپنانے کی توفیق نصیب ہو۔

مختصر یہ کہ علامہ شبلی کی مختصر کتاب ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' مختلف اعتبار سے بڑی قدر وقیمت رکھتی ہے۔اس سیاق میں مولانا عمیر الصدیق دریابادی ندوی کا یہ تاثر صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ''اس شبلی کو ایمانداری سے دیکھنے کی ضرورت ہے جس کے قلم نے پہلی بار مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم کے عنوان سے وہ تحریر پیش کی کہ اگر ان کے تمام تصنیفی کارناموں سے صرفِ نظر کرلیا جائے تو بس یہی ایک مضمون یا رسالہ ان کی انفرادیت والی عظمت کے لیے کافی ہے''(۳۰)۔درحقیقت یہ مختصر کتاب نہ صرف یہ علوم وفنون کی اشاعت اور تعلیم کے فروغ کے بارے میں مسلمانوں کو ماضی کی طرف لوٹا کر اس سے سبق حاصل کرکے مستقبل کے لیے منصوبہ بندی کی دعوت دے رہی ہے، بلا کسی تفریق مختلف علوم وفنون کی اشاعت کی تحریک پیدا کررہی ہے اور اہم موضوعات پر عصری اسلوب کے مطابق تصنیف وتالیف کا سلیقہ بھی سکھا رہی ہے۔ضرورت اس بات کی ہے اس رسالہ کے مباحث کا تنقیدی جائزہ لیا جائے اور اسے جدید طرز پر مرتب کرکے دیدہ زیب طباعت سے مزین کیا جائے۔ان سب سے اہم یہ کہ سرسید کے الفاظ میں ''یہ بے نظیر ولاجواب تحریر'' موجودہ دور کے مسلمانوں کو اس پہلو سے غور وفکر کی دعوت دے رہی ہے کہ تعلیم کی اشاعت اور علوم وفنون کے فروغ کے تعلق سے ہمارے اسلاف کے کارنامے کتنے عظیم الشان رہے ہیں اور آج ہم اس میدان میں کس مقام پر کھڑے ہیں۔اللہ کرے اس غور وفکر کے نتیجہ میں ہم علم بالخصوص علم دین کے مخلص خادم بن جائیں اور دین متین کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو وقف کرنے والے ہو جائیں۔آمین ثم آمین!

حواشی ومراجع

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: ظفر الاسلام اصلاحی، تعلیم عہد اسلامی کے ہندوستان میں، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۰۷ء، ص ۱۸۔۴۳۔ (۲) تعلیم سے متعلق علامہ شبلی کے مضامین ''مقالات شبلی''، جلد سوم میں مرتب کیے گئے ہیں۔ (۳) سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۱ء، ص ۱۳۹۔ (۴) حیات شبلی، محولہ بالا، ص ۱۷۱۔ (۵) خطوط سرسید، مرتبہ سرراس مسعود، نظامی پریس،

www.shibliacademy.org

بدایوں، ۱۹۳۱ء، ص ۷۰۔ (٦) مکاتیب شبلی، مرتبہ سید سلیمان ندوی، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۷۱ء ، ۸۳/۱۔ (۷) مکاتیب سرسید، مرتبہ: مشتاق حسین، فرینڈس بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹٦۰ء، ص ۱۷۴۔۱۷۵ ۔ (۸) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۵۵/۲۳، ۱۰/ جولائی ۱۸۸۸ء، ص ۷۷۳۔۷۷۴۔ (۹) مکاتیب شبلی، محولہ بالا ۲۳/۱۱۔۲۴۔ (۱۰) مکاتیب سرسید، محولہ بالا، ص ۱۷٦۔ (۱۱) خطوط سرسید، ص ۱۳٦۔ (۱۲) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۵۵/۲۳، ۱۰ جولائی، ص ۷۷۳۔۷۷۴۔ (۱۳) حوالۂ مذکور، ص ۷۷۳۔۷۷۴۔ (۱۴) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اس رسالہ کے پہلے شائع شدہ اشتہار کے متن کے لیے ملاحظہ فرمائیں: شمارہ، ۵۴/۲۳، ۷/ جولائی ۱۸۸۸ء، ص ۷٦۳۔۷٦۴۔ (۱۵) عبد الحلیم شرر، شبلی نعمانی، ماہنامہ دلگداز، ۱۲/۱٦، دسمبر، ۱۹۱۴ء، ص ۲۸۵۔ (۱٦) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۵۴/۲۳، ۷/ جولائی ۱۸۸۸ء، ص ۷٦۴؛ مکاتیب سرسید، ص ۱۷٦۔ (۱۷) مکاتیب سرسید، ص ۱۷۴۔۱۷۵۔ (۱۸) عبدالحلیم شرر، شبلی نعمانی، دلگداز، محولہ بالا، ص ۲۸۵۔ (۱۹) شبلی نعمانی، علم الکلام، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۰۳ء، ص ۱۱ (دیباچہ)۔ (۲۰) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۵۵/۲۳، ۱۰ جولائی ۱۸۸۸ء، ص ۷۷۳۔۷۷۴۔ (۲۱) مقالات شبلی، مرتبہ: سید سلیمان ندوی، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۵۵ء، ۱۷/۳، حاشیہ نمبر ۱۔ (۲۲) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۵۵/۲۳، ۱۰ جولائی ۱۸۸۸ء، ص ۷۷۳۔ (۲۳) سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۸۵ء، ص ۱۵۔۱٦۔ (۲۴) محمد الیاس الاعظمی، آثار شبلی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۳ء، ص ۵۱۰۔ ۵۱۱، ۵۱۵۔ ۵۱٦۔ (۲۵) مقالات شبلی، محولہ بالا، ۳۷/۳۔۷۷۔ (۲٦) رسائل شبلی، مرتبہ: شبلی نعمانی، مطبع العلوم، علی گڑھ، بدون تاریخ، ص ۲۹۰؛ مقالات شبلی، محولہ بالا، ٦٦/۳۔ (۲۷) رسائل شبلی، محولہ بالا، ص ۲۹۰، حاشیہ نمبر ۱؛ مقالات شبلی، ٦٦/۳، حاشیہ نمبر ۱۔ (۲۸) رسائل شبلی، ص ۲۹۸؛ مقالات شبلی، ۷۴/۳۔ (۲۹) رسائل شبلی، ص ۲۹۸، حاشیہ نمبر ۱؛ مقالات شبلی، ۷۴/۳، حاشیہ نمبر ۳۔ (۳۰) عمیر الصدیق دریابادی ندوی، شبلی۔ ایک زاویۂ نظر، راشٹریہ سہارا (لکھنؤ ایڈیشن)، شمارہ ۲۸/ نومبر ۲۰۱۴ء، ص ۹۔

www.shibliacademy.org

شبلی کی قطعہ نگاری

پروفیسر شہپر رسول

اردو کی فکری وفنی روایت کے صفحۂ زریں پر اگر علم وادب اور مذہب کے تعلق سے صرف چند ہی نام تحریر کیے جائیں تو ان میں ایک اہم نام شبلی نعمانی کا ضرور ہوگا۔ اکابر علم وادب نے ان کے بارے میں یونہی نہیں کہہ دیا کہ ان کا سب سے بڑا وصف مشغلۂ علم تھا۔ کتب بینی ان کی غذا تھی ۔ وہ خوش تقریر بھی تھے لیکن ان کا اصل جوہر کمال خوش تقریری نہیں خوش تحریری تھا۔ ان کی زبردست شہرت وعظمت کا نقیب زبان سے زیادہ قلم تھا۔ تاریخ ہو یا سوانح نگاری، شعر ہو یا نقد شعر، کلام ہو یا فلسفہ یا مذہبی، اخلاقی اور قومی مباحث ومسائل، جس موضوع پر بھی انہوں نے قلم اٹھایا نہ صرف اس کا حق ادا کردیا بلکہ اپنے انفرادو امتیاز کو بھی نقش کردیا۔

شبلی کی شاعری کا سلسلہ زمانۂ طالب علمی ہی میں شروع ہو چکا تھا۔ ان کی فارسی شاعری خصوصاً ایک الگ اور اہم مرتبے کی حامل ہے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ ان کی اردو شاعری جس خصوصی توجہ کی متقاضی تھی، ناقدین ادب نے اس پر وہ توجہ صرف نہیں کی۔ اردو شعراء کی اکثریت کی طرح شبلی نے بھی اپنی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا لیکن ان کا اصل وسیلۂ اظہار غزل گوئی نہیں نظم نگاری اور قطعہ نگاری تھا۔ ان کے سفر زندگی میں کئی ایسے موڑ آئے جنھوں نے ان کی تحریر و تخلیق کی سمت ورفتار کو غیر معمولی انداز میں متاثر کیا۔ خاص طور پر علی گڑھ کی نئی فضا نے ان پر فکر و اظہار کے نئے در وا کیے۔ مشرقی علمی، ادبی، مذہبی، قومی اور معاشرتی اقدار کی آمیزش اور مغربی افکار کی یورش نے ان کی زندگی کو نئی کروٹوں سے ہم کنار کیا۔

شبلی نعمانی کی چشم تخلیق کو ۱۸۵۷ کے بعد کے جس عہد اور جس منظرنامے سے سابقہ پڑا

شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵۔

www.shibliacademy.org

اس کے بارے میں یہاں چنداں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔لیکن اس کیفیت میں ان کی شاعری کی ایک اہم جہت ضرور نمایاں ہوئی کہ انھوں نے معاشرتی، اخلاقی اور سیاسی حقیقت نگاری کے ساتھ ہی زندگی کی اندرونی اور بیرونی پرتوں کو ایک ساتھ ملا کر نئے اور مکمل تناظر میں دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی۔اس زمانے میں سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء کی کوششوں اور علمی و ادبی نگارشوں نے بطور خاص مسلمانوں کے ذہن و دل پر چھائے ہوئے جمود کو متزلزل کر دیا تھا۔مغربی تعلیم و تہذیب نے انقلاب برپا کر رکھا تھا۔بعض روایتیں معدوم ہو رہی تھیں۔بعض نئی چیزیں سامنے آ رہی تھیں۔سائنس کا دور دورہ تھا۔مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ ’’جدید انقلاب نے دلوں میں نئے خیالات کے ساتھ ہی نئی امنگیں پیدا کر دی تھیں۔زاویہ ہائے نگاہ بدل رہے تھے‘‘۔اسی زمانے میں شبلی نے اپنی مشہور زمانہ مثنوی ’’صبح امید‘‘ لکھی جو اپنے مطالب و مقاصد کے اعتبار سے نہایت کامیاب مثنوی ہے۔ان کی اس وقت کی تحریر و تقریر کی طرح ہی اس مثنوی کے بین السطور میں بھی نئے زمانے کی آہٹوں کو سنا جا سکتا ہے۔اسی وجہ سے شبلی نے اپنے اس شعری کارنامے پر فخر کا احساس کیا اور ۱۸۸۶ء کے اپنے ایک خط میں لکھا کہ ’’مجھ کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اس نئی زندگی کے پیدا ہونے میں میرا بھی حصہ ہے‘‘۔

پروفیسر آل احمد سرور نے شبلی کو علوم مشرقیہ کا بحر بیکراں اور عروس سخن کا اداشناس کہا ہے۔ سرور صاحب کو ان کی شاعری حکیمانی نکتہ سنجی اور شاعرانہ شوخی کی بنا پر یگانۂ روزگار معلوم ہوتی ہے۔ وہ سہ ماہی ’’فکر و نظر‘‘ علی گڑھ کے ’’شبلی نمبر‘‘ میں یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ ’’ان (شبلی) کی شاعری ان کی خلاقی کے بحر بیکراں کی ایک موج ہے، مگر یہ موج کسی آب جو کی ہلکی سی لہر نہیں ہے بلکہ جوئے کوہستاں کا سا جلال و جمال رکھتی ہے‘‘۔سرور صاحب کی رائے سے کس کو انکار ہو سکتا ہے لیکن مذکورہ جلال و جمال میں حکیمانہ نکتہ سنجی اور شاعرانہ شوخی کے ساتھ اس متوازن اور مہذب طنزیہ کیفیت کا بھی خاصا دخل ہے جو جذبہ اور دلیل کے متناسب امتزاج نیز سوز دروں کی میٹھی میٹھی آنچ کے سبب آج بھی دل کے تاروں کو جھنجھوڑنے کا حکم رکھتی ہے۔ یہاں اس واقعے پر بھی گفتگو کرنا چاہوں گا بلکہ اس سچائی کو بے نقاب کرنا چاہوں گا کہ شبلی کی قومی، معاشرتی، مذہبی اور سیاسی شاعری جس خلوص فکر اور جس دلی سوز و گداز کے عناصر سے مملو ہے اس کا بہترین مظاہرہ دراصل ان کے

www.shibliacademy.org

قطعات میں ہوا ہے۔ یہ امر بھی لائق توجہ ہے کہ شبلی کے شعری تجربات کا بڑا حصہ قطعات ہی کی شکل میں وارد ہوا ہے۔ اب یہ بات الگ ہے کہ شبلی کے بیشتر ناقدین نے ان کے قطعات کو نظموں سے تعبیر کیا ہے۔ یوں تو نظم کا لفظ تمام تر شاعری کا احاطہ کر لیتا ہے لیکن اس کے باوجود شعری اصناف اپنے نام، ہیئت اور موضوع کی بنیاد پر دور سے پہچانی جاتی ہیں۔

قطعہ دراصل عربی، فارسی اور اردو شعری ادب کی ایک باضابطہ قسم ہے جس کی اپنی ایک تعریف بھی ہے اور تاریخ بھی۔ اس ادبی اصطلاح پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قطعہ اصل میں وہ شعری تخلیق ہے جو دو یا دو سے زیادہ ایسے اشعار پر مشتمل ہوتی ہے جن میں مضمون یا خیال کا تسلسل پایا جاتا ہے۔ جہاں تک قطعہ کی ہیئت کا سوال ہے وہ قصیدے، غزل یا غزل نما نظم سے بہت مشابہ ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اس میں مطلع نہیں ہوتا اور قافیے کا تعین پہلے شعر کے مصرعۂ ثانی کے قافیہ کی بنیاد پر ہوتا ہے گویا تمام اشعار پہلے شعر کے مصرعۂ ثانی کے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں۔ عام طور پر قطعات کی تین صورتیں پائی جاتی ہیں۔ اول یہ کہ دو سے زائد اشعار کا ایسا مجموعہ قطعہ کہلاتا ہے جو معنی کے اعتبار سے نظم کی طرح مربوط ہو لیکن مطلع سے محروم ہو اور اس کے ذریعے کوئی مکمل مضمون ادا کیا گیا ہو۔ دوم یہ کہ دو اشعار کا ایسا مجموعہ جو رباعی کے مخصوص اوزان سے مختلف وزن کا حامل ہو اور اس کا نظام قافیہ پہلے شعر کے مصرعۂ ثانی کے قافیے کے مطابق ہو تو اس کو قطعہ کہا جائے گا۔ تیسری صورت خاص طور پر غزل کی صنف ہی میں اس وقت رونما ہوتی ہے جب غزل کے بعض دو یا اس سے زائد اشعار اپنی مخصوص شناخت کے برخلاف معنوی اعتبار سے مربوط و مسلسل ہوتے ہیں۔ ایسے اشعار کو قطعہ بند اشعار کہا جاتا ہے اور ان پر ''غزل'' کے درمیان ہی میں ''ق'' لکھ دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر میر تقی میرؔ کی غزل کے یہ اشعار اس طرح کے قطعہ کی بہترین مثال ہیں:

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا　　یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ، بے خبر　　میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرور تھا

علمائے ادب نے قطعہ کے مصرعوں کی تعداد چار مصرعوں تک محدود کر کے اس کو جدید قطعے کا نام دیا ہے اور یہ چلن اس قدر رائج ہو گیا ہے کہ قطعہ کا ذکر سنتے ہی چار مصرعوں والے قطعہ

www.shibliacademy.org

کی شکل ذہن میں جاگ جاتی ہے، بلکہ مشاعرے کے پیشہ ور شعراء نے تو ایک اور بدعت شروع کردی ہے۔ وہ عام طور پر غزل سے پیشتر کچھ قطعات سناتے ہیں اور قطعہ پڑھنے سے پہلے فرماتے ہیں کہ ''چار مصرعے ملاحظہ کیجیے'' گویا اب اس صنف کا نام قطعے کے بجائے ''چار مصرعے'' ہو گیا ہے۔ خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا لیکن اس موقع پر مشہور و معروف قطعہ نگار، شاعر اختر انصاری کے وہ الفاظ ہماری توجہ اپنی طرف ضرور مبذول کراتے ہیں جو انھوں نے جدید قطعہ کے تعلق سے اپنی کتاب ''مطالعہ و تنقید'' میں تحریر کیے ہیں:

> ''جدید قطعہ (چار مصرعوں والا قطعہ) ایک جامع اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں دریا کو کوزے میں بند کرنے والی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اس کے چاروں مصرعے یکساں اہمیت وافادیت کے حامل اور اظہار مطلب میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ ہر مصرع اپنی جگہ پر پورے قطعے کا ایک مکمل جز ہوتا ہے''۔

یہاں بطور مثال اختر انصاری ہی کا ایک قطعہ ملاحظہ کیجیے:

ان آنسوؤں کو ٹپکنے دیا نہ تھا میں نے کہ خاک میں نہ ملیں میری آنکھ کے تارے
میں ان کو ضبط نہ کرتا اگر خبر ہوتی پہنچ کے قلب میں بن جائیں گے یہ انگارے

اختر انصاری کا یہ قطعہ معنوی حسن کے ساتھ ہی ان کی مخصوص شعری فکر کا غماز ہے اور چار مصرعوں والے جدید قطعہ کی تعریف پر پورا بھی اترتا ہے۔ یہاں چار مصرعوں والے قطعہ پر قدرے تفصیلی گفتگو کرنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ قدیم و جدید قطعہ کا فرق واضح ہو جائے اور دوسری نیز بہت اہم وجہ یہ ہے کہ ''کلیات شبلی'' میں بھی چار مصرعوں والے قطعات نہ صرف خاصی تعداد میں موجود ہیں بلکہ اپنی ایک الگ شناخت اس اعتبار سے رکھتے ہیں کہ شبلی کے ایسے قطعات کا چوتھا مصرعہ رباعی کی طرح تمام قطعہ کے معنوی عطر کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ گویا چوتھے مصرعے میں وہ تمام قطعہ کا نچوڑ پیش کر دیتے ہیں۔ اس وصف مخصوص کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ''وہ مصرعہ بہت زوردار ہوتا ہے''۔

اب آیئے شبلی کے درج ذیل قطعات پر بالائی معروضات کی روشنی میں نظر ڈالتے ہیں:

۱- اگر چہ آنکھ میں نم بھی نہیں ہے اب باقی اگرچہ صدمۂ بلقان سے جگر شق ہے
بچا رکھے ہیں مگر میں نے چند قطرۂ خوں کہ کانپور کے بھی زخمیوں کا کچھ حق ہے

www.shibliacademy.org

۲-ہم قدم آپ کا ہونا تو بہت ہے دشوار　　ان کا کیا ذکر جو اس دور میں شامل ہی نہیں
پاؤں کٹنے کا مجھے آج ہوا ہے صدمہ　　یعنی افسوس میں زنجیر کے قابل ہی نہیں

۳-ہمیں جس چیز نے کھویا وہ تفریق و تجزی تھی　　یہ وہ شے ہے کہ جو بربادیِ مسلم کے درپے ہے
مگر اب تو در و دیوار تک اس کا اثر پہنچا　　وضوخانہ الگ اک چیز ہے، مسجد الگ شے ہے

۴-وحدت جسے کہتے ہیں وہ کثرت سے الگ ہے　　یہ تفرقہ بے شبہ ہے مجھ کو نظر آتا
اس وہم کے دھوکے میں مگر آپ نہ آئیں　　احول ہوں مجھے ایک میں ہے دو نظر آتا

پہلے قطعہ میں اس شعری اظہار اور جذبہ صادق کی داد نہیں دی جاسکتی کہ جنگ بلقان کے مظالم پر صدمہ جاں کاہ سے گزرنے اور انتہائے رنج کے باعث آنکھوں میں اشکوں کے خشک ہوجانے یعنی تمام بحر اشک کے صرف ہوجانے کے باوجود کانپور کی مسجد کے حادثہ سے متعلق مظلوموں، زخمیوں اور شہیدوں پر رونے یا آنکھوں کے راستے بہانے کے لیے ابھی خون کے چند قطرے باقی ہیں۔ یہاں زخم اور خون کے قطروں میں جو رعایت ہے وہ بھی لائق توجہ ہے۔ دوسرے قطعہ میں شبلی نے اس حادثہ کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں اچانک بندوق چل جانے کے باعث ان کی ایک ٹانگ ضائع ہوگئی تھی۔ یہاں انھوں نے یہ کہہ کر کہ پاؤں کے کٹنے کا صدمہ تو بجا طور پر مجھے آج ہوا ہے کیوں کہ میں اس کی وجہ سے پابہ زنجیر ان کانپور کی ہم قدمی کے قابل ہی نہیں رہا، ان لوگوں پر شدید لیکن مہذب انداز میں طنز کیا ہے جن کے سینے قوم کے درد سے خالی ہیں۔ اس قطعہ کا آخری مصرع ''یعنی افسوس میں زنجیر کے قابل ہی نہیں'' میں کس درجہ حسرت اور کیسا درد پنہاں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمام قطعہ کی روح اس مصرعے میں سمٹ آئی ہے۔

تیسرا قطعہ بھی غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ اتفاق و اتحاد ہر قوم کا ایسا سرمایہ ہوتا ہے جس کے نہ ہونے سے قوموں کی عزت و ناموس بلکہ وجود تک کے خاتمے کا امکان رہتا ہے۔ شبلی نعمانی باہمی نفاق و تجزی کو مسلمانوں کی بربادی کا سبب بتاتے ہیں، ان کو خبردار کرتے ہیں اور ایک بلیغ طنزیہ اشارہ اس واقعے کی طرف کرتے ہیں، جس کے تحت کانپور کی مسجد سے متعلق انہدامی کارروائی کو حکام نے درست ٹھہرایا تھا۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ منہدم حصہ چوں کہ وضوخانہ ہے اس لیے اس کو مسجد نہیں کہا جاسکتا۔ گویا مسجد کا اس سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے، چنانچہ شبلی اسی حوالے سے

www.shibliacademy.org

کہتے ہیں کہ ہمارے متحد نہ ہونے کے مضر اثرات ہمارے در و دیوار پر بھی پڑنے لگے ہیں۔

چوتھے قطعہ کو بھی شبلی کی بامعنی طنزیہ شاعری کی بہترین مثال کہا جاسکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر عمل، نیت اور نظر درست ہو تو سب کچھ ٹھیک رہتا ہے، ورنہ بھینگے پن کی عینک سے لوگ آپ کی وحدت میں پنہاں دوئی کی کیفیت کو تلاش کر ہی لیتے ہیں۔

شبلی کے منقولہ تمام قطعات نہ صرف ان کی فکری وفنی انفرادیت کو ظاہر کرتے ہیں بلکہ جدید قطعہ کو آئینہ بھی دکھاتے ہیں۔ قطعہ کی متذکرہ شکل یعنی چار مصرعوں والے قطعات کی اور بھی بہت سی مثالیں ''کلیات شبلی'' میں موجود ہیں لیکن جن قطعات میں شبلی کی فکری، فنی اور تخلیقی صلاحیتوں کا استعمال بدرجۂ اتم ہوا ہے نیز ان کی شاعری کا بڑا حصہ جن قطعات پر مشتمل ہے وہ قطعہ کی اسی پہلی شکل سے تعلق رکھتے ہیں، جس میں دو سے زیادہ اشعار معنی ومفہوم کے اعتبار سے باہم مربوط ہوتے ہیں لیکن اس کا آغاز مطلع سے نہیں ہوتا اور اس کا تمام تر قافیائی نظام دوسرے مصرعے کے قافیے پر منحصر ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ایک اہم رویے اور اس کے نتیجے میں رونما ہونے والی کیفیت بلکہ صداقت پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ جب بعض واقعے، حادثے، قصے اور زندگی کے چھوٹے چھوٹے عملی حصے اور ٹکڑے اپنی افادیت واہمیت کے سبب ہماری فکر وفن اور روزمرہ زندگی میں کوئی خاص مقام حاصل کر لیتے ہیں تو ہم ان کی مناسبت ومطابقت کے زیر اثر ٹکڑوں میں سوچنا اور وقفے وقفے سے ردعمل کا اظہار کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر مرزا محمد رفیع سوداؔ کو اپنے بعض دوستوں کے غیر محبانہ عمل سے تکلیف پہنچی اور ان کے ساتھ دوستوں کے ذریعہ کی جانے والی بدی کا ایک چھوٹا سا واقعہ پیش آیا تو انہوں نے اپنے ردعمل کا تخلیقی اظہار قطعہ کی شکل میں کیا۔ ایسی صورت میں اس پر تخیل شعور اور پر تسلسل تخلیقی اظہار کی توقع یقیناً نہیں کی جاسکتی جو کسی مسلسل نظم کے بنیادی تخلیقی عناصر میں شامل ہوتا ہے۔ سودا کہتے ہیں:

کہا کلام یہ سودا سے ایک عاقل نے — کسو سے ربط کوئی زیر آسماں نہ کرے
کیا جو تجربہ ان دوستوں کو یہ پایا — بدی کا جن پہ کسی طرح دل گماں نہ کرے
چکھا انہوں نے جو اے یار دوستی کا شہد — وہ تلخ کام کبھو زہر دشمناں نہ کرے
بغیر بخل و حسد چاہیے کوئی مذکور — انہوں کا مہر ومروت کے درمیاں نہ کرے

www.shibliacademy.org

میں ان سے مل کے نہ داں اختیار عزلت کی　　دوچار انہوں سے خدا مجھ کو در جہاں نہ کرے

سودؔا کی مثال اس موقع پر اس لیے پیش کی گئی کہ ان کے عہد میں نظم کا وہ تصور موجود ہی نہیں تھا، جس کا اطلاق زیر نظر قطعہ پر کیا جا سکے یا جس طرح خود شبلی کے قطعات کو ان کی نظمیہ شاعری کے ذیل میں رکھا گیا ہے۔ سودا کے علاوہ میر تقی میرؔ، مصحفیؔ، انشاؔ، ناسخؔ، ظفرؔ، ذوقؔ، غالبؔ، حالؔی اور اقبالؔ غرض کہ تمام قابل ذکر شعراء کی شاعری قطعات سے بھری پڑی ہے۔ غالبؔ کا چکنی ڈلی والا قطعہ یا ذوقؔ کا یہ خوبصورت قطعہ:

کہوں کیا ذوق احوال شب ہجر　　کہ تھی اک اک گھڑی سو سو مہینے
نہ تھی شب، ڈال رکھا تھا اک اندھیر　　مرے بخت سیہ کی تیرگی نے
کہا جی نے ، مجھے یہ ہجر کی رات　　یقیں ہے صبح تک دے گی نہ جینے
کہ قسمت سے قریب خانہ میرے　　اذاں مسجد میں دی بارے کسی نے
موذن مرحبا بر وقت بولا　　تری آواز مکے اور مدینے

کیا خوبصورت قطعہ ہے۔ اس میں یقیناً کوئی فلسفہ پیش نہیں کیا گیا ہے لیکن دل پر گزرنے والی شب ہجر کی ایک پر اثر کیفیت اور آواز اذاں کی تیرگی کو روشنی میں بدل دینے والی برکت کا نہایت سحر کار انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

شبلی نعمانی کی زندگی میں بھی ایسے واقعات و حادثات اور کیفیات و مضمرات کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے جو ان کی قومی، مذہبی، سیاسی اور معاشرتی فکر کو مہمیز کرتا ہے۔ جستہ جستہ فکر و خیال پر کمند ڈالتا ہے اور زندگی کے مختلف النوع مظاہر و مناظر کو واقعات کی شکل میں تصویر کر دیتا ہے۔ اس ضمن میں وہ نہ صرف ڈرامائی عناصر اور طنز کے ناوکوں کا فنکارانہ استعمال کرتے ہیں، بلکہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کے لیے نہایت روانی اور چابک دستی کے ساتھ استعارات و تلمیحات کو بھی کام میں لاتے ہیں۔ جس سے ایجاز و اختصار اور بلاغت کا جادو جاگتا ہے اور قطعہ اپنے اجمال میں بعض تفصیلات کو نہایت کامیابی کے ساتھ سمیٹ لیتا ہے۔ علاوہ ازیں جہاں ان کو خطیبانہ طور اختیار کرنا ہوتا ہے وہاں ان کا بیانیہ انداز، روانی زبان اور فکری گداز قابل توجہ ہوتا ہے۔

''کلیات شبلی'' میں جدید مذہبی اور اخلاقی نظموں کے طور پر جن قطعات کو پیش کیا گیا

www.shibliacademy.org

ہے، وہ تمام کے تمام بہترین شعری تجربات کے مرقعے ہیں۔ لیکن ہجرت نبویؐ، تعمیر مسجد نبویؐ، ایک خاتون کی آزادانہ گستاخی، اہل بیت رسولؐ کی زندگی، مساوات اسلام اور ایثار کی اعلاترین نظیر وغیرہ کے عنوان سے پیش کیے جانے والے قطعات نہایت جاذب توجہ ہیں۔ ان قطعات میں مکالمہ ہے، مناظر ہیں، کردار ہیں، ایجاز واختصار ہے نیز کہیں کہیں حسب ضرورت تفصیل واستفسار بھی نظر آجاتا ہے گویا شاعری کی ایک دنیا آباد ہے۔

''اہل بیت رسولؐ کی زندگی'' کے عنوان سے جو قطعہ پیش کیا گیا ہے اس میں ابتداًا ایک منظر اور ایک صورت حال کو قدرے تفصیلی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً ابتدائی چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

افلاس سے تھا سیدۂ پاک کا یہ حال　　گھر میں کوئی کنیز نہ کوئی غلام تھا
گھس گھس گئی تھیں ہاتھ کی دونوں ہتھیلیاں　　چکی کے پیسنے کا جو دن رات کام تھا
اٹ جاتا تھا لباس مبارک غبار سے　　جھاڑو کا مشغلہ بھی جو ہر صبح و شام تھا
آخر گئیں جناب رسول خدا کے پاس　　یہ بھی کچھ اتفاق وہاں اذن عام تھا
محرم نہ تھے جو لوگ تو کچھ کرسکیں نہ عرض　　واپس گئیں کہ پاس حیا کا مقام تھا

منقولہ بالا ابتدائی اشعار منظر کی تفصیل وتکمیل کے لیے جزئیات کے متقاضی ہیں۔ چنانچہ ازروئے تقاضا جزئیات نگاری سے کام لیا جاتا ہے، منظر کی مصوری کی جاتی ہے، کرداروں کے مکالموں اور آمدورفت کے بیان سے منظر نامے میں حرکت وعمل کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور آخر میں کمال فن کے ساتھ تمام ماجرے کی روح کو اختتامی شعر میں اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ جیسے آسمان کو مٹھی میں بند کرلیا ہو۔ شعر یوں ہے:

یوں کی ہے اہلِ بیتِ مطہر نے زندگی
یہ ماجرائے دخترِ خیرالانام تھا

اس کے بعد ''ایثار کی اعلیٰ ترین نظیر'' کے عنوان سے جو قطعہ ہماری توجہ کا مرکز بنتا ہے، وہ اپنے معنی ومفاہیم اور فنی بنت کے اعتبار سے نہایت اہم ہے۔ قطعہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

کافروں نے یہ کیا جنگ احد میں مشہور　　کہ پیمبر بھی ہوئے کشتۂ شمشیرِ دو دم

www.shibliacademy.org

ہو کے مشہور مدینہ میں جو پہنچی یہ خبر ہر گلی کوچہ تھا ماتم کدۂ حسرت و غم
ہو کے بے تاب گھروں سے نکل آئے باہر کودک و پیر و جوان و خدم و خیل و حشم
وہ بھی نکلیں کہ جو تھیں پردہ نشینانِ عفاف جن میں تھیں سیدۂ پاک بھی با دیدۂ نم

اس کے بعد کے حصے میں نسل انصار کی ایک عورت کا حال بیان کیا گیا ہے، جو اس خبر کو سن کر اس قدر مضطرب ہوتی ہے کہ موقعِ جنگ پر جا پہنچتی ہے اور وہاں موجود حضرات اس سے کہتے ہیں کہ ہم تجھ کو یہ بتاتے ہوئے رنجیدہ و شرمندہ ہیں کہ تیرے والد اور بھائی کشتۂ تیغ ستم ہو چکے ہیں اور سب سے بڑھ کر ماجرا یہ ہے کہ تیرا شوہر بھی شہید ہو گیا ہے، گویا ''گھر کا گھر صاف ہوا ٹوٹ پڑا کوہِ الم''۔ اس کے بعد کے اشعار میں شبلی اپنے انداز کلام سے نہ صرف موقع و معاملات کی تصویر کشی کرتے ہیں بلکہ نسل انصار کی اس عورت کے دل میں پائے جانے والے قربانی و ایثار نیز رسول اکرمؐ کی محبت واردات کے جذبات کو قاری کے ذہن و دل پر کس طرح نقش کرتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

اس عفیفہ نے یہ سب سن کے کہا تو یہ کہا یہ تو بتلاؤ کہ کیسے ہیں شہنشاہِ امم
سب نے دی اس کو بشارت کہ سلامت ہیں حضور گرچہ زخمی ہیں سر و سینہ و پہلو و شکم
بڑھ کے اس نے رخ اقدس کو جو دیکھا تو کہا تو سلامت ہے تو پھر، ہیچ ہے سب رنج والم
میں بھی اور باپ بھی، شوہر بھی، برادر بھی فدا اے شہِ دیں ترے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم

شبلی کے دوسرے قطعات کی طرح اس قطعہ کے آخری شعر میں بھی تمام واقعے کا لب لباب انتہائی فنکاری کے ساتھ نظم کیا گیا ہے۔

آخر میں طول کلامی سے گریز کرتے ہوئے شبلی کے دو مشہور اور جامع قطعات کا مزید حوالہ دینا ضروری خیال کرتا ہوں، کیونکہ ان قطعات کی شمولیت کے بغیر شبلی کی قطعات نگاری پر کی جانے والی کوئی گفتگو مکمل نہیں ہو سکتی۔ پہلے قطعہ کا عنوان ہے ''ہمارا طرز حکومت''۔

کبھی ہم نے بھی کی تھی حکمرانی ان ممالک پر مگر وہ حکمرانی جس کا سکہ جان و دل پر تھا
قرابت راجگانِ ہند سے اکبر نے جب چاہی کہ یہ رشتہ عروس کشور آرائی کا زیور تھا
تو خود فرماندۂ جے پور نے نسبت کی خواہش کی اگرچہ آپ بھی وہ صاحب دیہیم و افسر تھا

www.shibliacademy.org

ولی عہدِ حکومت اور خود شاہنشہِ اکبر گئے انبیر تک جو تخت گاہِ ملک و کشور تھا

ان ابتدائی چار اشعار میں بیان کیا گیا ہے کہ ہم نے یعنی مسلمانوں نے ممالک پر کس خوش اسلوبی سے حکومت کی تھی کہ ہمارا سکہ لوگوں کے جان و دل پر جم گیا تھا۔اس کے بعد اکبر کی راجگانِ ہند سے قرابت کی تدابیر، اس کے حسن سلوک اور جے پور کی شاہزادی کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کر کے اپنے محل میں لانے کے واقعے کو اس قدر شاعرانہ خلاقی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ قاری مغلوں کے حسن اخلاق واطوار پر ایمان لانے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔آخر کے چار اشعار میں منظر نگاری اور آخری شعر میں شبلی کے مخصوص طنزیہ اسلوب کی سحر کاری کی داد نہیں جاسکتی۔ملاحظہ کیجیے:

ادھر راجا کی نورِ دیدہ گھر میں حجلہ آرا تھی اُدھر شہزادہ پر چترِ عروسی سایہ گستر تھا
دلہن کو گھر سے منزل گاہ تک اس شان سے لائے کہ کوسوں تک زمیں پر فرش دیبائے مشجر تھا
دلہن کی پالکی خود اپنے کندھوں پر جو لائے تھے وہ شاہنشاہِ اکبر اور جہاں گیر ابن اکبر تھا
یہی ہیں وہ شمیم انگیزیاں عطر محبت کی کہ جن سے بوستانِ ہند صدیوں تک معطر تھا

اس قطعہ کا آخری شعر جو واقعتاً مکمل قطعہ کی جان بھی ہے اور آج بھی بے شمار لوگوں کے دلوں میں سمایا ہوا ہے۔ملاحظہ کیجیے:

تمہیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ عالم گیر ہندو کش تھا ، ظالم تھا ، ستم گر تھا

شبلی کے جس دوسرے قطعہ کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اس کا عنوان ''عدل جہاں گیری'' ہے جس کو شاعری کی معجز بیانی کا جیتا جاگتا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔اردو کے بیشتر ناقدین نے اس قطعہ کی دل کھول کر داد دی ہے۔پچیس اشعار کے اس قطعہ میں ایک شامت زدہ رہ گیر کا قصہ اور اس کے بعد کے واقعات و مظاہر کو فنی معیار کی یکساں بلندی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، جو غلطی سے قصر شاہی میں داخل ہو جاتا ہے اور بیگم جہاں گیر یعنی نور جہاں کے طپنچہ کی گولی کا شکار ہو جاتا ہے۔ جہاں گیر کا انصاف مشہور عالم تھا، چنانچہ حکم صادر ہوتا ہے کہ ملکہ ہند کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جائے جو قتل کے دیگر ملزموں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ذرا خیال کیجیے کہ یہ وہی ملکہ ہے جس کے لیے شبلی نے کہا ہے:

www.shibliacademy.org

یہ وہی نور جہاں ہے کہ حقیقت میں یہی
تھی جہاں گیر کے پردے میں شہنشاہِ زمن

بالآخر ملکہ کا جرم ثابت ہو جاتا ہے اور بات سزا تک پہنچتی ہے تو ملکہ کی طرف سے گزارش کی جاتی ہے کہ ''خوں بہا بھی تو شریعت میں ہے اک امر حسن'' چنانچہ بادشاہ قصاص کے بجائے خون بہا دینے سے متعلق فتوی معلوم کرتا ہے اور مہلوک کے اقربا خوں بہا لینے پر راضی ہو جاتے ہیں اور اس طرح یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ واقعہ ہے کہ زیر بحث قطعہ جہاں گیر کی انصاف دوستی کے ساتھ ہی شبلی نعمانی کی شاعرانہ خوش خلقی کا بھی ثبوت ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے اس قطعہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے جو خوبیاں بیان کی ہیں اور اس کے ایک شعر کی جس طرح داد دی ہے، وہ لائق مطالعہ ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''اس (قطعہ) کے اشعار میں یہ شعر بھی ہے جس میں نور جہاں کے بے مثال حسن کی تصویر جس طرح کھینچی گئی ہے وہ شبلی کی شاعری کے نقطۂ عروج اور بلاغت کلام کی معراج کو ظاہر کرتی ہے۔ شعر یہ ہے:

اس کی پیشانی نازک پہ جو پڑتی تھی گرہ   جا کے بن جاتی تھی اوراق حکومت پہ شکن

اردو میں اس معجز بیانی کی کوئی اور مثال اس وقت میرے ذہن میں نہیں ہے...... یہ دلچسپ بات ہے کہ علامہ شبلی کی عظمت اپنی جگہ مسلم ہے مگر ''عدل جہاں گیری'' کے شاعر اور نور جہاں کے حسن کے اداشناس شبلی کی یہ نظم ان کے بڑے بڑے علمی کارناموں کے باوجود اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہے''۔

سرور صاحب نے شبلی کے شاعرانہ کمال کی بجا طور پر داد دی ہے۔ شبلی کے قطعات کی اس خوبی اور انفرادیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہ قطعہ کے اختتامی مصرعوں میں تمام متن کا عطر اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ کلام کی بلاغت اور تخلیقی حسن اپنے نقطۂ عروج پر نظر آتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے مذکورہ قطعہ کے آخری دو اشعار جن میں جہاں گیر کے قول و عمل کو تصویر کر دیا گیا ہے:

اٹھ کے دربار سے آہستہ چلا سوئے حرم
تھی جہاں نور جہاں معتکف بیتِ حزن

www.shibliacademy.org

دفعتاً پاؤں پہ بیگم کے گرا اور یہ کہا
تو اگر کشتہ شدی آہ چہ می کردم من

معلوم ہوتا ہے کہ جہاں گیر بادشاہ نہیں بلکہ ایک شوہر اور عاشق مصروف فریاد ہے۔ یہاں اس کی خودسپردگی اور معصومیت لائق دید ہے اور آخری مصرعے میں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام قطعہ سمٹ کر اسی میں آ گیا ہے۔ جہاں گیر کا آہ بھر کر یہ کہنا کہ اگر تجھ کو قتل کر دیا جاتا تو میں کیا کرتا۔ داستانِ جہاں گیر و نور جہاں کو کوزے میں بند کر دیتا ہے۔ دراصل یہی شبلی کے قطعات کا کمال فن ہے۔

شبلی نعمانی نے مسلم لیگ، ندوہ اور علی گڑھ سے متعلق بھی متعدد قطعات کہے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے سیاسی قطعات اپنی الگ شان رکھتے ہیں۔ وہ سیاسی جماعتوں اور سیاست دانوں کی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کو نشانۂ طنز بناتے ہیں لیکن اس سلیقے سے سخن کرتے ہیں کہ ان کے طرز ادا میں ناروا نشتریت کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔

شبلی کے قطعات میں قومی اور وطنی معاملات پر جس نوع کا تخلیقی اظہار ملتا ہے وہ بھی ان کی فکر اور اظہار کی انفرادیت کو قائم کرتا ہے۔ بغور دیکھئے تو محسوس ہوتا ہے کہ قومی اور وطنی حادثات و واقعات جیسے ان کی قلبی واردات کا حصہ بن گئے ہوں۔ ہر ایک واقعہ و حادثہ ان کا ذاتی درد بن جاتا ہے۔ چنانچہ ان کے لہجے کا گداز اور اظہار کا خلوص بعض ہنگامی موضوعات سے متعلق قطعات میں بھی ایک خاص طرح کی جاذبیت پیدا کر کے ان کے اثر کو دیرپا بنا دیتا ہے۔ البتہ یہ ایک سچائی ہے کہ شبلی کی اردو شاعری، شاعر شبلی سے وہ خراج وصول نہیں کر سکی جو نقاد اور نثر نگار شبلی سے ان کے نثری کارناموں نے حاصل کر لیا تھا لیکن اس کے باوجود اس حقیقت سے بھی انکار کی گنجائش نظر نہیں آتی کہ شبلی کے شعری افکار کا نور اور اظہار کا سرور قاری کو نہ صرف سحر زدہ کرتا ہے بلکہ اس کی سخن فہمی سے اپنا جائز خراج وصول کر لیتا ہے۔

www.shibliacademy.org

شبلی اپنی اردو شاعری کی روشنی میں

جناب خالد محمود

نئے تعلیم یافتہ کچھ بھی کہیں لیکن اردو ادب کے عناصر خمسہ یعنی سرسید، محمد حسین آزاد، نذیر احمد، حالی اور شبلی نے جو معرکے سر کیے ہیں وہ کسی اور کا مقدر نہ بن سکے انہوں نے جس کام کا آغاز کیا، اپنی مخلصانہ کوششوں سے اسے درجۂ کمال تک پہنچا دیا اور یہ سب کچھ اس وقت ہوا جب حالات اتنے سازگار نہ تھے جتنے آج ہیں۔ نہ انہیں وہ سہولتیں میسر تھیں اور نہ وہ رسائیاں حاصل تھیں جو ہمیں حاصل ہیں۔ نہ وہ آسائشیں اور حوصلہ افزائیاں تھیں، نہ وہ جدید لائبریریاں اور مطلوبہ مواد کی دستیابی کی آسانیاں اور تحقیق وتنقید کے اصول وضوابط غرض کچھ نہ تھا اور اگر کچھ تھا بھی تو وہ مدھم اور مبہم سا تھا چنانچہ انہیں ہر کام کا آغاز صفر سے کرنا پڑا مگر ان کے پاس کوئی ایسی داخلی طاقت ضرور تھی جو انہیں بڑے سے بڑے کام پر آمادہ کر لیتی اور اس کے سہارے وہ مشکل ترین راہوں سے گزر کر اپنی منزل کو پالینے میں کامیاب ہو جاتے۔ ان کی یہ داخلی طاقت خلوص، لگن اور جانفشانی کی طاقت تھی ان کی متعین کردہ منزلیں بھی خود ان کی ذات کی تزئین وآرائش اور شہرت ونا موری کے لیے نہیں تھیں۔ وہ دوسروں کے لیے راہیں ہموار کرتے اور منزلیں بھی انہیں کے لیے سر کرتے تھے۔ اردو ادب کے ان قابل احترام بزرگوں کے بڑے احسانات ہیں۔ انہوں نے ہمارے لیے راستے بنائے۔ ان راستوں میں چراغ روشن کیے اور قصر اردو کے باغات کو خون جگر سے سینچ کر تاریخ، تنقید، سوانح، ناول، انشائیہ اور شاعری کے اتنے پھول کھلا دیے کہ ان کی خوشبو سے سارا جہانِ اردو معطر ہو گیا۔ آج بھی انہیں کے اخلاص کا فیض جاری ہے۔ یہاں تک کہ ان کے معترضین بھی انہیں کی فتوحات علمی کے سہارے آگے بڑھنے اور اوپر اٹھنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ اردو زبان کی

پروفیسر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی۔

www.shibliacademy.org

خوش نصیبی ہے کہ ان صاحبان علم و دانش نے اس کے نثری ادب کو اپنے عہد زریں میں بیک وقت مالا مال کردیا۔ان میں کا ہر شخص ایک مینارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہے۔سرسید کو لیجیے تحریک سے قطع نظر ''اسباب بغاوت ہند''، ''خطبات احمدی''، ''آثارالصنادید''، ''تہذیب الاخلاق''، ''مضامین''، ''خطوط''، ''مسافران لندن'' جیسی قیمتی تصانیف دے کر گئے ہیں۔محمد حسین آزاد کی آب حیات، نیرنگ خیال، سخن دانِ فارس، دربار اکبری، مکتوبات آزاد اور سفرنامۂ ایران کا جواب کہاں ہے۔ نذیر احمد کے ناول مرأۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، رویائے صادقہ اور ابن الوقت کی اہمیت سے کسے انکار ہوسکتا ہے کہ یہی اردو میں فکشن کی بنیاد ہیں۔مولانا حالی کی مجالس النساء، حیات سعدی، مقدمہ شعر و شاعری، یادگار غالب، حیات جاوید وغیرہ وہ کتابیں ہیں کہ ان پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے۔بلاشبہ ان مصنّفین کی ناقابل فراموش اردو خدمات آبِ زر سے لکھی جانے کے قابل ہیں۔اب صرف ایک شبلی باقی رہ جاتے ہیں توان کی فتوحات ادبی اور علمی کو نگاہ میں رکھتے ہوئے یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ ان پانچوں ادبی ہستیوں میں بحیثیت مجموعی ان کا پایہ سب سے بلند ہے۔اس لیے کہ اس بطل جلیل نے اردو ادب کے سرمائے میں جیسا اور جتنا اضافہ کیا ہے وہ بہ اعتبار معیار و مقدار اپنے ہم عصروں سے نہ صرف زیادہ ہے بلکہ اپنی اہمیت، حیثیت اور عظمت کے اعتبار سے بھی قابل لحاظ حد تک افضل و برتر ہے اس اعتراف حقیقت سے دوسروں کی نفی یا تقابل مقصود نہیں کہ سب کا اپنا اپنا میدان اور اپنا اپنا طریقۂ کار ہے۔البتہ شبلی کے کارناموں کی وسعت دیکھ کر حیرت ضرور ہوتی ہے۔حیرت یوں ہوتی ہے کہ اتنی قلیل عمر میں ایک شخص اتنے مختلف سیاسی، سماجی، علمی، تعلیمی، تدریسی، خانگی، انتظامی، تہذیبی، ثقافتی اور تفریحی کام کیونکر انجام دے سکا اور پھر ان متضاد کاموں کے ساتھ اتنے تحقیقی، تنقیدی، تخلیقی اور تصنیفی کاموں کی یکسوئی کہاں سے لایا اور المامون، سیرت النعمان، الجزیہ، سفرنامۂ روم و مصر و شام، الفاروق، علم الکلام، الکلام، سوانح مولانا روم، موازنہ انیس و دبیر، اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، شعرالعجم اور سیرۃ النبیؐ جیسی غیر معمولی کتابیں کس طرح تصنیف کیں۔اردو ادب کی یہی وہ تصانیف ہیں جن کی بدولت وہ ایوان نمائندگان ادب میں معزز ترین رکن کی حیثیت سے متمکن ہیں۔مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ انہوں نے مذکورہ کارناموں کے ساتھ فارسی شاعری کے لیے بھی وقت نکال لیا اور فارسی میں بہترین شاعری کی مگر اس بات کا

www.shibliacademy.org

افسوس ہے کہ اردو شاعری کو لائق اعتنا نہ سمجھا۔ کبھی کبھی تفریح طبع کے طور پر یا کچھ خاص سیاسی اور قومی موضوعات پر چند نظمیں اور پانچ سات غزلیں ضرور کہی ہیں جن کی بدولت ایک دیوان تیار ہو گیا۔ اس دیوان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے سنجیدگی سے اس طرف رخ کیا ہوتا تو وہ اس میدان میں بھی اپنے ہم عصروں سے آگے ہوتے۔ شبلی کی کلیات اردو ان کے شاگرد رشید سید سلیمان ندوی نے مرتب کی ہے۔ میرے سامنے اس کلیات کا ۲۰۱۲ء کا ایڈیشن ہے جس میں سید سلیمان ندوی کا دیباچہ طبع اول مرقومہ ۱۹۲۵ء اور مقدمہ بعنوان ''مولانا شبلی اردو شاعری کے لباس میں'' مرقومہ ۶ر اپریل ۱۹۴۰ء شامل ہیں۔ مقدمہ خاصا وقیع اور ۲۴ صفحات کو محیط ہے اور اس میں شبلی کی شاعری سے سرسری بحث کی گئی ہے۔ پوری کتاب ۲۱۲ صفحات کی ہے جس میں مختلف اصناف پر شبلی کی چھوٹی بڑی ۹۳ تخلیقات شامل ہیں۔ سب سے بڑی نظم کے اشعار کی تعداد جسے مثنوی کہنا چاہیے۔ ۱۳۴۰ اشعار ہے اور چھوٹی چھوٹی کئی نظمیں بہ شکل قطعات دو دو شعروں کی ہیں۔ پوری کلیات ایک ہزار چار سو اٹھائیس اشعار پر مشتمل ہے جن میں چار چار مصرعوں والے چار قطعات ''تقسیم عمل''، ''وضو خانہ''، ''مسجد کانپور کا وفد''، ''شمشیر برطانیہ'' فارسی زبان میں ہیں ایک ۱۴ مصرعوں کا قطعہ ''کانپور میونسپلٹی کا خطاب مسجد مچھلی بازار کانپور سے'' اور ایک نظم ''مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کے خواب کی تعبیر'' بھی بہ زبان فارسی شامل کتاب ہیں۔ فارسی کے چھ اشعار اور ایک عربی کا شعر مثنوی ''صبح امید'' کی زینت ہے۔ اس کے علاوہ ایک نظم ''جنگ یورپ اور ہندوستان'' میں۔ غالب کا یہ شعر:

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا　　　کرتے ہیں قتل ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

اور غالب ہی کا ایک مصرع: ''مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیے'' نظم ''مسلم لیگ'' میں استعمال ہوا ہے۔ ان نظموں کے مطالعہ سے شبلی کی شاعرانہ عظمت، فن شعر پر ان کی گرفت اور اعلیٰ درجے کے مذاق سخن کا احساس ہوتا ہے۔ انہوں نے اگرچہ موضوعاتی نظمیں زیادہ کہی ہیں مگر خوب کہی ہیں۔ موضوعاتی نظموں کی ایک خامی یہ ہوتی ہے کہ اپنے موضوعات کی طرح ان کے اثرات بھی وقتی اور عارضی ہوتے ہیں لیکن شبلی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے فن کی قوت سے ان نظموں کو بھی زندہ کر دکھایا ہے چنانچہ آج بھی انہیں پڑھیے تو تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ شبلی ایک حساس بلکہ زود حس انسان تھے۔ یہ مزاج شاعری کے حق میں مفید ہوتا ہے مگر شبلی نے انہیں دیگر کاموں میں لگایا جوان

www.shibliacademy.org

کے نزدیک زیادہ اہم تھے۔ وہ ایک رومانیت پسند خوش عقیدہ جذباتی مسلمان تھے، انہیں اپنے شاندار ماضی سے عشق تھا۔ انہیں عربوں سے بھی بہت لگاؤ تھا وہ عربوں کی عظمت رفتہ کے واقف کار اور ہیروز آف اسلام کے عاشق زار تھے۔ انہیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ دوسری اقوام تو کیا خود مسلمان بھی اپنے بزرگوں کے کمالات علمی اور فتوحات ارضی سے واقف نہیں۔ وہ تمام عالم میں مسلمانوں کی زبوں حالی اور درماندگی سے غم زدہ رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ایک طرف اسلامی تاریخ کے عظیم کرداروں کو اردو میں متعارف کرنے کا بیڑا اٹھایا اور دوسری جانب ہندوستانی مسلمانوں کا دفاع کرنے کے لیے اردو شاعری کا سہارا لیا۔ ان کا عمل سرسید کے اصلاحی اور تعلیمی تحریک کو رسد پہنچانے کا ایک اچھا ذریعہ ثابت ہوا۔ وہ جانتے تھے کہ نثر کی بہ نسبت شاعری کا نسخہ زیادہ کارگر اور زود اثر ہوتا ہے چنانچہ انہوں نے اپنی مثنویوں اور طنزیہ نظموں میں قوم کو ماضی کی شاندار روایات یاد دلائیں۔ حال کی پستی و زبوں حالی کا چہرہ دکھایا اور تاریک مستقبل سے خبردار کرنے کی سعی بلیغ کرتے رہے۔ ان کی طبیعت میں خلوص، دل میں جوش و ولولہ اور نظر میں مسلمانوں کی ذلت و رسوائی اور ناطاقتی کے عبرت ناک مناظر و واقعات تھے اس لیے ان کا قلم کبھی طنز کے تیر برساتا، کبھی ڈھارس بندھاتا اور کبھی زخموں پر مرہم رکھ دیتا۔ معاصرین میں حالی، اکبر اور اقبال بھی تھے جس کے نتیجے میں مسدس، شکوہ، جواب شکوہ اور طنزیہ اشعار وجود میں آئے۔ سب کا مقصد ایک اور انداز جداگانہ تھا۔ سرسید تحریک اپنے انداز میں کام کر رہی تھی کوئی اس کا حامی تھا، کوئی مخالف تھا اور کوئی اپنی شرائط کے ساتھ حمایت دینا چاہتا تھا۔ کوئی انگریزوں سے سرسید کی حد سے بڑھی ہوئی دوستی اور انگریزی تہذیب کی درآمد سے متفق تھا تو کوئی متفق نہیں تھا۔ شبلی جذباتی ہیں، رومانی ہیں، شدت پسند ہیں۔ جدھر مسلمانوں کی بھلائی اور اسلام کی سرخ روئی دیکھتے ہیں ادھر ہو جاتے ہیں۔ ان کی اردو نظمیں مسلمانوں کے ذہنی انتشار، معاشرتی خلفشار، سیاسی بے وقعتی اور عالم گیر کسمپرسی کا تکلیف دہ ردعمل ہیں جو سننے والوں کو تڑپا کر رکھ دیتی ہیں۔ اس قسم کی پر تاثیر نظموں میں ''صبح امید'' کے چند اشعار پیش ہیں۔ واضح ہو کہ یہ شبلی کی سب سے طویل اور نمائندہ نظم ہے جو مثنوی کی ہیئت میں ہے۔ اس مثنوی کا آغاز فارسی شعر سے ہوتا ہے:

ادراک حال ما زنگہ می تواں نمود حرفے ز حالِ خویش بہ سیما نوشتہ ایم

www.shibliacademy.org

اس کے فوراً بعد ایک شعر میں قوم کے ابتلا کی جانب اشارہ کیا جاتا ہے:

کیا یاد نہیں ہمیں وہ ایام جب قوم تھی مبتلائے آلام

بظاہر یہ ایک سادہ سا سوال ہے کہ جیسے کسی نے پوچھا ہو آپ کو قوم کی بھی کچھ خبر ہے؟ اس سوال کو سن کر شاعر کا دریائے جوش اُبل پڑتا ہے اور ''مبتلائے ایام'' قوم کا شاندار ماضی اس کے پردہ ذہن پر متحرک ہونے لگتا ہے جسے وہ کرب اور فخر کے ملے جلے جذبات کے ساتھ صفحہ قرطاس پر منعکس کرنے لگتا ہے۔

وہ قوم کہ جان تھی جہاں کی وہ تاج تھی فرق آسماں کی
تھے جس پہ نثار فتح و اقبال کسریٰ کو بھی کرچکی تھی پامال
گل کر دیے تھے چراغ جس نے قیصر کو دیے تھے داغ جس نے
وہ نیزۂ خوں فشاں کہ چل کر ٹھہرا تھا فرانس کے جگر پر
روما کے دھوئیں اڑا دیے تھے اٹلی کو کنویں جھکا دیے تھے

مگر یہی نہیں کہ فتح وظفر کے بعد اس قوم نے اور کچھ نہیں کیا مفتوح علاقوں کی ترقی سے منہ موڑ کر بیٹھ گئی۔ ایسا ہرگز نہ تھا جاں بازیوں اور جہاں داریوں کے ساتھ ساتھ وہ علم و ہنر میں بھی یدطولیٰ رکھتی تھی۔ شبلی کو اس پر بھی احساس تفاخر تھا۔ لکھتے ہیں:

با ایں ہمہ جاہ و شوکت و فر تعلیم و ہنر بھی تھے مسخر
ہیئت میں بلند پایہ اس کا تھا فلسفہ زیر سایہ اس کا
منطق میں ہوا جو گرم جولاں تھامے تھا رکاب مصر و یونان
جو فلسفیان ہندو چیں تھے خرمن سے اسی کے خوشہ چیں تھے

شبلی نے انتہائی جامعیت کے ساتھ ارتقا کے سارے مدارج تمہید کے چند اشعار میں طے کر ڈالے اس کے بعد زوال کی داستان کا آغاز کیا۔ عظیم شعراء کا یہی کمال ہے کہ وہ جب چاہیں کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ باتیں کہہ گزرتے ہیں اور موقع و محل کی مناسبت سے ایسے الفاظ ومحاورات، تشبیہات، تلمیحات، اصطلاحات اور استعارات استعمال میں لاتے ہیں کہ کوزے میں دریا بند ہو جاتا ہے ''دھوئیں اڑانا اور کنویں جھکانا جیسے برمحل محاورے آپ دیکھ سکتے

www.shibliacademy.org

ہیں پھر وہ جب چاہتے ہیں اپنے قلم کے زور سے قطرے کو دریا بنا دیتے ہیں۔ کسی واقعے کو اس کی تمام تر جزئیات کے ساتھ مفصل بیان کرنا واقعہ نگاری کا دوسرا کمال ہے۔ شبلی نے یہ دونوں کام کیے ہیں ۔ جہاں اختصار کی ضرورت تھی وہاں اختصار سے کام لیا اور جہاں طوالت مطلوب تھی وہاں منظوم واقعہ نگاری کا حق اس طرح ادا کیا کہ واقعہ نگاری کو مرقع نگاری کے درجہ پر پہنچا دیا۔ اس نظم کی ایک فطری خوبی یہ ہے کہ مسلمانوں کی داستان زوال کو اچانک شروع نہیں کیا بلکہ اولاً عروج کی جھلکیاں دکھائیں پھر زوال کی داستان آغاز کی چنانچہ اس تضاد سے جو تاثر پیدا کرنا مقصود تھا شبلی اس میں پوری طرح کامیاب ہوئے ۔ قاعدہ ہے کہ جب ہم کسی بے کس ومحتاج شخص کو دیکھتے ہیں تو انسان ہونے کے ناطے فطرتاً اس سے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے لیکن اگر اس کے بارے میں یہ بھی معلوم ہو جائے کہ یہ محتاج کسی وقت صاحب تخت و تاج تھا تو یہ عبرت ناک صورت حال ہلا کر رکھ دے گی۔ مسلمانوں کے حالات و معاملات ایسے ہی عبرت ناک تھے۔ شبلی نے انہیں شاندار ماضی یاد دلا کر احساس کمتری سے نکالنے اور ان میں غیرت وحمیت، عزم وحوصلہ، خودداری، خود آگہی اور خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ نظم کی تمہید میں انہوں نے جن الفاظ سے کام لیا ہے ان میں تاج وفرق ، فتح و اقبال ، قیصر و کسریٰ ، جاہ وحشمت وغیرہ شامل ہیں جو سر بلندی اور اقبال مندی کی علامت ہیں۔ علم و ہنر میں علم ہیئت، فلسفہ، منطق اور مصر و یونان کے فلسفیوں کی جانب اشارہ کر کے یہ بتایا ہے کہ طاقتور ممالک میں فتح ونصرت کی ہماری قوم نے ان علوم وفنون کو فروغ دینے میں بھی کوئی کوتاہی نہیں برتی ۔ مثنوی عروج سے داستان زوال تک لانے کے لیے گریز کا فن استعمال کیا۔ گریز قصیدہ کا جز ہے اور اس کی خوبی یہ ہے کہ جس قدر مختصر ہو اتنی بہتر ہے۔ چنانچہ یہاں بھی دو ہی مصرعوں میں قوم کا عروج آمادہ زوال ہو جاتا ہے۔ مثلاً:

یہ قوم کہ تاج آسماں تھی اب کوئی گھڑی کی مہماں تھی

دوسرا مصرع حسرت ویاس کی تصویر بن کر اک آہ کی شکل میں بے ساختہ ٹپک پڑتا ہے۔ بات آگے بڑھتی تو ماضی پھر سامنے آجاتا ہے، بار بار یاد آتا ہے اور بار بار تکلیف کی شدت کو ابھار جاتا ہے۔

تھے جان کے پڑ گئے جو لالے ہر سانس پہ لیتی تھی سنبھالے

www.shibliacademy.org

جس چشمہ سے اک جہان تھا سیراب
وہ سوکھ کے ہو رہا تھا بے آب

مگر یہ غلطی کس کی ہے۔کیا ہم نے دوسروں سے شکست کھائی ہے؟شبلی اس خیال سے متفق نہیں۔ان کا تاثر یہ ہے کہ:

غفلت نے ڈبو دیا تھا ہم کو
تقلید نے کھو دیا تھا ہم کو

مٹنے پہ جو تھا نشاں ہمارا
خواب اور ہوا گراں ہمارا

غفلت کے یہ چل رہے تھے جھونکے
گو صبح ہوئی پہ ہم نے چونکے

کس نیند میں سوگئیں تھیں آنکھیں
بے کار سی ہوگئیں تھیں آنکھیں

یہ ایک دردمند دل کا قوم کی حالت زار پر بہترین تبصرہ اور تجزیہ ہے۔پوری نظم پر اگر اسی طرح بات کی گئی تو ایک طویل مضمون بھی ناکافی ہوگا۔مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کی ایسی کون سی برائی تھی جو ہمارے اندر نہ ہو اور یہ تمام برائیاں کسی نے تھوپی نہیں خود اختیاری ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ ''خود کردہ را علاج نیست'' من حیث القوم ہماری جو سب سے بڑی خامیاں تھیں اور آج بھی ہیں۔شبلی نے کس دردمندی سے بیان کی ہیں:

آپس میں نفاق کا یہ عالم
یہ اس سے خفا وہ اس سے برہم

اللہ رے یہ وفور غفلت
سمجھے تھے رواج کو شریعت

باطل پہ فدا تو حق سے بیزار
تقلید پر کس بلا کا اصرار

دین دار برائے نام تھے ہم
وابستۂ رسم عام تھے ہم

تھے رسم و رواج پر فدا سب
تحقیق سے کچھ غرض نہ مطلب

اقبال بھی اسی کرب میں مبتلا تھے۔فرماتے ہیں:

آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

شبلی کے مطابق ہمارا یہ حال ہے:

سمجھے نہ ذرا کہ وقت کیا ہے؟
کس سمت زمانہ چل رہا ہے؟

مگر جو قومیں اس راز سے واقف ہیں وہ بہت آگے نکل چکی ہیں:

یاں اور جو قافلے رواں ہیں
سب باد صبا کے ہم عناں ہیں

www.shibliacademy.org

اور ہم

اب تک ہیں بہ غفلت آرمیدہ محوِ چمن خزاں رسیدہ

اس کے بعد شبلی نے سرسید کی شخصیت کا اتنے خوبصورت انداز میں تعارف کرایا ہے کہ اس سے بہتر خیال میں نہیں آسکتا۔ لکھتے ہیں:

ماتم تھا یہی کہ آئی ناگاہ اک سمت سے اک صدائے جاں کاہ
اس شان سے تھی وہ آہ دل گیر پہلو میں اثر بغل میں تاثیر
دل ہاتھ سے لینے میں بلا تھی جادو تھی؟ فسوں تھی؟ جانے کیا تھی؟
ڈوبی ہمہ تن جو تھی اثر میں نشتر سی اتر گئی جگر میں
جس سمت سے آئی تھی وہ آواز وہ جلوہ نمائے سحر و اعجاز
جنبش جو ہوئی رگ اثر کو دل تھام کے سب بڑھے ادھر کو
دیکھا تو وہاں بجاہ و تمکیں آیا نظر اک پیر دیریں
صورت سے عیاں جلال شاہی چہرے پہ فروغ صبح گاہی
وہ ریشِ دراز کی سپیدی چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی
پیری سے کمر میں اک ذرا خم توقیر کی صورتِ مجسم
وہ ملک پہ جان دینے والا وہ قوم کی ناؤ کھینے والا
اٹھتے ہوئے جوش سے برقّت ہے مرثیہ خوانِ قوم و ملت
نالاں ہیں کہ اب سے بھی تو جاگو اے خواب گراں کے سونے والو
آخر کب تک یہ خوابِ غفلت الٹو تو ذرا نقابِ غفلت
تا چند رہوگے مست و سرشار اٹھو کہ سحر ہوئی نمودار
سوچو تو ذرا کہ حال کیا ہے کس خواب میں ہو؟ خیال کیا ہے

پرخلوص شاعر کی اس موثر نظم کا اختتام فارسی کے اس شعر پر ہوتا ہے:

سرگذشتِ عہد گل را ہم ز شبلی می شنو عندلیب آشفتہ تر گفت است ایں افسانہ را

نظم کیا ہے تاثیر کا طلسم ہے مصرعے کیا ہیں جگر کے ٹکڑے ہیں جو دہن قلم سے ٹپکے

www.shibliacademy.org

ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ شبلی اگر سنجیدگی سے فن شعر کی جانب متوجہ ہوتے تو ہم عصروں سے آگے ہوتے۔

شبلی نے مثنوی کے علاوہ قصائد، مسدس، قطعات اور نظمیں بھی لکھی ہیں۔ مگر ان کی شاعری کا سب سے بڑا موضوع قوم، ملت اور قومی اور ملکی سیاست ہے ایک آدھ مرثیہ اور دو چار تہنیتی نظمیں بھی ہیں اور لاجواب ہیں اگر ان کی قومی نظموں اور برادر عزیز کے مرثیہ اسحاق میں جو جگر کاوی اور جاں سوزی ہے۔ وہ کہیں اور نظر نہیں آتی ''تماشائے عبرت'' شبلی کا ایک قومی مسدس ہے۔ جسے انہوں نے سرسید کے قومی تھیٹر علی گڑھ میں اپنے پر درد اور پرسوز لہجے میں خود پڑھ کر سنایا تھا جیسا کہ وہ اکثر سنایا کرتے تھے۔ شبلی کے لیے ایک سہولت یہ تھی کہ انہیں قومی معاملات میں درد اور سوز پیدا کرنے کے لیے کسی کوشش کی ضرورت نہ تھی یہ چیز ان کے رگ و پے میں سمائی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس کا یہ اثر ہوتا کہ بات دل سے نکلتی اور دل میں اترتی چلی جاتی۔ علی گڑھ میں ''تماشائے عبرت'' کے دوران بھی یہی ہوا کہ سننے والے اپنا سر دھنتے تھے۔ یہ وہ تھیٹر ہے جس میں سرسید اور ان کے ہم نواؤں نے سوانگ بھرے اور لباس اور حلیہ بدل کر تقریریں کیں اور اسی میں شبلی نے اپنی نظم سنائی۔ اس نظم میں ایک بند کے چار مصرعے پڑھنے کے بعد اقبال کے شکوے کا ایک شعر یاد آ گیا اور معاً خیال آیا کہ قومی معاملات میں ان اسلاف کے سوچنے سمجھنے اور یہاں تک کہ لکھنے کے ڈھنگ میں بھی کس قدر یکسانیت پائی جاتی تھی اور یہ بزرگ شعوری اور لاشعوری طور پر یہ ایک دوسرے سے کس قدر قریب تھے۔ مثلاً شبلی کے ایک بند میں چار مصرعوں کے بعد میں نے اقبال کے دو مصرعوں کا پیوند لگایا ہے۔ دیکھیے کیسا چسپاں ہوا ہے:

کون تھا جس نے کیا فارس و یونان تاراج — کس کی آمد پہ فدا کر دیا جے راج نے راج
کس کو کسریٰ نے دیا تخت و زر و افسر و تاج — کس کے دربار میں تاتار سے آتا تھا خراج
''کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے — منہ کے بل گر کے ھو اللہ احد کہتے تھے''

محسن کاکوروی کا نعتیہ قصیدہ اردو شاعری میں کئی لحاظ سے منفرد خیال کیا جاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ اپنے موضوع تشبیب اور روانی کے اعتبار سے اردو قصائد کی جان ہے۔ نعتیہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس تشبیب میں موسم بہار کا ذکر ہے اور اس کے تمام اشعار حرف لام پر ختم

www.shibliacademy.org

ہوتے ہیں اس لیے یہ قصیدہ اصطلاحاً بہاریہ اور لامیہ بھی ہے۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی صنف اپنے معیار کی آخری حدوں کو چھو لیتی ہے تو دوسرے لوگ اسے بھاری پتھر سمجھ کر چومتے ہیں اور چھوڑ دیتے ہیں لیکن بعض جیالے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اس سے پنجہ کشی کی ٹھان لیتے ہیں چنانچہ شبلی نے بھی محسن کی زمین میں قصیدہ کہنے کی ٹھان لی اور جسٹس سید محمود فرزند سرسید احمد خاں کی شادی میں تہنیتی قصیدہ نہ صرف اس زمین بلکہ اسی رنگ میں کہہ ڈالا اور حق یہ ہے کہ خوب کہا بعض بعض مصرعے تو ایسے کمال کے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے محسن سے چھوٹ گئے تھے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

پھر ہوا باد بہاری کا جو عالم میں عمل — چھا لیا سبزہ نوخیز نے سب دشت و جبل
سمت قبلہ سے جو اٹھتی ہیں گھٹائیں ہر بار — کہتی ہیں توبہ زاہد سے کہ اب کی تو سنبھل

پہلے شعر میں لفظ ''چھالیا'' خوب بلکہ بہت خوب ہے۔ اس لفظ کا استعمال آسان نہ تھا۔ میر کا شعر ہے:

اگر ہنستا ہوا صحن چمن میں اب کے پاؤں گا — تو بلبل آشیاں تیرا بھی میں پھولوں سے چھاؤں گا

شبلی کے قصیدے میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ دوسرے شعر میں قبلہ کی رعایت سے زاہد اور توبہ کے الفاظ آئے ہیں۔ شبلی نے جگہ جگہ مختلف صنعتوں اور رعایتوں کا استعمال کیا لیکن ان کے موضوعات و مضامین اور فکر و نظر پر زیادہ گفتگو کی جاتی ہے۔ قصیدہ کے چند اشعار دیکھیے:

نوعروساں چمن کے ہیں نرالے انداز — کہ صبا گود میں لیتی ہے تو جاتے ہیں مچل
جھومتی چلتی ہے بے خود روشوں پر جو نسیم — غنچے کہتے ہیں چٹک کر کہ سنبھل دیکھ سنبھل
اے صبا باغ میں آنا تو دبے پاؤں ذرا — نیند میں سبزۂ خوابیدہ کے آئے نہ خلل
بوئے خوش سے یہ نسیم سحری کہتی ہے — حجرۂ غنچہ میں کیا کرتی ہے آ سیر کو چل

قصیدہ کا موضوع شادی ہے جس میں ایک دلہن بیاہ کر آئی ہے اس صورت حال کو ذہن میں رکھیے اور پھر تشبیب کے مذکورہ بالا اشعار کو بغور پڑھیے، شبلی کی شوخ مزاجی، رومان پروری اور فن شعر پر کامل عبور کا راز آپ پر منکشف ہو جائے گا اور پھر عروس نو، چمن عروس نو کا نرالا پن، صبا کی گود، عروس کا مچلنا، نسیم کا جھومنا، بے خود ہونا، غنچہ کا چٹکنا، صبا کا دبے پاؤں آنا، سبزۂ خوابیدہ، نیند میں خلل، بوئے خوش، نسیم سحری، حجرہ غنچہ، سیر کی دعوت کے استعاراتی راز بھی اپنے تلازمات کے ساتھ منکشف ہو جائیں

www.shibliacademy.org

گے۔شبلی مضامین تشبیب کو لطیف اور معنی خیز بنانے میں کامیاب ہیں۔شبلی نے ایک پر لطف قصیدہ سلطان عبدالحمید کی مدح میں لکھا ہے اس کی زمین انشاء اللہ خاں انشاء کے مشہور قصیدے

بکھیاں پھولوں کی تیار کرائے بوئے سخن
کہ ہوا کھانے کو نکلیں گے جوانان چمن

سے مستعار ہے۔اس قصیدے میں تشبیہات اور استعارات کی بہار دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ چند اشعار کی قرأت پر اکتفا کروں گا۔

شعلہ زن پھر چمنستاں میں ہوئی آتش گل — پھر صبا چلتی ہے گلشن میں بچا کر دامن
مسند آرائے تجمل جو ہوا شاہد گل — مرغ گلشن پہ صدا دیتے ہیں الملک لمن
کوندتی برق ہے گھنگھور گھٹا چھائی ہے — بوندیاں پڑتی ہیں چلتی ہیں ہوائیں سن سن

آخری مصرع میں سَن سَن کی تکرار، ہوا کا انداز ہی نہیں بلکہ اس کی آواز بھی ہے۔ پورا قصیدہ جو صرف ۱۴ اشعار پر مشتمل ہے پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ذوق سلیم اسے بار بار پڑھنے پر اکساتا ہے۔ایسی غضب کی فنکاری جو سطح پر نظر نہ آئے اور جو میر و غالب کا شیوہ ہے مگر غور کیجیے تو تمام اشعار فصاحت و بلاغت سے لبریز ہی نہیں سرشار بھی ہیں اور کیوں نہ ہوں جو شاعر ''موازنہ انیس و دبیر'' میں شبنم و اوس پر اور صحرا و جنگل کی نشست پر نگاہ رکھتا ہو وہ اپنے کلام میں ان باتوں کا خیال کیوں نہ رکھے گا۔ انہوں نے رکھا اور پورا خیال رکھا۔صرف یہی نہیں کہ اسے آتش گل کی شعلہ زنی کے خوف سے صبا بھی گلشن میں اپنا دامن بچا کر چل رہی ہے کہ جھلس نہ جائے اور شاہد گل اس غرور اور شان نخوت سے مسند نشیں ہوا ہے کہ گلشن کے پرند بھی گویا احساس مرعوبیت میں اس کی خدائی کا اعلان کرنے لگے ہیں۔ تیسرا شعر تو منظرکشی اور فصاحت کی جان ہے۔ان اشعار میں معنی آفرینی، لطافت بیان اور نزاکت خیال کے ساتھ ہم مزاج اور ہم آواز لفظوں کے انتخاب نے صوتی ہم آہنگی کی فضا قائم کرتی ہے جو بلاغت کی بنیادی شرط ہے۔

شبلی کی مذہبی اور اخلاقی نظمیں بھی انتہائی پر اثر ہیں۔عموماً اس قبیل کی نظموں میں تاثیر کم ہوتی ہے۔ان کو پڑھنے میں جی بھی نہیں لگتا، طبیعت بہت جلد اُچاٹ سی ہو جاتی ہے مگر شبلی کے قلم میں قدرت نے وہ قوت اور تاثیر رکھ دی ہے کہ موضوع کوئی ہو نظم شروع کرنے کے بعد ختم ہونے

www.shibliacademy.org

سے پہلے نہیں چھوٹتی جس طرح نثر میں ان کا طرز تحریر رنگینی و سادگی، متانت و شگفتگی اور لطافت و سنجیدگی کا سنگم ہے۔ یہاں تک کہ تاریخ و تنقید اور تحقیق جیسے خشک موضوعات میں ان کا اسلوب نگارش جذب و کشش کی اپنی فطری صلاحیت سے دست بردار نہیں ہوتا۔ اسی طرح نظم کے ہر مضمون میں ان کے طرز ادا کی زیریں لہریں اپنے وجود کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔ شبلی واقعہ کو اتنی خوبصورتی اور فنکاری سے بنتے ہیں کہ اس کی کڑیاں ایک دوسرے سے جڑتی چلی جاتی ہیں۔ انہیں واقعات کی جزئیات اور واقعے کی مناسبت سے الفاظ کے انتخاب میں کمال حاصل ہے فکر و فن کا یہ اتصال ہی ان کی نظموں کو پڑھے جانے اور متاثر کرنے کے قابل بناتا ہے۔ ہجرت نبویؐ، تعمیر مسجد نبویؐ، ایک خاتون کی آزادانہ گستاخی، اہل بیت رسولؐ کی زندگی، ایثار کی اعلیٰ ترین نظیر، مساوات اسلام اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔ چند اشعار پیش ہیں۔

ہجرت نبویؐ میں جب رسول اکرم ﷺ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہمراہ راہ کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے مدینے پہنچتے ہیں تو آپ کا زبردست خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ شبلی لکھتے ہیں:

لڑکیاں گانے لگیں جوش میں آ کر اشعار نغمہ ہائے طلع البدر سے گونج اٹھے گھر

اس کے بعد:

سب کو تھی فکر کہ دیکھیں یہ شرف کس کو ملے میہماں ہوتے ہیں کس اوج نشیں کے سرور

اور یہ شعر تو شبلی جیسا بڑا شاعر ہی کہہ سکتا تھا:

سینے کہتے تھے کہ فطرت گہ دل حاضر ہے آنکھیں کہتی تھیں کہ دو اور بھی تیار ہیں گھر

یہ ہے وہ شاعری کہ اس پر جس قدر ناز کیا جائے کم ہے۔ تعمیر مسجد نبویؐ کے لیے جب آنحضرت ﷺ نے یتیم بچوں سے ان کی زمین خرید لی تو اب تعمیر کی فکر ہوئی۔ تمام انصار و مہاجر مزدور بن گئے مگر صرف انصار و مہاجر ہی مزدور نہیں بنے بلکہ شبلی کہتے ہیں:

اک اور نفس پاک بھی ان سب کا شریک جو آب و گل کے شغل میں بھی شاد کام تھا
کندھوں پہ اپنے لاد کے لاتا تھا سنگ و خشت سینہ غبار خاک سے سب گرد فام تھا
سمجھے کچھ آپ؟ کون تھا ان کا شریک حال یہ خود وجود پاک رسولؐ انام تھا
جو وجہ آفرینش افلاک و عرش تھا جس کا کہ جبرئیلؑ بھی ادنیٰ غلام تھا

www.shibliacademy.org

اس مقام پر پہنچ کر اہل ایمان کے دلوں میں رقت طاری ہو جاتی ہے آنکھیں فرطِ عقیدت سے نم ہو جاتی ہیں اور زبان سے درود جاری ہو جاتا ہے صلوا علیه و آله:

''اہل بیت رسول کی زندگی'' میں سیدہ فاطمہؓ کا ایک واقعہ اس قدر پر اثر انداز میں بیان ہوا ہے کہ اس کو پڑھ کر بھی آنسو نکل پڑتے ہیں۔ اس نظم میں بنت نبی ﷺ ایک کنیز کی خواہش کرتی ہیں مگر حضور اکرم ﷺ ان سے زیادہ ضرورت مندوں کا حوالہ دیتے ہیں تو وہ خاموش واپس چلی جاتی ہیں۔ اس واقعے کو شبلی نے دلوں کو چھو لینے والی سادگی اور خوبی سے بیان کیا ہے۔

ایک اور نظم ''ایثار کی اعلیٰ ترین نظیر'' میں شبلی انصار کی ایک خاتون کا واقعہ بیان کرتے ہیں۔ یہ جنگ احد کا واقعہ ہے جس میں نعوذ باللہ حضور اکرم ﷺ کے تعلق سے ایک افواہ پھیلا دی گئی تھی۔ یہ افواہ سن کر انصار کی ایک خاتون اس قدر پریشان ہوئیں کہ دل برداشتہ ہو کر میدانِ جنگ کی جانب چل پڑیں۔ وہاں پہنچ کر انہیں یہ اندوہ ناک خبریں ملیں کہ ان کے والد بھائی اور شوہر سب شہید ہو چکے ہیں مگر ان خبروں کا ان خاتون پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ پھر کیا ہوا۔ شبلی کے اشعار میں سنیے:

اس عفیفہ نے یہ سب سن کے کہا تو یہ کہا ۔۔۔ یہ تو بتلاؤ کہ کیسے ہیں شہنشاہ اُمم
سب نے دی اس کو بشارت کہ سلامت ہیں حضور ۔۔۔ گرچہ زخمی ہیں سر و سینہ و پہلو و شکم
بڑھ کے اس نے رخ اقدس کو جو دیکھا تو کہا ۔۔۔ تو سلامت ہے تو پھر ہیچ ہیں سب رنج و غم
میں بھی اور باپ بھی شوہر بھی برادر بھی فدا ۔۔۔ اے شہ دیں ترے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم

شبلی حضرت عمرؓ کے بڑے مداح ہیں انہوں نے حضرت عمرؓ کی سوانح ''الفاروق'' ہی نہیں لکھی کئی نظمیں بھی کہی ہیں۔ حضرت عمرؓ ایسی ہی آن بان اور شان والے خلیفہ تھے۔ ان کے رعب و دبدبے کا اعتراف دشمن بھی کرتے ہیں دوسری طرف عدل و انصاف اور حق و صداقت کے آگے سر تسلیم خم کرنے کے بھی ان کے بے شمار واقعات ہیں۔ کبھی کوئی بدو انہیں بر سر منبر ٹوک دیتا ہے کبھی کوئی ضعیفہ روک دیتی ہیں۔ شبلی نے ان واقعات کو اپنے مخصوص سادہ پر اثر انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ سادگی میں بڑا اثر ہوتا ہے اور اگر واقعہ سچا اور بیان کنندہ مخلص ہو تو اس کے اثر کا تو پوچھنا ہی کیا ان نظموں کے ساتھ شبلی کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

شبلی کی ایک اور نظم ''عدل جہاں گیری'' ہے یہ ہم نے گیارہویں درجے کی درسی کتاب

www.shibliacademy.org

میں پڑھی تھی، اس کی روانی اور واقعہ کی تعجب خیزی کی وجہ سے اسی وقت پوری یاد ہوگئی تھی۔ واقعہ یوں ہے کہ ملکہ نور جہاں شاہی محل کے بام پر جلوہ افروز تھی کہ اتفاقاً کوئی راہ گیر ادھر سے گزرتا ہے۔ نور جہاں کو غصہ آجاتا ہے اور وہ طپنچہ سے اس کو ختم کر دیتی ہے جہاں گیر کو خبر ہوئی تو نور جہاں نے اپنے عمل کی تصدیق کر دی اور مفتی دیں نے قصاص کا فتویٰ صادر فرما دیا۔ نور جہاں گرفتار کر لی گئی مگر مقتول کے ورثا نے خوں بہا لے کر معاف کر دیا۔ اس واقعہ میں کسی عشقیہ مثنوی کے قصہ جیسی کشش ہے۔ قصہ چونکہ کسی رنگین ڈرامے کے المیہ سین جیسا ہے اس لیے اس کی زبان اور اسلوب سادہ و پُرکار ہے۔ شبلی نے اس واقعہ کو وہی فطری زبان دی ہے جو اس کا حق ہے۔ شبلی کی یہی خوبی ہے کہ نثر ہو یا نظم طرز ادا اور موضوع میں مطابقت اور مماثلت کا پورا خیال رکھتے ہی اور روانی تو بہرحال ان کا طرۂ امتیاز ہے جو زبان و بیان پر ان کی دسترس کا مظہر ہے۔ اس نظم میں جو ڈرامائی فضا قائم کی گئی ہے اور مکالموں کے جو تیور ہیں ان سب نے مل کر واقعہ کو مرقع بنایا ہے۔ نظم پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے جیسے سارے کردار ہمارے سامنے ہیں اور ہم یہ واقعہ پڑھ نہیں رہے بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ پوری نظم سنا دی جائے مگر ۱۲۵ اشعار کی نظم ہے اس لیے چند اشعار پر ہی اکتفا کروں گا۔ نظم شروع ہوتی ہے:

قصر شاہی میں کہ ممکن نہیں غیروں کا گزر — ایک دن نور جہاں بام پہ تھی جلوہ فگن
کوئی شامت زدہ رہ گیر ادھر آ نکلا — گرچہ تھی قصر میں ہر چار طرف سے قدغن
غیرت حسن سے بیگم نے طپنچہ مارا — خاک پر ڈھیر تھا اک کشتۂ بے گور و کفن

اس قتل کی خبر جہاں گیر کو پہنچتی ہے۔ وہ تصدیق چاہتا ہے نور جہاں اعتراف کر لیتی ہے مگر اعتراف بھی کیسا۔ یہ کسی عامی کا اعتراف نہیں حسن مجسم نور جہاں کا اعتراف ہے جو ایک طرف ملکۂ جہاں گیر ہے دوسری جانب ملکۂ حسن ہے اس لیے نخوت حسن سے سرشار ہے۔ اب ذرا اس کی نخوت کے تیور ملاحظہ کیجیے۔ کلک شبلی نے کس طرح اسے نخوت مجسم بنا دیا ہے۔ کہتی ہے:

ہاں مجھے واقعہ قتل سے انکار نہیں — مجھ سے ناموس حیا نے یہ کہا تھا کہ بزن
اس کی گستاخ نگاہی نے کیا اس کو ہلاک — کشور حسن میں جاری ہے یہی شرع کہن

سیاسی نظموں میں "شہر آشوب اسلام" اچھی نظم ہے اسے پڑھنے کے بعد اقبال کا ایک

www.shibliacademy.org

شعر یاد آ گیا جو اس نظم کا خلاصہ ہے:

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم نہایت اس کی حسین ابتدا ہے اسماعیل

''خیر مقدم ڈاکٹر انصاری'' بھی ایک اچھی نظم ہے۔ یہ نظم ہندوستان کے طبی وفد کی جنگ بلقان ترکی سے واپسی پر بطور تہنیت بمبئی میں پڑھی گئی تھی۔ اس نظم کی خوبی یہ ہے کہ اس کا اختتام مایوس کن نہیں، پُر امید اور حوصلہ افزا ہے۔ آخر کے دو شعر پیش خدمت ہیں:

عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر اچھل آئے کہ ہم نے انقلابِ چرخ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں

دعائے کہنہ سالاں ہے اگر مقبول یزدانی تو اب دست دعا ہے اور یہ شبلی نعمانی

مسلم لیگ پر کئی نظمیں ہیں اور تقریباً سب کی سب طنزیہ ہیں۔ شبلی کو مسلم لیگ کی پالیسیوں اور نظریات سے اختلاف تھا وہ اس پارٹی میں خلوص کی کمی اور قول و عمل میں تضاد دیکھتے تھے۔ اس لیے اکبر الہ آبادی کے انداز میں انہیں خوب طنز کے تیروں کا نشانہ بنایا ہے۔ اس دور پر اکبر کا گہرا اثر تھا۔ شبلی نے ان کے انداز میں کئی قطعات اور کچھ نظمیں کہیں۔ اکبر کے انداز میں اس درجہ بلاغت تھی کہ ان کی راہ پر چلنا ہر ایک کے لیے آسان نہ تھا۔ شبلی نے کامیاب نقل کی ہے۔ چند قطعات دیکھیے مگر ان کا تعلق مسلم لیگ سے نہیں ایک قطعہ کا عنوان ہے ''افسون حریت''۔

لاکھ آزادئ افکار کو روکا لیکن یہ وہ افسوں ہے جو ہر شخص پہ چل جاتا ہے

غیر کم بخت تو گستاخ تھے مدت سے مگر اب تو کچھ آپ کے منہ سے بھی نکل جاتا ہے

ایک قطعہ اور سن لیجیے۔ عنوان ہے ''ردعمل''۔

اعتدال آنے نہ پایا ہے نہ آئے گا کبھی آپ کی طرح سے مجھ کو بھی یہی کھٹکا ہے

یہ تو ہونا ہے کہ اچھلے گی اسی زور سے یہ آپ نے قوم کو جس زور سے دے پٹکا ہے

شبلی کی مختصر نظموں میں ''ہم کشتگان معرکۂ کانپور'' ہیں نہایت پر اثر اور مشہور نظم ہے۔ جنگ بلقان کے زمانے میں کانپور کے محلّہ مچھلی بازار میں ایک مسجد تھی جس کے وضو خانے کو حکومت وقت نے سڑک نکالنے کے لیے شہید کر دیا تھا اس کے ردعمل میں مسلمانوں کو جوش آ گیا اور وہ مسجد کی اینٹیں اٹھا کر دیوار بنانے لگے۔ کلکٹر نے حملہ کا حکم دے دیا۔ بہت سے مسلمان جن میں معصوم بچے بھی شامل تھے شہید ہو گئے۔ اس واقعہ نے سارے ہندوستان کو ہلا کر رکھ دیا۔ شبلی کی نظم

www.shibliacademy.org

اسی واقعہ کی یاد تازہ کرتی ہے۔

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے   دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفل خورد سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر   بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں

اور آخری شعر ہے:

پوچھا جو میں نے کون ہو تم آئی یہ صدا   ہم کشتگان معرکۂ کانپور ہیں

یہ قطعہ نما نظم میر کی زمین میں ہے مگر ردیف بدلی ہوئی ہے۔ میر کی غزل میں ''تھا'' ردیف تھی۔ اس کا ایک قطعہ بند بہت مشہور ہے اور اتنا ہی پراثر بھی ہے اسے یہاں پڑھا جائے تو بے محل نہ ہوگا۔ میر کہتے ہیں:

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا   یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر   میں بھی کبھو کسو کا سر پر غرور تھا

میر کی اسی زمین میں شبلی نے ایک اور نظم بھی کہی ہے اور اس میں ردیف بھی تبدیل نہیں کی۔ عنوان ہے ''خطاب بہ رائٹ آنریبل سید امیر علی'' یہ ایک طنزیہ نظم ہے جس کا آغاز اس مطلع سے ہوتا ہے:

اغماض چلتے وقت مروت سے دور تھا   اس وقت پاس آپ کا ہونا ضرور تھا

اسی طرح مسلم لیگ پر ایک طنزیہ نظم ہے جس کا عنوان بھی مسلم لیگ ہے۔ اس کا پہلا شعر ہے:

جناب لیگ سے میں نے کہا کہ اے حضرت   کبھی تو جا کے ہمارا بھی ماجرا کہیے

یہ قطعہ غالب کی زمین میں ہے جس کا مطلع ہے:

کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے   تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے

غالب کی اس غزل کا لہجہ بھی طنزیہ ہے جو شبلی کو سوٹ کر رہا تھا اسی لیے انہوں نے نظم کا اختتام غالب ہی کے مصرع پر کیا ہے:

جناب لیگ نے سب کچھ یہ سن کے فرمایا   ''مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیے''

یہ پوری نظم اسی مصرعے کی تضمین بن گئی ہے۔ ہر ذہین اور صاحب ذوق قاری کی طرح شبلی بھی غالب سے بہت متاثر ہیں جگہ جگہ ان کی نقل کرتے ہیں اور ان کے اشعار کا شعوری اور غیر ضروری طور پر برمحل استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ایک نظم ''یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کا اجلاس لکھنؤ''

www.shibliacademy.org

کے پانچویں بند کا یہ پہلا شعر:

نے وہ خروش و جوش نہ وہ گیر و دار ہے   یا صبح دم جو دیکھئے آ کر تو بزم میں

غالب کی غزل:

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے   اک شمع ہے دلیل سحر، سو خموش ہے

سے ماخوذ ہے ردیف و قافیہ بدل جانے کی وجہ سے مصرع ثانی میں تھوڑی سی تبدیلی آ گئی ہے۔
غالب کا شعر یوں ہے:

یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں   نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

ممکن ہے شبلی نے جان بوجھ کر تحریف کی ہو اور مصرع اول میں جسے جوں کا توں نقل کیا ہے مرتب یا کاتب واوین لگانا بھول گئے ہوں۔

ایک اور نظم بعنوان ''جنگ یورپ اور ہندوستان'' بھی غالب کے ایک شعر کی تضمین ہے۔ نظم ہے:

اک جرمنی نے مجھ سے کہا ازرہ غرور   آساں نہیں ہے فتح تو دشوار بھی نہیں
برطانیہ کی فوج ہے دس لاکھ سے بھی کم   اور اس پہ لطف یہ ہے کہ تیار بھی نہیں
باقی رہا فرانس تو وہ رندِ لم یزل   آئیں شناس شیوۂ پے کار بھی نہیں
میں نے کہا غلط ہے ترا دعویٰ غرور   دیوانہ تو نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں
ہم لوگ اہل ہند ہیں جرمن سے دس گنے   تجھ کو تمیز اندک و بسیار بھی نہیں
سنتا رہا وہ غور سے میرا کلام اور   پھر وہ کہا جو لائق اظہار بھی نہیں
''اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا   لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں''

آخری شعر غالب کا ہے۔ مشہور ہے سب جانتے ہیں مگر کتاب میں اس پر بھی واوین ہونا چاہیے جو نہیں ہے۔

آخر میں شبلی کے اس مرثیے کا ذکر ضرور کروں گا جو انہوں نے اپنے بھائی کی وفات پر لکھا تھا واقعی یہ ایک نہایت پرسوز مرثیہ ہے۔ اردو کے شخصی مرثیوں میں اس کا حوالہ اتنا نہیں ملتا جتنے کا یہ مستحق ہے۔ اس کوتاہی کی جانب توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ شبلی نے سیرۃ النبیؐ اور نواب

www.shibliacademy.org

سلطان جہاں بیگم والیِ ریاست بھوپال کے لیے جو دو قطعات لکھتے ہیں وہ غیر فانی ہیں:

شبلی کی نظموں کے اس فکری اور فنی (فکری زیادہ فنی کم) تجزیے کے بعد جی چاہتا ہے کہ ان کی غزلوں کا بھی مختصر جائزہ لیا جائے۔ ان کی دستیاب غزلوں کی تعداد صرف سات ہیں اس لیے یہ جائزہ اپنے آپ مختصر ہو جاتا ہے۔ کلیات شبلی کے مرتب سید سلیمان ندوی نے شبلی کی غزلوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک دلچسپ مگر معنی خیز جملہ یہ لکھا ہے کہ ''ان غزلوں میں سوائے غزل ہونے کے کوئی خاص خوبی نہیں''۔ حالانکہ غزل ہونا بذات خود غزل کی خوبی ہے اور یہی شبلی کی غزل کی خاص خوبی ٹھہری''۔ ادب کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اب غزل کا دامن فکر اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ اس نے دنیا کے ہر موضوع کو اپنے کوزے میں بند کر لیا ہے اور چونکہ غزل رمز و کنایہ کا فن ہے اس لیے اس کے اندر معانی کا ایک جہاں آباد ہے۔ غزل کا شعر ایک ایسا طلسمی پٹارا ہے کہ اسے جو جس مقصد سے کھولے گا اسے وہی مقصد حاصل ہو گا لیکن ایسے طلسمی شعر کی چابی ہر شاعر کے پاس نہیں ہوتی۔ اس فسوں کی فسوں کاری کسی کسی کے حصے میں آتی ہے یا پھر وہ غزل تو ہے ہی جسے شعرا نے عشق و محبت کی باتیں کرنا، عورتوں سے باتیں کرنا یا خدا سے باتیں کرنا سکھایا ہے اور اگر یوں ہے تو یوں ہونا بھی کیا برا ہے۔ محبت کے جذبے سے کوئی بشر خالی نہیں۔ اس طرح یہ ایک بڑا اور وسیع موضوع بن جاتا ہے۔ اب رہا عورتوں سے باتیں کرنے کا معاملہ تو پہلے انسان سے آج تک سبھی نے عورتوں سے عشق و محبت کی باتیں کی ہیں اور کرتے رہیں گے۔ اس لیے اپنے بنیادی، لغوی اور فطری معنی میں غزل محبت کی زبان ہے اس لیے اس کی اہمیت اور ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ شرط وہی ہو گی جو غالب نے عائد کی تھی:

مقصد ہو ناز و غمزہ و لے گفتگو میں کام چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

شبلی نے اپنی تھوڑی سی غزلوں میں اسی روایتی عشقیہ غزل کی نمائندگی کی ہے جس کی جانب کلیات کے مرتب مولانا سید سلیمان ندوی نے اشارہ کیا ہے یعنی عورتوں سے باتیں کرنے والی غزل۔ اس خیال کو ذہن میں رکھ کر جب شبلی کی ان سات غزلوں کا مطالعہ کیجیے تو صاف محسوس ہو گا کہ انہوں نے بس یوں ہی تفریح طبع کے طور پر یہ چند غزلیں کہی ہیں مگر انہیں پڑھ کر صنف

www.shibliacademy.org

غزل کی کم نصیبی پر افسوس ہوتا ہے کہ وہ اتنے اچھے شاعر سے محروم رہی پہلے چند اشعار دیکھیے:

اثر کے پیچھے دل حزیں نے نشان چھوڑا نہ ہر کہیں کا
گئے ہیں نالے جو سوئے گردوں تو اشک نے رخ کیا زمیں کا

شاعر عموماً نالے کرتے یا اشک بہاتے ہیں۔ نالے کیے تو آسمان کو ہلا دیا، آنسو بہائے تو ساری زمیں تر کردی لیکن شبلی نے ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا، بظاہر بڑا فطری اور مبالغے سے عاری شعر ہے مگر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نالے اور اشک وہ سب کچھ کر دکھائے جس کا ذکر کیا گیا ہے۔ دل حزیں نے برائے اثر اپنے سفیر زمیں سے فلک تک ہر کہیں بھیج دیے ہیں یعنی کوئی جگہ نہیں چھوڑی، خیال آفرینی کی اچھی مثال ہے۔ دوسرا شعر دیکھیے:

بھلی تھی تقدیر یا بری تھی یہ راز کس طرح سے عیاں ہو　　بتوں کو سجدے کیے ہیں اتنے کہ مٹ گیا سب لکھا جبیں کا

غالب نے بھی بہت سجدے کیے تھے شبلی کے سجدوں سے تو پیشانی کا لکھا ہوا مٹا ہے۔ غالب نے سنگ آستاں کو ہی مٹانے کا ارادہ کرلیا تھا۔ اپنی غزلوں میں شبلی غالب سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ جگہ جگہ ان کے ہم خیال ہیں۔ غالب کا رنگ اختیار کرنا تو مشکل ہے مگر مضامین تو اپنائے جاسکتے ہیں۔ شبلی نے یہی کام کیا ہے۔ اس مضمون میں غالب نے کہے ہیں:

گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا　　ننگ سجدہ سے میرے سنگ آستاں اپنا

دونوں کے سجدوں میں جو خاص بات ہے وہ یہ ہے کہ شبلی کے شعر میں تقدیر کا لکھا مٹ گیا ہے جو خارجی نہیں داخلی ہوتا ہے اور غالب کا سجدہ ننگ سجدہ ہے یعنی سجدے کے لیے عار ہے۔ انہیں الفاظ و خیالات نے ان اشعار کو معنی خیز بنایا ہے۔ شبلی کا تیسرا شعر ہے:

وہی لڑکپن کی شوخیاں ہیں وہ اگلی ہی سی شرارتیں ہیں
سیانے ہوں گے تو ہاں بھی ہوگی ابھی تو سن ہے نہیں نہیں کا

حالانکہ موضوع کے اعتبار سے اس شعر میں لکھنوی انداز جھلکتا ہے مگر ذہن کو بھٹکاتا اور بہکاتا نہیں بے تکلفی اور پاکیزگی اور معصوم شرارتوں کا احساس دلاتا ہے۔ الھڑپن کی نفسیاتی گرہ کشائی کی اچھی مثال ہے۔ غالب نے بھی اپنے انداز میں لفظ ''نہیں'' کی شکایت کی ہے۔ دیکھیے معشوق کی ''نہیں'' پر کیا خوبصورت طنز ہے کہتے ہیں کہ خالق نے جب معشوق کو بنایا تو دہن کی

www.shibliacademy.org

جگہ ''نہیں'' رکھ دیا۔

نفی سے کرتی ہے اثبات طراوش گویا　　　دی ہے جائے دہن اس کو دم ایجاد نہیں

لیکن اب اس کی ''نہیں'' کو ہی ''ہاں'' سمجھنا چاہیے۔

شبلی غالب سے اس حد تک متاثر ہیں جب بھی وہ غزل کہتے ہیں غالب ان پر طاری ہو جاتے ہیں فنی اعتبار سے تو نہیں البتہ فکری اعتبار سے ضرور وہ جگہ جگہ وہ غالب کے اثر میں نظر آتے ہیں۔مثلاً ناتوانی اور ضعف غالب کا پسندیدہ موضوع ہے اور غالب نے اسے حد درجہ مبالغے کے ساتھ جگہ جگہ استعمال کیا ہے۔شبلی بھی اس مضمون سے دلچسپی رکھتے ہیں مثلاً یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

ناتواں عشق نے آخر کیا ایسا ہم کو　　　غم اٹھانے کا بھی باقی نہیں یارا ہم کو

دردِ فرقت سے ترے ضعف ہے ایسا ہم کو　　　خواب میں بھی ترے دشوار ہے آنا ہم کو

اب اسی مضمون پر غالب کے شعر دیکھیے:

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں　　　دکھتے ہیں آج اس بت نازک بدن کے پانو

یا

ضعف سے نقش پئے مور ہے طوق گردن　　　ترے کوچے سے کہاں طاقت رم ہے ہم کو

شبلی کا شعر ہے:

واہ کاہید گئی جسم بھی کیا کام آئی　　　بزم میں تھے پہ رقیبوں نے نہ دیکھا ہم کو

غالب کہتے ہیں:

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے　　　میرا ذمہ گر کوئی محفل میں بتلا دے مجھے

شبلی کا ایک اور شعر دیکھیے:

کی ذرا دست جنوں نے کوتہی　　　چاک آکر تا بہ داماں رہ گیا

اس شعر میں شبلی نے میر کا دامن تھاما ہے۔جنوں میں شاید میر بھی اسی تجربے سے گزرے ہوں گے کہ ''چاک آکر تا بداماں رہ گیا'' مگر اب ان کا کچھ اور ہی عزم ہے۔کہتے ہیں:

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے　　　دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

شبلی نے ایک مقطع تو غالب سے تقریباً چھین لیا ہے۔کوئی فرق ہی نہیں معلوم ہوتا۔

www.shibliacademy.org

اگر ہے بھی تو معمولی سا فرق ہے۔ بس اتنا کہ شبلی کہتے ہیں:

صریرِ خامۂ شبلی کی آتش افشانی یہ مان لیجیے ہے بھی پر اس میں دم کیا ہے

اور غالب فرماتے ہیں:

سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

اس اثر پذیری کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ شبلی نے غالب کے انداز میں (رنگ میں نہیں) ایک مسلسل غزل کہی ہے جس میں شب تنہائی کا احوال نظم کیا ہے بارہ اشعار کی اس غزل میں شب ہجر میں عاشق پر جو گزری اور معشوق نے جو بے اعتنائی اختیار کی ہر شعر میں اس کیفیت کا تقابلی بیان ہے۔ ادھر عاشق زار ہے اُدھر معشوق ستم شعار ہے عاشق اپنا حال بھی بیان کرتا ہے اور معشوق کی بے نیازی کا ذکر بھی، مگر شکوہ نہیں کہ یہ بھی احترام عشق کے منافی ہے البتہ تقابل سے سارا منظر عیاں ہو جاتا ہے۔ غزل کی بحر رواں اور غزل میں روانی ہے۔ رعایتوں اور مناسبتوں کا بھی پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔

شب کہ برق سوز دل سے زہرۂ ابر آب تھا شعلۂ جوّالہ ، ہر اک حلقۂ گرداب تھا
واں کرم کو عذر بارش تھا عناں گیر خرام گریہ سے یاں پنبہ بارش کفِ سیلاب تھا
واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال یاں ہجوم اشک میں تا رنگہ نایاب تھا
جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں، آبجو یاں رواں مژگاں چشم تر سے خوں ناب تھا
یاں سر پرشور بے خوابی سے تھا دیوار جو واں وہ فرق تا زمحو بالش کم بخواب تھا
یاں نفس کرتا تھا روشن شمع بزم بے خودی جلوۂ گل واں بساطِ صحبت احباب تھا
فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موج رنگ کا یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا
ناگہاں اس رنگ سے خونابہ ٹپکانے لگا دل کہ ذوقِ کاوش ناخن سے لذت یاب تھا
پوچھتے کیا ہو جو حال شب تنہائی تھا رخصت صبر تھی یا ترک شکیبائی تھا
شب فرقت میں دل غمزدہ بھی پاس نہ تھا وہ بھی کیا رات تھی کیا عالم تنہائی تھا
میں تھا یا دیدۂ خونابہ فشائی تھی شب ہجر ان کو واں مشغلۂ انجمن آرائی تھا
پارہ ہائے دل خونیں کی طلب تھی پیہم شب جو آنکھوں میں مری ذوق خود آرائی تھا
رحم تو ایک طرف پایہ شناسی دیکھو قیس کو کہتے ہیں مجنوں تھا صحرائی تھا

www.shibliacademy.org

آنکھیں قاتل سہی پر زندہ ہے جو کرنا ہوتا — لب پہ اے جان تو اعجاز مسیحائی تھا
خون رو رو دیے بس دو ہی قدم میں چھالے — یاں وہی حوصلۂ بادیہ پیمائی تھا
دشمن جاں تھے ادھر ہجر میں درد و غم و رنج — اور ایک اکیلا ترا شیدائی تھا
انگلیاں اٹھتی تھیں مژگاں کی اسی رخ پیہم — جس طرف بزم وہ کافر ترسائی تھا
کون اس راہ سے گزرا ہے کہ ہر نقش قدم — چشم عاشق کی طرح اس کا تماشائی تھا
خوب وقت آئے نکیرین جزا دے گا خدا — لحدِ تیرہ میں کیا عالم تنہائی تھا
ہم نے بھی حضرت شبلی کی زیارت کی تھی — یوں تو ظاہر میں مقدس تھا پہ شیدائی تھا

بہت خوبصورت غزل ہے۔ شب فرقت میں دل کا پاس نہ ہونا کہ وہ تو معشوق کے پاس تھا۔ یاں آنکھوں سے خون بہنا اور واں انجمن سجانا، انجمن پھولوں سے سجائی جاتی ہے اور پھول خون کی طرح سرخ ہوتے ہیں۔ آنکھیں بھی اپنی آرائش و زیبائش چاہتی ہیں انہیں دل خونیں کی طلب ہے۔ قیس، مجنوں اور صحرا میں رعایت بھی ہے اور رفاقت بھی ہے۔ معنوی تفاوت بھی پیدا کیا گیا ہے۔ اس شعر کا تو جواب ہی نہیں کہ اگر آنکھیں قاتل ہیں تو ہونٹ تو جاں بخش ہیں آنکھوں سے مارا ہے تو لبوں سے زندہ کر دیا ہوتا۔ شعر میں تلمیح بھی ہے اور حسن طلب بھی۔ چھالے نہ صرف رو دیے بلکہ خون رو رو دیے مگر کیا مجال کہ ہمارا حوصلہ ٹوٹتا۔ خون رونا محاورہ ہے۔ شدت تکلیف سے بے کل ہونا، تین دشمنوں کے درمیان ایک اکیلا پڑ جانا لطف یہ ہے کہ ہجر خود بھی دشمن ہے اور اس پر درد، غم اور رنج اور عاشق ایک اکیلا۔ ایک اکیلا کی داد نہیں دی جا سکتی۔ انگلیاں اٹھنا محاورہ ہے جو برائی نکالنے کے لیے استعمال ہوتا ہے مگر انگلیاں معشوق کی طرف اٹھتی ہیں گویا آنکھیں کسی نہ کسی بہانے اسی کو دیکھنا چاہتی ہیں۔ نقش قدم چشم عاشق کی طرح تماشائی ہے۔ عاشق کی آنکھیں انتظار محبوب میں ہر دم کھلی رہتی ہیں اور نقش پا کی آنکھیں بھی کھلی رہتی ہیں۔ قبر میں تنہائی کا عالم تھا منکر نکیر آ گئے تو تنہائی دور ہو گئی اور خدا کا ذکر آ گیا تو ہمارا مسلمان ہونا بھی ثابت ہو گیا۔ اس لیے جزا کی امید قائم ہو گئی ہے۔ ہم نے حضرت شبلی سے ملاقات کی تھی بظاہر تو مقدس معلوم ہوتے ہیں مگر عاشق ہیں اور عاشق تو عاشق ہوتا ہے وہ تو دیوانہ ہے۔ وہ کسی تقدیس کو کہاں مانتا ہوگا حضرت، زیارت اور مقدس میں رعایت ہے۔ کاش شبلی نے اور غزلیں بھی کہیں ہوتیں!

www.shibliacademy.org

مراسلات شبلی - ایک مطالعہ

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

علامہ شبلی (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) کی جامع کمال شخصیت کے متنوع پہلوؤں میں ایک اہم پہلو ان کی مراسلہ نگاری بھی ہے۔انھوں نے وقتاً فوقتاً اخبارات و رسائل میں مراسلے لکھے۔ یہ مراسلے ۱۸۸۸ سے ۱۹۱۴ء کے درمیان لکھے گئے ہیں۔ان کی معلوم تعداد ۲۴ ہے۔ان میں بیشتر مراسلات کو مولانا سید سلیمان ندوی نے مقالات شبلی جلد ہشتم میں شامل کیا ہے،البتہ چند نو دریافت مراسلات کا ذکر اس مقالہ میں پہلی بار کیا جارہا ہے۔نو دریافت مراسلات درج ذیل ہیں:

"الف لیلہ ولیلہ،ابن المقفع کا اسلام لانا،حرم محترم میں جامعہ اسلامیہ (یونیورسٹی) کی تجویز، تعطیل جمعہ،مولوی عبدالکریم کی معطّلی ،مدینہ یونیورسٹی کا نصاب تعلیم"۔

علامہ شبلی کے یہ مراسلات اس لحاظ سے بے حد اہم ہیں کہ ان میں علم و تحقیق اور تصنیف و تالیف کے مختلف پہلوؤں کی نہ صرف نشاندہی کی گئی ہے بلکہ نئے نئے علمی و تعلیمی منصوبوں کے خاکے پیش کرکے ان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اہل علم سے مشورے کیے گئے ہیں۔بعض مراسلات کی حیثیت توضیحی ہے،ان میں انھوں نے ندوہ کے معاملات یا اس سے متعلق الزامات کی تردید یا وضاحت کی ہے۔غرض علامہ شبلی کے مراسلات نہ صرف ان کی سوانح زندگی کے لحاظ سے بلکہ بعض قومی،ملی اور تعلیمی خدمات کے لحاظ سے بھی بے حد اہم ہیں۔ان مراسلات کی ایک غایت یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہ عام ہوجائیں ،ملت کے ممتاز افراد و اشخاص بالخصوص ارباب کمال کی نظروں سے گذر جائیں اور ان پر بحث و مباحثہ ہو،اس کے بعد جو لائحہ عمل تیار ہو اس کو

رفیق اعزازی،دارالمصنّفین،اعظم گڑھ۔

www.shibliacademy.org

عملی جامہ پہنایا جاسکے۔

علامہ شبلی نے جو مراسلات لکھے ہیں ان کے عناوین یہ ہیں:

۱۔ابن رشد۔

۲۔المامون۔

۳۔الف لیلہ ولیلہ۔

۴۔عبداللہ ابن المقفع کا اسلام لانا۔

۵۔اشاعت کتب قدیمہ۔

۶۔وقف اولاد کے مسئلہ کے متعلق ایک نہایت ضروری تحریک۔

۷۔اجلاس ندوہ۔

۸۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مفصل اور مستند سوانح عمری۔

۹۔نومسلموں کو دوبارہ ہندو ہو جانے سے بچانے کے لئے تمام برادران اسلامی کی خدمت میں فریاد۔

۱۰۔مجلس علم کلام۔

۱۱۔مورخین یورپ کی کذب بیانی۔

۱۲۔تعطیل جمعہ۔

۱۳۔حرم محترم (مکہ) میں جامعہ اسلامیہ (یونیورسٹی) کی تجویز۔

۱۴۔مدینہ یونیورسٹی کا نصاب تعلیم۔

۱۵۔مولانا عبدالباری کی شہادت۔

۱۶۔مولوی عبدالکریم صاحب کی معطّلی اور مولانا عبدالحیٔ صاحب۔

۱۷۔مولوی عبدالکریم کی معطّلی۔

۱۸۔اوقاف اسلامی۔

۱۹۔ایک اہم مراسلہ (دارالمصنّفین)۔

۲۰۔ایک مذہبی مدرسۂ اعظم کی عمارت کے لیے تمام ہندوستان کے مسلمانوں سے

www.shibliacademy.org

درخواست۔

۲۱۔اسٹرائیک کا سبب کون تھا؟

۲۲۔اصلاح ندوہ اور ہمدرد۔

۲۳۔جلسۂ دہلی کے متعلق ایک عام غلط فہمی کی تردید۔

۲۴۔ترکوں کی اعانت۔

یہ مراسلات مختلف اخبارات و رسائل مثلاً مسلم گزٹ لکھنؤ، اخبار آزاد لکھنؤ، وکیل امرت سر، ہمدرد دہلی، زمیندار لاہور، الہلال کلکتہ، الہلال مصر اور ماہنامہ الندوہ لکھنؤ میں شائع ہوئے۔ یہاں ان کا اجمالاً ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ابن رشد: علامہ شبلی کے اب تک جو مراسلات دریافت ہوئے ہیں ان میں پہلا مراسلہ ۱۸۸۸ء کا ہے جو اخبار آزاد لکھنو میں ۷؍دسمبر ۱۸۸۸ء کو شائع ہوا ہے۔ یہ علامہ ابن رشد سے متعلق ہے ''علامہ ابن رشد اوران کے ہم عصر'' کے عنوان سے نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی (۱۸۴۴ء-۱۹۳۶ء) نے اردو گائڈ میں ایک طویل مضمون لکھا تھا جو ان کے مجموعۂ مضامین ''رسائل عماد الملک'' میں بھی شامل ہے، جس میں انھوں نے اور باتوں کے علاوہ یہ بات بھی لکھی تھی کہ ابن رشد کے حالات اور کارناموں پر بہت کم معلومات دستیاب ہیں اور وہ اسلامی تاریخ میں ایک گم شدہ شخص ہے۔علامہ شبلی نے اسے مسلمانوں کی تاریخی واقفیت پر بیجا حملہ قرار دیا اور یہ وضاحتی مراسلہ لکھ کر ابن رشد کے حالات اور کارناموں پر لکھی جانے والی متعدد تحریروں کی نشاندہی کی اور کئی کتابوں کے حوالے دیے۔انہوں نے اخبار آزاد کے ایڈیٹر شوق قدوائی کو لکھا کہ:

''میں نے اخبار آزاد مطبوعہ ۱۶؍نومبر ۱۸۸۸ء میں وہ ریویو پڑھا تھا جو آپ ''المامون'' پر نہایت قابلیت سے لکھ رہے ہیں، اس ریویو میں آپ نے مثالاً ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے، جو آپ کے نزدیک مسلم اور بدیہی الثبوت بن گیا ہے، یعنی یہ کہ امام ابوالولید ابن رشد جو مسلمانوں میں ارسطو کا ہم پلہ تھا، اسلامی تاریخ میں ایک گم شدہ شخص ہے، ۱۲؍اکتوبر ۱۸۸۸ء کے پرچہ میں بھی آپ نے اس کو مثالاً پیش کیا ہے اور جہاں تک مجھ کو یاد ہے ایک اور پرچہ میں بھی آپ نے

www.shibliacademy.org

اس واقعہ کو عبرت انگیز صورت میں دکھایا ہے۔

مسٹر سید حسین بلگرامی المخاطب بہ عماد الملک کا وہ مضمون جو ابن رشد اور اس کے معاصرین پر ہے، جب اول اول اخبار اردو گائڈ میں چھپا تو اس وقت مجھ کو گمان ہوا کہ اس خاص امر کی نسبت وہ بہت سے لوگوں کے لیے غلطی میں پڑنے کا باعث ہوگا، آپ مجھے معاف فرمائیے گا، اگر میں یہ کہوں کہ اس دام میں پہلے پھنسنے والے آپ تھے''۔ (مقالات شبلی، ج ۸، ص ۴۷)

اسی غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے علامہ شبلی نے یہ مراسلہ لکھا اور قدرے تفصیل سے ان کتابوں کے بارے میں وضاحت کی جن میں ابن رشد کے کارناموں کی تفصیلات موجود ہیں۔ بعد میں علامہ شبلی جب ماہنامہ الندوہ کے ایڈیٹر ہوئے تو ابن رشد پر ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا جس کی آخری قسط ان کی وفات کے بعد جون ۱۹۱۸ء میں ماہنامہ معارف میں شائع ہوئی۔

۲-المامون: ۱۸۸۷ء میں علامہ شبلی کی معروف کتاب المامون شائع ہوئی تو اس پر متعدد اعتراضات وارد کیے گئے، ان میں ایک اعتراض یہ تھا کہ خلیفہ مامون انتخاب کے قابل نہ تھا اور ہارون کو مامون پر ترجیح حاصل ہے۔

اس سلسلہ میں بعض علمی حلقوں کی جانب سے جب تنقید و اعتراض کی لے بڑھنے لگی تو اخبار آزاد لکھنؤ کے ایڈیٹر شوق قدوائی نے ان تنقیدوں کے جواب کے لیے علامہ شبلی کو متواتر خطوط لکھے۔ ان کے مسلسل اصرار پر علامہ شبلی نے ایک مختصر مراسلہ ان ہی کے نام لکھا۔ یہ مراسلہ اخبار آزاد میں ۲۲/فروری ۱۸۸۹ء کے ایڈیشن میں شائع ہوا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ علامہ شبلی کی یہ واحد تحریر ہے جو انھوں نے اپنی کسی تصنیف پر تنقید کے جواب میں لکھی ہے۔

اس مراسلہ میں انھوں نے مامون کے انتخاب پر جو اعتراضات کیے گئے تھے ان کا مسکت و مدلل جواب دیا ہے۔ ان کا لہجہ اس میں ذرا سخت نظر آتا ہے جو شاید بعض معترضین کے اعتراض برائے اعتراض کے رویہ کے پیش نظر بے جا بھی نہیں کہا جا سکتا۔ انھوں نے لکھا کہ:

''جن لوگوں نے اس بات کو طول دیا ہے کہ دولت عباسیہ میں ہارون انتخاب کے لائق تھا نہ کہ مامون۔ اس اعتراض کا تصفیہ وہ شخص کر سکتا ہے جس نے

www.shibliacademy.org

نہایت وسعت کے ساتھ تاریخی معلومات فراہم کیے ہوں اور ساتھ ہی باریک بین اور تاریخی اصولوں کا نکتہ شناس بھی ہو‘‘۔ (مقالات شبلی، ج ۸،ص ۱۴۱)

اس کے بعد انہوں نے ہارون رشید کے انتخاب نہ کرنے کے متعدد اسباب بیان کیے ہیں اور لکھا ہے:

’’اگر چہ مجھ کو زیبا نہیں کہ مرحوم ہارون الرشید کی فرد قرار داد جرم تیار کروں لیکن اگر ہمارے دوستوں کے خزانہ معلومات میں المامون اور تاریخ الخلفاء کے سوا اور بھی کچھ ہے تو خیال کریں کہ وہ کون تھا، جس نے سرحدی شہروں کے تمام گرجے بعض بیجا تعصب سے منہدم کرا دیے؟ کون تھا جس نے اپنے قید خانہ کو بعض شبہ کی بنا پر حضرت موسیٰ کاظم سے آباد کیا تھا؟ کون تھا جس کے درباری اس کی بدمزاجی سے اس قدر خائف رہتے تھے کہ اکثر اس کے پاس کفن پہن کر جاتے تھے؟ کون تھا جس نے حضرت یحییٰ بن عبداللہ کو معاہدہ صلح لکھ دیا، جس پر تمام علماء اور بنو ہاشم کے دستخط تھے۔ پھر بے وجہ ان کو قید کر دیا؟ اور گو امام محمد صاحب نے کہا بھی کہ یہ بالکل اسلام کے خلاف کارروائی ہے مگر باز نہ آیا۔ کون تھا جس کے عہد میں عمال اور عہدہ داران ملکی اعلانیہ ظلم کرتے تھے اور سال بھر میں ایک بار بھی مظلوموں کی فریاد سننے کو دربار نہیں کرتا تھا؟ کون تھا جس کو قاضی ابو یوسف نے نہایت حسرت اور تمنا سے کتاب الخراج میں یوں مخاطب کیا:

’’اگر اے امیر المومنین تو خدا کا تقرب اس طرح حاصل کرتا کہ رعایا کی فریاد سننے کے لیے مہینہ بلکہ دو مہینہ میں ایک اجلاس بھی کرتا جس میں تو مظلوم کی فریاد سنتا اور ظالم سے باز پرس کرتا تو مجھ کو امید تھی کہ تیرا شمار ان لوگوں میں نہ ہوتا جو رعایا کی حاجتیں نہیں سنتے اور غالباً تو دو ایک ہی اجلاس کرے گا ملک میں یہ چرچا پھیل جائے گا کہ تو برس دن میں ایک بار بھی لوگوں کی حاجت روائی کے لیے اجلاس کرتا ہے تو وہ لوگ انشاء اللہ ظلم سے باز رہیں گے‘‘۔ کون تھا جس کے عہد میں اکثر واقعہ نویس عمالوں سے سازشیں رکھتے تھے اور بالکل جھوٹ اور فساد

www.shibliacademy.org

انگیز خبریں ہارون الرشید کو لکھتے تھے؟ جس کی وجہ سے قاضی ابو یوسف نے مجبور ہو کر کتاب الخراج میں اس کا ذکر کیا۔کون تھا جس کے عہد میں ملک کی تباہی کا یہ حال تھا کہ سواد کے علاقہ میں حضرت عمرؓ نے جو خفیف رقم مقرر کی تھی رعایا اس کو بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی اور آخر قاضی ابو یوسف صاحب کو وہ مقدار جمع گھٹا کر اس کی توجیہ کرنی پڑی۔کون تھا جس کا خزانہ اس طرح معمور کیا جاتا تھا کہ جب کسی پر کچھ شبہ ہوا تو اس کا کل مال ومتاع ضبط کر کے خزانہ شاہی میں داخل کر دیا گیا؟ علی بن عیسیٰ سے دس کروڑ درہم چھین کر جو خزانہ میں داخل کیے گئے کیا جائز حق سے لیے گئے۔کون تھا جس نے اسلام میں یہ نئی بدعت ایجاد کی کہ خلافت کے چند ٹکڑے کیے اور اپنے بیٹوں میں اس کو موروثی جائداد کی طرح تقسیم کیا؟ کیا ان باتوں کے ہم پلہ مامون کی تاریخ میں بھی مل سکتی ہیں۔......

فتوحات کے لحاظ سے رشید کو کیا ترجیح ہے؟ مختصر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ رشید نے کوئی نیا ملک فتح نہیں کیا لیکن مامون کے عہد میں صقلیہ اور کریٹ کی جو فتحیں ہوئیں، وہ خاص لحاظ کے قابل ہیں۔علم و قابلیت کے لحاظ سے سب جانتے ہیں کہ ہارون رشید صرف ادب، فقہ، حدیث میں کمال رکھتا تھا لیکن مامون ان علوم کے علاوہ فنون حکمت کے مختلف شعبوں میں ایک حکیم تسلیم کیا جاتا تھا''۔(مقالات شبلی، ج ۸، ص ۴۲-۴۳)

اس کے بعد علامہ شبلی معترضین پر اظہار افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''افسوس ہے کہ نہ لوگوں کو تمام حالات سے اطلاع نہ واقعات کے موازنہ کرنے کی قابلیت۔ یہ امور جو میں نے لکھے ہیں شاید لوگوں کو چیستاں معلوم ہوں اور تاریخی دفتروں میں اس کے حوالے بھی نہ ڈھونڈھ سکیں''۔(مقالات شبلی، ج ۸، ص ۴۲-۴۳)

ایڈیٹر آزاد کو مخاطب کر کے لکھا کہ:

''رشید کی برائیاں میں نے کم گنائیں۔رنج ہوتا ہے کہ سینکڑوں برس کے

www.shibliacademy.org

دبے فتنے آج ابھارے جائیں۔ خیر رشید جو کچھ تھا خوب تھا۔ ان طرف داروں سے اس کا حق مجھ پر زیادہ ہے۔ میں نے کچھ سمجھ کے اس کو نہیں لیا۔ مامون پر جو نکتہ چینیاں کی گئی ہیں، وہ اسی طرح تفصیل طلب ہیں جس طرح رشید و مامون کا موازنہ۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے اوقات کو ان فضول باتوں میں صرف کروں؟ آپ یقین فرمائیں کہ مجھ کو عام لوگوں کی تحسین سے نہ خوشی ہوئی، نہ ان کے اعتراض سے رنج۔ میں چاہتا ہوں کہ لوگ اعتراض کریں آپ کا جی چاہے تو ان کے جواب کی طرف متوجہ ہوں۔ مجھ کو چھوڑ دیجیے کہ رائل ہیروز کے باقی حصے پورے کروں۔

رسی آنکہ بدرد من کہ چو من
خامہ گیری و حرف بنگاری

(مقالات شبلی، ج ۸، ص ۴۴)

اس مراسلہ سے ہمیشہ کے لیے یہ برحق فیصلہ ہو گیا کہ مامون کے انتخاب پر جو انگشت نمائی کی گئی تھی وہ کسی طرح درست نہ تھی۔

۳- الف لیلہ ولیلہ: علامہ شبلی کے زیر مطالعہ عربی اخبارات و رسائل رہا کرتے تھے اور وہ ان میں مراسلے بھی لکھا کرتے تھے۔ حال ہی میں ان کے دو عربی مراسلے جو جرجی زیدان کے رسالہ الہلال مصر میں شائع ہوئے تھے جناب ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی صاحب کو ملے ہیں۔ یہ دونوں مراسلے دراصل استدراک ہیں۔ پہلے مراسلہ میں کتاب الف لیلہ ولیلہ کا ذکر ہے۔ الہلال کے ایک مراسلہ نگار حکمت بک شریف نے اس کتاب کو یونانی الاصل قرار دیا تھا اور یہ دلیل پیش کی تھی کہ اس میں قہوہ کا ذکر ہے اور قہوہ اس زمانہ میں موجود نہیں تھا۔ علامہ شبلی نے اپنے مراسلہ میں حکمت بک شریف کے موقف اور ان کے دلائل کی تردید کی ہے۔ انہوں نے پہلے مسعودی کی مروج الذہب اور ابن ندیم بغدادی کی الفہرست کے حوالہ سے عربی تراجم کا ذکر کیا ہے اور متعدد مترجمہ کتب کی تفصیل پیش کی ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ:

ان تمام تفصیلات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اصلاً فارسی سے

www.shibliacademy.org

منقول ہے اور بعض لوگوں کو جو یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ یونانی الاصل ہے وہ صحیح نہیں بلکہ صرف ظن وتخمین ہے۔اس قصے کی جو اصل ہے وہ تو فارسی ہے۔ہاں اس میں الحاقات بھی بہت ہوئے ہیں اور غالباً یہ الحاقات جہشیاری وغیرہ کے اس موضوع کے نسخوں سے کیے گئے ہیں۔آپ کے مایہ ناز رسالہ الہلال میں فاضل مراسلہ نگار حکمت بک شریف نے جو یہ دلیل دی ہے کہ اس میں متعدد مقامات پر قہوہ کا ذکر آیا ہے جبکہ قہوہ اس زمانہ میں موجود نہیں تھا تو یہ بات بھی صحیح نہیں ہے۔قہوہ قدیم زمانہ میں شراب کے معنی میں استعمال ہوتا تھا اور یہ مشہور بات ہے۔(الہلال مصر، ج ۷،شمارہ ۱، دسمبر ۱۸۹۵ء، ص ۲۵۴)

۴۔عبداللہ ابن المقفع کا اسلام لانا: دوسرا مراسلہ عبداللہ ابن المقفع کے اسلام لانے کے متعلق ہے۔عربی مجلّہ المقتطف میں اہل علم کے درمیان یہ بحث تھی کہ عبداللہ ابن المقفع مجوسی تھے یا مسلمان؟ علامہ شبلی نے اس بحث پر تعجب کا اظہار کیا اور لکھا کہ:

”بخدا مجھ کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ مسئلہ نامور ادباء کی معرکہ آرائی اور فکری جنگ کا موضوع بن جانے کا اہل ہے اور طرفہ تماشہ یہ کہ اس باب میں جو طریقہ استدلال اختیار کیا گیا ہے، وہ اور بھی حیرت ناک ہے اور کیوں نہ ہو جب امیر شکیب ارسلان جیسے نامور فاضل کی نگاہوں سے ابن خلکان کی عبارتیں پوشیدہ رہ جائیں اور فادر لویس شیخو جیسا دانشور جن کو تسلیم کرنے سے گریز کرے اور نسیان کا سہارا لے اور المقتطف کے ایڈیٹر جیسا فلسفی محض زندقہ کے اتہام کی بنا پر ابن المقفع کو نصرانی بتانے لگے اور یہ کہنے لگے کہ زندقہ دراصل مجوسیت کا نام ہے اور اکثر مجوسیوں نے یا تو عیسائیت اختیار کر لی یا عیسائیت کی طرف مائل ہو گئے“۔

(الہلال مصر، ج ۱۷، ۱۵، یونیو ۱۹۰۰ء، ص ۵۵۹)

علامہ شبلی نے اس صورت حال کا جائزہ لیا ہے اور ابن المقفع کے اسلام لانے کا ذکر کیا ہے اور اپنے موقف کی تائید میں ابن الندیم، شریف رضا مرتضٰی اور صنعانی وغیرہ کی کتابوں کے اقتباسات سے استدلال کیا ہے، پھر زندقہ کے الزام کی تردید کی ہے۔اس سلسلہ میں ابن الندیم

www.shibliacademy.org

کی الفہرست سے بھی استدلال کیا ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ:

> ''اصل بات یہ ہے کہ اسلام کی ابتدائی دوصدیوں میں عام طور پر فلسفہ اور عقلی علوم کو ناپسند کیا جاتا تھا پس جس شخص کا زیادہ میلان اور توجہ ان علوم کی طرف لوگ دیکھتے تھے اس کو زندیق کہہ کر پکارتے تھے، ابن المقفع کا معاملہ یہ بھی ہے کہ اس نے بہت سے مجوسی زندیقوں کی کتابوں کے ترجمے بھی کیے جیسا کہ مسعودی نے مروج الذہب میں صراحت کی ہے۔
>
> المقتطف کے ایڈیٹر کی یہ دلیل کہ اس نے یونانی علوم کے ترجمے کیے جس سے اس کی نصرانیت کا پتہ چلتا ہے، یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ اس نے جن یونانی علوم کا ترجمہ کیا ہے وہ دراصل یونانی سے نہیں کیا ہے بلکہ اس کے فارسی ترجمہ سے کیا ہے۔ صاحب کشف الظنون نے لفظ حکمت کے ذیل میں اس کی تصریح کی ہے''۔ (ایضاً، ص ۵۶۰)

۵- اشاعت کتب قدیمہ: اشاعت کتب قدیمہ کے سلسلہ میں علامہ شبلی نے پہلے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین کی ادارت کے زمانہ میں ایک نوٹ لکھا تھا پھر اسے ۳/اپریل ۱۸۹۶ء کو مراسلہ کی شکل میں اخبار آزاد لکھنؤ میں شائع کرایا۔ اس میں انہوں نے قدیم مراجع کی اشاعت پر زور دیا ہے اور ان کی نشاندہی کی ہے اور لکھا ہے کہ:

> ''کس قدر تعجب کی بات ہے کہ مثلاً فقہ حنفی کا تمام تر دارومدار امام محمد کی روایات وتصنیفات پر ہے، جن کو اصطلاح فقہ میں ظاہر الروایہ کہتے ہیں، لیکن آج ان میں سے بجز جامع صغیر کے جو نہایت مختصر اور سب سے چھوٹی ہے۔ ایک کتاب بھی موجود نہیں، یہاں تک کہ قسطنطنیہ اور مصر کے عظیم الشان کتب خانے بھی ان سے خالی ہیں، اسی طرح فلسفہ اور منطق میں مسلمانوں کو جن ناموروں پر ناز ہوسکتا ہے، وہ یعقوب کندی، فارابی، ابن رشد ہیں لیکن ان کی تصنیفات اس قدر نایاب ہیں کہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ قرآن مجید کے اعجاز وفصاحت وبلاغت پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے تمام ہندوستان میں ایک کتاب بھی موجود

www.shibliacademy.org

نہیں۔تاریخ کی قدیم اور نادر تصنیفات تو گویا ہمارے ملک میں سرے سے آئی ہی نہیں۔بعض قدیم کتابیں جو یورپ میں چھپی ہیں،لیکن قطع نظر ان کے گراں قیمت ہونے کے ہر شخص کو بہم نہیں پہنچ سکتیں،ان واقعات کی بنا پر مجھ کو یہ خیال آیا کہ ایک مجلس قائم کی جائے ، جو اس مفید اور اہم کام کو انجام دے‘‘۔(مقالات شبلی،ج ۸،ص ۵۳)

اس مجلس میں درج ذیل تین قسم کے ممبروں کے علامہ شبلی خواہش مند تھے:

۱-وہ لوگ جو ۱۰؍روپے سالانہ چندہ دینا منظور فرمائیں اور یہی لوگ ارا کین مجلس قرار دیے جائیں گے اور ان کو امور انتظامی مجلس میں رائے دینے کا حق حاصل ہوگا اور نیز جو کتاب یا کتابیں چھاپی جائیں گی گو کہ ان کی قیمت ان کے چندہ ممبری سے زائد ہو ان کو دی جائیں گی۔

۲-وہ اہل علم جو اس کام میں اپنی رائے اور اپنی واقفیت و تلاش سے امداد دیں اور اس قسم کی کتابوں کو بہم پہنچائیں،ان کو یہ حق حاصل ہوگا کہ مجلس ان کو تمام تجویزات اور حالات سے وقتاً فوقتاً مطلع کرتی رہے گی اور ایک یا دو نسخہ کتاب مطبوعہ کا ان کو نذر کرے گی۔

۳-وہ لوگ جو یہ منظور کریں کہ کتاب چھپنے پر ایک نسخہ قیمت معینہ پر خرید لیں گے،ان بزرگوں کا نام رجسٹر میں درج کر لیا جائے گا اور جو کتاب چھپے گی، اس کا ایک نسخہ ان کی خدمت میں ویلوپے ایبل بھیج دیا جائے گا۔(مقالات شبلی، ج ۸،ص ۵۴)

علامہ شبلی جن کتابوں کی فوری طور پر اشاعت کے خواہش مند تھے ان کے نام یہ ہیں:

اعجاز القرآن للامام باقلانی،طبقات الشعراء لابن قتیبہ،مناقب الشافعی للامام الرازی،مجموعہ رسائل فارابی،جس میں ۱۵؍رسالے شامل ہیں۔تلخیص المثال ابن رشد مطبوعہ یورپ،عمدہ لابن رشیق القیر وانی،تاریخ صغیر امام بخاری۔(مقالات شبلی،ج ۸،ص ۵۴-۵۵)

www.shibliacademy.org

لیکن اشاعت کتب قدیمہ کی مجلس وہ قائم نہ کر سکے، اس سلسلہ میں مولانا سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے کہ:

> ''قدیم عربی کتابوں کی اشاعت کی جو تجویز انہوں نے ۱۸۹۶ء میں پیش کی تھی گو وہ اس وقت پوری نہیں ہوئی لیکن عجیب بات ہے کہ جن قلمی کتابوں کی اشاعت کا نام انہوں نے لیا تھا ان میں سے ایک (مناقب شافعی للرازی) کے سوا سب کتابیں ان کی زندگی میں چھپ گئیں''۔ (مقالات شبلی، ج۸، ص۱۰)

۶- وقف اولاد کے مسئلہ کے متعلق ایک نہایت ضروری تحریک: انگریز جج وقف علی الاولاد کو تسلیم نہیں کرتے تھے اور عدالتوں میں وقف علی الاولاد کے مقدمات میں اسلامی قانون کی خلاف ورزی کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے متعدد وقف املاک برباد ہوئیں۔ علامہ شبلی اسے مسلمانوں کا بہت بڑا ضیاع خیال کرتے تھے، چنانچہ یہ مراسلہ لکھ کر انہوں نے اس کے خلاف ایک تحریک شروع کی جس میں انہوں نے فوری طور پر ایک رسالہ وقف علی الاولاد لکھا جس میں شریعت کے مطابق وقف علی الاولاد کے مسئلہ کو واضح کیا۔ پھر تمام ہندوستان کے ائمہ و مفتیان کرام کو خطوط لکھے اور ان کی تائید حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس کے نتیجے میں ملک میں ہر طرف یہ تحریک اور اس کے اغراض و مقاصد پھیل گئے اور اس تحریک کی اہمیت کا احساس عام ہوا۔ چنانچہ علامہ شبلی نے جب اپنے موقف کی تائید میں اہل علم کے دستخط چاہے تو بے شمار لوگوں نے تائید کی اور دستخط کیے۔ اسی کی روشنی میں مسٹر محمد علی جناح نے پارلیمنٹ میں اس مسئلہ کو پیش کیا جسے بالآخر حکومت نے منظور کرتے ہوئے قانونی شکل دی۔ اس طرح علامہ شبلی کو اس مسئلے میں بڑی کامیابی ملی۔

۷- اجلاس ندوہ: علامہ شبلی نے یہ مراسلہ ندوہ کے ۱۹۱۱ء کے اجلاس کے لیے اس کے ارکان کے پاس لکھا تھا۔ یہ مراسلہ مکاتیب شبلی میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور مکتوبات شبلی میں مولوی قیام الدین بخت جونپوری کے نام درج ہے۔

اس مراسلہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ شبلی ندوہ کے ارکان کے انتخاب میں بھی پوری دلچسپی لیتے تھے اور اس کے لیے فراخ دلی کے ساتھ اہل علم اور ارباب کمال کی نشاندہی کرتے تھے۔ جس میں ان کا نقطۂ نظر مسلک سے بھی بالاتر ہوتا تھا۔ مثلاً اس مراسلہ میں انہوں نے مولانا

www.shibliacademy.org

لطف اللہ مفتی عدالت عالیہ حیدرآباد، مولانا ابوبکر شہاب عرب اور مولانا حمیدالدین فراہی کے علاوہ مولانا عبدالجبار غزنوی، مولانا عبداللہ غازی پوری اور مولانا ثناء اللہ امرتسری کا نام قابل انتخاب قرار دیا ہے۔ (مکتوبات شبلی، ص ۱۰۹)

۸۔آنحضرت ﷺ کی مفصل اور مستند سوانح عمری: علامہ شبلی کے دل میں گوناگوں وجوہ سے جب سیرت نبویؐ کی تالیف و تدوین کا خیال آیا تو انہوں نے ماہنامہ الندوہ میں آنحضرتؐ کی مفصل اور مستند سوانح عمری کی ضرورت کے عنوان سے ایک مراسلہ لکھا۔ جس کا آغاز ان الفاظ سے ہوا ہے:

> ''کیا عجیب بات ہے! ہندوستان میں چھ کروڑ مسلمان ہیں، مشرقی علوم وفنون ابھی تک زندہ ہیں، نہایت لائق اور قابل فخر انشاپرداز موجود ہیں، ملکی زبان نے ایسی قابل قدر تصنیفات پیش کیں کہ روم ومصر میں مضمون کے لحاظ سے ان کا جواب نہیں، قومی روایات کا مذاق بچہ بچہ کی رگ میں ہے، جناب رسول اللہؐ کے ساتھ قدیم اور جدید دونوں گروہ کو یہ عقیدت و نیاز ہے کہ آپؐ کے نام پر جان ومال قربان کردینا کوئی بات نہیں۔
>
> یہ سب ہے لیکن اتنی بڑی وسیع قوم اور اتنی عالم گیر زبان (اردو) میں جناب رسول اللہؐ کی کوئی سوانح عمری نہیں، یا ہے تو ایسی ہے کہ اس کو سیرت نبویؐ کہنا آنحضرتؐ کی روح مبارک کو آزردہ کرنا ہے، سیرت نبویؐ کی ضرورت اس لحاظ سے اور بڑھ جاتی ہے کہ قوم میں جدید تعلیم وسعت سے پھیلتی جاتی ہے اور یہی جدید تعلیم یافتہ گروہ ایک دن قوم کی قسمت کا مالک ہوگا، یہ گروہ آنحضرتؐ کے حالات زندگی اگر جاننا چاہتا ہے تو اردو میں کوئی مستند کتاب نہیں ملتی، اس لیے اس کو چارناچار انگریزی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے، جن میں یا تعصب کی رنگ آمیزیاں ہیں یا ناواقفیت کی وجہ سے ہر موقع پر غلطیاں ہیں۔
>
> ایک خاص بات یہ ہے کہ سیرت نبویؐ کی ضرورت پہلے صرف تاریخی حیثیت سے تھی لیکن اب عقائد کی حیثیت سے بھی ہے، یورپ جو اسلام پر نکتہ چینی

www.shibliacademy.org

کرتا ہے، زیادہ تر اس بنا پر کرتا ہے کہ بانی اسلام کے اخلاق و عادات و تاریخ زندگی ایسی نہیں کہ ان کو خدا کا بھیجا ہوا معصوم پیغمبر کہا جا سکے"۔ (مقالات شبلی، ج ۸، ص ۴۰-۴۱)

علامہ شبلی کے اس مراسلہ کا اثر یہ ہوا کہ ہر طرف سے سیرت نبویؐ کی تالیف کے لیے آوازیں بلند ہوئیں، سب سے پہلے ایک خاتون نے چندہ بھیجا پھر بھوپال سے نواب حمید اللہ خاں نے کتابوں کی خریداری کے لیے یکمشت ہزار روپئے بھیجے۔ پھر بیگم بھوپال نے اس کی مستقل ذمہ داری لے لی۔ غرض اس مراسلہ نے ہر باشعور شخص کو سیرت نبویؐ کی طرف متوجہ کر دیا اور علامہ شبلی نے بڑے پیمانہ پر سیرت نبویؐ کے کام کا آغاز کیا جس کے نتیجہ میں سیرت نبویؐ کی دو جلدیں ان کے قلم سے نکلیں اور اسی پر ان کی زندگی کا خاتمہ ہوا اور ان کا یہ قطع سچ ثابت ہوا:

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبر خاتمؐ
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

علامہ شبلی کے اس مراسلے کا علی العموم استقبال ہوا مگر ایک آواز اس کے خلاف بھی بلند ہوئی۔ مولوی انشاء اللہ خاں ایڈیٹر الوطن لاہور نے لکھا کہ چونکہ سیرت نبویؐ کے لیے مولانا محمد سلیمان منصور پوری قلم اٹھا چکے ہیں اس لیے علامہ شبلی کو زحمت کی ضرورت نہیں۔ (دیباچہ رحمۃ للعالمین، ص ۷) سیرت نبویؐ سے متعلق اس نامناسب آواز کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔

اس مراسلہ کا عام اثر یہ ہوا کہ اردو میں سیرت نبویؐ کے مطالعہ و تحقیق کا ایک عام سلسلہ شروع ہوا اور بقول مولانا سید سلیمان ندوی "ان کی سیرت نبویؐ کی تجویز ایسی سرسبز ہوئی کہ آج ہماری زبان اس مقدس لٹریچر کی فراوانی، بلندی اور افادیت پر بجا فخر کر سکتی ہے"۔ (مقالات شبلی، ج ۸، ص ۶)

۹۔ نومسلموں کو دوبارہ ہندو ہو جانے سے بچانے کے لیے تمام برادران اسلامی کی خدمت میں فریاد: شدھی تحریک کے زیر اثر راجپوتانہ اور بعض دوسرے علاقوں میں نومسلموں کے دوبارہ ہندو ہونے کی خبروں کا آغاز ۱۹۰۸ء میں ہوا۔ علامہ شبلی اس خبر سے تڑپ اٹھے۔ چنانچہ

www.shibliacademy.org

اس کے تدارک کے لیے انہوں نے شاہ جہاں پور اور رائے بریلی وغیرہ کا دورہ کیا۔ راجپوتانہ میں اپنے معتمد بھیجے کہ آریوں اور ان کی شدھی تحریک کا سدباب کیا جاسکے اور کاموں کے ساتھ علامہ شبلی اس کام میں بھی مسلسل لگے رہے۔ ۱۹۱۲ء میں ندوہ کے جلسہ میں اسے ایک ملی مسئلہ کی شکل میں پیش کرنے کی غرض سے یہ مراسلہ لکھا۔ اس میں ارتداد کی تفصیل کے ساتھ اس کے تدارک کی چند تجویزیں بھی پیش کی ہیں، انہوں نے لکھا ہے کہ:

> ''جو تدبیریں اس وقت خیال میں آئیں ہیں وہ اس غرض سے پیش کی جاتی ہیں کہ تمام حضرات کو ان پر غور اور فکر کا موقع ملے، وہ تدبیریں حسب ذیل ہیں:
>
> ۱- اس قسم کے واعظ مقرر کیے جائیں جو دو دو چار چار مہینے ایک گاؤں میں رہ کر لوگوں کو اسلام کے احکام سکھائیں، اس قسم کے واعظوں کے تیار کرنے کا خاص انتظام ہونا چاہیے۔
>
> ۲- دو دو چار چار گاؤں کے بیچ میں ابتدائی مدرسے قائم کیے جائیں، جن میں قرآن شریف اور اردو کی تعلیم دی جائے۔
>
> ۳- صوفی وضع لوگ بھیجے جائیں، جن کا اثر عوام پر خود بخود پڑتا ہے۔
>
> ۴- مسلمانوں کے دیہات میں جو سرکاری ابتدائی مدرسے ہیں، کوشش کی جائے کہ ان کے مدرسین مسلمان مقرر ہوں۔ اب تک اکثر ہندو مدرس مقرر ہوتے ہیں اور اس لیے بچوں کو اسلام کی طرف رغبت نہیں ہوسکتی، غرض یہ ایک نہایت اہم مذہبی اور قومی مسئلہ ہے، اس کو نہایت غور، فکر اور جدوجہد سے حل کرنا چاہیے، اگر مسلمان ایسے خطرہ کی پرواہ نہیں کرتے تو ان کو اسلام کا نام نہیں لینا چاہیے۔ (مسلم گزٹ، ۱۱/ مارچ ۱۹۱۲ء)

اسی فتنۂ ارتداد کے سدباب کے لیے انہوں نے اشاعت اسلام کا منصوبہ بنایا تھا اور بڑے پیمانہ پر تحریک کا آغاز کیا مگر ندوہ کے خلفشار اور قلیل مدت حیات نے اسے عملی جامہ پہنانے کا موقع نہیں دیا اور تحریک حفاظت و اشاعت اسلام کا کام آگے نہ بڑھ سکا۔

۱۰- مجلس علم کلام: علامہ شبلی طویل غور وفکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ جدید علم کلام بالکل

www.shibliacademy.org

ناممکل اور ناقص ہے اور اس کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ ''مجلس علم کلام'' بنائی جائے، چنانچہ انہوں نے ۴؍ مارچ ۱۹۱۲ء کے مسلم گزٹ لکھنؤ میں مجلس علم کلام قائم کرنے کے لیے ایک مفصل مراسلہ لکھا اور اس کی ضرورت پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور ایک کمیٹی قائم کرنے کی تجویز پیش کی، انہوں نے لکھا کہ:

''اس کمیٹی میں قدیم علماء اور جدید تعلیم یافتہ دونوں گروہ کے لوگ ممبر ہوں، قدیم علماء اس بات کا فیصلہ کریں گے کہ جو عقائد اور مسائل فلسفہ کے خلاف بیان کیے جاتے ہیں، ان میں سے کون سے مسائل درحقیقت اسلام کے اصل عقائد ہیں اور کون سے نہیں، جدید تعلیم یافتہ گروہ اس بات کا فیصلہ کر سکے گا کہ جن چیزوں کو فلسفہ کے مخالف کہا جاتا ہے، وہ درحقیقت فلسفہ کے مخالف ہیں بھی یا نہیں اور اگر ہیں تو فلسفہ کی تحقیقات کہاں تک یقینی اور قطعی ہے، اس کمیٹی کے لیے بزرگان ذیل انتخاب ہو سکتے ہیں:

علماء: ۱- مولوی مفتی محمد عبداللہ صاحب ٹونکی۔ ۲- مولانا مولوی شیر علی صاحب حیدر آباد، سابق مہتمم دارالعلوم ندوہ۔ ۳- سید محمد رشید رضا صاحب مصری، ایڈیٹر ''المنار''۔

جدید تعلیم یافتہ: ۱- ڈاکٹر محمد اقبال صاحب بیرسٹر۔ ۲- مولوی حمید الدین صاحب عربی پروفیسر یونیورسٹی الہ آباد۔ ۳- مولوی عبدالقادر صاحب بی اے، بھاگل پوری۔

ہم کو خوشی ہے کہ ڈاکٹر محمد اقبال صاحب نے اس مجلس کی ممبری منظور کر لی ہے اور صاحبوں نے ابھی خط کا جواب نہیں دیا لیکن امید ہے کہ کسی کو اس عمدہ کام کی شرکت سے انکار نہ ہوگا۔

ہم چاہتے ہیں کہ ملک کے اور حضرات جن کو اس تجویز سے دلچسپی ہو، ہم سے خط و کتابت کریں، جلسہ سالانہ ندوۃ العلماء میں یہ تجویز پیش کی جائے گی اور جو فیصلہ ہوگا، اس کے مطابق عمل کیا جائے گا۔ (مقالات شبلی، ج ۸، ص ۶۲-۶۳)

مگر یہ مجلس بقول مولانا سید سلیمان ندوی ''خط و کتابت سے آگے نہیں بڑھی''۔ (مقالات

www.shibliacademy.org

شبلی ج ۸ص۱۰)

۱۱۔مورخین یورپ کی کذب بیانی: یہ مراسلہ کسی اخبار یا رسالہ میں نہیں لکھا گیا بلکہ دفتر سیرت نبوی سے وابستہ اہل قلم کے نام لکھا گیا تھا۔ان میں پروفیسر عبدالقادر، مولوی ریاض حسن خاں خیال، ایم مہدی حسن افادی اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں،اس لیے کہ یہ مراسلہ ان کے نام مکاتیب شبلی میں درج ہے۔اس کا بنیادی مقصد سیرۃ النبی سے متعلق انگریزی کتابوں کے ان حصوں کا ترجمہ تھا جن میں مصنّفین یورپ نے کذب بیانی سے کام لیا تھا۔علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ:

> ’’سیرت نبویؐ جوزیر تصنیف ہے،میں چاہتا ہوں کہ یورپ کے مصنّفین نے جو کچھ آنحضرتؐ کے متعلق لکھا ہے،اس سے پوری واقفیت حاصل کی جائے تا کہ ان کے تائیدی بیان حسب موقع حجت الزامی کے طور پر پیش کیے جائیں اور جہاں انہوں نے غلطیاں اور بددیانتیاں کی ہیں،نہایت زور وقوت کے ساتھ ان کی پردہ دری کی جائے۔
>
> اسی بنا پر انگریزی کی کثرت سے تصنیفات مہیا کی گئی ہیں،جو آنحضرتؐ کے متعلق تصنیف ہو چکی ہیں،لیکن ان سب کا اردو میں ترجمہ کرنا ناممکن ہے،اس لیے یہ رائے قرار پائی ہے کہ جن صاحبوں کو اس سے ذوق ہو،ان کے پاس ایک ایک کتاب بھیج دی جائے،وہ مطالعہ کر کے قابل ترجمہ مقامات پر نشانات کرتے جائیں اور پھر کتاب واپس بھیج دیں تا کہ دفتر کے مترجمین سے ترجمہ کرایا جائے۔
>
> اس بنا پر آپ سے درخواست ہے کہ کیا آپ بھی اس کام میں حصہ لینا پسند فرمائیں گے‘‘۔(مکاتیب شبلی،ج۲،ص۱۶۳-۱۶۴)

ترجمہ کے اس کام میں متعدد اہل علم نے حصہ لیا اس میں ایک نمایاں نام مولانا عبدالماجد دریابادی کا بھی ہے۔

۱۲۔تعطیل جمعہ: یہ مراسلہ مولانا ظفر علی خاں کے اخبار زمیندار (۱۰/اپریل ۱۹۱۳ء) میں شائع ہوا ہے۔اس میں دراصل اس بات پر بحث ہے کہ نماز جمعہ کی ادائیگی کے لیے جمعہ کے دن ایک گھنٹے

www.shibliacademy.org

کی چھٹی ہونی چاہیے یا آدھے دن کی۔علامہ شبلی آدھے دن کی چھٹی کے حامی تھے۔دونوں میں کس پر عمل کیا جائے یا دونوں میں کون بہتر ہے۔یہ طے کرنے کی غرض سے مراسلہ لکھا گیا ہے۔

علامہ شبلی نے بڑے پیمانہ پر تعطیل جمعہ کی تحریک چلائی تھی۔اس دوران بنگال کونسل میں تعطیل جمعہ کے لیے دو گھنٹہ کی رخصت کی تجویز منظور ہوئی اس کے بعد علامہ شبلی نے یہ مراسلہ لکھا۔ اس مراسلے پر کوئی بحث ہوئی یا نہیں اس کے بارے میں تفصیلات دستیاب نہیں۔پھر علامہ شبلی نے وفات پائی اور یہ کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

۱۳-حرم محترم میں جامعہ اسلامیہ (یونیورسٹی) کی تجویز: یہ مراسلہ بھی زمیندار لاہور (۱۵/ اپریل ۱۹۱۳ء) میں شائع ہوا ہے۔اس میں انہوں نے مکہ مکرمہ میں ایک اسلامی یونیورسٹی کے قیام کی تجویز پیش کی ہے۔اور آخر میں لکھا ہے کہ:

> میں بہ ایں ضعف اور شکستہ پائی یہ کر سکتا ہوں کہ اس تحریک کے لیے تمام ہندوستان کا دورہ کروں اور پھر ہجرت کر کے مکہ معظّمہ چلا جاؤں اور اس مبارک جامعہ میں جاروب کشی کی خدمت انجام دوں۔(روزنامہ زمیندار، ۱۵/اپریل ۱۹۱۳ء)

اس مراسلہ کا ذکر حیات شبلی میں نہیں ہے۔حال ہی میں اسے پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے دریافت کیا ہے۔اس مراسلہ پر اخبارات میں بحث ومباحثہ بھی ہوا۔مولانا ابوالکلام آزاد نے اس تجویز کی حمایت کی، البتہ انہوں نے ایک نئی یونیورسٹی کے بجائے مدرسہ صولیتہ مکہ مکرمہ کو ترقی دینے اور یونیورسٹی بنانے کی تجویز پیش کی۔علامہ شبلی کی اس تجویز کی حمایت میں متعدد مراسلے شائع ہوئے جس میں وقار نواز جنگ اور حاجی محمد اسماعیل کے نام قابل ذکر ہیں۔البتہ ایک آواز اس کے خلاف بھی بلند ہوئی اور وہ آواز مولانا ظفر علی خاں کی تھی۔مولانا ظفر علی خاں نے زمیندار میں تین قسطوں میں اس کے خلاف مضمون لکھا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ مسلمانوں کی ترقی علوم وفنون کی تحصیل اور یونیورسٹی کے قیام سے نہیں ہو سکتی اس لیے علامہ شبلی کا یہ خیال درست نہیں۔(زمیندار، ۵/مئی ۱۹۱۳ء)

۱۴-مدینہ یونیورسٹی کا نصاب تعلیم: ۱۹۱۳ء میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا ظفر علی خاں وغیرہ کی کوششوں سے ترکی حکومت نے مدینہ منورہ میں جامعہ اسلامیہ کے قیام کی تجویز منظور کی۔شیخ عبدالعزیز شاویش اس کے نامزد وائس چانسلر تھے۔علامہ شبلی علامہ حمید الدین فراہی اور علامہ اقبال کو

www.shibliacademy.org

اس یونیورٹی کا نصاب تعلیم بنانے کے لیے منتخب کیا گیا اور انہیں تار بھیجے گئے۔ علامہ شبلی اسے ایک قومی مسئلہ خیال کرتے تھے۔ چنانچہ اس نصاب کے سلسلے میں انہوں نے زمیندار میں مراسلہ لکھا تاکہ اس پر مزید بحث ومباحثہ ہو۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس لیے کہ مزید تفصیلات دستیاب نہیں۔ حیات شبلی بھی اس کی تفصیل سے خالی ہے۔

۱۵-مولانا عبدالباری کی شہادت: ۱۹۱۲ء میں علامہ شبلی نے ماہنامہ الندوہ کی ادارت سے استعفادیا تو ان کی جگہ مولوی عبدالکریم صاحب ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ انہوں نے فوراً ہی جہاد پر ایک مضمون لکھا جو قابل اعتراض قرار پایا۔ چنانچہ تمام معتمدین ندوہ نے مل کر انہیں معطل کر دیا اور جب معطّلی پر ہنگامہ ہوا تو اس کی تمام تر ذمہ داری علامہ شبلی کے سر ڈال دی، اس مسئلہ نے اتنا طول کھینچا کہ بات اخبارات تک پہنچ گئی اور علامہ شبلی پر طرح طرح کے الزامات عائد کیے گئے۔ ان کے جواب میں علامہ شبلی نے کئی مراسلے لکھے۔ یہ مراسلہ بھی اسی سلسلہ کا ہے۔ اس میں انہوں نے مولوی عبدالباری فرنگی محلی کے الزامات کا جائزہ لے کر ثابت کیا ہے کہ خود مولانا عبدالباری اس کارروائی میں شریک تھے اور اب اپنی برأت کا اظہار کر رہے ہیں۔

مولوی عبدالباری صاحب نے اپنے مراسلے میں یہ الزام بھی عائد کیا تھا کہ مولانا شبلی نے دھمکی دے کر اراکین کو اپنا ہم نوا بنایا تھا، علامہ شبلی نے اس کی بھی تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ تمام معتمدین نے متفقہ طور پر مولوی عبدالکریم کو معطل کیا تھا۔

۱۶-مولوی عبدالکریم صاحب کی معطّلی اور مولانا عبدالحئی صاحب: یہ مراسلہ مولوی عبدالحئی صاحب سابق ناظم ندوۃ العلما کو مخاطب کر کے لکھا گیا ہے اور وکیل امرتسر میں شائع ہوا ہے۔ یہ مراسلہ بھی مولوی عبدالکریم صاحب کی معطّلی ہی کے حوالہ سے ہے، مولوی عبدالحئی صاحب نے مسلم گزٹ میں مراسلہ شائع کر کے مولوی عبدالکریم صاحب کی معطّلی میں شرکت سے انکار کیا تھا، علامہ شبلی اپنے مراسلہ میں لکھتے ہیں:

"جناب مولوی عبدالحئی صاحب!

آپ نے مسلم گزٹ میں اس امر سے برأت ظاہر کی ہے کہ آپ مولوی عبدالکریم صاحب کی معطّلی میں شریک مشورہ نہ تھے۔

www.shibliacademy.org

مولانا!

جو روداد جلسۂ انتظامیہ مورخہ ۹؍ مارچ ۱۹۱۳ء شائع ہوئی ہے، اس میں ریزولیوشن کی یہ عبارت ہے:

''اس جلسہ کے نزدیک مولوی عبدالکریم صاحب کا مضمون مسئلہ جہاد جو الندوہ بابت جون ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا، اس کارروائی کا سزاوار نہ تھا، جو معتمد صاحب دارالعلوم نے بہ مشورہ مولوی عبدالحئی صاحب و مولوی ظہور احمد صاحب کی اور یہ جلسہ یہ امر ضروری سمجھتا ہے کہ مولوی عبدالکریم صاحب سے یہ تینوں حضرات تحریری معافی مانگ کر جو نقصانات ان کو ان کی شہرت وغیرہ کے متعلق اس کارروائی سے پہنچے ہیں تلافی کریں''۔

اس تجویز کی تائید مولوی اعجاز علی صاحب نے کی، مولوی محمد نسیم صاحب نے ترمیم کی کہ اس تجویز کا آخری حصہ جو معافی و تلافی کے متعلق ہے، اس کو نکال ڈالا جائے اس کی تائید مولوی عبدالباری صاحب نے کی اور باتفاق آرا ترمیم پاس ہوئی۔

یہ ریزولیوشن بہ ترمیم تحریک مقامی پاس ہوا، آپ بھی اس جلسہ میں موجود تھے، کیا جلسہ انتظامیہ کی یہ کارروائی، جس میں نہایت کثرت سے ممبر شریک تھے اور جو خود آپ کے زیر اہتمام شائع کی گئی ہے، غلط سمجھی جائے؟ اور کیا اس میں اتفاق آرا کا لفظ غلط ہے؟ اور مولوی عبدالباری صاحب نے اپنی شہادت میں یہ الفاظ بیان کیے ہیں:

''اس پر مولوی شبلی صاحب نے فرمایا کہ اچھا آپ (مولوی عبدالحئی صاحب معطّلی کا حکم لکھ دیں، مولوی عبدالحئی صاحب نے منظور کیا''۔ کیا یہ الفاظ غلط ہیں؟۔

(۷؍ جون ۱۹۱۳ء، از وکیل امرتسر)

اس کے بعد دونوں کے درمیان کیا خط و کتابت ہوئی اس کی تفصیلات دستیاب نہیں ہیں۔

۱۷- مولوی عبدالکریم کی معطّلی: علامہ شبلی کا یہ مراسلہ بھی مذکورہ بالا واقعہ سے متعلق ہے

www.shibliacademy.org

اور زمیندار میں شائع ہوا ہے۔ یہ مراسلہ اس لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ یہ ابھی حال میں دریافت ہوا ہے۔ مقالات شبلی میں شامل نہیں اور غالباً حیات شبلی کے مصنف کی بھی نظر سے نہیں گذرا، اسے مذکورہ بالا مراسلات کا خلاصہ تصور کرنا چاہیے۔ چونکہ یہ نو دریافت مراسلہ ہے اس لیے مکمل نقل کیا جاتا ہے۔

السلام علیکم!

میں دس دن سے سخت علیل ہوں اور صاحب فراش، میرے متعلق آج کل جو اتہامات اور اکاذیب کا طوفان برپا کیا گیا ہے میں اس سے بے خبر نہیں ہوں۔ لیکن اول تو میری عام عادت ایسے موقعوں پر سکوت کی ہے، ثانیاً سخت بیماری کی وجہ سے میں کچھ نہ لکھ سکا۔ مفصل بعد صحت لکھوں گا۔ اس وقت مختصراً چند امور گذارش ہیں:

۱- میں نے اس وقت تک کوئی تحریر گورنمنٹ کے کسی افسر کو مولوی عبدالکریم صاحب کے متعلق خود نہیں بھیجی، نہ میں اس وقت تک کسی افسر سے اس معاملہ کے پیش آنے کے وقت سے اب تک ملا۔ جو تحریریں گورنمنٹ میں گئی ہیں وہ دفتر نظامت سے گئی ہیں، جو میرے محکمہ سے بالاتر محکمہ ہے۔

۲- جس جلسہ میں مولوی عبدالکریم صاحب کا تا جلسہ انتظامیہ معطل ہونا طے ہوا تھا اس میں پانچ حضرات شریک تھے، یعنی جناب مولوی عبدالباری صاحب فرنگی محلی، مولوی ظہور احمد صاحب، مولانا مولوی سید عبدالحئ صاحب، منشی احتشام علی صاحب سکریٹری مال اور خود میں۔ اس جلسہ میں جو متفقہ انگریزی یادداشت مرتب ہوئی، مولوی ظہور احمد صاحب نے کی اور بذریعہ دفتر نظامت کے ڈپٹی کمشنر صاحب کے پاس بھیجی گئی، اس پر تینوں سکریٹری کے دستخط تھے یعنی مولانا سید عبدالحئ صاحب، منشی احتشام علی صاحب اور خود میرے۔ اردو تحریر میں اضافہ کے متعلق جو مجھ پر اعتراض ہے، اس کی بابت بعد کو لکھوں گا، اس وقت یہ عرض ہے کہ میں نے اپنی یاد سے اردو یادداشت میں جو لفظ اضافہ کیا وہ دفتر

www.shibliacademy.org

نظامت میں بھیج دیا گیا تھا اور وہ ایسا امر نہیں کہ اس پر واقعہ کا کوئی انحصار ہو۔

۳- یہ امور کہ مضمون مذکورہ کا مقاصد ندوہ کے خلاف ہے اور اس کی اطلاع ڈپٹی کمشنر صاحب کو دینی چاہیے اور یہ کہ پرچہ (الندوہ) روک دیا جائے اور یہ کہ مولوی عبدالکریم صاحب ایڈیٹری سے معطل کیے جائیں، اس جلسہ کے تمام ارکان مذکورہ بالا کا متفقہ فیصلہ تھا، میں نے کوئی مزید حصہ اس میں نہیں لیا، یہ امر خود ان حضرات سے دریافت کرنا چاہیے، البتہ جب اس جلسہ کے سب ارکان کی یہ رائیں قائم ہوچکیں کہ مضمون، مقاصد ندوہ کے خلاف ہے تو میں نے اس بات پر زور دیا کہ جس طرح مولوی عبدالکریم صاحب کے متعلق یہ سب امور تا جلسہ انتظامیہ طے کیے جاتے ہیں اسی طرح جلسہ انتظامیہ کے منعقد ہونے تک وہ مدرسہ سے بھی معطل رہیں، کیونکہ مدرسہ خاص میری ذمہ داری میں ہے۔

۴- ندوۃ العلماء کے ۱۵ ممبر ہیں، جن میں دو ثلث علماء ہیں، ان کی کثرت آرا اب موصول ہوچکی ہیں۔

جن ارکان نے مضمون مذکورہ کو قابل گرفت خیال کیا اور اس بنا پر مولوی عبدالکریم صاحب کی معطّلی تا جلسہ انتظامیہ سے اتفاق کیا ان میں بعض حضرات یہ ہیں: جناب حاجی نواب اسحاق خاص صاحب سکریٹری علی گڑھ کالج، جناب حاجی رحیم بخش صاحب پریزیڈنٹ بہاول پور، مولوی حبیب الرحمٰن صاحب شروانی رئیس علی گڑھ، جناب مولوی نظام الدین صاحب جعفری افسر واعظین مجلس ہدایت الاسلام دہلی، مولوی غلام محمد صاحب فاضل ہوشیار پوری، مولوی قاری عبدالسلام صاحب پانی پتی، امام صاحب جامع مسجد دہلی، حکیم عبدالولی صاحب۔ متعدد ارکین کی رائیں اس کے خلاف بھی ہیں لیکن کثرت آرا اسی طرف ہے۔

۵- اس امر پر کہ اصل مضمون قابل گرفت ہے یا نہیں میں بعد صحت تفصیل سے لکھوں گا۔ اس وقت صرف اس قدر گذارش ہے کہ مضمون مذکورہ دفعہ دس میں یہ بتایا گیا ہے کہ کوئی مسلمان کسی کافر کی حکومت میں نہیں رہ سکتا اگر رہے

www.shibliacademy.org

گا تو گنہگار رہوگا۔

شبلی نعمانی

(زمیندار لاہور، ۱۰؍جمادی الاولیٰ ۱۳۳۱ھ)

۱۸-اوقاف اسلامی: وقف علی الاولاد کی تحریک کے زمانہ میں علامہ شبلی کے دل میں عام اوقاف اسلامی کے تحفظ کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ وہ اس کے لیے بھی تحریک چلانا چاہتے تھے۔اسی غرض سے ۲۶؍جنوری ۱۹۱۴ء کو یہ مراسلہ لکھا۔ان کی تجویز یہ تھی کہ:

"۱-ایک موریل تیار کیا جائے جس میں انتظام اوقاف کی خواہش گورنمنٹ سے کی جائے اور اس موریل پر اس کثرت سے مسلمانوں کے ہر طبقہ سے دستخط کرائے جائیں کہ یہ موریل تمام قوم کی طرف سے سمجھا جائے۔

۲-گورنمنٹ سے جس قسم کی نگرانی کی خواہش کی جائے اس طریقے کی ہو کر مذہبی دست اندازی کا احتمال پیدا نہ ہونے پائے، مثلاً اس کا طریقہ یہ ہو کہ ایک کمیٹی قائم کی جائے جس کے ارکان تمام صوبوں سے نیابتانہ طریقے پر انتخاب کیے جائیں اور انتخاب کی تمام کارروائی صرف اسلامی جماعت کی طرف سے انجام پائے پھر گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ اس کمیٹی کو باقاعدہ تسلیم کرے اور اس کو باضابطہ اختیارات تحقیقات وغیرہ کے دیے جائیں پھر اس کی حریت کردہ رپورٹ ملک میں شائع کی جائے اور گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ اس کے مطابق عمل کیا جائے۔

۳-تیموری سلطنت میں تمام اوقاف کے انتظام کا ایک خاص عہدہ تھا جس کو صدر الصدور کہتے تھے کیا گورنمنٹ سے یہ درخواست نہیں کی جاسکتی کہ یہ عہدہ دوبارہ پھر قائم کیا جائے لیکن صدر الصدور کا تقرر اسی نیابتانہ اصول پر اسلامی جماعت کی طرف سے ہوتا کہ گورنمنٹ کے متعلق کسی قسم کی دست اندازی کا احتمال نہ پیدا ہوسکے، ان کے علاوہ اور جو تجویزیں آپ کے خیال میں آئیں آپ تجویز فرمائیں"۔(مقالات شبلی، ج۸،ص ۳۵)

www.shibliacademy.org

یہ مراسلہ کہاں شائع ہوا اس کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اسے مقالات شبلی میں نقل کیا ہے اور حیات شبلی میں اس کا ذکر بھی کیا ہے۔

۱۹-ایک اہم مراسلہ (دارالمصنّفین): ۱۱ر فروری ۱۹۱۴ء کو دارالمصنّفین کی تجویز پر مشتمل یہ مراسلہ الہلال میں شائع ہوا ہے۔ مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ:

''خدا کا شکر ہے کہ ملک میں تصنیف و تالیف کا مذاق پھیلتا جاتا ہے اور قابل قدر ارباب قلم پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن بااین ہمہ اس گروہ میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جن کو مصنف کے بجائے مضمون نگار یا انشاپرداز کہنا زیادہ موزوں ہوگا، کیونکہ ان کی مستقل تصنیفیں نہیں ہیں بلکہ معمولی رسالے یا مضامین ہیں۔

اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان کو اعلیٰ درجہ کی تصنیف کی قابلیت نہیں بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کی تصنیف کے لیے جو سامان درکار ہے وہ مہیا نہیں ہے، ان میں سے اکثر کے پاس کتابوں کا ذخیرہ نہیں، جو انتخاب اور استنباط اور اقتباس کے کام آئے، اتفاق سے اگر کوئی مقامی کتب خانہ موجود ہے تو دلجمعی کے اسباب نہیں کہ اطمینان سے چندروز وہاں رہ کر کتابوں کا مطالعہ اور اس سے استفادہ اور نقل و انتخاب کر سکیں، ان باتوں کے ساتھ کوئی علمی مجمع بھی نہیں کہ ایک دوسرے سے مشورہ اور مبادلۂ خیالات ہو سکے۔

ان مشکلات کے حل اور تصنیف و تالیف کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ایک وسیع ''دارالتصنیف'' امور ذیل کے موافق قائم کیا جائے''۔ (الہلال ۱۱ر فروری ۱۹۱۴ء)

علامہ شبلی دارالمصنّفین ندوہ میں قائم کرنا چاہتے تھے۔ مگر اسی زمانہ میں وہ ندوہ سے مستعفی ہوئے اور اعظم گڑھ آئے اور دارالمصنّفین اعظم گڑھ میں قائم کیا۔ اب دارالمصنّفین کے قیام پر صدی گذر چکی ہے۔ سو سال میں اس ادارہ نے بڑے عظیم الشان علمی و تحقیقی اور تصنیفی کارنامے انجام دیے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے نہ صرف دو سو سے زاید بلند پایہ کتابیں شائع کیں بلکہ اس نے متعدد اہل قلم اور ارباب کمال پیدا کیے۔ دارالمصنّفین کی تاریخ پر کئی ضخیم کتابیں

www.shibliacademy.org

سپرد قلم کی جا چکی ہیں۔

۲۰-ایک مذہبی مدرسۂ اعظم کی عمارت کے لیے علامہ شبلی نے یہ مراسلہ ماہنامہ الندوہ میں **تمام ہندوستان کے مسلمانوں سے درخواست:** لکھا۔اس میں انہوں نے دارالعلوم ندوہ کی عمارت کی تعمیر کے لیے لوگوں کو راغب کیا ہے اور لکھا ہے کہ ''تمام ہندوستان میں ایک بھی ایسا خالص دینی و مذہبی مدرسہ نہیں جو بہ لحاظ جامعیت و وسعت کے مدرسۂ اعظم کہلانے کا مستحق ہو''۔ پھر انہوں نے ان ضروریات کی تفصیل لکھی ہے جس کو پورا کر کے مدرسۂ اعظم کی تعمیر کی جا سکتی ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ:

> ''چونکہ یہ عمارت ایک عظیم الشان عمارت ہوگی، جس کا تخمینہ پچاس ہزار سے کم نہیں ہوسکتا، اس لیے ندوہ کی طرف سے ہم چند ارکان نے ارادہ کیا ہے کہ مشہور مقامات میں دورہ کر کے اس رقم کو فراہم کریں۔امید ہے کہ بزرگانِ قوم ہماری اور اپنی شرم رکھیں گے اور ایک خالص مذہبی کام کے انجام دینے میں ہم کو مایوس نہ کریں گے''۔(مقالاتِ شبلی، ج ۸،ص ۹۶)

۲۱-اسٹرائک کا سبب کون تھا: ندوہ میں طلبہ کے ساتھ بعض زیادتیاں ہوئیں جن کے سبب طلبہ نے ۷ر مارچ ۱۹۱۴ء کو اسٹرائک کر دی۔ذمہ داران ندوہ نے اس اسٹرائک کی ذمہ داری بھی علامہ شبلی کے سر ڈال دی، چنانچہ علامہ شبلی نے ۶ر اپریل ۱۹۱۴ء کو ہمدرد دہلی میں ایک مراسلہ ''اسٹرائک کا سبب کون تھا'' لکھ کر اسٹرائک کے اسباب بتائے۔اور قدرے تفصیل سے ان اسباب کی وضاحت کی جن کے سبب اسٹرائک ہوئی۔یہ تاریخی اسٹرائک کئی ماہ تک جاری رہی۔اس کے روح رواں مولانا مسعود علی ندوی (۱۸۸۹-۱۹۶۷ء) تھے۔اسٹرائک ختم کرانے کے لیے اس وقت کے عمائدین نے کوشش کی تب جا کر یہ ختم ہوئی۔اس کی تفصیل حیاتِ شبلی میں موجود ہے۔

۲۲-اصلاح ندوہ اور ہمدرد: مولانا محمد علی جوہر ایڈیٹر رسالہ ہمدرد دہلی نے ۲۴ر اپریل ۱۹۱۴ء کے ہمدرد میں اصلاح ندوہ کے سلسلے میں چند مشورے دیے اور لکھا کہ ندوہ میں جو خرابیاں ہیں ان کا ذکر فرداً فرداً تمام ارا کین ندوہ سے کرنا چاہیے۔اگر اس سے کام نہ بنے تو پھر جوش و غیرت دلائی جائے کہ یہ قومی ادارہ ہے اسے برباد ہونے سے بچانا چاہئے۔علامہ شبلی نے اس کے جواب

www.shibliacademy.org

میں یکم مئی ۱۹۱۴ء کو ہمدرد ہی میں ایک مراسلہ لکھا اور واضح کیا کہ پہلے طریقہ کے مطابق اصلاح ندوہ کی کئی بار کوشش ہو چکی ہے یہاں تک کہ:

''میں نے بارہا فرداً فرداً اور اجتماعی طریقہ سے اس کی طرف توجہ دلائی، دو سال ہوئے کہ میں نے ایک مطبوعہ خط تمام ارکان کی خدمت میں بھیجا کہ موجودہ خرابیاں اس وجہ سے ہیں کہ ندوہ میں دو مختلف الخیال اور مختلف المذاق قسم کے ممبر ہیں، اس لیے دونوں کی کشمکش کی وجہ سے کسی امر کی اصلاح نہیں ہو سکتی اس بنا پر یہ مناسب ہوگا کہ یورپ کے قاعدہ کے موافق ایک مدت معین تک ایک مذاق کے تمام ممبر کام سے دست بردار ہو جائیں اور تنہا ایک فریق کو کام کرنے دیا جائے اور سب سے پہلے میں خود اور میرے ہم خیال اس کے موافق دست کش ہونے پر آمادہ ہیں لیکن یہ تجویز جلسہ انتظامیہ میں نامنظور کی گئی''۔ (مقالات شبلی، ج ۸، ص ۱۳۳-۱۳۴)

پھر یہ واضح کیا کہ اب مسلمانوں کی عام کانفرنس کے سوا اس کا کوئی دوسرا علاج باقی نہیں رہا۔

۲۳- جلسہ دہلی کے متعلق ایک عام غلط فہمی کی تردید: ندوہ کے آپسی اختلافات میں جب شدت پیدا ہوگئی تو اس کو حل کرنے کے لیے دہلی میں ایک اجلاس ہونا طے پایا اس کے روح رواں حکیم اجمل خاں تھے۔ اس کے متعلق لوگوں میں عجیب عجیب قیاس آرائیاں کی گئیں ایسی ہی ایک غلط فہمی کے ازالہ کے لیے علامہ شبلی نے ۲۰ رمئی ۱۹۱۴ء کے زمیندار میں ایک مراسلہ لکھا جس میں لکھا کہ:

''یہ خیال غلطی سے عام طور پر پھیل گیا ہے کہ دہلی میں ندوہ کی اصلاحی تجویز کے متعلق جو جلسہ ہونے والا ہے، وہ موجودہ کارکن اشخاص کی مخالفت اور ان کے ساتھ معرکہ آرائی کا جلسہ ہے، اس غلط خیالی نے تمام پبلک میں ایک اشتعال آمیز (مخالف یا موافق) جوش پیدا کر دیا ہے، قومیں جب ابتدائی ترقی کے دور میں ہوتی ہیں تو ان کا مذاق طبع ہر بات میں اشتعال انگیز پہلو کو ڈھونڈھتا ہے اور اس سے متاثر ہو کر اصل حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

www.shibliacademy.org

حقیقت یہ ہے کہ ندوہ کے چند امور مسلمۂ فریقین ہیں، یہ امر کہ ندوہ میں کچھ خرابیاں ہیں، دونوں کو تسلیم ہے، یہ امر ان خرابیوں یا اصل قانون ندوہ میں اصلاح کی حاجت ہے، دونوں فریق کو تسلیم ہے۔ گفتگو صرف یہ ہے کہ یہ خرابیاں کس نے پیدا کیں؟ اور اب ان کی اصلاح کا کیا طریقہ ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ ہر فریق دوسرے فریق کو خرابیوں کا ذمہ دار بتاتا ہے اور اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اگر کوئی آزاد کمیشن بیٹھتا تو یہ مسئلہ صاف ہو جاتا، لیکن بہر حال ایسا کرنے میں مخالفت اور جوش کا زیادہ احتمال ہے، اس لیے سر دست اسی نقطہ کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ خرابیاں کیا ہیں؟ اور اصلاح کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے؟

(مقالات شبلی، ج ۸، ص ۱۳۶-۱۳۷)

یہ مراسلہ قدرے طویل ہے، اس کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوا ہے:

''ارکان ندوہ کے علاوہ جو لوگ اس مسئلہ کو قوم میں لانے کے مخالف ہیں، صرف دو قسم کے لوگ ہیں، یا وہ ہیں جو آج ۲۲ برس سے ندوہ کے مخالف اور اس کے وجود کے دشمن ہیں، ان کو اس سے بڑھ کر کیا خوشی ہو سکتی ہے کہ ندوہ کل کا تباہ ہوتا ہوا آج تباہ ہو جائے، یا وہ لوگ ہیں جو خود کسی انسٹی ٹیوشن پر اسی طرح خود مختارانہ قابض ہیں اور ڈرتے ہیں کہ اس آگ کے شعلے پھیلتے پھیلتے ان کے گھر تک نہ پہنچ جائیں''۔ (ایضاً)

۲۴-ترکوں کی اعانت: یہ مراسلہ دراصل علامہ شبلی کے اپنے ہی ایک فتویٰ کے سلسلہ میں ہے۔ جنگ بلقان کے زمانہ میں بقر عید آئی تو علامہ شبلی کو خیال ہوا کہ ہندوستان کے مسلمان قربانی کا پیسہ اگر ان لوگوں تک پہنچا دیں جو اس وقت حقیقی قربانی پیش کر رہے ہیں تو یہ ترکی کا ایک بڑا تعاون ہوگا۔ چنانچہ علامہ شبلی نے اس سلسلہ میں ایک فتویٰ تیار کیا جس سے علمائے فرنگی محل نے بھی اتفاق کیا لیکن بعض لوگوں نے اس سے اختلاف بھی ظاہر کیا۔ ان کے شاگرد مولانا ظفر علی خاں نے بھی اس پر خدشہ ظاہر کیا۔ اسی شبہ کو دور کرنے کے لیے علامہ شبلی نے درج ذیل مراسلہ لکھا اور اخبارات میں شائع کرایا۔

www.shibliacademy.org

''جناب من!

بعض صاحبوں کا خیال ہے کہ ترکوں کی ہمدردی میں اگر قربانی کے بہ جائے قیمت دی گئی تو اس سے احتمال ہوگا کہ قربانی خود غیر ضروری ہے لیکن یہ صحیح نہیں، شریعت میں فرائض کے درجات میں بھی ترتیب ہے اور وقتی ضرورتوں کا خیال رکھا گیا ہے، غزوۂ خندق میں جہاد میں مصروف ہونے کی وجہ سے آنحضرتؐ کی نماز عصر قضا ہوئی تو کیا یہ حجت ہو سکتی ہے کہ نماز کا قضا کرنا جائز ہے؟

ترکوں کی اعانت اس وقت فرض عین ہے۔ اس لیے اس خاص موقع اور ضرورت کے وقت اگر یہ فرض مقدم رکھا گیا تو اس سے آئندہ کے لیے کیا حجت ہو سکتی ہے؟

قربانی شعار اسلام ہے، مسلمان اس کو نہیں چھوڑ سکتے، نہ کوئی قوم ان کو اس پر مجبور کر سکتی ہے، نہ وہ اس کے مقابلہ میں دنیا کی کسی قوم کی پروا کر سکتے ہیں''۔ (حیات شبلی ص ۶۳ ۴)

اب تک علامہ شبلی کے کل ۲۴؍ مذکورہ مراسلات دستیاب ہوئے ہیں، چونکہ ان کے عہد کے اخبارات بالخصوص ہمدرد دہلی، زمیندار لاہور اور مسلم گزٹ لکھنؤ کی مکمل فائلیں دستیاب نہیں ہیں اس لیے یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اب مزید مراسلات دستیاب نہیں ہوں گے، بہرحال جو مراسلات دستیاب ہیں ان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ علامہ شبلی ہمہ وقت ملت کے لیے فکرمند رہتے تھے اور اس کو زوال کے بھنور سے نکالنے اور ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں کرتے رہتے تھے اور یہ سب وہ تن تنہا کرنے کے بھی مدعی نہ تھے بلکہ ان کی خواہش تھی وہ تمام لوگ جو ملت کا درد رکھتے ہیں، اس میں شامل ہوں اور تمام ملی و رفاہی کاموں کو مشترکہ اور متفقہ طور پر انجام دیا جائے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو علامہ شبلی اپنے معاصرین میں سب سے ممتاز اور یگانہ شخص تھے۔

www.shibliacademy.org

مولانا شبلی کے غیر مدوّن خطوط

ڈاکٹر شمس بدایونی

۲۰۰۴ء عیسوی مولانا شبلی اور شبلیات سے میرے شغف کا نقطہ آغاز ہے۔ اسی سال دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ میں منعقد نیشنل سمینار (۲۸، ۲۹/ اکتوبر ۲۰۰۴) میں راقم الحروف نے ایک طویل مقالہ بہ عنوان ''مولانا شبلی کے خطوط - تدوین جدید کی ضرورت'' (۱) پڑھا تھا۔ اسی مقالے کے ایک حاشیے میں یہ اطلاع دی گئی تھی:

سید صاحب نے مولانا شبلی کے ان غیر مطبوعہ خطوط کو بھی حیات شبلی کا ماخذ بنایا ہے جو مکاتیب شبلی میں شامل نہیں۔ ملاحظہ کریں حیات شبلی، ص: ۳۴۸۔

لیکن شبلی پر کام کرنے والے اس طرف متوجہ نہیں ہو سکے۔ اس درمیان دارالمصنّفین کے رفیق مولانا کلیم صفات اصلاحی کو میں نے آمادہ کیا کہ وہ حیات شبلی کے مکتوباتی مآخذ پر ایک مبسوط مقالہ لکھیں۔ انہوں نے بڑی دیدہ ریزی سے بہ عنوان ''حیات شبلی کے زبانی اور مراسلاتی مآخذ'' مقالہ مرتب کیا جو ہماری زبان دہلی کی تین قسطوں (۸ تا ۱۴، ۱۵ تا ۲۱، ۲۲ تا ۲۸/ ستمبر ۲۰۱۲ء) میں شائع ہوا (۲)۔ مولانا کلیم صفات نے اپنے مقالے میں ان خطوط کی نشاندہی کو ضروری نہیں سمجھا جو مکاتیب شبلی میں شامل خطوط پر اضافہ ہیں اور جن کا مختصر یا طویل متن حیات شبلی میں نقل ہوا ہے (اگرچہ ان میں سے بعض خطوط دوسری جگہ بھی شائع ہو چکے ہیں)۔ لہٰذا حیات شبلی کو بالاستیعاب دیکھنا پڑا۔ اس محنت کے عوض نو ایسے خط حیات شبلی سے نئے برآمد ہو گئے جو شبلی کے مجموعہ ہائے خطوط میں شامل نہیں ہیں۔ ان نو خطوط کے علاوہ ایک ایک خط ماہنامہ لسان الصدق کلکتہ، مقالات شبلی ج ۸، حیات عبدالحئی اور علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط (۳) سے دستیاب

نیو آزاد پورم کالونی، بدایوں۔

www.shibliacademy.org

ہوئے۔ دو غیر مطبوعہ خط بھی ہمہ دست ہوئے۔ اس طور یہ پندرہ خطوط مناسب توضیح کے ساتھ پیش کیے جا رہے ہیں۔

یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ شخصی خطوط کے علاوہ شبلی نے گشتی چھٹیاں (۴) بھی لکھی ہیں اور ہم عصر رسائل میں مراسلے بھی۔ بعض مدیران کے نام ان کے خطوط مکاتیب شبلی اور مکتوبات شبلی میں جگہ پا چکے ہیں (۵) لیکن تین تحریریں جو دراصل خط ہیں خطوط کے مجموعوں میں شامل نہیں ہوسکیں، ان کو بھی غیر مدون خطوط کے زمرے میں رکھتے ہوئے اس مضمون میں شامل کیا جا رہا ہے۔

اس سے پیشتر اسی عنوان سے ایک مضمون سہ ماہی ''فکر و نظر'' علی گڑھ ستمبر ۲۰۱۳ء میں پیش کیا جا چکا ہے۔ یہ مضمون اسی کی تکمیل ہے۔

مولانا شبلی نعمانی (۱۸۵۷-۱۹۱۴) غالب کے بعد دوسرے بڑے مکتوب نگار ہیں، جن کے خطوط میں وہ تمام محاسن موجود ہیں جو قاری کو مطالعہ کے دوران ذہنی مسرت اور بصیرت کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ لیکن غالب کی طرح شبلی کے خطوط کے مجموعے کثرت سے شائع نہیں ہوسکے اور نہ ہی ان کے متنی ایڈیشن تیار کیے جا سکے۔ اب تک مولانا شبلی کے خطوط کے حسب ذیل مجموعے مرتب و شائع ہو چکے ہیں:

۱- مکاتیب شبلی، ج ا، مرتبہ سید سلیمان ندوی، مطبوعہ مطبع شاہی لکھنؤ، بار اول ۱۹۱۶ء، ص ۳۴۰۔ طبع دوم ۱۹۲۸ء، سوم ۱۹۵۶ء، چہارم ۱۹۶۶ء اور پنجم یعنی طبع جدید (۶) ۲۰۱۰ء میں دارالمصنّفین اعظم گڑھ کی جانب سے شائع ہوئے۔

۲- مکاتیب شبلی، ج ۲، مرتبہ سید سلیمان ندوی، مطبوعہ مطبع معارف اعظم گڑھ بار اول ۱۹۱۷، ص ۳۰۴۔ طبع دوم ۱۹۲۷ء، سوم ۱۹۳۲ء، چہارم ۱۹۷۱ء، پنجم یعنی طبع جدید ۲۰۱۲ء میں دارالمصنّفین اعظم گڑھ کی جانب سے شائع ہوئے۔

۳- خطوط شبلی، مرتبہ محمد امین زبیری و سید یوسف قیصر، مطبوعہ شمسی مشین پریس آگرہ، اول ۱۹۲۶ء، ص ۱۲۴۔ خطوط شبلی عورتوں کے نام، مرتبہ محمد امین زبیری، ناشر تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور، دوم ۱۹۳۵ء، ص ۱۲۸۔

www.shibliacademy.org

۴-خطوط شبلی بنام آزاد، بہ قلم شبلی، مرتبہ ڈاکٹر سید محمد حسنین، ناشر بہار اردو اکیڈمی پٹنہ، اول ۱۹۸۸ء، ص ۲۱۳۔

۵-مکتوبات شبلی، مرتبہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ناشر ادبی دائرہ اعظم گڑھ، اول ۲۰۱۲ء، ص ۲۶۰۔

مذکورہ بالا مجموعہ ہائے خطوط میں ۸۸ مکتوب الیہم کے نام مکتوبات کی تعداد حسب ذیل ہے:

مکاتیب شبلی، ج ا	۴۰۲ خط	صحیح ۴۰۰ خط	کل تعداد ۴۰۰
مکاتیب شبلی، ج ۲	۳۸۲ خط	صحیح ۳۷۹ خط	کل تعداد ۳۷۹
خطوط شبلی	۱۰۲ خط	صحیح ۱۰۲ خط	کل تعداد ۱۰۲
خطوط شبلی بنام آزاد	۵۸ خط	صحیح ۵۹ خط (۵۳ خطوط کے عکس)	

اس مجموعے میں شامل ۴۰ خطوط مکاتیب شبلی ج ۲ میں شائع ہو چکے تھے، لیکن ۳۴ خطوط کا عکس اور ۱۹ غیر مطبوعہ خطوط مع عکس کی پیش کش مکاتیب شبلی میں پیش کردہ خطوط پر اضافہ ہیں۔ ۱۹ خطوط چونکہ مکتوبات شبلی میں شامل کر لیے گئے لہٰذا کل تعداد میں ان کو محسوب نہیں کیا گیا۔

مکتوبات شبلی	۲۱۰	صحیح ۲۰۹ (۷)	کل تعداد ۲۰۹
غیر مدوّن خطوط (پیش نظر)			۱۵

دستیاب خطوط کی کل تعداد (۸)	۱۱۰۵
کل تعداد مکتوب الیہ ۸۸+۳=	۹۱

مکتوبات شبلی، شبلی کے خطوط کا آخری مجموعہ ہے جس میں رسائل و کتب میں بکھرے شبلی کے ۲۰۱ مطبوعہ خطوط (من جملہ باقیات شبلی (دہلی ۱۹۶۴ء) و خطوط شبلی بنام آزاد میں جمع کردہ بالترتیب ۶۷ صحیح ۴۷+ ۱۹ مکاتیب) کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ دس (صحیح آٹھ) غیر مطبوعہ خطوط بھی شامل اشاعت ہیں۔ تمام خطوط کے مآخذ، مکتوب الیہم کے مختصر کوائف، خطوط پر حواشی کے اہتمام نے مجموعے کی افادیت کو بڑھا دیا ہے۔ مرتب کی محنت، تلاش و جستجو کے اعتراف کے ساتھ یہ لکھنا ناگزیر ہے کہ ۱۳ مطبوعہ خطوط مرتب کی نظروں سے اوجھل رہے یا ان تک رسائی نہیں ہو سکی۔ ان تیرہ

www.shibliacademy.org

خطوط میں سے دس مکاتیب کی صورت میں علاحدہ کہیں شائع نہیں ہوئے بلکہ مضامین و کتب میں عبارت کے درمیان آ گئے ہیں یا حاشیے میں نقل کیے گئے ہیں، لہٰذا ان تک رسائی آسان بھی نہیں تھی۔ خود سید صاحب نے نو خط حیات شبلی میں نقل کیے لیکن وہ مکاتیب شبلی میں جگہ نہیں پا سکے (۹)۔ ان نو خطوط کے علاوہ چھ خط راقم الحروف کو مزید دستیاب ہوئے ان میں دو غیر مطبوعہ ہیں۔ اس طور پندرہ خطوط ضروری توضیح کے ساتھ تاریخی ترتیب میں پیش کیے جا رہے ہیں:

(۱)

زیر نظر خط مولانا شبلی کے والد ماجد شیخ حبیب اللہ (ف ۱۲/نومبر ۱۹۰۰ء) کے نام ہے۔ جس میں ان کے نام شبلی کے برادر خورد محمد مہدی حسن بار ایٹ لا (ف ۲۹/جون ۱۸۹۷ء) کے خط کو کھول کر پڑھ لینے کا تذکرہ ہے۔ مہدی حسن ان دنوں اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن میں مقیم تھے۔ (مدت قیام ۱۸۸۵ تا ۱۸۸۸ء) اور اپنے والد محترم کو وہاں کے حالات سے خطوط (۱۰) کی شکل میں مطلع کرتے رہتے تھے۔ اس خط سے مطلع ہو جانے کے بعد شیخ حبیب اللہ سے شبلی کی مدت مکاتبت ایک سال پیچھے چلی گئی ہے۔ شیخ کے نام شبلی کا پہلا خط ۲۵/مئی ۱۸۸۷ء کا مکتوبہ ہے جو مکاتیب شبلی ج ا میں شامل ہے۔ زیر نظر خط اولاً ماہنامہ ادیب علی گڑھ، جولائی اگست ۱۹۶۳ء (ص ۷) میں اور ثانیاً علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط (ص ۱۳) میں شائع ہوا۔ اکتوبر ۱۸۸۶ء میں علی گڑھ سے اعظم گڑھ بیماری کی حالت میں آنے اور قیام کرنے کا تذکرہ حیات شبلی میں نہیں ملتا۔ خط حسب ذیل ہے:

والد صاحب!

میں کسی کا خط کھولنا معیوب سمجھتا ہوں، مگر مہدی کا خط مدت سے نہیں دیکھا تھا۔ علاوہ اس کے آپ کے نام کا خط مخفی راز ہی نہیں ہوتا، اس لیے یہ جرأت ہوئی۔ میں اب تک بیمار ہوں، شدت کا بخار ہر روز رہتا ہے۔ جنید (۱۱) کا بھی یہی حال ہے۔ میں کل اعظم گڑھ آ گیا ہوں، ڈاکٹر کا علاج ہوتا ہے۔

شبلی

۱۷/اکتوبر ۱۸۸۶ء

www.shibliacademy.org

(۲)

زیر نظر خط روزنامہ ''آزاد'' لکھنؤ کے مدیر منشی احمد علی شوق قدوائی (ف ۱۹۲۵ء) کے نام ہے۔ خط کا پس منظر یہ ہے کہ المامون (مطبوعہ علی گڑھ ۱۸۸۷ء) کی اشاعت کے بعد اس پر جو اختلافی تحریریں آزاد میں شائع ہو رہی تھیں، مدیر آزاد کے اصرار پر ان تحریروں کے جواب میں شبلی نے یہ خط سپرد قلم کیا (۱۲)۔ اس سے پیشتر (اور بعد میں بھی) انہوں نے اپنے خلاف لکھے جانے والے مضامین و تبصروں کا کبھی جواب نہیں دیا۔ شاگردوں کو بھی ایسے تمام مواقع پر جواب نہ دینے کی ہدایت کرتے رہے۔ یہ خط ''المامون'' کے عنوان سے (بہ صورت مضمون) مقالات شبلی ج ۸ میں شامل ہے۔ چونکہ بنیادی طور پر یہ خط ہے لہٰذا اس کو شبلی کے مجموعۂ خطوط ہی میں شامل کیا جانا چاہیے۔ خط پر تاریخ تحریر موجود نہیں، البتہ اشاعت کی تاریخ ۲۲ رفروری ۱۸۸۹ء دی گئی ہے۔ اس سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ فروری ۱۸۸۹ء ہی کا یہ خط مکتوبہ ہے۔ خط حسب ذیل ہے:

جناب من۔ آپ کے متواتر خطوط پہنچے، کہ میں ان تحریرات کی طرف متوجہ ہوں جو المامون کے متعلق اخبار آزاد میں شائع ہوئیں۔ بے شبہ آپ کا مقصود صرف یہ ہے کہ امر حق فیصل ہو جائے، لیکن افسوس ہے کہ نہ مجھ کو فرصت اور نہ اس قدر عام رائیں لحاظ کی مستحق ہیں۔ آج کل جس کے ہاتھ میں قلم ہے وہ نچلا نہیں بیٹھ سکتا، میں کس کس کی طرف توجہ کروں گا۔ آپ کو بہت بڑا شبہ یہ پیدا ہوا ہے کہ دولت عباسیہ میں رشید (۱۳) انتخاب کے قابل تھا نہ مامون (۱۴)۔ ریویو لکھنے والوں نے بھی اس بات کو زیادہ طول دیا ہے۔ اس امر اور تمام دوسرے اعتراضات کا تصفیہ وہ شخص کر سکتا ہے جس نے نہایت وسعت کے ساتھ تاریخی معلومات فراہم کیے ہیں اور ساتھ ہی باریک بیں اور تاریخی اصول کا نکتہ شناس بھی ہو۔ رشید کے تمام کارنامے کس کی نظر میں ہیں؟ المامون اور چند معمولی کتابوں سے جو واقفیت حاصل کی گئی ہے وہ رشید پر رائے دینے کے لیے کافی نہیں ہے، نہ کہ موازنہ جو بڑی تحقیق و تدقیق کا نتیجہ ہے۔ المامون میں رشید کا تذکرہ ضمناً آ گیا ہے اور جس قدر لکھ دیا گیا ہے وہی مناسب موقع تھا۔ رشید کی برائیاں لوگوں نے صرف برامکہ پر محدود خیال کیں اور اس بنا پر

www.shibliacademy.org

مامون سے موازنہ کرنے کو تیار ہو گئے۔ مامون کی جس قدر غلطیاں اور برائیاں لوگوں نے گنائی ہیں، اس کے مقابل میں رشید کے اور تمام کارنامے موجود ہیں۔ برامکہ کا واقعہ رشید کے الزامات کے پلّہ کو بھاری کر دیتا ہے۔ اگرچہ مجھ کو زیبا نہیں کہ میں مرحوم ہارون الرشید کی فرد قرارداد جرم تیار کروں، لیکن اگر ہمارے دوستوں کے خزانۂ معلومات میں المامون اور تاریخ الخلفاء کے سوا اور بھی کچھ ہے تو خیال کریں کہ وہ کون تھا جس نے سرحدی شہروں کے تمام گرجے بغض، بے جا تعصب سے منہدم کرا دیے؟ کون تھا جس نے اپنے قید خانہ کو بعض شبہ کی بنا پر حضرت موسیٰ کاظم سے آباد کیا تھا؟ کون تھا جس کے درباری اس کی بدمزاجی سے اس قدر خائف رہتے تھے کہ اکثر اس کے پاس کفن پہن کر جاتے تھے؟ کون تھا جس نے یحییٰ بن عبداللہ کو معاہدۂ صلح لکھ دیا جس پر تمام علماء اور بنو ہاشم کے دستخط تھے، پھر بے وجہ ان کو قید کر دیا؟ اور گو امام محمد صاحب نے کہا بھی کہ یہ بالکل اسلام کے خلاف کارروائی ہے، مگر باز نہ آیا۔ کون تھا جس کے عہد میں عمال اور عہدہ داران ملکی علانیہ ظلم کرتے تھے اور سال بھر ایک بار بھی مظلوموں کی فریاد سننے کو دربار نہیں کرتا تھا؟ کون تھا جس کو قاضی ابو یوسف نے نہایت حسرت اور تمنا سے کتاب الخراج میں یوں مخاطب کیا:

”فلو تقربت الی اللّٰہ عز و جل یا امیر المومنین بالجلوس لمظالم رعیتک فی الشھر او الشھرین مجلسا واحدا تسمع فیہ من المظلوم و تنکر علی الظالم رجوت ان لا تکون ممن احتجب عن حوائج رعیتہ لعلک لا تجلس الا مجلسا او مجلسین حتیٰ یسیر ذلک فی الامصار والمدن فیخاف الظالم وقومک علی ظلم مع انہ متی علم العمال والولا لا انک تجلس للنظر فی امور الناس یوما فی السنۃ لیس یوما فی الشھر تناھوا باذن اللہ عن الظلم“۔

”یعنی اگر اے امیر المومنین تو خدا کا تقرب اس طرح حاصل کرتا کہ رعایا کی فریاد سننے کے لیے مہینہ میں بلکہ دو مہینہ میں ایک اجلاس بھی کرتا جس میں تو مظلوم

www.shibliacademy.org

کی فریاد سنتا اور ظالم سے باز پرس کرتا تو مجھ کو امید تھی کہ تیرا شماران لوگوں میں نہ ہوتا جو رعایا کی حاجتیں نہیں سنتے اور غالباً تو دو ایک ہی اجلاس کرے گا کہ ملک میں یہ چرچا پھیل جائے گا۔ پس ظالم کو ڈر پیدا ہوگا کہ اس کے ظلم کی تجھ کو خبر نہ ہو جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جب عالموں اور عہدہ داروں کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ تو برس دن میں ایک بار بھی لوگوں کی حاجت روائی کے لیے اجلاس کرتا ہے تو وہ لوگ انشاء اللہ ظلم سے باز رہیں گے''۔

کون تھا کہ جس کے عہد میں اکثر واقعہ نویس عمالوں سے سازشیں رکھتے تھے اور بالکل جھوٹ اور فساد انگیز خبریں ہارون الرشید کو لکھتے تھے۔ جس کی وجہ سے قاضی ابو یوسف نے مجبور ہو کر کتاب الخراج میں اس کا ذکر کیا؟ کون تھا جس کے عہد میں ملک کی تباہی کا یہ حال تھا کہ سواد کے علاقہ میں حضرت عمرؓ نے جو خفیف جمع مقرر کی تھی رعایا اس کو بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی اور آخر قاضی ابو یوسف صاحب کو وہ مقدار جمع گھٹا کر اس کی توجیہ کرنی پڑی؟ کون تھا جس کا خزانہ اس طرح معمور کیا جاتا تھا کہ جب کسی پر کچھ شبہ ہوا تو اس کا کل مال ومتاع ضبط ہو کر خزانہ شاہی میں داخل کر دیا گیا۔ علی بن عیسیٰ سے دس کروڑ درہم چھین کر جو خزانہ میں داخل کیے گئے، کیا جائز حق سے لیے گئے؟ کون تھا جس نے اسلام میں یہ نئی بدعت ایجاد کی کہ خلافت کے چند ٹکڑے کیے اور اپنے بیٹوں میں اس کو موروثی جائداد کی طرح تقسیم کیا؟

کیا ان باتوں کے ہم پلّہ مامون کی تاریخ میں بھی مل سکتی ہیں؟ افسوس ہے کہ نہ لوگوں کو تمام حالات سے اطلاع، نہ واقعات کے موازنہ کرنے کی قابلیت۔ یہ امور جو میں نے لکھے شاید لوگوں کو چیستاں معلوم ہوں اور تاریخی دفتروں میں اس کے حوالے بھی نہ ڈھونڈھ سکیں۔ فتوحات کے لحاظ سے رشید کو کیا ترجیح ہے؟ مختصر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ رشید نے کوئی نیا ملک فتح نہیں کیا، لیکن مامون کے عہد میں صقلیہ اور کریٹ کی جو فتحیں ہوئیں وہ خاص لحاظ کے قابل ہیں۔ علم وقابلیت کے لحاظ سے سب جانتے ہیں کہ رشید صرف ادب وفقہ وحدیث میں کمال رکھتا تھا، لیکن مامون ان

www.shibliacademy.org

علوم کے علاوہ فنون حکمت کے مختلف صیغوں میں ایک حکیم تسلیم کیا جاتا تھا۔

پھر میں کہتا ہوں کہ رشید کی برائیاں میں نے کم گنائیں، رنج ہوتا ہے کہ سینکڑوں برس کے دبے فتنے آج ابھارے جائیں۔ خیر رشید جو کچھ تھا خوب تھا۔ ان طرف داروں سے اس کا حق مجھ پر زیادہ ہے، میں نے کچھ سمجھ کے اس کو نہیں لیا۔ ''المامون'' پر جو نکتہ چینیاں کی گئی ہیں، وہ اسی طرح تفصیل طلب ہیں جس طرح رشید و مامون کا موازنہ۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے اوقات کو ان فضول باتوں میں صرف کروں۔ آپ یقین فرمائیں کہ مجھ کو کبھی عام لوگوں کی تحسین سے نہ خوشی ہوئی، نہ ان کے اعتراض سے رنج۔ میں چاہتا ہوں کہ لوگ اعتراض کریں۔ آپ کا جی چاہے تو ان کے جواب کی طرف متوجہ ہوں۔ مجھ کو چھوڑ دیجیے کہ ''رائل ہیروز'' کے باقی حصے پورے کروں:

رسی آنکہ بدرِ و من چو من خامہ گیری و حرف بہ نگاری

(مطبوعہ: روزنامہ ''آزاد'' لکھنؤ، ۲۲ رفروری ۱۸۸۹ء)

(۳)

زیر نظر خط مولانا ارشاد حسین مجددی رامپوری (ف ۱۸۹۳ء) کے نام ہے جو فقہ اصول میں مولانا شبلی کے استاد تھے۔ جن دنوں مولانا شبلی سیرۃ النعمان (مطبوعہ علی گڑھ ۱۸۹۱) کی تصنیف میں مشغول تھے، یہ خط انہیں ایام کا ہے۔ خط پر نام یعنی دستخط اور تاریخ تحریر مرقوم نہیں، لیکن یہ خط مع جواب ''فتاوی ارشادیہ'' (مطبوعہ: ابوالعلائی پریس آگرہ، ۱۹۲۸ء، ص ۹۳-۹۴) میں نقل ہوا ہے (۱۵)۔ لہٰذا شبلی سے اس کی نسبت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

شبلی نے ۱۸۸۹ء کے اوائل میں ''سیرۃ النعمان'' کے پہلے حصہ پر کام کا آغاز کیا اور دسمبر ۱۸۸۹ء میں اس حصے کی تکمیل کر لی۔ (مکتوب بنام محمد سمیع ۲۵) دوسرا حصہ ۱۸۹۰ء میں شروع کیا اور یہ بھی دسمبر ۱۸۹۰ میں مکمل کر لیا۔ (مکتوب ۲۸ بنام سمیع) گویا اس خط کا زمانہ تحریر اوائل ۱۸۸۹ تا دسمبر ۱۸۹۰ کی درمیانی مدت ہے۔ سید سلیمان ندوی نے اس خط کو ''حیات شبلی'' (دیکھیے حاشیہ، ص ۱۸۱) میں بھی نقل کیا ہے، لیکن ''مکاتیب شبلی'' کی دونوں جلدوں میں یہ شامل نہیں کیا جا سکا۔ ''فتاوی

www.shibliacademy.org

ارشادیہ" اور "حیات شبلی" کے متن میں معمولی اختلاف ہے جسے اصل سے مطابقت کر کے درست کر دیا گیا ہے۔ خط حسب ذیل ہے:

مخدوم ومطاع ما دامت افضالھم۔ پس از اداے مراسم تحیت وتسلیم آں کہ ملازمان عالی کو معلوم ہوگا کہ بہت جد و جہد سے امام ابوحنیفہؒ کی سوانح عمری لکھ رہا ہوں جس کے لیے میں نے بہت سے مواد تاریخی فراہم کیے۔ اس وقت جو جز و زیر تحریر ہو وہ ان کے فتاوے ہیں۔ عقود الجمان میں ان کے چند فتاوے مذکور ہیں لیکن دو جگہ مجھ کو شک پیدا ہوا۔ اس لیے ان کو عرض کرتا ہوں کہ تشفی فرمائی جاوے۔ اصل عبارت لکھ کر شبہ لکھتا ہوں:

قال یا ابا حنیفه یا ابا الخطاب ما تقول فی رجل غاب عن اهله اعواما و نعی الیها فظنت امراته انه میت فتزوجت ثم قدم زوجها الاول وقد ولدت ولدافقا الاول وادعاه الثانی اکل واحد منهما قذفهما ام الذی انکر الولد بالجواب فیها ۔(۱٦)

مجھے (۱۷) اس میں شبہ یہ ہے کہ دونوں زوجوں میں (سے) کسی نے اس کو زانیہ نہیں کہا، پھر قذف کے کیا معنی؟ باقی یہ امر کہ ولدیت کے ادعا اور انکار سے ضمناً قذف لازم آتا ہے، اس پر دو سوال ہیں: ۱- کیا ایسی دلالت التزامی سے قذف کا جرم قائم ہوسکتا ہے؟ ۲- وہ عورت درحقیقت زانیہ ہوئی یا نہیں، اگر ہوئی تو کیا واقعیت کا اظہار قذف میں داخل ہے؟ ایسا تفصیلی جواب عنایت ہو جو اصل مسئلہ کو حل کر دے اور امام صاحب کے اس سوال کی حقیقت کھول دے۔

دوسرا فتویٰ یہ لکھا ہے کہ چند آدمی ایک جگہ بیٹھے تھے، ایک شخص پر سانپ آ کر گرا، اس نے دوسرے پر پھینک دیا۔ اسی طرح تین چار آدمی تک نوبت پہنچی۔ آخر میں اس نے ایک شخص کو کاٹ لیا اور وہ مر گیا۔ امام صاحب نے فتویٰ دیا کہ اگر گرنے کے ساتھ سانپ نے کاٹا تو اخیر پھینکنے والے پر دیت لازم آئے گی اور اگر وقفہ ہوا تو کسی پر نہیں۔ اس پر یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ جس شخص نے پھینکا یہ اس کا اضطراری فعل

www.shibliacademy.org

تھا۔اس اضطراری فعل پر وہ کیوں ماخوذ ہوا،فقہ میں اس کے متعلق کیا امر قرار دیا ہے
جواب جلد تر مرحمت ہو،ورنہ میرا حرج ہوگا۔فقط

(۴)

پیش نظر خط مولوی محمد سمیع (ف ۱۹۱۶ء) کے نام ہے۔جن کے نام ۵۷ خطوط مکاتیب شبلی ج ۱ میں اور ۱۱ بہ زبان فارسی ج ۲ میں شامل ہیں۔غیر مدون خطوط میں سمیع کا یہ واحد خط ہے جو دستیاب ہوا ہے۔سید صاحب نے اس پر حاشیہ دیا ہے: یہ خط مکاتیب میں نہیں (حیات:۱۸۹) اسی خط میں ایک فارسی ٹکڑے کی وضاحت بھی سید صاحب نے حاشیے میں کر دی ہے: مولوی سمیع مرحوم کا رنگ اچھا خاصا سیاہ تھا۔(حیات:۱۸۹)

یہ خط نامکمل ہے۔خط کا پس منظر اوائل اپریل ۱۸۹۲ء میں ارادۂ سفر کشمیر ہے۔لیکن یہ سفر کرنا ممکن نہ ہوسکا۔بعد میں اس کی جگہ روم ومصر وشام کا سفر کیا گیا۔خط کی تاریخ سے سید صاحب نے مطلع کر دیا ہے۔خط حسب ذیل ہے:

......اپنے ارادے سے جلد مطلع کرو۔میں انشاء اللہ اسی مہینے کے آخر
میں روانہ ہوجاؤں گا......کشمیر میں جانے سے ممکن ہے کہ تمہارے ظاہری رنگ میں
فرق آئے یعنی نتواں شستن از زنگی سیاہی غلط ہوجائے　　　شبلی

۱۰/اپریل ۱۸۹۲ء

(حیات شبلی ص ۱۸۹)

(۵)

زیر نظر خط بھی مولوی محمد سمیع کے نام ہے۔خط کا نامکمل متن علی گڑھ میں ملازمت کے دوران ایک سال کی رخصت (دسمبر ۱۸۹۶ تا نومبر ۱۸۹۷) مہینے کی تاریخ کی شہادت کے طور پر حاشیے میں نقل کیا گیا ہے۔سید صاحب نے خط کی تاریخ کتابت سے مطلع کرتے ہوئے حاشیے میں یہ وضاحت بھی کر دی ہے:

یہ تاریخ (مراد چھٹی کی) مولوی محمد سمیع صاحب کے نام ایک خط میں ملی جو درج مکاتیب نہیں۔تمہید کے بعد خط (کارڈ) یہ ہے۔(حیات:۳۲۰)

www.shibliacademy.org

اس سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ پیش نظر مکتوب پوسٹ کارڈ پر لکھا گیا ایک عمومی خط تھا جس کا مضمون محفوظ کر لیا گیا البتہ تمہید حذف کر دی گئی ہے۔ یہ خط علی گڑھ سے لکھا گیا۔ مکتوب الیہ ان دنوں جونپور میں مقیم تھے۔ خط حسب ذیل ہے:

...... میں غالباً ۲۳ یا ۲۴/ دسمبر کو یہاں سے روانہ ہوتا ہوں، اگر تمہارا قصد اعظم گڑھ کا ہو تو انتظار کرو کہ میرا ساتھ ہو اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو لکھ بھیجو۔ میں نے سر دست سال بھر کی رخصت لی ہے۔

والسلام

شبلی

۵/ دسمبر ۱۸۹۶ء

(۶)

زیر نظر خط حیات شبلی ۳۴۸ سے ماخوذ ہے۔ سید صاحب نے شبلی کے بیٹے حامد نعمانی (ف ۱۹۴۲ء) کے اچانک مفرور ہو جانے اور شبلی کے نکاح ثانی کے واقعے کے ذیل میں اس خط کو نقل کر کے شبلی کے اضطراب و بدحواسی کو اجاگر کیا ہے۔ تقریباً اسی مضمون کا ایک خط اپنے بھائی محمد اسحاق (ف ۱۹۱۴ء) کے نام ہے (مکتوبہ ۵/ مئی ۱۹۰۰ء) جو مکاتیب شبلی جلد اول میں شامل ہے۔ زیر بحث خط کا مکتوب الیہ نامعلوم ہے، یہ مکتوبہ ہے ۲۱/ اپریل ۱۹۰۰ء کا۔ یعنی اسحاق کو لکھے جانے والے خط سے پیشتر کا ہے۔ دستیاب خط القاب و آداب اور دستخط شبلی سے عاری ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکاتیب شبلی کی ترتیب کے دوران سید سلیمان ندوی نے شبلی کے خطوط منتخب کرنے کے جو اصول وضع اور اختیار کیے تھے (جن کی صراحت مکاتیب کے مقدمہ میں کی گئی ہے) زیر نظر خط ان اصولوں پر پورا نہیں اتر سکا اور مکاتیب کے لیے منتخب نہیں کیا جا سکا۔ خط کی عبارت سے پیشتر سید صاحب کا یہ جملہ:

”ایک صاحب کے نام ایک خط، مورخہ ۲۱/ اپریل ۱۹۰۰ میں جو درج مکاتیب نہیں“۔ (حیات شبلی ص ۳۴۸)

میرے اس خیال کی تائید کرتا ہے۔ خط حسب ذیل ہے:

حامد کے مفرور ہونے کا قصہ تم نے پہلے سنا ہوگا۔ ۱۱/ اپریل کو میرے پاس

www.shibliacademy.org

ان کا خط آیا کہ ''مجھ کو اب بھول جایئے''۔اس خط سے اس قدر پریشانی ہوئی کہ میں بالکل بدحواس ہو گیا۔ چار وقت تک کھانا نہ کھایا گیا اور ہر وقت رویا کرتا تھا۔اسی اثنا میں شادی کی تاریخ آئی۔لوگوں کو اصرار تھا کہ تاریخ نہیں ٹالنی چاہیے،لیکن مجھ کو دل پر قابو نہ تھا، نہ جا سکا۔اُدھر مہمان وغیرہ آ چکے تھے اور اس وجہ سے ان لوگوں کی بہت سبکی ہوئی۔ وہاں سے سمیع آئے کہ اعظم گڑھ ہی میں نکاح ہو جائے، میں اس پر بھی راضی نہ ہوا۔البتہ زیور اور کپڑا بھیج دیا کہ بعد طبیعت ٹھہرنے کے عقد ہو جائے گا۔

میاں حامد چند روز دربھنگہ میں رہ کر وہاں سے بھی کہیں چل دیے اور بالکل پتا نہیں،اور غالباً مہینوں پتا نہ لگے۔(حیات شبلی ص ۳۴۸-۳۴۹)

(۷)

زیر نظر خط بھی حیات شبلی:۳۸۶ سے ماخوذ ہے۔اس کا مکتوب الیہ اور تاریخ تحریر نا معلوم ہے۔سید صاحب نے اسے کلکتہ کی روداد صفحہ ۱۰ سے اخذ کر کے شامل کیا ہے۔ یہ خط بھی نامکمل معلوم ہوتا ہے۔اس میں کلکتہ نہ پہنچ پانے کا تذکرہ ہے۔اس سے مراد اغلباً ندوۃ العلماء کا اجلاس ہشتم (منعقدہ: ۵، ۶، ۷، ۸/ دسمبر ۱۹۰۱ء بہ مقام کلکتہ) ہے۔جس میں شرکت کی دعوت موصول ہونے کے بعد یہ خط ندوہ کے کسی ذمہ دار شخص کو لکھا گیا ہے۔مولانا ان دنوں ریاست حیدرآباد میں ملازم تھے۔۲۲/مئی ۱۹۰۱ء کو ناظم سررشتہ علوم کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا تھا۔دریں اثنا وہاں کے سیاسی حالات مخدوش تھے لہٰذا انہیں رخصت ملنے کی توقع نہیں تھی جس کا انہوں نے برملا اظہار کر دیا۔بایں طور اس خط کا زمانہ کتابت ۲۲/ مئی ۱۹۰۱ سے ۴/ دسمبر ۱۹۰۱ء کی درمیانی مدت ہے۔

سید صاحب نے اس خط کے مضمون کو مولانا شبلی کی ندوہ میں شرکت کے عمومی اعلان سے تعبیر کیا ہے۔انہوں نے لکھا ہے:

۱۹۰۱ء میں مولانا ایک نئی ملازمت کی قید میں گرفتار ہو چکے تھے۔اس لیے اس سال بھی ندوہ کے سالانہ جلسہ میں ......شریک نہیں ہوئے۔لیکن انہوں نے ایک خط کے ذریعے سے جلسہ میں یہ اعلان کرا دیا کہ وہ عنقریب سب چھوڑ چھاڑ کر ندوہ کے آستانہ پر آ بیٹھیں گے۔(ص ۳۸۶)

www.shibliacademy.org

یہ روداد باسم ''روداد اجلاس ہشتم ندوۃ العلماء'' دسمبر ۱۹۰۱ء میں محمود المطابع کانپور سے چھپ کر شائع ہوئی تھی۔ خط حسب ذیل ہے:

......رخصت ملنے کی توقع نہیں۔ اس لیے شاید کلکتہ نہ پہنچ سکوں۔ لیکن اب کی مرتبہ ندوہ میں اعلان کرادیجیے کہ میں نے مصمم ارادہ کرلیا ہے کہ سب چھوڑ چھاڑ کر ندوہ کے آستانہ پر آبیٹھوں اور اپنی تمام عمر اس کی خدمت میں صرف کردوں۔ (حیات شبلی: ۳۸۶)

(۸)

زیر نظر خط مولانا ابوالکلام آزاد (ف ۱۹۵۸ء) کے ایک قدیم مضمون ''ترقی اردو اور تراجم علوم وفنون کا سلسلہ'' (مطبوعہ ماہنامہ ''لسان الصدق'' کلکتہ، اگست وستمبر ۱۹۰۴ء) میں بر سبیل تذکرہ نقل کیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خط کا ابتدائی حصہ حذف کرکے صرف موضوع سے متعلق حصہ ہی مضمون میں نقل کرلیا گیا۔ خط کا پس منظر یہ ہے کہ سرسید انگریزی تعلیم کی جگہ مشرقی علوم کی تحصیل اوران کے اردو تراجم کے سخت خلاف تھے۔ اسی لیے انھوں نے پنجاب یونیورسٹی اور الہ آباد یونیورسٹی (جو مشرقی علوم اور زبانوں کا کورس جاری کرنا چاہتی تھیں) کی مخالفت کی تھی۔ شبلی کے رسالے ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' (لکھنؤ اول ۱۸۸۸) میں بھی سرسید کے اسی نظریے کی حمایت کی گئی تھی۔ مولانا آزاد نے اپنے مضمون میں ''گذشتہ تعلیم'' کا متعلقہ اقتباس نقل کرکے شبلی کا یہ خط نقل کیا ہے اور بتایا ہے کہ علوم مشرقی کے مترجموں کی بابت شبلی کا اصل نظریہ سرسید سے مختلف تھا۔

عبدالقوی دسنوی (ف ۲۰۱۱ء) نے ''ماہنامہ لسان الصدق کلکتہ'' کے نام سے اس جریدہ کے جملہ شمارے یکجا کردیے تھے جنھیں مکتبہ جامعہ لمٹیڈ دہلی نے اسی نام سے پہلی بار ۲۰۰۸ میں اور دوسری مرتبہ ۲۰۱۱ء میں شائع کیا۔ دوسری اشاعت میرے پیش نظر ہے جس کے ص ۲۰۰-۲۰۱ پر یہ خط مضمون کے عین وسط میں دیکھا جاسکتا ہے۔

خط پر تاریخ تحریر ۲۲/مارچ ۱۹۰۳ء ہے۔ ابھی تک شبلی سے مولانا آزاد کی مراسلت کا زمانہ آغاز ۲۱/اکتوبر ۱۹۰۵ء تھا۔ (خط نمبر ۱: خطوط شبلی بہ نام آزاد، ص ۱۸) اس خط کے دستیاب ہوجانے کے بعد دونوں کے مابین خط کتابت کے آغاز کی تاریخ ۲۲/مارچ ۱۹۰۳ء ہوگئی ہے۔ خط حسب ذیل ہے:

www.shibliacademy.org

مکرمی! آپ کا دلچسپ والا نامہ پہنچا......ترجمہ کا میں مخالف نہیں ہوں۔''گذشتہ تعلیم'' میں سرسید نے مجھ سے وہ عبارت بہ جبر لکھوادی تھی، میں نے سخت انکار کیا تھا لیکن ان کا اصرار غالب رہا۔ میں تو ترجمے کو اصل خدمت سمجھتا ہوں بلکہ ان شاء اللہ اس کا ایک باضابطہ سررشتہ قائم کروں گا۔

شبلی

۲۲/مارچ ۱۹۰۳ء

(۹)

سطور آئندہ میں شبلی کا ایک غیر مطبوعہ خط پیش کیا جارہا ہے۔ یہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے ضمیمہ یونیورسٹی کلکشن اردو مخطوطات نمبر ۳۲۱ کے تحت محفوظ ہے۔ ۲۷/جولائی ۱۹۰۷ء کے مکتوبہ اس پوسٹ کارڈ کا فوٹو عکس جناب عطا خورشید (علی گڑھ) کی عنایت سے حاصل ہوا۔ یہ مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی (ف ۱۹۳۵ء) کے نام ہے، جس پر مکتوب الیہ کا پتا (جناب مرزا ہادی صاحب عزیز، نخاس جدید، لکھنؤ) لکھا ہے، خط حسب ذیل ہے:

تسلیم، ہاں میں مقطوع الرجل ہوگیا، خدا کا شکر ہے۔ زخم کی تکلیف ابھی تک ہے۔ موازنہ (۱۸) سے متبعین دبیرؔ تو ناراض ہوئے ہوں گے۔ معلوم نہیں اربابِ انیسؔ کا کیا خیال ہے؟

والسلام

شبلی

۲۷/جولائی ۱۹۰۷ء

مذکورہ بالا خط کی دریافت سے شبلی کے مکتوب الیہم میں ایک نئے نام کا اضافہ ہوگیا ہے۔

(۱۰)

درج ذیل خط مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (ف ۱۹۹۹) کے خاندانی رجسٹر سے برآمد ہوا ہے۔ رجسٹر پر مرقوم ہے:''رجسٹر خطوط مشاہیر ہندوستان بہ نام سید عبدالحئیؒ حسنی صاحب'' یہ رجسٹر صرف خطوط کے ذخیرے پر مشتمل ہے۔''حیات عبدالحئیؒ'' کی تالیف کے دوران مولانا علی میاں اسے اپنے ساتھ رائے بریلی سے لکھنؤ لے آئے تھے۔ تب سے آج تک یہ ندوۃ العلماء کی لائبریری میں موجود و محفوظ ہے۔

www.shibliacademy.org

اس رجسٹر میں شبلی کے تین خط تھے: دو خط ''حیات عبدالحیٔ'' میں شامل ہو گئے (ص ۱۶۷ تا ۱۷۹) پیش نظر خط کسی نا معلوم سبب کی بنا پر کتاب مذکور میں شامل ہونے سے رہ گیا۔ ''حیات عبدالحیٔ'' میں شامل دونوں خطوں کی اصل کاپی رجسٹر میں موجود ہونی چاہیے تھی، لیکن صرف ایک اصل خط موجود ہے۔ دوسرا خط یا تو اپنے مقام سے ہٹ گیا یا تلف ہو گیا۔

زیر نظر خط ۱۴/ جون ۱۹۱۰ء کا مکتوبہ ہے۔ یہ خط مولانا محمد ہارون صاحب، لائبریرین علامہ شبلی نعمانی لائبریری ندوۃ العلماء لکھنؤ کی عنایت سے حاصل ہوا۔ ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ خط حسب ذیل ہے:

مکرمی!

۱- دو تین ہفتے کے اندر جلسہ انتظامیہ کیجیے۔

۲- ایک تحریر بھیجتا ہوں یہ صرف ارکان موجودہ لکھنؤ اور مولوی خلیل الرحمٰن صاحب و مولوی حبیب الرحمٰن صاحب و مسیح الزماں صاحب کے پاس بھیجی جائیں۔ ارکان موجودہ لکھنؤ کے پاس ایک ہی نقل بھیجنا کافی ہوگا۔

۳- آپ کو جو ضروری امور پیش کرنے ہوں، قلم بند کر لیجیے۔ جلسہ میں آپ تاخیر نہ کیجیے۔ بہت سے کاموں کا ہرج ہوتا ہے اور اشاعت اسلام وغیرہ سب بیکار پڑے رہیں گے۔

شبلی

۱۴/ جون ۱۹۱۰ء

(۱۱)

زیر نظر خط مولانا سید عبدالحیٔ (ف ۱۹۲۳ء) ناظم ندوۃ العلماء کے نام ہے۔ ۷/ نومبر ۱۹۱۰ء کا مکتوبہ یہ خط ''حیات عبدالحیٔ'' مرتبہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (ندوۃ المصنّفین دہلی، طبع اول ۱۹۷۰ء، ص ۱۶۷ تا ۱۶۸) میں شامل ہے۔ حیات عبدالحیٔ میں بین السطور شبلی کے دو خط نظر آتے ہیں۔ ایک خط (مکتوبہ ۲۴/ اگست؟) مکتوبات شبلی میں جگہ پا گیا۔ (ص ۱۵۲) دوسرا یعنی پیش نظر خط اس میں غالباً سہواً شامل ہونے سے رہ گیا۔ یہ خط مولوی شمس تبریز خان کی مولفہ تاریخ ندوۃ العلماء (ج ۲، لکھنؤ، ۱۹۸۴ء، ص ۶۸) میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ خط اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں

www.shibliacademy.org

مولانا شبلی کی معتمدی کے خلاف ندوہ میں جو ماحول تیار ہو گیا تھا اسے مولانا نے اس خط کے ذریعے سے مخلصانہ طور پر حل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس خط پر مولانا سید عبدالحئی حسنی، مولانا خلیل الرحمٰن سہارنپوری (ف ۱۹۳۶) نائب ناظم، مولانا شاہ سلیمان پھلواروی (ف ۱۹۳۵) اور منشی احتشام علی کاکوروی (ف ۱۹۴۳) کی رائیں بھی درج ہیں، جنہیں ''حیات عبدالحئی'' میں خط کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔ خط حسب ذیل ہے:

جناب مولانا سید عبدالحئی صاحب

یہ امر اب مخفی نہیں رہا کہ ارکان ندوہ میں سخت ناچاقی ہے جو روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور جس کا برا اثر اب علانیہ پڑنے لگا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ کبھی آج تک یہ قصد نہیں کیا گیا کہ ناراض اصحاب آپس میں بیٹھ کر شکایتوں کا باہم اظہار کریں اور جس کی شکایت ہے وہ اپنا جواب پیش کرے۔ مجھ کو یقین ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو ضرور بہت سی شکایتیں رفع ہو گئی ہوتیں۔

یہ ظاہر ہے کہ ہم لوگوں میں کوئی خاندانی عداوت نہیں ہے، اس لیے ذاتی مخالفت کی کوئی وجہ نہیں۔ ہم لوگوں کو رو در رو تمام شکایتوں کو حل کر لینا چاہیے اور ایک طریقۂ کارروائی آئندہ کے لیے منضبط کر لینا چاہیے۔ اس بنا پر میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ دو تین دن کے اندر تمام معتمدین اور نائب ناظم صاحب کو ایک معین وقت میں تشریف لانے کی تکلیف دیں۔ میرا خیال ہے کہ صلح سے لڑائی کی بہ نسبت زیادہ کامیابی حاصل ہو سکتی ہے جو قوت آپس کی مخالفت میں کئی سال سے صرف ہو رہی ہے یہ ندوہ کی ترقی اور قوت میں صرف ہو گی۔ شبلی

۷ر نومبر ۱۹۱۰ (۴ر ذی قعدہ ۱۳۲۸ھ)

(۱۲)

پیش نظر تحریر نجی خط نہیں بلکہ ایک عمومی مراسلہ ہے جو ۱۷ر نومبر ۱۹۱۲ء کو عام اخبارات میں برائے اشاعت ارسال کیا گیا تھا۔ اس مراسلے میں ترکوں کی اعانت کے لیے اپیل کی گئی ہے۔ اکتوبر ۱۹۱۲ء میں یورپ کی شہ پا کر بلقان کی ریاستوں نے ٹرکی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

www.shibliacademy.org

اسی جنگ کے زمانہ میں عیدالاضحیٰ کے موقع پر مولانا شبلی نے خیال کیا کہ اگر ہندوستانی مسلمان اس سال قربانی کی رقم ٹرکی کے فنڈ میں جمع کر دیں تو یہ ایک اچھی اعانت ہوگی اور مسلمان زیر بار بھی نہ ہوں گے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک فتویٰ مرتب کیا اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی (ف ۱۹۲۶ء) کی تائید وحمایت کے بعد اسے مشتہر کر دیا۔ بعض علماء نے اس فتوے سے اختلاف بھی کیا۔ زیر نظر خط اسی فتوے کے متعلق شبہات کے ازالے کے لیے لکھا گیا۔ اس مراسلے کو ۱۷ر نومبر ۱۹۱۲ء ہی کا مکتوبہ سمجھنا چاہیے۔ مراسلے کی اشاعت کے حوالے دستیاب نہیں۔ متن حیات شبلی: ۵۹۹ میں موجود ہے جو یہ ہے:

جناب من، بعض صاحبوں کا خیال ہے کہ ترکوں کی ہمدردی میں اگر قربانی کے بجائے قیمت دی گئی تو اس سے احتمال ہوگا کہ قربانی خود غیر ضروری ہے، لیکن یہ صحیح نہیں۔ شریعت میں فرائض کے درجات میں بھی ترتیب ہے اور وقتی ضرورتوں کا خیال رکھا گیا ہے۔ غزوۂ خندق میں جہاد میں مصروف ہونے کی وجہ سے آنحضرت (ﷺ) کی نماز عصر قضا ہوئی تو کیا یہ حجت ہوسکتی ہے کہ نماز کا قضا کرنا جائز ہے؟

ترکوں کی اعانت اس وقت فرض عین ہے۔ اس لیے اس خاص موقع اور ضرورت کے وقت اگر یہ فرض مقدم رکھا گیا تو اس سے آئندہ کے لیے کیا حجت ہوسکتی ہے؟ قربانی شعائر اسلام ہے۔ مسلمان اس کو نہیں چھوڑ سکتے۔ نہ کوئی قوم ان کو اس پر مجبور کر سکتی ہے، نہ وہ اس کے مقابلہ میں دنیا کی کسی قوم کی پروا کر سکتے ہیں۔

امید کہ میرا خط اور صاحبان اخبار بھی اپنے پرچوں میں نقل کر دیں۔

(حیات شبلی: ۵۹۹)

(۱۳)

پیش نظر تحریر بھی شخصی مکتوب نہیں بلکہ ایک عام خط ہے، جو تحفظ اوقاف اسلامی کے سلسلے میں اخبارات کے مدیران کو بھیجا گیا۔ سردست اخبارات کی اشاعتوں کے حوالے ہمہ دست نہیں لیکن حیات شبلی: ۵۵۱ میں خط کا ضروری حصہ نقل کر دیا گیا ہے۔ مکمل خط مقالات شبلی (ج ۸، ص ۲۶) میں ''اوقاف اسلامی'' کے عنوان سے محفوظ ہے۔ اس پر تاریخ اشاعت ۲۶ر جنوری ۱۹۱۴ء

www.shibliacademy.org

مرقوم ہے۔لہٰذا اسے جنوری ہی کا مکتوبہ خیال کرنا چاہیے۔مکمل خط نقل کیا جاتا ہے:

آپ اس بات سے واقف ہیں کہ مسلمانوں کی مذہبی، تعلیمی اور تمدنی ضروریات روز بروز بڑھتی جاتی ہیں، جس کے لیے مصارف کثیر درکار ہوتے ہیں اور اس وجہ سے ہر روز ایک نیا چندہ کھولنا پڑتا ہے،لیکن اس غریب قوم کی یہ حالت نہیں کہ ان تمام چندوں کی متحمل ہوسکے، اس لیے اکثر کام ناتمام رہ جاتے ہیں اور قومی ضرورتوں کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔

اس کی سب سے بہتر اور آسان تدبیر یہ تھی کہ ملک میں کروروں روپے کے جو اسلامی اوقاف ہیں، ان کا ایسا معقول انتظام ہوتا کہ وہ بیجا مصارف میں نہ صرف ہوتے اور صحیح ضروریات کے کام میں آتے، اسی ضرورت سے مسلم لیگ اور دیگر اسلامی انجمنوں نے بارہا یہ رزولیوشن پاس کیا کہ گورنمنٹ ان اوقاف کی نگرانی پر متوجہ ہو،لیکن گورنمنٹ سے یہ جواب ملا کہ دو باتیں ثابت کرنی چاہئیں، ایک یہ کہ یہ خواہش تمام قوم کی طرف سے ہے، دوسرے یہ کہ وہ اوقاف صحیح مصرف میں نہیں صرف کیے جارہے ہیں۔اس کے بعد مسلم لیگ یا اور کسی انجمن نے کچھ کارروائی نہیں کی،حقیقت یہ ہے کہ یہ کہہ دینا نہایت آسان ہے کہ اوقاف کا انتظام کیا جائے لیکن یہ بتانا مشکل ہے کہ کون کرے اور کس طرح کیا جائے گورنمنٹ تو اس لیے دست اندازی نہیں کرسکتی کہ وقف عموماً ایک مذہبی چیز ہے اور گورنمنٹ کسی مذہبی چیز میں ہاتھ ڈالنے سے ہمیشہ محترز رہتی ہے اوراس کو محترز رہنا چاہیے،قوم میں کوئی شخص یا چند اشخاص متوجہ ہوں تو وہ کیا کرسکتے ہیں، متولیان اوقاف پر کوئی اختیار حاصل نہیں، عدالت میں اگر مقدمات دائر کیے جائیں تو اس طول عمل اور دوسری اور سب سے بڑھ کر مصارف کا کون متکفل ہوسکتا ہے۔

اس بنا پر میں چاہتا ہوں کہ ایک مختصر سی کمیٹی قائم ہو جو اس کی تدبیروں پر غور کرے، اور کوئی صحیح اور متعین اور قابل عمل طریقہ تجویز کرکے ایک اسکیم (خاکہ) بنائے جو قوم کے سامنے پیش کی جائے اور فیصلہ کے بعد اس پر عمل کیا جائے، اس بنا پر

www.shibliacademy.org

میں آپ سے خواہش کرتا ہوں کہ آپ اس کی ممبری قبول فرمائیں۔

چند سرسری باتیں میں بہ دفعات ذیل پیش کرتا ہوں:

۱- ایک موریل تیار کیا جائے جس میں انتظام اوقاف کی خواہش گورنمنٹ سے کی جائے اور اس موریل پر اس کثرت سے مسلمانوں کے ہر طبقہ سے دستخط کرائے جائیں کہ یہ موریل تمام قوم کی طرف سے سمجھا جائے۔

۲- گورنمنٹ سے جس قسم کی نگرانی کی خواہش کی جائے، اس طریقے کی ہو کہ مذہبی دست اندازی کا کسی طرح احتمال پیدا نہ ہونے پائے، مثلاً اس کا یہ طریقہ ہو کہ ایک کمیٹی قائم کی جائے جس کے ارکان تمام صوبوں سے نیا بتانہ طریقے پر انتخاب کیے جائیں اور انتخاب کی تمامتر کارروائی صرف اسلامی جماعت کی طرف سے انجام پائے، پھر گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ اس کمیٹی کو باقاعدہ تسلیم کرے اور اس کو باضابطہ اختیارات تحقیقات وغیرہ کے دیے جائیں، پھر اس کی مرتب کردہ رپورٹ ملک میں شائع کی جائے اور گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ اس کے مطابق عمل کیا جائے۔

۳- تیموری سلطنت میں تمام اوقاف کے انتظام کا ایک خاص عہدہ تھا جس کو صدر الصدور کہتے تھے، کیا گورنمنٹ سے یہ درخواست نہیں کی جاسکتی کہ یہ عہدہ دوبارہ پھر قائم کیا جائے، لیکن صدر الصدور کا تقرر اسی نیابتانہ اصول پر اسلامی جماعت کی طرف سے ہوتا کہ گورنمنٹ کے متعلق کسی قسم کی دست اندازی کا احتمال نہ پیدا ہو سکے، ان کے علاوہ اور جو تجویزیں آپ کے خیال میں آئیں آپ تجویز فرمائیں۔

(شبلی)

(۱۴)

سطور ذیل میں جو خط پیش کیا جا رہا ہے اس کو سید صاحب نے حیات شبلی میں ''مصالحت کے لیے مولانا کی آخری کوشش'' عنوان کے تحت نقل کیا ہے (ص:۶۶۳)۔ سید صاحب نے اس پر جو تمہیدی نوٹ دیا ہے اس کو من وعن نقل کر دینا مناسب ہوگا۔ لیکن سید صاحب نے اپنے نوٹ

www.shibliacademy.org

میں اسے خط نہیں بلکہ تحریر لکھا ہے جب کہ یہ ایک طویل خط ہے۔جس میں تخاطب کے لیے القاب وتسلیم کے ساتھ تاریخ تحریر کا بھی اندراج کیا گیا ہے۔مکتوب الیہ غالباً نائب ناظم ندوہ معلوم ہوتے ہیں۔سید صاحب لکھتے ہیں:

۱۴؍جون ۱۹۱۴ءکو ندوہ کا جلسہ انتظامیہ ہونا طے ہوا اور اس کا ایجنڈا رکن کی حیثیت سے مولانا کی خدمت میں بھی بھیجا گیا،اس میں غالباً دہلی کی اصلاحی کانفرنس کی مخالفت کی طرف بھی کوئی اشارہ تھا،اس پر مولانا نے ۲۵؍مئی ۱۹۱۴ءکو اس کے جواب میں بمبئی سے ایک مفصل تحریر لکھ کر بھیجی اور مصالحت کی تجویز پیش کی ،خوش قسمتی سے اتفاقاً مجھے یہ تحریر دفتر ندوہ کے پرانے کاغذات میں اس وقت مل گئی ،گو نیچے سے اس کی ایک دو سطریں پھٹ کر الگ ہوگئی ہیں،تاہم مطلب کی بات اس میں سب کچھ موجود ہے۔خط حسب ذیل ہے:

جناب من !السلام علیکم ۔جلسۂ انتظامیہ مورخہ ۱۴؍جون ۱۹۱۴ءکا اجنڈا پہنچا،اس زمانہ میں غالباً میں ان اطراف میں نہ رہوں گا ،میری صحت اب اس کی مقتضی نہیں کہ میں سیرت نبویؐ کے سوا زیادہ تر اور کسی طرف متوجہ ہوسکوں ،بعض ضروری امور گذارش ہیں:

۱-جلسۂ دہلی کے متعلق میری رائے ہے کہ اس کا منشا ارکان ندوہ کی توہین یا شکست نہ تھی ، بلکہ صرف یہ تھی کہ چونکہ تین چار دفعہ خود ندوہ کے مختلف اور متعدد ارکان کی طرف سے اصلاح کی کوشش ہوچکی،مولوی عبدالباری صاحب (۱۹) اور میرزا ظفر اللہ خاں صاحب (۲۰) کے خطوط مطبوعہ اور یادداشت مطبوعہ سب کے پیش نظر ہیں،باوجود اس کے کوئی توجہ......اس لیے بعض لوگوں نے یہ مناسب خیال کیا کہ یہ مسئلہ پوری قوم کے سامنے لایا جائے ،لیکن بعض لوگوں نے غلط فہمی سے یہ سمجھا کہ (اس کا مقصد) کسی شخص کو معتمد یا ناظم بنانا ہے،یا موجودہ کارکن صاحب کو برطرف کرانا ہے،اس لیے نہایت فریق بندانہ جوش پیدا ہوا لیکن جلسہ میں ایک حرف ان امور کے متعلق نہیں کہا گیا،صرف چند اصحاب منتخب ہوئے کہ دستور العمل کے اصلی نقائص اور اس کی عدم پابندی کے متعلق اصلاحی اسکیم مرتب کریں،یہ اسکیم غالباً

www.shibliacademy.org

خود ارکان ندوہ کے سامنے پیش ہوگی ، اس بنا پر جلسۂ دہلی کی کارروائی کے ساتھ مخالفت کی بظاہر وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

سچ تو یہ ہے کہ ندوہ اب بالکل نئے سرے سے باقاعدہ ہونے کا محتاج ہے۔

۲-مولوی عبداللہ صاحب (۲۱) کی رپورٹ متعلق اسٹرائیک دیکھ کر سخت حیرت ہوئی،اس میں بعض باتیں تو ایسی ہیں جن کی شہادت صرف خدائے عالم الغیب پر محول ہے،مولانا عبداللہ صاحب نے ایک نہیں متعدد دفعہ مجھ سے صحیح بخاری کے سبق روکنے پر اپنی مجبوری بیان کی اور کہا کہ میں کیا کروں؟ ناظم صاحب سے متعدد دفعہ نماز کے اوقات میں مسجد میں ملاقات ہوتی ہے اور وہ ہر دفعہ مجھ سے کہتے ہیں کہ بخاری پڑھنے والے لڑکوں کو خارج کر دیا یا نہیں،لیکن اب تک میں نے نہیں خارج کیا، میں نے کہا کہ آپ ان سے حکم لکھوا لیجیے،اس پر فرمایا کہ وہ باہر چلے گئے ہیں،آئیں گے تو میں لکھواؤں گا ، پھر یہ بھی کہا کہ ان کے واپس آنے تک لڑکے اگر بخاری پڑھیں تو مجھے اعتراض نہ ہوگا۔

اب اگر مولانا موصوف ان واقعات سے منکر ہوں تو خدائے عالم الغیب کے سوا اور کون اس کا فیصلہ کرنے والا ہے؟

باقی قانونی حیثیت سے تو اس کی یہ کیفیت ہے کہ ندوہ جب سے قائم ہے،لڑکے باہر اساتذہ وغیرہ سے پڑھتے تھے،خود اس زمانہ میں جب یہ واقعہ پیش آیا، بہت سے لڑکے اور اسباق ......مثلاً خلیل صاحب (۲۲) (شیخ محمد عرب صاحب کے فرزند) سے......کیں، بخاری شریف کے سبق کے متعلق چونکہ مولانا نے براہ راست مجھ کو مخاطب کیا ہے،اس لیے یہ چند سطریں لکھنی پڑیں۔

۳-اسی رپورٹ میں میرے دارالاقامہ کے تعلق کا بھی ذکر ہے،اس کے متعلق کوئی شکایت ہے تو میں اس کا ذمہ دار ہوں،لیکن دارالاقامہ میری نگرانی میں کبھی براہ راست نہیں رہا، جو مہتمم ہوتا تھا،اسی سے اس کا تعلق رہتا تھا۔

یہ امور ضابطہ کی حیثیت سے لکھے گئے۔

www.shibliacademy.org

خاص طور پر میری یہ گذارش ہے کہ بجائے اس کے کہ باہمی مخالفت میں دوقوتیں ہمیشہ ٹکراتی رہیں، اسلامی (مصالح) کا یہ اقتضا ہے کہ دوتین شخصوں کو حکم مان کر تمام معاملات ان کے ہاتھ میں دے دیجیے، جو فیصلہ وہ لوگ کریں سب منظور کرلیں پھر وہ جلسہ انتظامیہ میں با قاعدہ منظور ہو جائے، ورنہ تمام ہندوستان میں ہم سب کی سخت تضحیک ہو چکی اور ہوتی رہے گی، اس وقت اس بحث سے بھی قطع نظر کیجیے کہ جھگڑا کہاں سے شروع ہوا، کیونکہ ہر فریق یہی سمجھتا ہے کہ دوسرا فریق برسر ناحق ہے۔

ایسے اشخاص خود ندوہ میں موجود ہیں جن کی دیانت پر فریقین کو اعتماد ہے۔

ممبروں کی خالی شدہ جگہوں کے لیے اشخاص ذیل موزوں ہیں:

ڈاکٹر ناظر الدین حسن (بیرسٹر)

مسٹر ممتاز حسین (بیرسٹر)

مولوی آزاد صاحب سبحانی، کانپور

مولوی سید سلیمان، پونہ۔ دکن

شبلی ۲۵ رمئی ۱۹۱۴ء

حیات شبلی: ۶۶۳ تا ۶۶۶ (بمبئی)

(۱۵)

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (ف ۱۹۵۱) شبلی کے خاص دوستوں میں تھے۔ زیر نظر خط انہیں کو لکھا گیا تھا۔ مولانا شروانی نے شبلی کی وفات (۱۸ رنومبر ۱۹۱۴ء) کے بعد لکھے جانے والے اپنے مضمون بہ عنوان ''مرحوم علامہ شبلی نعمانیؒ (مطبوعہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ، ۲۰ رجنوری ۱۹۱۵) میں اس خط کو نقل کیا ہے۔ مولانا شروانی کا یہ مضمون بعد میں متعدد جگہ نقل ہوا:

کسوف الشمسین	مرتبہ نظامی بدایونی	مطبوعہ بدایوں	۱۹۱۵ (خط۔ص ۱۸ تا ۲۰)
مقالات شروانی	مقتدیٰ خاں شروانی	علی گڑھ	۱۹۴۶ (خط۔ص ۱۷۵ تا ۱۷۷)
شبلی معاصرین کی نظر میں	ظفر احمد صدیقی	لکھنؤ	۲۰۰۵ (خط۔ص ۴۲ تا ۴۴)

حیات شبلی میں بھی اس خط کو حسب ذیل تمہیدی عبارت کے ساتھ شامل کیا گیا ہے:

www.shibliacademy.org

ایک مکتوب جو ۱۶/ستمبر ۱۹۱۴ء کو مولانا شروانی کو لکھا تھا، پڑھنے کے قابل ہے۔ (یہ مکتوب خدا جانے کس طرح مکاتیب شبلی میں درج ہونے سے رہ گیا ہے۔ مولانا شروانی نے مولانا کی وفات پر جو مضمون علی گڑھ گزٹ میں لکھا تھا اس میں اس کو پورا نقل کر دیا ہے۔ (حیات شبلی، ص ۶۷۴)

خط القاب و آداب اور دستخط شبلی سے عاری ہے۔ تاریخ تحریر کی نشاندہی خود مکتوب الیہ نے کر دی ہے، یعنی ۱۶/ستمبر ۱۹۱۴۔ یہ خط شبلی کے بھائی محمد اسحاق فوت ۵/اگست ۱۹۱۴ کی وفات کے تذکرے سے شروع ہو کر دار المصنّفین کی تشکیل و تکمیل کے تذکرے پر ختم ہوا ہے۔ خط حسب ذیل ہے:

عزیز مرحوم کے واقعہ نے مجھ پر اس قدر سخت اثر کیا کہ تمام عمر کبھی نہیں ہوا تھا، حالانکہ مہدی مرحوم (۲۳) کا واقعہ اسی درجہ کا گزر چکا تھا۔ بہر حال میں اعظم گڑھ چلا آیا۔ محمڈن شبلی اسکول جو ۳۰ برس ہوئے میں نے قائم کیا تھا، ہائی اسکول سے مڈل اسکول تک آ گیا۔ عزیز مرحوم اس کو انٹرنس تک پہنچانا اور تمام برادری کے قصبات میں اسکول اور مکاتب قائم کرنا چاہتے تھے۔ دو مہینے کا دورہ رکھا تھا اور پانسو روپے مصارف دورہ کے لیے الگ کر دیے تھے۔ اشتہارات اور رسید یہاں سب چھپ گئی تھیں۔

مجھ کو اس کام کے علاوہ دار المصنّفین اور دار التکمیل کی فکر ہے، ندوہ میں کام کرنا ممکن نہ تھا۔ ۶ برس تک کشاکش میں گزرے، جو ہو گیا وہ تعجب انگیز ہے۔ بہر حال صورت موجود یہ ہے کہ اسکول کے پاس ہی میرا اور میرے خاندان کا باغ ہے جس کا کل رقبہ گیارہ بیگھہ پختہ ہے۔ اس کو وقف کر رہا ہوں اور شرکاء بھی راضی ہو گئے ہیں۔ مسودہ لکھا چکا رجسٹری کرانا ہے، دو بنگلے پہلے سے موجود ہیں، کتب خانہ (دوبارہ) بہ قدر معتد بہ مہیا ہو گیا ہے اور بڑھتا جاتا ہے، دفتر سیرت کا کل سرمایہ اس طرف منتقل ہو جائے گا، بلکہ صرف کتب خانہ کے لیے کافی ہوگا۔ دار المصنّفین کی عمارت کے لیے کچھ اضافہ ہوگا۔ چاہتا ہوں کہ اس کے چار کمرے ۴ عناصر اردو کے نام سے تعمیر ہوں، اور عمارت پر تمام موجودہ معززین ارباب قلم کے نام کندہ ہوں۔

www.shibliacademy.org

چندہ مشروط نہیں، ہر صاحب قلم چندہ دے بھی نہیں سکتا۔ اس کے ساتھ دارالتکمیل کھول رہا ہوں، یعنی ادب اور تفسیر کی تکمیل کے طلبہ کو تیار کروں۔ دو مددگار رہوں گے۔ انتہائی صفوں کو خود پڑھاؤں گا۔ سر دست طلبائے تصنیف کی تعلیم کا یہ طریقہ ہوگا کہ پہلے چھوٹے چھوٹے عنوانات اور ان کے متعلق ذخیرۂ معلومات اور کتابیں ان کو دی جائیں گی۔ جو کچھ لکھیں گے اس کا عیب و ہنر بتایا جائے گا، پھر پمفلٹ، رسالے اور پھر تصانیف کرائی جائیں گی، وظائف تصنیفی مقرر ہوں گے جو کم از کم ۲۰ - ۲۵ روپے ماہوار ہوں گے۔ دستاویز کی رجسٹری ہو جائے تو باغ کی کاٹ چھانٹ اور عمارت کی داغ بیل ڈالی جائے۔ ایک کمرہ مرحوم کے نام سے بھی تعمیر کرانا مقصود ہے۔ یہ آخر عمر کا خواب ہے اور امید ہے کہ ع ''چوں ہنر ہائے دگر موجب حرماں نہ شود''

نواب عماد الملک (۲۴) نے دارالمصنّفین کی صدر انجمنی قبول کر لی ہے۔

تکمیل دستاویز کے بعد انجمن کے قواعد اور ممبروں اور عہدہ داروں کے نام شائع ہوں گے۔ والتسلیم''۔

حواشی

(۱) یہ مقالہ پہلی بار معارف اعظم گڑھ (فروری مارچ ۲۰۰۶ء) میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں راقم الحروف کے مجموعہ مضامین، مکتوباتی ادب (دہلی ۲۰۱۰ء) اور شبلی کی ادبی وفکری جہات (اعظم گڑھ ۲۰۱۳) میں شامل ہوا۔ (۲) یہ مقالہ موصوف کے مجموعہ مضامین عرفان شبلی (دہلی ۲۰۱۴) میں شامل ہے۔ (۳) ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کی مرتبہ یہ کتاب اعظم گڑھ سے ۲۰۱۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے مقدمہ میں انہوں نے شبلی کے ۹ خطوط کی نشاندہی کی ہے۔ اسے اتفاق ہی کہیے کہ ''کلیات مکاتیب شبلی'' کی ترتیب و تدوین کے دوران یہ سارے خطوط میرے مطالعے کا بھی حصہ بنے ہیں۔ اب تک میری معلومات میں شبلی کے پندرہ خطوط ایسے ہیں جو ان کے مکاتیب کے مجموعوں میں شامل نہیں ہیں۔ (۴) مثلاً: سیرۃ النبی کی تالیف پر گشتی چھٹی۔ مکتوبہ جون ۱۹۱۱، بنام پروفیسر عبدالقادر خط نمبر ۸، ایم مہدی حسن: ۳۷ مشمولہ مکاتیب شبلی ج ۲، بنام حبیب الرحمٰن خاں شروانی ۱۰۲، مولوی ریاض حسن خاں ۲۰، مشمولہ مکاتیب اجلاس ندوۃ العلماء سے متعلق گشتی چھٹی۔ مکتوبہ ۱۰/

www.shibliacademy.org

جنوری ۱۹۱۱ء۔ مشمولہ مکتوبات شبلی ص ۱۰۸، ۱۲۵، بنام قیام الدین بخت جونپوری خط ۳ و حبیب الرحمٰن خاں شروانی ۱۴:۔(۵) مثلاً: ایڈیٹر صاحب جرائد اسلامیہ، ۲ خط مکاتیب ج ا، ایڈیٹر الناظر لکھنؤ، ایڈیٹر زمیندار لاہور مشمولہ مکاتیب ج ا۔ ایڈیٹر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ، ایڈیٹر اودھ اخبار لکھنؤ مشمولہ مکتوبات شبلی۔ (۶) طبع جدید سے مراد کمپیوٹر کی کتابت اور آفسیٹ کی طباعت پر شائع شدہ نسخہ مع اشاریہ اعلام و کتب۔ (۷) تعداد خطوط کے بارے میں یہ عرض کرنا ہے کہ مکاتیب شبلی میں خطوط پر جو نمبر شمار دیے گئے ہیں، اکثر لوگوں نے انہیں نمبر شمار سے تعداد خطوط کا تعین کر لیا ہے۔ انہیں چیک کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مثلاً ج ا میں محسن الملک کے نام خطوط کا آخری نمبر شمار ۳ ہے جبکہ خط صرف ۲ ہیں۔ اسی طرح جلد ۲ میں مولوی حمید الدین کے نام خطوط کا نمبر شمار ۷۷ ہے جبکہ خط ۷۶ ہیں۔ اسی طرح دونوں جلدوں میں ایک گشتی خط جس کی عبارت و مضمون ایک ہے کئی لوگوں کے نام ہے ظاہر ہے اسے ایک ہی محسوب کیا جائے گا۔ اسی انداز پر دوسرے مجموعہ ہائے خطوط کی تعداد کو قیاس کر لیجیے۔ راقم الحروف نے اپنے مضمون مکاتیب شبلی تدوین جدید کی ضرورت (مشمولہ مکتوباتی ادب) میں اس پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

مکتوبات شبلی (ص ۱۰ تا ۱۲) آثار شبلی (ص ۵۸۸ تا ۶۴۴) اور علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط (ص ۱۲، ۲۱) میں خطوط کی تعداد کا صحیح اندراج نہیں۔ محض شماریاتی تعداد پر حصر کر لیا گیا اور اسے درست مانتے ہوئے اسی کا اندراج کر دیا گیا۔

راقم الحروف نے اپنی کتاب شبلی کی ادبی و فکری جہات (اعظم گڑھ ۲۰۱۳) میں شبلی کے خطوط عنوان کے تحت شبلی کے جملہ مکتوب الیہ، مجموعہ ہائے مکاتیب اور مطبوع دستیاب خطوط کی صحیح تعداد اور ان کے اصل آخذ کی ایک فہرست دی ہے۔ اس فہرست میں تین وہ مکتوب الیہ بھی شامل ہیں جن کے نام کے خطوط زیر نظر مضمون میں نقل کیے جا رہے ہیں۔ دراصل یہ خطوط "مکتوبات شبلی" میں جگہ نہیں پا سکتے تھے۔ مذکورہ فہرست میں جملہ دستیاب خطوط کی تعداد ۱۰۹۳ دی گئی ہے جو اب ۱۱۰۵ ہو گئی ہے۔ گویا اس فہرست میں ۱۲ نئے خطوط کا اضافہ ہوا۔

(۸) حاشیہ نمبر ۴ میں اجلاس ندوۃ العلماء سے متعلق گشتی چٹھی کا تذکرہ ہے۔ یہ دو افراد کے نام ہے۔ اسے ایک شمار کیا جانا چاہیے تھا۔ یہ چٹھی مکتوبات شبلی میں شامل ہے۔ (۹) یہاں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ جب مکاتیب شبلی کے مرتب، شبلی کے نو نئے خطوط سے واقف ہیں اور ان کو حیات شبلی (بار اول ۱۹۴۳) میں نقل بھی کرتے ہیں تو یہ مکاتیب شبلی کے ان ایڈیشنوں میں شامل کیوں نہیں کیے جا سکے جو حیات شبلی کی اشاعت کے بعد طبع ہوئے؟

www.shibliacademy.org

میری مراد جلد اول کے طبع سوم اور چہارم سے ہے۔اس سلسلے میں میرا خیال ہے کہ مکاتیب شبلی، طبع دوم کے لیے تیار کی گئیں جستہ کی پلیٹوں کو محفوظ کرلیا گیا تھا اور بعد کے ایڈیشن انہیں پلیٹوں پر طبع ہوتے رہے۔ بایں سبب کسی اضافے، تصحیح یا ترمیم کی صورت پیدا نہیں ہوسکی۔(۱۰) مہدی حسن کے خطوط بھی دلچسپ ہیں اور خطوط نگاری کے جملہ تقاضے پورے کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ خطوط نگاری کی تاریخ میں تذکرہ وتعارف کا انتظار کررہے ہیں۔افسوس ۶۲ خطوط میں سے صرف ۷ خط مکمل صورت میں دستیاب ہیں۔ باقی ۲۴ خطوط کے اقتباسات دو مضمون نگاروں نے اپنے مضامین میں کوٹ کیے ہیں۔انہیں کے مطالعے پر حصر کرنا پڑتا ہے، ملاحظہ کریں: محمد مہدی کے مکاتیب لندن، از ڈاکٹر ابن فرید مطبوعہ ماہنامہ آج کل دہلی، جون ۱۹۶۳ء۔مہدی حسن کے مکاتیب لندن، از ڈاکٹر سید عبدالباری مشمولہ ادب اور وابستگی ٹانڈہ ۱۹۸۵۔(۱۱) مولانا شبلی کے سب سے چھوٹے بھائی محمد جنید نعمانی (ف ۱۹۳۳ء)۔(۱۲) سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے:

المامون اہل علم کی نگاہوں میں قابل اعتبار ٹھہری۔اس پر اخباروں میں بہت سے ریویو نکلے۔ان میں سے قابل ذکر ریویو......مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (کا تھا) مولانا نے صرف اسی ریویو کا جواب ۲۱/ فروری ۱۸۸۹ء کے آزاد لکھنؤ میں اس کے ایڈیٹر کے پے در پے اصرار پر دیا تھا۔(حیات شبلی ص ۱۷۳)

سید صاحب نے آزاد میں اشاعت کی تاریخ ۲۱ رفروری لکھی ہے جبکہ مقالات شبلی میں ۲۲ رفروری ہے۔ان میں سے کون سی تاریخ درست ہے سر دست طے کرنا مشکل ہے۔

(۱۳) رشید سے مراد ہارون الرشید (ف ۲۴/مارچ ۸۰۹ء)۔(۱۴) مامون سے مراد مامون الرشید (ف ۳۱/ جولائی ۸۳۳ء)۔(۱۵) فتاوی ارشادیہ کا قدیم ایڈیشن نایاب ہے۔راقم الحروف کے پاس خط سے متعلق اوراق کی عکسی کاپی محفوظ ہے۔اس خط کا جواب علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط (ص ۳۶ تا ۳۸) میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔(۱۶) بالجواب الخ۔حیات شبلی میں ساقط ہوگیا۔(۱۷) قوسین میں (مجھے) اور (سے) فتاوائے ارشادیہ میں نہیں۔(۱۸) موازنہ انیس و دبیر پہلی مرتبہ مطبع مفید عام آگرہ سے ۱۹۰۷ء میں چھپ کر شائع ہوا۔(۱۹) مولانا عبدالباری فرنگی محلی (ف ۱۹۲۶ء)۔(۲۰) مرزا ظفر اللہ خاں، ڈسٹرکٹ جج سیالکوٹ، پنجاب۔(۲۱) مفتی عبداللہ ٹونکی مدرس اعلیٰ دارالعلوم ندوہ (ف ۱۹۳۰ء)۔(۲۲) مولانا خلیل الرحمٰن سہارنپوری (ف ۱۹۳۶ء)۔(۲۳) مولانا شبلی کے منجھلے بھائی مسٹر مہدی بیرسٹر (ف ۱۸۹۷ء)۔(۲۴) عماد الملک سید حسین بلگرامی (۱۸۴۲-۱۹۲۶) ناظم تعلیمات ریاست حیدرآباد دکن۔

www.shibliacademy.org

علامہ شبلی اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی
کتاب خانہ حبیب گنج کی روشنی میں

ڈاکٹر عطا خورشید

علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷۔۱۹۱۴) اور نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خاں شروانی (۱۸۶۶۔۱۹۵۰) کی عمروں میں تقریباً ۹ سال کا تفاوت تھا لیکن علم دوستی اور فکری و ذہنی ہم آہنگی کے سبب دونوں ایک جان دو قالب کے مانند تھے۔ دونوں کے درمیان جو چیز قدرِ مشترک تھی، وہ تھی کتابوں سے شغف اور ان کی جمع آوری۔ کوئی نادر نسخہ جب شبلی کو کہیں دستیاب ہوتا تھا تو اس کی اطلاع وہ نواب صاحب کو دیتے تھے اور جب کوئی علمی دستاویز نواب صاحب کے ہاتھ لگتی تھی تو فوری اس کی خبر علامہ کو دیتے تھے۔ جس کے جواب میں مولانا شبلی بھی ان کی علمی نظر کی تعریف کیا کرتے تھے۔ یہ آپسی تعلقات اس قدر گہرے تھے کہ دونوں کے درمیان جو مراسلت ہوتی تھی ان کی تعداد مولانا کے احباب میں سب سے زیادہ نواب صدر یار جنگ کو لکھے خطوط سے ملتی ہے۔ اتنی بڑی تعداد میں کسی دیگر کے نام خطوط دستیاب نہیں۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں ''آثار شبلی'' مولفہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی)۔ مولانا شبلی ایک خط میں نواب صدر یار جنگ کو لکھتے ہیں: میں آپ کو دنیا میں اپنا سب سے سچا اور مخلص اور بے ریا دوست سمجھتا ہوں۔ میرے دل میں اگر آپ کی طرف سے کھٹک پیدا ہوئی تو میری زندگی بدمزہ ہو جائے گی۔ (مورخہ ندارد، مطبوعہ نقوش، لاہور مکاتیب نمبر، ص ۹۷۔۱۹۶)۔

نواب صدر یار جنگ کو قلمی کتابوں کی فراہمی اور ان کی حفاظت سے بے حد شغف تھا۔

مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

www.shibliacademy.org

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مقاصد میں نادر قلمی کتابوں کی تلاش اور ان کی حفاظت بھی تھی ، لیکن اس پر عمل نہیں ہوسکا۔ کانفرنس کی ذمہ داری جب مولانا شروانی کو دی گئی تو پھر انھوں نے اس طرف توجہ دی اور اپنی اسی دلچسپی اور شوق کے سبب ۱۲؍ مارچ ۱۹۱۹ء کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے شمارے میں ایک طویل مضمون نما اپیل بعنوان ''علمی خزانوں کی تباہی: قدیم قلمی کتابوں اور فرامین کی حفاظت کے لیے اپیل'' بھی شائع کی۔

نواب صدر یار جنگ اور علامہ شبلی کے تعلقات کی ابتدا ۱۸۸۷ء سے ہوتی ہے جب نواب صاحب نے علامہ کی تصنیف ''المامون'' پر تبصرہ لکھا جو اخبار آزاد (لکھنؤ) کے ایک شمارے میں شائع ہوا۔ اگر چہ وہ تبصرہ اختلاف کی بنیاد بن سکتا تھا اس لیے کہ اس میں نہ صرف تعریفیں تھیں بلکہ تنقید بھی تھی اور بڑے لوگوں کا یہ شیوہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اوپر کی گئی تنقید کو بھی بسر وچشم قبول کرتے ہیں۔ علامہ نے اس تبصرے کو پڑھنے کے بعد جس اعلی ظرفی کا ثبوت دیا وہ ان کی اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے جو علامہ نے شوق قدوائی، مدیر اخبار آزاد کے اصرار پر لکھا تھا، جو ''آزاد کے ۲۲ رفروری ۱۸۸۹ء کے شمارے'' میں شائع بھی ہوا تھا۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے ''المامون'' پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ اعتراض کیا کہ دولت عباسیہ میں مامون کے بجائے ہارون انتخاب کے لائق تھا۔ اس تبصرے میں ہارون و مامون کا آپسی موازنہ بھی پیش کیا گیا تھا اور مامون کی کمزوریاں شمار کر کے ہارون کی برتری ثابت کی گئی تھی۔ مولانا نے اس کا مدلل اور مسکت جواب دیا۔ اس جوابی مراسلے میں پوری شد و مد کے ساتھ مولانا نے مامون کے انتخاب پر اپنے دلائل پیش کیے اور ہارون پر مامون کی برتری ثابت کی۔ یہ مکمل تحریر مقالات شبلی جلد ہشتم میں موجود ہے۔ ان سارے دلائل کے باوجود مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اپنے قائم کردہ نظریے پر ثابت قدم رہے اور آخر تک ہارون کو مامون سے بہتر سمجھتے رہے۔ چنانچہ ''المامون'' پر تبصرہ لکھنے کے تقریباً ۲۷ سال بعد جب ''شعر العجم'' پر تبصرہ لکھا تو مولف شعر العجم کے شیخ علی حزیں کے کلام کو شامل نہ کرنے پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا کہ ''حزیں کو سلسلہ شعراء سے خارج کرنا ایسے ہی انتخاب کی غلطی ہوگی جیسے خلافت عباسیہ کا ہیرو بجائے ہارون کے مامون کو قرار دینے میں ہوئی''۔ (شعر العجم از حبیب الرحمٰن خاں شروانی، الندوہ، لکھنؤ، مارچ ۱۹۱۰ء، ص ۱۶)۔

www.shibliacademy.org

نواب صدر یار جنگ اپنے کتاب خانے کی جمع آوری کے لیے بھی علامہ کے مرہون منت تھے۔ چنانچہ اپنے ایک مضمون ''حبیب گنج کا کتاب خانہ کس طرح جمع ہوا'' (معارف، اکتوبر ۱۹۳۱ء) میں لکھتے ہیں:

''......اسی زمانے میں (یعنی ۱۸۸۸ء میں) علامہ شبلی مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ ان کے فیض صحبت سے وسعت نظر پیدا ہوئی۔ پٹنہ، رام پور وغیرہ کے کتاب خانوں کے حالات سنے......جو قلمی چیزیں خریدی جاتیں علامہ (شبلی) مرحوم کو دکھائی جاتیں۔ جرح کرتے اور کوشش فرماتے کہ نگاہ بلند ہو۔ انھیں کے ذریعہ سے لکھنؤ کے قلمی کتاب فروشوں سے سابقہ ہوا، جن کو مولانا (شبلی) ''غارت گر'' کہتے تھے۔ وہ کتاب ایسی دکھاتے تھے کہ نہ لینا ممکن نہ ہوتا۔ قیمت ایسی طلب کرتے کہ دیوالیہ کردیتے۔ اب بھی ان کی قیمت دیکھتا ہوں تو گراں باری محسوس ہوتی ہے۔ لکھنؤ کی مدد سے قلمی کتابوں کا سرمایہ بڑھتا رہا''۔

جب بھی کوئی نادر قلمی نسخہ مولانا شبلی کے ہاتھ لگتا، یا وہ کسی کتاب خانے کا دورہ کرتے تو اس کا ذکر مولانا شروانی سے ضرور کرتے اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ ''قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری''۔ مثلاً ۶ رمئی ۱۹۰۷ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''کلیات جامی شاہجہاں کی مہر کا عجیب وغریب نسخہ ہاتھ آیا ہے۔ ابھی قیمت وغیرہ طے نہیں ہوئی ہے۔

اعجاز خسروی کا ایک عجیب وغریب نسخہ ہاتھ آیا، امیر (خسرو) کی وفات کے دس برس کے بعد کا لکھا ہوا ہے۔ نہایت صحیح اور سرتاپا محشّٰی ہے اور کمال یہ کیا ہے کہ لفظی رعایت میں ایک لفظ کے کئی ٹکڑے میں بھی کوئی رعایت ہے تو اس قدر ٹکڑا سرخ لکھا ہے۔ مثلاً باغ کی رعایت میں بود کا لفظ آ گیا تو بود کو سرخ لکھا ہے۔ تمام کتاب میں یہ التزام ہے۔ اس قدر دیدہ ریزی شاید مصنف کی ہو۔

(خط مورخہ ۱۵ رنومبر ۱۹۱۰ء)

مولانا نے ایک حمائل خریدی تو اس کا ذکر ۶ رجولائی ۱۹۱۴ء کے خط میں یوں کرتے ہیں:

www.shibliacademy.org

”آج وہ حمائل لے لی۔ دوسو پچاس نذرانہ کے دیے۔ کل ۴۲ برس کا
ہے تاہم ایک چیز ہے ایران کا خاتم الخطاطین احمد تبریزی تھا۔ آغا خاں اول کے
بھائی نے اس کو ایران سے بلوا کر لکھوایا تھا۔ اول سے آخر تک مطلّا ہے یعنی ہر
سطر پر طلائی ٹکڑے ہیں اور تقطیع نہایت موزوں ہے“۔

دس دن کے بعد ۱۶/ جولائی کو اسی حمائل کے تعلق سے لکھتے ہیں

”ان شاء اللہ آپ کی زیارت ہوگی تو مصحف پاک کی زیارت کراؤں گا“۔

مولانا کے پاس جب قلمی نسخے فروخت کے لیے آتے تھے تو اس کی اطلاع وہ فوری مولانا شروانی کو ضرور دیتے تھے۔ ان میں اہم نسخے وہ اپنے کتب خانے کے لیے خرید لیا کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۷/ جولائی ۱۹۰۷ء کو ایک خط میں اسی طرح کی نادر کتابوں کی اطلاع دیتے ہیں:

”جناب من! چند نایاب کتابیں فروخت کو آئی ہیں۔ مختصراً کیفیت درج
ہے پسند ہو تو تحریر فرمایئے ورنہ وہ کہیں اور بندوبست کریں۔

مثنوی گوی و چوگان۔ خط ولایت عمدہ، تمام کاغذ افشاں طلا، نہایت
پرلطف۔(۱)

مناجات عبداللہ انصاری۔ خط جلی حسب نمونہ کتاب سابق۔

کلیات جامی۔ نہایت کثرت سے سلاطین اور امراء کی مہریں ہیں۔
شاہ جہاں کے کتب خانے کا نسخہ ہے۔ خوش خط اور مکمل یعنی تمام قصائد اور
غزلیات ہیں۔ نوشتہ قریب العہد مصنف، خط ولایت۔

کلیات قمی۔ نہایت خوش خط نسخہ مکمل حاوی تمام کلام۔

قیمتوں میں شاید کچھ تخفیف بھی ہو سکے۔

مثنوی مولانا روم۔ عالمگیری کتب خانے کی، ملتفت خاں کی پیش
کردہ، جائزہ اور مہریں موجود ہیں“۔

شعرالعجم لکھنے کے دوران جس کتاب کی بھی ضرورت پڑتی تھی مولانا بلاتکلف مولانا شروانی کو لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ امیر خسرو کے حالات لکھنے کے دوران مولانا نے خسرو کی کئی

www.shibliacademy.org

تصنیفات طلب کیں۔ مثلاً ۱۸ر فروری ۱۹۰۸ء کو خط میں لکھتے ہیں:

''نہ سہ پہر اور آئینہ سکندری رجسٹرڈ بھیج دیجیے بلکہ عشقیہ بھی''۔

۲۶ر فروری کو تاکیدی خط لکھتے ہیں:

''آئینہ سکندری، نہ سہ پہر، عشقیہ کا اب تک انتظار ہے۔ خسرو کے قصائد ہوں تو اس کی بھی ضرورت ہے''۔

غالباً یہ نسخے مولانا تک پہنچ گئے۔ ۵ر مارچ ۱۹۰۸ء کو خسرو کے حوالے سے پھر وہ ایک نئی فرمائش کرتے ہیں:

''دیباچہ تحفۃ الصغر بھی عنایت ہو، ورنہ کتاب ناتمام رہ جائے گی''۔

محی لاری کی مثنوی ''فتوح الحرمین'' کی ضرورت پڑی تو مولانا شروانی کو ہی لکھا:

''فتوح الحرمین حالات حرمین میں ایک مثنوی ہے۔ مصنف کا نام محی ہے لیکن کشف الظنون کے سوا اور کسی تذکرہ مین پتا نہیں لگتا۔ آپ اپنے دفتر میں تو دیکھیے''۔

یہ خط ۸ر فروری ۱۹۱۰ء کا لکھا ہوا ہے۔ اس وقت تک ''فتوح الحرمین'' کا کوئی قلمی نسخہ اس کتاب خانے میں نہیں تھا۔ غالباً تیسری دہائی میں ایک نسخہ داخل کتب خانہ ہوا۔ جیسا کہ مولانا شروانی کے ایک مضمون بعنوان ''مثنوی فتوح الحرمین'' مطبوعہ رسالہ ''معارف'' نومبر ۱۹۳۲ء سے پتا چلتا ہے، جس کا پہلا جملہ ہے ''اس مثنوی کا ایک نفیس قلمی نسخہ حیدر آباد سے حال ہی میں آکر داخل کتاب خانہ حبیب گنج ہوا ہے''۔ (۲)

مولانا شبلی نے جب خدا بخش خاں کے کتاب خانے کا دورہ کیا اور وہاں جو نوادرات دیکھے تو اس کی اطلاع بھی دی:

''مرزا کامران کا دیوان، اکبری کتب خانے کا نہایت مستند دیکھا۔ شاہ جہاں اور جہاں گیر کے خاص ہاتھ کی تحریر ہیں۔ میں نے فوٹو لیا اور متعدد کاپیاں کرائیں کہ اور شوقینوں کے بھی کام آئے''۔

المامون کے بعد جس کتاب پر نواب صدر یار جنگ نے خامہ فرسائی کی وہ مولانا کا

www.shibliacademy.org

''سفر نامہ روم ومصر وشام'' تھا جو پہلی بار ۱۸۹۲ء میں دہلی سے طبع ہوا۔اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۹۴ء میں مطبع مفید عام، آگرہ سے شائع ہوا۔نواب صدر یار جنگ نے اس دوسرے ایڈیشن پر تعارف لکھا جو اخبار ''آزاد'' لکھنؤ کے ۱۷/اگست ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا۔ یہ ایک مختصر سا مضمون ہے جس میں مولانا کی طرز تحریر کی تعریف کی گئی ہے اور بس۔

مولانا نے یہ سفر ''الفاروق'' کی تصنیف کی غرض سے کیا تھا۔ان کی خواہش تھی کہ ممالکِ اسلامیہ کے کتب خانوں میں جو قدیم مراجع و مآخذ موجود ہیں، ان سے استفادہ کیا جائے۔اس جذبے کے تحت انھوں نے یہ سفر اختیار کیا۔ہندوستان واپس آکر انھوں نے پہلے اپنا سفر نامہ لکھا، اس کے بعد ''الفاروق'' کی تالیف عمل میں آئی۔

''الفاروق'' کا پہلا ایڈیشن ۱۸۹۹ء میں منظر عام پر آیا (۳)۔نواب صدر یار جنگ نے اس تصنیف پر بھی تبصرہ لکھا اور خاصا طویل تبصرہ لکھا، جو علی گڑھ سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''معارف'' کے جولائی ۱۸۹۹ء کے شمارے میں شائع ہوا۔جب یہ شمارہ مولانا تک پہنچا، انھوں نے فوری خط لکھا:

> ''جیسے معارف آیا، ریویو پڑھا اور بار بار پڑھا۔خدا کی قسم دیر تک ایک کیفیت طاری رہی۔اگر خودستائی کا پہلو نہ نکلتا تو میں اس کو الفاروق کے ساتھ شامل کر کے شائع کرتا''۔(خط مورخہ ۵/جولائی ۱۸۹۹ء)

''الفاروق'' کے تبصرے میں نواب صدر یار جنگ کس خوبی کے ساتھ مولانا کی تعریف کرتے ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

> ''ہم کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ ان کا دماغ برسوں حضرت فاروق کے حالات کی تفتیش میں مصروف رہا ہے اس لیے ان کے ہیرو کے صفات کا پرتو ان کے دماغ پر پڑا اور وہ جنگی مطالب اس خوبی اور صفائی سے لکھ سکے ورنہ ایک مدرسہ کے مولوی کو اس مضمون کا لکھنا دشوار بلکہ ناممکن ہوتا''۔(مقالات شروانی ص ۴۲)

مبصر نے اپنے تبصرے کے آخر میں مصنف کی طرز ادا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

www.shibliacademy.org

''مخاطب جب واحد ہو (خواہ وہ کسی مرتبہ کا ہو) تو عرب کے قاعدے کے بہ موجب ضمیر وصیغہ اس کے واسطے واحد ہوگا۔ ہندوستان کے اہل ادب نے مفرد کی جگہ عربی میں اس موقع پر جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے لیکن یہاں پر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ عرب اور عربی کا قاعدہ تھا۔ ہماری زبان اردو کا طریقہ وہ نہیں ہے۔ ہم اگر کسی مخاطب کے مقابلہ میں (باستثنائے اپنے چھوٹوں کے) واحد کی ضمیر یا صیغہ استعمال کریں تو یا تو تذلیل وتحقیر معلوم ہوگی یا پہاڑی بولی۔ اگر یہ کہیں کہ تو نے یہ کام نہیں کیا یا مولوی رحیم بخش آیا تھا تو اول سے مخاطب کی ذلت اور دوسری سے سرحدی پہاڑیوں کی بولی معلوم ہوتی ہے۔ شرفائے دہلی اپنے سائیس ونفر کو بھی اس طرح مخاطب نہیں کرتے''۔ (مقالات شروانی ص ۴۷)

''سلسلۂ ناموران اسلام'' سیریز کے تحت مولانا شبلی کی اگلی کتاب ''الغزالی'' ہے۔ نواب صدر یار جنگ نے اس پر کوئی مضمون نہیں لکھا لیکن آپ کے کتب خانے میں جو مطبوعہ نسخہ ہے وہ آپ کے مطالعہ میں رہا ہے۔ اس میں دو جگہوں پر آپ نے مختصراً حاشیہ آرائی کی ہے۔ صفحہ ۳۰ پر مولانا نے غزالی کے عقائد زندیقانہ اور ملحدانہ پر بحث کرتے ہوئے حاشیے میں امام غزالی کی ایک تصنیف ''منخول'' کا ذکر کرتے ہوئے خود امام غزالی کا قول نقل کیا ہے کہ ''منخول احیاء العلوم، کیمیائے سعادت اور جواہر القرآن کے بعد کی تصنیف ہے''۔ مولانا شبلی آگے لکھتے ہیں کہ ''منخول اس وقت ہمارے پیش نظر ہے اس کا طرز تحریر اعلانیہ شہادت دیتا ہے کہ وہ ابتدائی زمانہ کی تصنیف ہے خصوصاً امام ابوحنیفہؒ کی شان میں جو گستاخیاں ہیں وہ ہرگز اس زمانہ کی نہیں ہوسکتیں جب وہ تارک الدنیا اور صوفی ہو چکے تھے اور اس قسم کی تحریر سے قطعی توبہ کر چکے تھے۔ مکاتبات میں یہ بھی لکھا ہے کہ امام صاحب نے انکار کیا کہ میں نے امام ابوحنیفہؒ کی شان میں کبھی گستاخانہ الفاظ نہیں استعمال کیے''۔ اس آخری جملے پر نشان لگا کر نواب صدر یار جنگ نے حاشیہ پر لکھا کہ:

''یہ بھی ممکن ہے کہ جو کتاب منخول احیاء العلوم وغیرہ کے بعد تصنیف ہوئی، وہ اور منخول ہو اور یہ پہلو اس لحاظ سے زیادہ دلنشیں ہے کہ علامہ موصوف منخول زیر بحث کی طرز کو ابتدائی زمانے کی جانب منسوب کرتے ہیں۔ فقط حبیب الرحمٰن

www.shibliacademy.org

۱۴ ذی حجہ ۲۰ھ"۔

امام غزالی کی تصنیفات کی بحث کرتے ہوئے جب مولانا صفحہ ۴۵ پر"منخول" کا تعارف کراتے ہوئے اسے امام غزالی سے منسوب تصنیف قرار دیتے ہیں، اس پر بھی نواب صاحب نے حاشیہ لکھا کہ"خود امام صاحب کا جو قول صفحہ ۳۰ پر لکھا ہے، اس کے خلاف ہے"۔

مکاتیب شبلی حصہ اول میں شبلی کے خطوط ان کے معاصرین کے نام ہیں۔ ان میں چند خطوط پر نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے حاشیہ آرائی کی ہے ملاحظہ فرمائیں:

نواب محسن الملک کو ایک خط مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۸۹۴ء کو شبلی نے محسن الملک کی علی گڑھ آنے کی دعوت پر ایک تفصیلی خط لکھا جس میں قوم کی خدمت کرنے کی بات آئی تو مولانا نے لکھا کہ "......رہا قوم کی خدمت کرنی، اس کی یہ تدبیر نہیں کہ جھوٹی سفارش کر کے دو چار کو نوکری دلا دی جائے، ان کو اس قابل بنانا چاہیے کہ وہ خود اپنی سفارش کر سکیں"۔ نواب صدر یار جنگ نے"وہ خود اپنی سفارش کر سکیں" پر حاشیہ لکھا" بلکہ دوسروں کی بھی"۔

مولانا محمد سمیع جو مولانا کے ایک عزیز اور ابتدائی دور کے شاگردوں میں تھے۔ انھیں اپنے ایک خط مورخہ ۱۳ اپریل ۱۹۰۱ء میں لکھتے ہیں" گھر کے مصائب نے یہاں تک پہنچایا ورنہ میں اپنے گوشۂ عافیت کو فلک نما سے کم نہیں سمجھتا ہوں"۔ (ص ۱۰۳)۔ مرتب مکاتیب سید سلیمان ندوی نے"فلک نما" پر نوٹ لکھا کہ"حیدر آباد کی ایک مشہور ممتاز عمارت کا نام جو اب نظام کا مسکن ہے"۔ نواب صدر یار جنگ نے حاشیے پر تحریر کیا کہ"غلط! یہ مہمان خانہ ہے۔ نواب وقار الامرا کا تعمیر کردہ، پہاڑی پر"۔

اپنے نام لکھے شبلی کے ایک خط مورخہ ۱۹ جنوری ۱۹۰۲ء پر بھی نواب صدر یار جنگ نے حاشیہ آرائی کی۔ مولانا شبلی نے ندوہ میں رہنے پر آمادگی ظاہر کرتے ہوئے لکھا:

"اب نکتہ چینی کی خدمت ادا کرتا ہوں ع
خوشم انداز قد سرو پا در گل نمی آید"

نواب صاحب نے حاشیۃً ایک شعر لکھا۔

بجو و سروپا در گل چمن بر خویش می بالد

www.shibliacademy.org

بہ چشم جلوۂ آں سروِ خوش رفتار بایستی

شبلی نے آگے ایک مصرع لکھا ع

بآغوش بتے بودی و یابردار بایستی

نواب صاحب نے حاشیہ پر لکھا:

’’خواجہ حافظ فرماتے ہیں ع

خوش آمد گل و زاں خوشتر نباشد‘‘

شبلی کے اسی مصرع پر دوسرا حاشیہ بھی لکھا:

سرآزادگان در پائے دون طبعان بود حیف ست

اگر خاک در جانان نشد بر دار بایستی

نواب صدر یار جنگ نے ’’شعر العجم‘‘ پر ریویو لکھ کر شبلی کو بھیجا۔ جواب میں شبلی نے لکھا:

’’شعر العجم کا کیا کم احسان ہے کہ اس کی بدولت آپ کی ادبی بارش فیض پھر نصیب ہوئی، افسوس یہ دست و قلم زمین داری کے بدمزہ کاغذات پر صرف ہوں‘‘۔

اس جملے پر نواب صاحب نے حاشیہ لگایا۔

’’اگر عالی دماغی سے کام کیا جائے (تو) زمین داری کے کاغذات بہت کافی ہیں کہ شاہی لطف کا رنگ اپنے اندر رکھتے ہیں‘‘۔ (ص ۱۷۶)

مولانا شبلی نے لکھا کہ ’’آپ دار المصنّفین کو حبیب گنج لے جانا چاہتے ہیں تو حضرت میں اعظم گڑھ کو کیوں نہ پیش کروں؟‘‘ (ص ۲۰۹)۔ نواب صاحب نے ’’اعظم گڑھ‘‘ پر نشان لگا کر حاشیہ لکھا ’’دار المصنّفین الحمد للہ تعالیٰ اعظم گڑھ میں فیض بار ہوا۔ مرحوم نے باغ اور بنگلے وقف کیے، وہیں دفن ہوئے‘‘۔

مولانا شبلی جب کچھ لکھتے تھے تو مولانا شروانی سے نیاز مندانہ مشورہ بھی کیا کرتے تھے۔ جس زمانہ میں ’’الکلام‘‘ لکھ رہے تھے، ۱۴؍ مارچ ۱۹۰۲ء کو ایک خط میں حیدر آباد سے مولانا شروانی کو لکھتے ہیں:

www.shibliacademy.org

''......میں علم کلام کا خاص حصہ لکھ رہا ہوں، آپ کے پاس بھیجوں گا

(اور اس شاگردی کی نسبت میں نے آج تک کسی کے ساتھ گوارا نہیں کی)۔

آپ دیکھ کر بتائیے گا کہ کون سا حصہ رکھنے کے قابل ہے کون سا نہیں......''۔

مولانا شبلی کی خواہش تھی کہ نواب صدر یار جنگ فارسی شاعری کی تاریخ لکھیں اور مولانا انھیں اسسٹ کریں۔ چنانچہ اپنے ایک خط مورخہ ۱۰؍جولائی ۱۸۹۹ء کو لکھتے ہیں:

''آپ کو اگر مرغوب ہو تو فارسی شاعری کی تاریخ اور عہد بہ عہد کی خصوصیتیں اور ترقیاں لکھیے۔ان تمام مضامین میں آپ کو اسسٹنسی کا کام دے سکتا ہوں۔مواد، تحریر، عنوانات، مضامین وغیرہ وغیرہ سب سامان مہیا کر دوں گا''۔

غالباً نواب صاحب اس کام کے لیے راضی نہیں ہوئے۔مولانا نے خود اس کام کو کرنے کا بیڑا اٹھایا اور ۵ جلدوں میں فارسی شاعری کی تاریخ ''شعر العجم'' کے عنوان سے لکھ ڈالی۔اس کی پہلی جلد ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی۔اس پہلی جلد پر نواب صاحب نے تبصرہ لکھا جو ماہنامہ ''الندوہ'' کے مارچ ۱۹۱۰ء کے شمارے میں شائع ہوا۔۱۹۱۰ء تک صرف جلد اول شائع ہوئی تھی، اس لیے صرف اسی جلد پر تبصرہ کیا بقیہ جلدوں کے لیے لکھا کہ ''شائع ہونے پر مفصل بحث کی جائے گی'' (ص ۱۶)۔لیکن یہ سلسلہ آگے نہیں بڑھ سکا۔

نواب صدر یار جنگ نے تمام جلدوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور حاشیہ لکھ کر اپنی ذہانت، صلاحیت اور فارسی شاعری سے شغف کا بھرپور اظہار کیا ہے۔انھوں نے نہ صرف پروف کی اصلاح کی بلکہ سنین، اماکن و اشخاص کے ناموں کو بھی درست کیا۔اشعار بھی صحیح کیے اور اپنے طور پر استفسارات بھی کیے۔چونکہ یہ اصلاحات اور یادداشتیں ان کی کسی تحریر میں نہیں آئی ہیں لہٰذا مناسب ہے کہ میں انھیں جلد وار بغیر کسی تنقید کے یہاں پیش کروں۔

شعر العجم، جلد اول: صفحہ ۵۷ پر مولانا نے محمود غزنوی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ ''فقہ میں خود اس کی (محمود غزنوی کی) ایک مبسوط تصنیف موجود ہے'' نواب صاحب نے حاشیہ پر پوچھا کہ ''اس تصنیف کا نام کیا ہے''؟

مولانا نے محمودی دربار کے سات شعرا کا نام لکھا ہے اور انھیں آسمان سخن کا سبعہ سیارہ

www.shibliacademy.org

لکھا ہے، انہی ساتوں میں ایک نام ''غضاری'' لکھا ہے۔ نواب صدر یار جنگ نے ہر جگہ اس نام کی اصلاح کر کے حاشیہ پر ''غضائری'' لکھا۔ (ص ۶۰، ۶۱، ۷۸)۔

صفحہ ۹۰ پر مولانا نے لکھا ''مشہور ہے کہ حضرت سلیمانؑ ہوا کے تخت پر بیٹھ کر سیر کیا کرتے تھے''۔ نواب صاحب نے حاشیہ لگایا ''مشہور نہیں، واقعہ ہے جیسا کہ آج بھی ہے''۔ جیسا کہ آج بھی ہے سے مراد غالباً ہوائی جہاز ہے۔

صفحہ ۲۲۷ پر حکیم سنائی کے اشعار لکھے ہیں۔ پہلا شعر ہے:

سالہا باید کہ تا یک سنگ اصلی ز آفتاب لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن

نواب صدر یار جنگ نے پہلے مصرع کا پہلا لفظ ''سالہا'' کے نیچے ''قرنہا'' لکھا۔ اگلا شعر ہے

قرنہا باید کہ تا یک کودکے از لطف طبع عالمے گویا شود یا فاضلے صاحب سخن

اس شعر میں دو تبدیلیاں کی ہیں۔ پہلے مصرع کا پہلا لفظ ''قرنہا'' کے نیچے ''سالہا'' لکھا ہے۔ نیز دوسرے مصرع کی جگہ ایک دیگر مصرع لکھا عالمے گردد نکو یا شاعرے شیریں سخن۔

بعض جگہوں پر مولانا شروانی نے سنین سے اختلاف کیا ہے۔ جہاں اختلاف ہے وہاں سنہ پر نشان لگا کر حاشیہ پر کراس کر دیا ہے۔ مثلاً صفحہ ۲۳۱ پر عمر خیام کے ذکر میں نظامی عروضی کے حوالے سے مولانا شبلی نے لکھا کہ جب وہ یعنی نظامی ۵۰۳ھ میں نیشا پور پہنچا تو حکیم موصوف کا چند برس پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ نواب صاحب نے ۵۰۳ھ کو کراس کر دیا۔ سبب کچھ نہیں لکھا لیکن اس کی ظاہری وجہ صرف یہ نظر آتی ہے کہ اس عبارت سے کچھ قبل ہی اسی صفحے پر نظامی کے ہی حوالے سے یہ لکھا ہے کہ ''۵۰۶ھ میں میں (یعنی نظامی عروضی) بلخ گیا۔ معلوم ہوا کہ خیام آج کل یہیں امیر ابوسعید کے مکان پر مقیم ہے، خدمت میں حاضر ہوا......'' ظاہر ہے جب نظامی کی ملاقات خیام سے ۵۰۶ھ میں ہوئی تھی تو ۵۰۳ھ سے قبل اس کی موت کے ذکر کا کیا جواز ہو سکتا ہے؟ یہاں مولانا شبلی سے سنہ لکھنے میں تسامح ہوا ہے۔

صفحہ ۲۳۴ پر خیام کی تصنیفات کے ذیل میں اُس کی زیچ کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ''زیچ جو تیار کی تھی اس کا ہمارے اسلامی ملکوں میں تو پتا نہیں لیکن یورپ نے چھاپ کر شائع

www.shibliacademy.org

کی ہے''۔ شروانی صاحب کا استفسار ہے کہ ''کہاں سے لے کر چھاپی''؟ (۴)

صفحہ ۲۳۵ پر عمر خیام کی رباعیات سے بحث کرتے ہوئے مولانا نے یہ شکوہ کیا کہ ''رباعیوں کے ساتھ مسلمانوں نے جس قدر اعتنا کیا اس سے ہزاروں درجہ بڑھ کر یورپ نے کیا''۔ شروانی صاحب کا اس پر تبصرہ ہے کہ ''شراب نوشی کی وجہ سے''۔

بعض جگہوں پر ہم معنی اشعار بھی حاشیے پر لکھے ہیں۔ مثلاً صفحہ ۲۳۹ پر ''طلب مغفرت'' کی بحث کرتے ہوئے عمر خیام کی مشہور رباعی مولانا نے لکھی ہے:

ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو   واں کس کہ گنہ نہ کرد چوں زیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی   پس فرق میانِ من و تو چیست بگو

مولانا شبلی نے موازنہ کرتے ہوئے اسی مضمون کا نظامی کا ایک شعر لکھا:

گناہ من ارنامدے در شمار   ترا نام کے بودے آمرزگار

شروانی صاحب نے اسی مضمون کا ایک شعر میر اویس منطقی کشمیری کا حاشیے پر لکھا:

گناہِ (من) زعدم گر نیامدے بوجود   وجودِ عفو تو در عالم عدم می بود

دنیا کی بے ثباتی اور عبرت انگیزی کا عنوان قائم کر کے مولانا شبلی نے خیام کا یہ قطعہ لکھا:

خاکے کہ بزیر پائے ہر حیوانے است   زلف صنمی و عارض جانانے است
ہر خشت کہ بر کنگرہ ایوانے است   انگشت وزیرے و سر سلطانے است

شروانی صاحب نے بھی اسی مضمون کا میرزا عبدالقادر بیدل کا ایک شعر حاشیہ پر لکھا:

ہر کجا گرد عزیزی سرمہ آراید بچشم   بی تامل نگذری آنجا کلاہ افتادہ است

شعر العجم جلد دوم: صفحہ ۲۱ پر ظہیر فاریابی کا ایک شعر مولانا نے لکھا:

شراب در سرو چہرہ ز شرم رنگ آمیز   چنین میانہ شرم و حقار می آید

شروانی صاحب نے دوسرے مصرع میں لفظ ''حقار'' کی جگہ 'خمار' لکھا۔

نواب صدر یار جنگ نے ''شعر العجم'' کا اس قدر گہرائی و گیرائی سے مطالعہ کیا کہ جزئیات پر بھی اصلاح کی ہے۔ مثلاً صفحہ ۲۶ پر غزل کی بحث کرتے ہوئے کمال (خجندی) کا ایک شعر مع اردو ترجمہ لکھا ہے:

www.shibliacademy.org

دوش بگذشتم و دشنام ہمی دادمرا خدمتش کردم و پنداشت کہ من نشنیدم

''کل میں ادھر سے گذرا تو وہ مجھ کو گالیاں دے رہا تھا، میں نے اس کو سلام کیا اور وہ سمجھا کہ میں نے گالیاں سنیں''۔ اصل معنی یہ ہے کہ ''میں نے گالیاں نہ سنیں'' اس میں لفظ ''نہیں'' چھوٹ گیا جسے شروانی صاحب نے حاشیہ پر اپنے قلم سے بڑھا دیا۔

صفحہ ۲۹ پر سعدی شیرازی کے حالات میں مولانا شبلی نے لکھا ''سال ولادت معلوم نہیں۔عمر کی مدت عام تذکروں میں ۱۰۲ برس لکھی ہے'' شروانی صاحب نے ۱۰۲ برس کی جگہ ۱۲۰ برس لکھا۔

صفحہ ۲٦ پر غزل کی بحث کرتے ہوئے مولانا نے لکھا کہ:

''غزل کی نسبت یہ مسلم ہے کہ سب سے پہلا خاکہ کمال (خجندی) ہی نے قائم کیا جس کو شیخ سعدی نے اس قدر ترقی دی کہ موجد بن گئے''۔

مولانا شروانی نے اس پر حاشیہ لکھا کہ ''یہ رتبہ سنائی کو حاصل ہے''۔تقریباً یہی خیال اُنھوں نے اپنے مضمون ''غزل فارسی' (مطبوعہ در ماہنامہ اردوئے معلیٰ، کانپور، جون ۱۹۰۴ء) میں بھی ظاہر کیا ہے۔لکھتے ہیں:

''عام طور پر شیخ سعدی غزل کے مجتہد اول مانے گئے ہیں۔تلاش اس کو غلط ثابت کرتی ہے۔تقدم کا شرف خواجہ سنائی غزنوی کو حاصل ہے۔خواجہ (شیخ؟) ممدوح دوسرے طبقے میں ہیں''۔

شیخ سعدی کی تصانیف کے ذیل میں صفحہ ۵۴ پر مولانا شبلی نے ''کلیات سعدی'' کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا:

''کلیات شیخ کا قدیم ترین قلمی نسخہ کتب خانہ دیوان ہند، India Office میں موجود ہے جس کا نمبر ۱۱۱۷ ہے، تاریخ استنساخ اول رجب ۷۲۸ھ یعنی شیخ کی وفات کے بعد قریب ۳٦ سال ہے۔کاتب کا نام ابوبکر بن علی بن محمد ہے جس نے شیخ کے اصلی نسخے سے نقل لی ہے''۔

مولانا شروانی نے اس کے حاشیے پر صرف اسی قدر لکھا ''کتاب خانہ حبیب گنج کا نسخہ''۔

www.shibliacademy.org

اس میں کوئی شک نہیں کہ کتاب خانہ حبیب گنج کا نسخہ (نمبر۹/۴۸) ''کلیات سعدی'' کے چند قدیم نسخوں میں سے ایک ہے، جس کی کتابت ۸۱۴ھ میں ہوئی ہے اور کاتب کا نام 'جمال سکا کی' ہے۔کلیات کے اس نسخے میں انڈیا آفس کے نسخے سے زیادہ رسائل ہیں۔

صفحہ ۱۰۷ پر امیر خسرو کے حالات کے مآخذ کے لیے مولانا نے دیباچہ غرۃ الکمال اور ریو کے مرتبہ برٹش میوزیم کیٹلاگ کا ذکر کیا ہے۔اس پر شروانی صاحب نے امیر خسرو کے دیوان تحفۃ الصغر کا دیباچہ دیکھنے کا مشورہ دیا ہے''ملاحظہ طلب دیباچہ تحفۃ الصغر''۔

صفحہ ۱۲۷ پر امیر خسرو کا اپنے بھائی کے لیے لکھے مرثیہ پر مولانا کے بیان پر مولانا شروانی نے لکھا کہ''مولانا شبلی کو بھی اپنے بھائی مولوی اسحاق صاحب کا مرثیہ اپنے خونِ جگر سے لکھنا پڑا ہے''۔

صفحہ ۲۱۲ پر مولانا نے خواجہ حافظ شیرازی کا تذکرہ لکھتے ہوئے ان کے تفصیلی حالات زندگی نہ ملنے کا شکوہ کیا ہے۔مولانا شروانی نے لکھا کہ:

''(حافظ شیرازی کے) کلام کے ذوق نے اس کمی کی تلافی کردی۔

حافظ کا اصل حال ان کا کلام ہے''۔

ابن یمین کے کلام کے متعلق مولانا لکھتے ہیں''ان کا (ابن یمین کا) دیوان سربداروں کے ہنگامہ میں ضائع ہوگیا''۔(ص ۲۹۹) شروانی صاحب نے حاشیہ پر یہ اطلاع دی''ضخیم کلیات حبیب گنج میں ہے اور اس کی اصل بہاول پور میں ہے، محلات کے کتاب خانے میں''۔(۵) اسی صفحے پر ابن یمین کا ایک شعر مولانا نے نقل کیا ہے:

عشق تا دل آمد نہ در آمد نہ نمود   بادہ پرشور نشد تا کہ بہ مستاں نہ رسد

مولانا شروانی نے اصلاح کی:

عشق تا درِ دلِ اہلے نہ در آمد نہ نمود   بادہ پرشور نشد تا کہ بہ مستاں نہ رسید

شعرالعجم جلد سوم: آغاز میں مولانا نے''ایرانی شاعری کا دور آخر'' کے عنوان سے سلطنت صفویہ کی تاریخ لکھی ہے۔آخر میں خاندان صفویہ کے متعلق لکھا کہ:

''اس خاندان نے اگرچہ سنی مذہب کو نہایت ظلم اور بے رحمی اور سفاکی کے ساتھ ایران سے معدوم کردیا یعنی جو لوگ شیعہ مذہب قبول نہ کرتے وہ قتل کر

www.shibliacademy.org

دیے جاتے تھے‘‘۔(ص ۳)

نواب صدر یار جنگ نے حاشیے پر یہ اضافہ کیا کہ:

’’فنون و علوم کا خاتمہ ہوگیا۔ نہ جامی پیدا ہوئے، نہ میر علی کاتب، نہ بہزاد، نہ حیدر شیرازی، ایران چوپٹ ہوگیا‘‘۔

سحابی استر آبادی کے لیے مولانا نے لکھا کہ ’’اس نے کم از کم سترہ ہزار رباعیاں لکھیں‘‘ (ص ۲۲)۔مولانا شروانی نے سترہ کو قطع کر ستّر لکھا یعنی ستّر ہزار رباعیاں لکھیں۔

ملک الشعرا فیضی کا تعارف کراتے ہوئے مولانا نے لکھا ’’فارسی شاعری نے چھے سو برس کی وسیع مدت میں ہندوستان میں صرف دو شخص پیدا کیے خسرو اور فیضی‘‘۔(ص ۳۱) شروانی صاحب نے ان میں ایک نام کا مزید اضافہ کیا یعنی ’’سید حسن دہلوی‘‘۔

فیضی کی تصنیف ’’مرکز ادوار‘‘ کے متعلق مولانا نے لکھا کہ ’’مرکز ادوار کا عمدہ نسخہ ہمارے کتب خانے میں جو اَب ندوہ پر وقف کردیا گیا، موجود ہے‘‘۔مولانا شیروانی نے اس پر اطلاع فراہم کی کہ ’’ایک نسخہ یہاں مکتبہ حبیبیہ میں ہے‘‘۔(۶)

طالب آملی کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے میر ابوالقاسم، حاکم مازندران کی مدح میں کہے گئے اس کے قصیدہ کا ذکر کیا ہے (ص ۱۶۶) وہیں مولانا شروانی نے یہ اضافہ کیا ہے کہ ’’(طالب آملی کا) شاہ عباس کی مدح میں بھی قصیدہ ہے‘‘۔

مولانا شروانی کے کتاب خانے میں طالب آملی کے دیوان کے دو نسخے ہیں۔ایک نسخہ دہلی سے خریدا گیا جو بقول شروانی صاحب ’’......معمولی خط کا بہت غلط ہے......(لیکن) کثرت کلام کے لحاظ سے قابل قدر ہے‘‘۔(مقالات شروانی، ص ۲۴۰)۔دوسرا نسخہ انھوں نے لکھنؤ سے خریدا۔مولانا شبلی نے اسے طلب فرما کر عرصہ تک زیر مطالعہ رکھا۔واپس فرمایا تو لکھا کہ ’’یہ نسخہ خود طالب آملی کی تحریروں سے مزین ہے‘‘۔اس کی دلیل یہ ہے کہ کاتب کے قلم کے علاوہ ایک دیگر قلم سے جا بجا اصلاحیں درج ہیں۔بعض جگہ حاشیوں پر ’’لراقمہ‘‘ لکھ کر غزلوں و اشعار کا اضافہ کیا گیا ہے۔نظر ثانی کے وقت خود طالب نے اس کی اصلاحیں کی ہیں۔بعض اشعار کو قطع کر حاشیے پر نیا شعر لکھا ہے۔انھی دلائل کی بنیاد پر مولانا شروانی نے لکھا کہ ’’یہ کہنا بجا ہے کہ یہ دیوان بطور بیاض

www.shibliacademy.org

کے خود طالب کے لیے لکھا گیا تھا جو اس کے پاس رہا اور وقتاً فوقتاً اس کے قلم سے فیضیاب ہوتا رہا۔ ایسے نسخہ پر ہر کتاب خانہ فخر کرسکتا ہے۔ میرے کتاب خانے کو یہ سرمایۂ فخر علامہ شبلی مرحوم کی جوہر شناس نظر کے فیض سے حاصل ہوا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ‘‘۔ (مقالات شروانی، ص ۲۴۱)۔(۷)

میرزا صائب کے ایک قصیدے کا شعر مولانا نے لکھا ہے:

احاطہ کرد خط آں آفتابِ تاباں را گرفت خیل پری درمیاں سلیماں را (ص ۱۹۵)

شروانی صاحب نے لکھا ’’یہ غزل کا مطلع ہے جو دیوان میں ہے‘‘۔

شعر العجم جلد چہارم: ابتدائی ابواب میں شاعری کی بحث کرتے ہوئے تخیل پر روشنی ڈالی ہے اور ایک شعر درج کیا ہے۔ (ص ۴۱)

بے مہریٔ دہر بیں کہ در یک ہفتہ گل سرزد و غنچہ کرد و بشگفت و بریخت

(زمانے کی بے مہری دیکھو کہ ایک ہی ہفتہ میں پھول نے سر نکالا، غنچہ ہوا، کھلا اور پھر گر پڑا)

مولانا شروانی نے شعر کو حاشیہ پر اس طرح لکھا:

بے مہریٔ عمر بیں کہ گل در دہ روز سر برزد و غنچہ کرد و بشگفت و بریخت

ص ۷۵ پر عرفی و نظیری کا موازنہ کرتے ہوئے مولانا نے لکھا کہ:

’’عرفی کے وقت تک عیش و عشرت کے خیالات اور اس کا اثر چنداں عام نہیں ہوا تھا۔ نظیری نیشاپوری اکبر کے عہد کا شاعر ہے لیکن (اس پر) غزل کا مذاق غالب تھا اور زبان میں نہایت گھلاوٹ اور نزاکت آگئی تھی اس لیے اس کے قصیدوں میں زور نہیں ہے‘‘۔ (ص ۷۵)۔

مولانا شروانی نے اس پر حاشیہ لکھا:

’’عہدِ عرفی و نظیری تو ایک ہے مگر دونوں میں جو فرق ہے وہ ان کی طبیعت اور طرز کے تفاوت کا اثر ہے‘‘ حبیب الرحمان ۱۷؍جمادی الاول ۱۳۳۰ھ‘‘۔

’’معشوق گو نامہربان اور دشمن ہو، تاہم اس کی محبت دل سے نہیں جاتی‘‘ کا عنوان قائم کرکے مولانا نے دو شعر فرخی اور سعدی کے لکھے ہیں (ص ۱۲۰) مولانا شروانی نے اس پر عالی شیرازی کے ایک شعر کا اضافہ کیا:

www.shibliacademy.org

دوشیزانِ شوخ جفا پیشہ خود نالیدم دل کشیدہ آہ کہ یاراست چہ می باید کرد

مولانا کا کہنا ہے کہ مادح کا نام باقی رہ جاتا ہے اور ممدوحین کو کوئی نہیں جانتا ہے۔اس سلسلے میں انہوں نے نظامی کا ایک قطعہ لکھا ہے:

بسا کاخا کہ محمود ش بنا کرد کہ از رفعت ہمی با مہ ندا کرد

(محمود نے بہت سے محل بنائے جو بلندی میں چاند کے برابر تھے)

نہ بینی زان ہمہ یک خشت بر جا مدیح عنصر ماندہ است بر جا

(ان میں سے ایک اینٹ بھی قائم نہیں رہی صرف عنصری کی مدح باقی رہ گئی ہے)

مولانا شبلی نے اس قطعہ کے بعد لکھا ہے کہ:

''اگرچہ یہ خیال محض لغو ہے،سعدی،خاقانی،ظہیر فاریابی،انوری زمانہ میں مشہور ہیں لیکن ان کے ممدوحین کو کون جانتا ہے؟(ص ۱۴۸۔۱۴۹)

مولانا شروانی نے حاشیہ آرائی کی ہے کہ''نظامی بھی تو یہی کہہ رہا ہے پھر اس کا خیال لغو کیوں ہے؟''

ص ۱۵۱ پر مولانا نے دانش مشہدی کا ایک شعر خزانہ عامرہ کے حوالے سے لکھا ہے جس پر داراشکوہ نے شاعر کو لاکھ روپے دلوائے تھے۔(ص ۱۵۱)

تاک را سرسبز کن اے ابرِ نیساں در بہار قطرہ تا مئے می تواند شد چرا گوہر شود

مولانا شروانی نے پہلے مصرع میں''سرسبز کن'' کی جگہ''سیراب ساز'' لکھا۔یہی شعر تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ ص ۲۳۶ پر لکھا ہے،وہاں پہلے مصرع میں''تاک را سیراب دار......'' لکھا ہے۔مولانا شروانی نے یہاں بھی اصلاح کر کے''سیراب دار'' کو''سیراب ساز'' لکھا ہے۔

مولانا شبلی لکھتے ہیں:

''فارسی کی لطافت پسندی کو اس سے قیاس کرنا چاہیے کہ اس نے خود اپنی زبان کے ثقیل اور گراں الفاظ چھوڑ دیے اور ان کے بجائے عربی الفاظ اختیار کر لیے''۔(ص ۲۲۰)

مولانا شروانی نے حاشیہ آرائی کی''عربی زبان کی لطافت نے آنکھیں کھولیں،اس لیے

www.shibliacademy.org

فارسی ثقیل الفاظ ترک ہوئے''۔

شعر العجم جلد پنجم: مولانا نے قدسی کا ہندوستان آنا ۱۱۴۲ھ میں لکھا ہے۔ مولانا شروانی نے اسے کاٹ کر ۱۰۴۲ھ لکھا ہے۔ اسی طرح مولانا نے قدسی کو شاہ جہاں کی طرف سے چاندی میں تلوانے کا سنہ ۱۱۴۵ھ لکھا ہے۔ مولانا شروانی نے اسے قطع کر ۱۰۴۵ھ لکھا ہے۔ (ص ۱۲)

سبھی جلدوں میں پروف کی غلطیاں بیشمار ہیں جن کی نشاندہی نواب صدر یار جنگ نے حاشیوں پر کی ہے۔ کثرت تعداد کے سبب جنہیں اس مضمون میں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ شعر العجم کا جب بھی اگلا ایڈیشن اشاعت پذیر ہو تو نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے مطالعہ شدہ نسخے سے ضرور استفادہ کیا جائے۔

حواشی

(۱) مولانا آزاد لائبریری کے شعبۂ مخطوطات کے حبیب گنج کلکشن میں ملا محمود عارفی (م ۸۵۳ھ) کی فارسی مثنوی ''گوی و چوگان'' کا ایک نسخہ میر علی ہروی (۸۸۱ھ۔۹۵۱ھ/۱۴۷۶ء۔۱۵۴۴ء) کے خط میں تحریر کردہ محفوظ ہے (نمبر ۳۷/۷۷ ۵۰)۔ میر علی ہروی اپنے عہد کے نامور ترین خوش نویسوں میں تھا۔ یہ ''کاتب سلطان'' کے لقب سے ملقب تھا اور اپنی تحریروں پر ''میر علی سلطانی''، میر علی کاتب السلطانی''، ''میر علی حسینی ہروی''، ''میر علی'' لکھتا تھا اور کبھی کبھی صرف ''علی'' ہی رقم کر دیا کرتا تھا۔ یہ مثنوی ۸۴۲ھ میں لکھی گئی اور میر علی ہروی نے اس نسخے کو ۹۲۶ھ میں نقل کیا ہے۔ ۳۳ اوراق پر مشتمل اس نسخے کی کتابت جلی قلم سے کی گئی ہے۔ یہ ایک شاہی نسخہ ہے۔ اس کی خوبصورت سنہری چرمی جلد اس کے شاہی نسخہ ہونے کی غمازی کرتی ہے۔ کتاب کے آخری صفحے پر حسب ذیل ترقیمہ درج ہے:

''کتبہ العبد الفقیر المذنب علی الحسینی الکاتب غفر اللہ ذنوبہ و ستر عیوبہ فی اوائل شہر ربیع الاول سنہ ست و عشرین و تسع مائۃ بمدینۃ الھراۃ''۔

پہلے ورق کی پشت والے صفحے پر آٹھ چھوٹی بڑی مہریں، عرض دیدے اور دوسری تحریریں درج ہیں۔ ان میں سب سے ممتاز اور قدیم تحریر ذیل میں درج ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گولکنڈہ کی فتح کے

www.shibliacademy.org

موقع پر اورنگ زیب کو یہ نسخہ حاصل ہوا:

''کتاب گوی و چوگان بخط ایام کمال استاد الکتاب ملا میر علی بابت فتح گلکنڈہ غرہ ذی الحجہ سال سی و یکم جلوس اقبال تحویل سہیل نمودہ شدہ عدد اوراق سی وسہ قیمت دو ہزار روپیہ چہار صد و نو دو دو اشعار''۔

اس عبارت کے پہلو میں ایک مدور مہر ہے جس میں ''قابل خاں خانہ زاد بادشاہ عالم گیر ۱۰۹۵'' منقوش ہے۔ اس عبارت کے پاس ہی باریک قلم سے ''داخل سیاھہ تحویل محمد فاضل غرہ ذی الحجہ سنہ ۳۱'' اور اس کے بعد دوسرے قلم سے یہ عبارت درج ہے: ''از وجوہ محمد فاضل غرہ جمادی الاولی سنہ ۴۹ تحویل محمد رضا شد''۔ بائیں ہاتھ کو حسب ذیل عبارت درج ہے: ششم ربیع الاول سنہ ۲۳ از وجوہ محافظ خاں در وجہ تحویل محمد حافظ شد''۔ اوپر کی طرف ایک چھوٹی بیضاوی مہر لگی ہوئی ہے جس میں ''کفایت اللہ خاں ۱۱۱۹'' منقوش ہے اور اس کے نیچے یہ عبارت درج ہے: ''ششم ربیع الاول سنہ ۲۳ عرض دیدہ شد''۔ اسی تاریخ کا لکھا ہوا ایک اور عرض دیدہ صفحے کے اوپری دائیں حصے پر درج ہے اور اس پر دو مہریں بھی ثبت ہیں۔ ایک مہر ظاہرا کسی شخص کی ہے اور دوسری کسی کتاب خانے کی ہے۔ ایک نمایاں مدور مہر، جو تقطیع کے لحاظ سے اس صفحے کی تمام مہروں میں بڑی ہے، وسط صفحے پر ثبت ہے۔ اس میں صاحب مہر کا نام بالکل نہیں پڑھا جاتا ہے۔ بقیہ عبارت یہ ہے: ''...... خان خانہ زاد بادشاہ عالم غازی ۱۱۲۰''۔ اس مہر کے نیچے یہ عبارت ہے'' چہار دھم ربیع الاول سنہ ۴ جلوس والا عرض دیدہ شد''۔ اس ورق کی پیشانی کے بائیں گوشے پر یہ عبارت لکھی ملتی ہے: ''بتاریخ نوزدھم شہر رجب المرجب سنہ ۱۱۹۷ ہجری کتاب گوی چوگان بقیمت دوصد و دہ روپیہ خریدہ داخل سیاھہ کتب خانہ شد'' پھر قطب الدولہ کی یہ تحریر درج ہے: ''مبلغ دوصد پنجاہ روپیہ خریدہ شد سنہ ۱۲۶۴ قطب الدولہ بہادر''۔ اس کے نیچے یہ اندراج ہے:

''کتاب ھذا از قطب الدولہ خریدہ داخل کتب خانہ محمد مصاحب خاں صاحب کردہ شد سنہ ۱۲۶۹ھ''۔

ان تحریروں کے علاوہ اس صفحے پر حسب ذیل قدیم اندراجات ہیں:

غرہ صفر سنہ ۳ عرض دیدہ شد۔ ربیع الثانی سنہ ۴ جلوس اقدس عرض دیدہ شد۔ ۴ شعبان سنہ ۳ عرض دیدہ شد۔ چہاردہم ربیع الاول سنہ ۴ جلوس والا عرض دیدہ شد۔ چہارم شعبان سنہ ۳ وجوہ محمد حافظ تحویل محمد۔ خان شد۔

www.shibliacademy.org

اگلا ورق جو اصل کتاب کا ورق ا (الف) ہے اس پر ''قابل خاں خانہ زاد بادشاہ عالم گیر'' کی پھر ایک مہر ہے اور ۴ شعبان سنہ ۳ کے دو عرض دیدے اور ایک مہر ثبت ہے جس میں ''کفایت اللہ ابن امانت اللہ'' منقوش ہے۔ اسی صفحے پر دو اور مربع مہریں بھی ثبت ہیں۔ دونوں مہریں دو کتاب خانوں کی ہیں۔ ایک مہر میں ''کتاب خانہ ضیاء الدولہ ضیاء الدین خاں بہادر ۱۱۶۰'' اور دوسری مہر میں یہ عبارت منقوش ہے: ''مہر کوٹھ کتاب خانہ محی الدین علی خاں بہادر ۱۱۶۳''۔ اسی صفحے پر کتب خانہ حبیب گنج کی مہر اور یہ تحریر درج ہے: از آگرہ بہ قیمت مبلغ یک صد و ہفتاد روپیہ خریدہ شد محمد حبیب الرحمٰن خاں غرہ صفر المظفر، سنہ ۱۳۲۱ ھجری''۔

مثنوی گوی و چوگان کے پیش نظر نسخے کا سفر ہرات سے علی گڑھ تک کس طرح طے ہوا ان مہروں اور تحریروں کی مدد سے واضح ہوتا ہے۔ اس کی کتابت میر علی الحسینی الہروی نے ہرات میں ۹۲۶ ھ میں کی، ہرات سے یہ نسخہ سفر کرتا ہوا ہندوستان وارد ہوا اور کسی طرح حیدرآباد پہنچا۔ جب اورنگ زیب عالم گیر نے گولکنڈہ فتح کیا تو مال غنیمت کے ساتھ یہ نسخہ بھی حاصل ہوا۔ گولکنڈہ ۱۴/ ذوالقعدہ ۱۰۹۸ھ/ ۲۱/ ستمبر ۱۶۸۷ء کو فتح ہوا تھا۔ تقریباً دو ہفتے کے بعد یکم ذوالحجہ ۱۰۹۸ھ کو یہ کتاب ایک شاہی منصب دار خواجہ سہیل کی تحویل میں دے کر شاہی کتاب خانے میں محفوظ کر دی گئی۔ یہ کتاب اسی تاریخ یعنی غرہ ذوالحجہ سنہ ۳۱ جلوس کو محمد فاضل کی تحویل میں دے دی گئی۔ یہ کتاب اس منصب دار کی تحویل میں تقریباً ۱۸ سال تک رہی۔ اس کے انتقال کے بعد یکم جمادی الاولیٰ سنہ ۴۹ جلوس عالم گیری کو محمد رضا کی تحویل میں پہنچ جاتی ہے۔ سنہ ۱۱۱۸ھ میں عالم گیر کے انتقال کے بعد یہ کتاب اس کے اخلاف میں بہادر شاہ (م ۱۱۲۴ھ) کے کتاب خانے میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اس وقت کے منصب داروں کی تحریریں اور مہریں اس کا ثبوت ہیں۔ شاہی کتاب خانے سے نکل کر اب یہ کتاب دو امیروں کے کتاب خانوں میں پہنچتی ہے۔ ان میں ایک ضیاء الدولہ ضیاء الدین خان بہادر اور دوسرے محی الدین علی خان بہادر ہیں۔ قیاس غالب ہے کہ پہلے اول الذکر کے کتاب خانے میں یہ کتاب سنہ ۱۱۹۷ھ میں پہنچی ہے پھر دوسرے کے پاس۔ آخر سنہ ۱۲۶۲ھ میں قطب الدولہ بہادر اسے خرید کر اپنے کتاب خانے میں داخل کرتے ہیں لیکن یہ قیام بھی عارضی ثابت ہوتا ہے اور ۷ سال کے بعد سنہ ۱۲۶۹ھ میں محمد مصاحب خاں اس کتاب کو اپنے کتاب خانے کے لیے قطب الدولہ سے خرید لیتے ہیں۔ بعد میں یہ کسی طرح آگرہ کے بازار میں پہنچ جاتی ہے جہاں سے غرہ صفر المظفر ۱۳۲۱ھ کو صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے قیمتاً ۱۷۰ روپئے میں خریدی اور عرصے تک ان کے کتاب خانے کی زینت رہی۔ ۵/ دسمبر ۱۹۶۰ء

www.shibliacademy.org

کو کتاب خانہ حبیب گنج کا سارا ذخیرہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی لائبریری میں منتقل ہو گیا اور اب یہ نادر نسخہ مولانا آزاد لائبریری کی زینت ہے۔(مثنوی گوی و چوگان کے پیش نظر نسخے کی مہروں اور تحریروں کی تفصیلات ڈاکٹر مختارالدین احمد کے مقالے ''میر علی الکاتب کا ایک شاہکار'' مطبوعہ درسہ ماہی ''مجلّہ علوم اسلامیہ''، علی گڑھ، جلد ۱، شمارہ ۱ سے اخذ کی گئی ہیں)۔

(۲) ''فتوح الحرمین'' کے دو نسخے حبیب گنج کلکشن میں ہیں (نمبر ۱/۱۸ اور ۱۸/۹)۔ زیر تذکرہ نسخہ ۳۳ر اوراق پر مشتمل ۱۱۴۳ھ کا مکتوبہ ہے اور اس کے کاتب سید محمد ابن فتح اللہ ہیں۔ خط نستعلیق میں لکھے اس نسخے میں ۱۹ مختلف صفحات پر مقدس مقامات کے رنگین خوبصورت نقشے بنائے گئے ہیں۔

(۳) ''الفاروق'' کا مسودہ مطبع سے اشاعت کے بعد مولوی بشیرالدین (اٹاوہ) کے ہاتھ آ گیا۔ انھوں نے اسے اپنے ذخیرے میں شامل کر لیا۔ مولوی صاحب کا ذخیرہ، جسے بعد میں جواہر میوزیم کا نام دیا گیا، ۱۹۶۴ء میں مولانا آزاد لائبریری میں منتقل ہو گیا۔ اس ذخیرے کے ساتھ ''الفاروق'' کا مسودہ بھی آیا اور اب یہ مولانا آزاد لائبریری کے جواہر کلکشن کی زینت ہے۔

(۴) حافظ محمود شیرانی نے بھی خیام کی کسی زیچ کی یورپ میں اشاعت سے انکار کیا ہے۔(مقالات حافظ محمود شیرانی، جلد پنجم، ص ۸۶۵)۔

(۵) ۱۰۲۷ صفحات پر مشتمل یہ ایک ضخیم نسخہ ہے جس پر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی کئی یادداشتیں درج ہیں۔ صفحہ نمبر بعد میں پنسل سے لکھا گیا ہے۔ صفحہ نمبر ۱۰۲۳ اور ۱۰۲۴ بیاض الاصل ہیں۔ صفحہ ۱۰۲۳ پر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی سب سے پہلی یادداشت ۲۲ر صفرالمظفر ۱۳۴۱ھ کی درج ہے جس میں انھوں نے اس نسخے کی مکمل کیفیت لکھی ہے:

> ''کلیات ابن یمین کا یہ نسخہ حیدر آباد دکن میں میری فرمائش سے لکھا گیا۔ منقول عنہ نسخہ نواب صاحب بہاول پور کے خاص کتاب خانے میں تھا۔ مولوی رشید احمد صاحب انصاری نے اس کا پتا لگایا۔ مولوی سر رحیم بخش صاحب کونسل کے پریسڈنٹ کی مہربانی سے نقل کے واسطے مجھ کو ملا، جزاہما اللہ عنی خیراً۔ نسخہ مذکور پر سنہ کتابت تحریر نہیں، تاہم کاغذ اور انداز خط سے چار سو برس سے زائد کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ رسم الخط بھی اس کی تائید کرتا ہے جس کی پابندی ناقل نے کی ہے۔ سرلوح ایک مطلا و منقش دائرہ میں سنہری حروف میں عبارت یہ

www.shibliacademy.org

تحریر ہے　　رسم

خزینۃ السلطان

الاعظم الاعدل

مغیث السلطنۃ والدین

ابوالفتح ارسم سلطان

نسخہ اپنی ہر ایک شان سے شاہی کتاب خانہ کا معلوم بھی ہوتا ہے۔

محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی ۲۲ صفر المظفر ۱۳۴۱ھ حیدرآباد دکن"

(۶) ذخیرۂ حبیب گنج میں فیضی کی مثنوی "مرکز ادوار" کے دو نسخے ہیں۔ زیر تذکرہ نسخہ صاف اور واضح نستعلیق میں ۱۱۲۶ھ کا مکتوبہ ہے (نمبر ۱۵۱/۵۰) جبکہ دوسرا نسخہ ایک مجموعے میں شامل ہے۔

(۷) ذیل میں طالب آملی کے ہاتھ کی لکھی ایک اضافہ شدہ مکمل غزل پیش نظر نسخے سے نقل کی جاتی ہے:

شعر شوقم بوی مصر از یاد کنعاں بشنوم　　بر زباں ہر گل کہ آرم نکہت آں بشنوم

بس کہ نازک شد مشامم در ہوای زلف یار　　از چراغِ دیدہ بوی دودِ مژگاں بشنوم

صحن کویت گلشنِ ارواح را ماند کزاں　　ہر کفِ خاکی کہ بویم نکہتِ جاں بشنوم

بس کہ در سودای زلف او پریشاں شد دماغ　　جمع اگر آید نسیمِ گل پریشاں بشنوم

نیم عطری از گریبانش بدیں روزم نشاند　　آہ اگر زاں پیرہن بوی بساماں بشنوم

نالۂ کز بند بند ارغنون آید بگوش　　من بیمنِ دل ز ہر تارِ گریباں بشنوم

دزدِ نکہت نیستم لذت ربای نغمہ ام　　نالہ بگذار کز بیروں بستاں بشنوم

طالب آں نازک مشامم کز درودیوارِ باغ　　بوی گلہای بہاری در زمستاں بشنوم

www.shibliacademy.org

شبلی و حالی ،تعلقات کا ازسرِنو جائزہ

ڈاکٹر خالد ندیم

علامہ شبلی نعمانی اور مولانا الطاف حسین حالی کے باہمی تعلقات ہمیشہ خوش گوار رہے، جن کا اظہار دونوں کے سوانحی حالات اور پھر ان کی مراسلت سے لگایا جاسکتا ہے۔حالی عمر میں شبلی سے بیس برس بڑے تھے،لیکن تعلقات کی نوعیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ حالی نے شبلی کا بزرگ بننے کی کوشش نہیں کی،شاید وہ برادر بزرگ بننے کو بھی تیار نہ تھے،یہی وجہ ہے یہ کہ انھوں نے زندگی بھر شبلی کا احترام ملحوظ رکھا۔

شبلی و حالی کے مابین بعض امور میں اگر کبھی اختلاف ہوا بھی تو دھیمے سروں میں لیکن مہدی افادی،مولوی عبدالحق اور سید سلیمان ندوی نے دونوں بزرگوں کے درمیان اختلافات کا خصوصی طور پر ذکر کیا ہے۔

مہدی افادی نے اپنے ایک مضمون ''حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک'' (۱) کے ذریعے ان ''اختلافات'' کو خوب ہوا دی، لکھتے ہیں کہ ''اصلی کام حالی و شبلی کو باہم ٹکرانا ہے'' (۲)۔مضمون میں اس ''چشمک'' کی کئی ایک مثالیں دینے کے بعد مہدی کہتے ہیں کہ ''یہاں تک تو چشمک کی صرف نرم مثالیں تھیں،یعنی تلخ گولیاں غلافِ شکر میں،اب ذرا قوی شواہد لیجیے'' (۳)،البتہ مضمون کے آخر میں آکر یہ بیان داغ دیتے ہیں کہ ''میری غایت محض تنشیط ادب،یعنی احباب کی دماغی تفریح کے سوا اور کچھ نہیں ہے'' (۴)،لیکن یار لوگ تو معاصرانہ چشمک کو لے اڑے،حتیٰ کہ اس جملے کی بازگشت آج تک سنائی دے رہی ہے۔اس حوالے سے آلِ احمد سرور کا تبصرہ بہت اہم ہے، لکھتے ہیں:

> ہم لوگوں میں یہ ایک عام کمزوری ہے کہ پہلے انسانوں کے بت بناتے

صدر شعبہ اردو،سب کیمپس سرگودھا یونی ورسٹی ،بھکر۔

www.shibliacademy.org

ہیں اور پھر ان بتوں کو آپس میں ٹکرا کر خوش ہوتے ہیں۔ خدا جانے، کس گھڑی میں مہدی افادی نے حالی اور شبلی کی ''معاصرانہ چشمک'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا کہ اب ادبی حلقوں میں حالی و شبلی کا موازنہ اور ایک کو دوسرے سے بڑھانے یا گھٹانے کی کوشش اچھا خاصا فرض بن گئی ہے۔(۵)

عبداللطیف اعظمی کا کہنا ہے کہ موصوف (مہدی افادی) نے صرف معاصرانہ چشمک کی تصنیف ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اپنے بہت سے خطوط میں بھی اس کی شکایت کی ہے۔(۶) یوں یہ روایت آگے بڑھتی رہی، چنانچہ ان اختلافات کو نمایاں کرنے میں مولوی عبدالحق کی خدمات بھی قابل ذکر ہیں۔ مولوی صاحب کے خیال میں، حالی کے برعکس ''شبلی کی طبیعت میں ضبط بالکل نہ تھا''، چنانچہ 'جب کبھی ان کے دل میں کوئی بات آتی تو فوراً کہہ گزرتے''۔ مولوی صاحب کے مطابق، 'وہ نجی صحبتوں میں ایسی باتیں کرتے تھے، جن سے سرسید اور مولانا حالی کی تنقیص نکلتی تھی'، اس سلسلے میں انھوں نے ایک واقعہ بیان کیا ہے:

> جن دنوں حیات جاوید شائع ہوئی تو مولانا شبلی کے لیے، جو اس وقت اتفاق سے حیدرآباد میں وارد تھے، میں نے یہ کتاب لے جا کر ان کی خدمت میں پیش کی۔ اس وقت وہاں اور بھی کئی اشخاص موجود تھے۔ مولانا شبلی نے یہ کتاب دیکھتے ہی فرمایا، 'یہ کذب وافترا کا آئینہ ہے'۔ مولانا نے کتاب کو پڑھے بغیر ہی یہ رائے دے دی۔(۷)

اگر اس بیان کا جائزہ لیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ مولوی صاحب نے یہ فرض کر کے کہ حیاتِ جاوید کا اولین نسخہ ان کے پاس آیا، انھی نے اسے شبلی کے سامنے پیش کیا اور شبلی نے بغیر تردد کے اس پر تبصرہ کر دیا، حالانکہ بقول شیخ محمد اکرام، 'وہ [شبلی] کتاب کی عام اشاعت سے پہلے اسے یا اس کے بعض اجزا دیکھ چکے تھے'(۸)۔ ویسے بھی حیاتِ جاوید سے متعلق شبلی کی تنقیدی رائے کوئی راز کی بات نہیں، بلکہ اس کا اظہار تو انھوں نے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام اپنے دو خطوط میں بھی کیا ہے (جن کا ذکر آئندہ سطور میں آئے گا)۔

مولوی صاحب مولانا حالی کو 'بڑے صاحب دل آدمی' قرار دیتے ہوئے یہ لکھتے ہیں کہ حالی نے 'ان (شبلی) کی کتابوں پر بڑے اچھے تبصرے کیے اور جو باتیں قابل تعریف تھیں، ان کی جی

www.shibliacademy.org

بھر کرداد دی'۔مولوی صاحب کی یہ بات بالکل درست ہے۔۳۰ر نومبر ۱۹۰۶ء کو حالی نے شبلی کو ایک طویل خط لکھا، جس سے دونوں کے تعلقات کی گہرائی، خلوص اور باہمی عقیدت واحترام کا اندازہ ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ شبلی کی تصانیف کے بارے میں حالی کے خیالات کا اظہار بھی۔حالی لکھتے ہیں:

> اس قدر مدت کے بعد عنایت نامہ کے وُرود نے میری آنکھوں کے ساتھ وہی کام کیا، جو پیراہن یوسف نے چشم یعقوب کے ساتھ کیا تھا۔
>
> میری کوتاہ قلمی سے اگر آپ یہ سمجھے ہوں تو کچھ تعجب نہیں کہ میں آپ کے حقوقِ صحبت کو بھول گیا ہوں، مگر مولانا! یہ تغافل اسی قسم کا ہے، جس کی نسبت کہا گیا ہے...... تغافلے کہ کم از صد نگاہ حسرت نیست۔ میں اپنے حالات کی تفصیل لکھ کر آپ کو ملول کرنا نہیں چاہتا۔
>
> آپ کے گراں بہا عطیہ کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں، گو اس سے پورا پورا مستفید نہیں ہوسکتا۔ایک آنکھ سے بالکل نظر نہیں آتا، دوسری آنکھ میں بھی موتیا کا پانی آنا شروع ہوگیا ہے۔داہنی آنکھ بنوانے کا ارادہ ہے، لیکن کھانسی کی وجہ سے فروری تک آپریشن کرانا ملتوی کر دیا ہے۔...... چونکہ میں بذاتِ خود کتابوں سے کماحقہ استفادہ حاصل نہیں کرسکتا، اس لیے اپنی ہوس کو اس طرح پورا کرتا ہوں کہ اور لوگوں کے لیے لائبریری سے کتابیں منگواتا ہوں...... اسی بنا پر سوانح مولانا روم لائبریری کی طرف سے منگوائی گئی تھی، لیکن چونکہ وہ آپ نے خاص میرے لیے عنایت فرمائی ہے، اس لیے اس کو اپنے پاس رکھوں گا اور لائبریری کے لیے دوسرا نسخہ اسی درجے کا بصیغہ ویلو پی ایبل ارسال فرمانا ہوگا۔جہاں تک مجھے معلوم ہے، آپ کی جملہ تصانیف لائبریری میں آگئی ہیں۔صرف الغزالی اب تک نہیں آئی تھی، لیکن اب عبداللہ خاں کو حیدرآباد لکھ دیا گیا ہے کہ اس کا ایک نسخہ فوراً بھیج دیں۔ مجھے ٹھیک معلوم نہیں کہ المامون اور سیرۃ النعمان بھی آگئی ہیں یا نہیں، میں لائبریرین سے دریافت کرکے ان کے لیے بھی شاید تکلیف دوں۔ باقی الفاروق، سفر نامہ روم ومصر وغیرہ، رسائل شبلی، تاریخ علمِ کلام کے دونوں حصے (الکلام اور علم الکلام)، یہ سب کتابیں لائبریری میں موجود ہیں۔سوانح کے ساتھ

www.shibliacademy.org

دیوانِ فارسی بھی پارسل میں شامل کرادیجیے گا۔

سوانح (مولانا روم) کو مَیں اب تک ایک سرسری نظر سے دیکھ سکا ہوں۔ اول مولوی وحید الدین دیکھنے کو لے گئے، ان کے بعد غلام حسین نے مانگ لی۔ آپ کی تصنیفات کی نسبت میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ من حرف منزلکم فی الصنیف کل لسانہ۔ آپ کا وجود قوم کے لیے باعث فخر ہے۔ خدا تعالیٰ آپ کو بہت مدت تک زندہ وسلامت رکھے۔

موازنہ انیس ودبیر کا مسودہ میں نے میر کاظم علی صاحب معتمد تعمیراتِ سرکارِ عالی سے بڑے تقاضوں کے ساتھ حیدرآباد میں منگوا کر دیکھا تھا اور جس رقعہ کے ساتھ ان کے دفتر میں اس کو واپس بھیجا تھا، اس میں ان کو بہت غیرت دِلائی تھی کہ اب تک اس کے شائع کرنے کا یہاں کسی کو خیال نہیں آیا، یا تو سرکار کی طرف سے آپ اس کو چھپوا دیں یا بعض اشخاص، جو اس کے چھاپنے پر آمادہ ہیں، ان کو اجازت دے دیں اور سب سے بہتر یہ ہے کہ اس مسودے کو خود مولانا کے پاس بھجوا دیں، کیونکہ اس میں جابجا کورے اوراق چھوڑ دیے گئے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو اس میں کچھ اور اضافہ کرنا منظور ہے۔ میر کاظم علی صاحب نے بہت دِن کے بعد اس کا یہ جواب دیا کہ سرکار سے اس کے چھاپنے کی منظوری لے لی گئی ہے، لیکن باوجود اس کے کہ میں اس کے بعد کئی مہینے تک وہاں ٹھہرا رہا، میرے سامنے اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ بفرضِ محال چھپتا بھی تو بالکل مسخ ہوتا۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ یہاں چھپنے کو دے دیا۔ جب موازنہ بالکل چھپ جائے تو ازراہِ عنایت اس کی بھی ایک جلد سیکرٹری وکٹوریا میموریل لائبریری کے نام ضرور بصیغہ ویلو پی ایبل بھجوا دیجیے گا۔(۹)

یہی نہیں کہ مولانا حالی شبلی کی قدر کرتے تھے، بلکہ جہاں انھیں یہ احساس ہوتا ہے کہ شبلی کو نظرانداز کیا گیا ہے، وہ اس پر حیرت کا اظہار کرتے تھے۔ مولوی عبدالحق نے ایک فہرست تیار کی، جس میں کچھ ایسے لوگوں کا انتخاب کیا گیا تھا، جن کے کام پر تنقیدی مضامین لکھنے کا منصوبہ تھا۔ دانستہ یا نادانستہ اس میں شبلی کا نام شامل نہ ہوسکا تو مولانا حالی نے انھیں لکھا:

www.shibliacademy.org

> جن لوگوں کو آپ نے اس غرض سے انتخاب کیا ہے کہ ان کے کام پر کریٹکل ایسے [critical essay] لکھے جائیں، ان میں سے ایک شخص کا نام ہونے اور ایک کا نہ ہونے سے نہایت تعجب ہوا۔ مولوی سید احمد صاحب میرے نہایت دوست ہیں اور اردو ڈکشنری لکھنے میں جو محنت اور استقلال انھوں نے دکھایا ہے، اس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔ ان کی ڈکشنری پر ۸۸ء میں ایک لمبا ریویو میں خود لکھ چکا ہوں، مگر ماڈرن اردو لٹریچر کا ہیرو میں اُن کو نہیں کہہ سکتا اور اس سے بھی زیادہ تعجب شمس العلما مولوی شبلی نعمانی کا نام چھوڑ دینے پر ہے۔ اس فروگذاشت کو سوا اس کے کہ آپ کو انتخاب کرتے وقت ان کا خیال نہ آیا ہو، میں اور کسی بات پر محمول نہیں کرسکتا۔ (۱۰)

خود مولوی عبدالحق نے بھی ایک واقعہ بیان کیا ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ شبلی پر بے جا تنقید پر بھی حالی خاموش نہیں رہتے تھے۔ اگرچہ ان کا لہجہ دھیما ہوتا تھا، لیکن وہ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے۔ ایک مرتبہ مولانا ظفر علی خاں نے دکن ریویو میں مولانا شبلی کی کسی کتاب یا رسالے پر دو مضامین لکھے، جن میں بقول مولوی عبدالحق، 'کسی قدر شوخی سے کام لیا گیا تھا'۔ جب حالی حیدرآباد جانا ہوا تو ان کی ظفر علی خاں سے ملاقات ہوئی۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں:

> دورانِ گفتگو میں انھوں نے متذکرے مضامین کے متعلق ظفر علی خاں کو ایسے شفقت آمیز پیرایے میں نصیحت کرنا شروع کی کہ ان سے کوئی جواب بن نہ پڑا اور وہ سر جھکائے آنکھیں نیچی کیے چپ چاپ سنا کیے۔ مولانا نے یہ بھی فرمایا، 'میں تنقید سے منع نہیں کرتا، تنقید بہت اچھی چیز ہے اور اگر آپ لوگ تنقید نہ کریں گے تو ہماری اصلاح کیونکر ہوگی، لیکن تنقید میں ذاتیات سے بحث کرنا یا ہنسی اڑانا منصب تنقید کے خلاف ہے'۔ (۱۱)

مندرجہ بالا اقتباسات سے ثابت ہو جاتا ہے کہ حالی کے دل میں شبلی کی بڑی قدر تھی، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ شبلی بھی 'بڑے صاحب دل آدمی' تھے۔ نواب محسن الملک کے نام ۱۹/ اپریل ۱۹۰۳ء کے خط میں شبلی نے حالی کو 'ہمارے بزرگ مولانا حالی' کہہ کر یاد کیا ہے۔ (۱۲) حالی نے شبلی کو حیاتِ سعدی کا نسخہ بھیجا تو شبلی نے اُس پر نہ صرف تبصرہ کیا، بلکہ مولوی محمد سمیع کو

www.shibliacademy.org

اس کے مطالعے کی ترغیب دلاتے ہوئے لکھا:

> یہ شیخ سعدی کی نہایت دلچسپ محققانہ سوانح عمری ہے۔ میں نے بے اختیار اس کو تمھارے لیے پسند کیا اور مولوی حالی صاحب کو لکھ دیا ہے کہ وہ تمھارے نام بھیج دیں۔ دیکھو، کہیں واپس نہ جائے، قیمت ایک روپیہ چار آنے ہے۔ واقعی بے مثل ہے اور تم کو اپنے پاس رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اس کتاب کے اور خریدار پیدا کرنے چاہئیں۔ (۱۳)

گویا مولوی صاحب جن معنوں میں مولانا حالی کو 'بڑے صاحب دل آدمی' قرار دیتے ہیں، شبلی بھی انھی اوصاف سے متصف تھے۔ اس بات کے ثبوت میں ایک اور مثال پیش کی جا سکتی ہے، یعنی جب شعرالعجم کی دوسری جلد میں شیخ سعدی کے حالات قلم بند کرنے کا وقت آیا تو شبلی نے حاشیے میں حالی کو درج ذیل الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا:

> مولوی الطاف حسین صاحب حالی نے حیاتِ سعدی میں سعدی کے حالات اور شاعری پر جو کچھ لکھ دیا، اس کے بعد کچھ لکھنا بے فائدہ ہے، لیکن بعض تعلیم یافتہ دوستوں نے حد سے زیادہ اصرار کیا اور آخر مجبوراً لکھنا پڑا۔ (۱۴)

شبلی یادگارِ غالب کے متعلق بھی نہایت اچھی رائے رکھتے تھے۔ شیخ رشیدالدین انصاری کے کسی سوال کے جواب میں شبلی نے لکھا کہ 'مرزا غالب کے حالات وریویو حالی صاحب نے جس تفصیل سے لکھے ہیں، اس کے بعد کسی اور کتاب کی کیا ضرورت ہے'۔ (۱۵)

شبلی و حالی کے مابین اختلافات پر گفتگو کرنے کے بعد مہدی افادی کی طرح مولوی عبدالحق بھی وضاحت کرتے ہیں کہ 'مولانا شبلی کو مولانا حالی سے کوئی بغض نہ تھا'۔ (۱۶) سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مذکورہ دونوں بزرگوں کے دلوں میں کوئی بغض نہیں تھا تو پھر ان کے مابین مبینہ 'اختلافات' کو نمایاں کرنے کا کیا سبب تھا۔

حیاتِ شبلی میں سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ مولانا شبلی کو اپنے معاصرین میں مولانا حالی کے ساتھ سب سے زیادہ عقیدت، محبت اور اُلفت تھی، ساتھ ہی دو اقتباسات دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ 'یہ چوٹ مولانا حالی پر ہے'، حالانکہ دونوں اقتباسات میں حالی کا براہِ

www.shibliacademy.org

راست ذکر نہ تھا؛ البتہ حیاتِ جاوید سے متعلق ایک دو جملوں سے شبلی کی ناپسندیدگی ضرور ظاہر ہوتی ہے۔ حبیب الرحمٰن شروانی کے نام شبلی نے حیاتِ جاوید کو سید صاحب کی یک رخی تصویر اور مدلل مداحی قرار دیا۔(۱۷) اس سے پہلے وہ یہ بھی لکھ چکے تھے کہ حیاتِ جاوید کو میں لائف نہیں، کتاب المناقب سمجھتا ہوں اور وہ بھی غیر مکمل۔(۱۸)

چونکہ حالی کی نسبت سرسید سے شبلی کی قربت بہت زیادہ تھی، چنانچہ بقول شیخ محمد اکرام 'اگر ان (شبلی) کی طبیعت کو کسی معاصر کے حالات لکھنے گوارا ہوتے تو وہ حالی کی نسبت کہیں زیادہ مکمل اور زیادہ دلچسپ تصویریں پیش کرتے'۔ ان کے نزدیک 'حالی کا کام ایک ریسرچ سکالر کا تھا، انھوں نے سرسید کے کریکٹر اور کارناموں کے بنیادی پہلوؤں اور بنیادی احسانات کو روز روشن کی طرح عیاں کر دیا، لیکن پھر بھی کئی اہم معاملات کے اہم پہلو رہ گئے ہیں'،(۱۹) اور آل احمد سرور نے حالی کی اس کمزوری کی طرف اشارہ کیا تھا کہ 'وہ وہاں بھی خاموش رہتے ہیں، جہاں خاموشی گناہ ہے'، چنانچہ 'انھوں نے سرسید کی بہت سے کوتاہیوں کی تاویلیں کی ہیں'۔(۲۰)

حالی سے متعلق شبلی کے مذکورہ بالا خیالات پر خود ان کے قریبی دوست مہدی افادی نے سخت ردِ عمل کا اظہار کیا تھا۔ اگر چہ ان کا یہ کہنا ادبی تنقید کا حصہ نہیں بن سکتا کہ 'شیش محل میں بیٹھ کر اوروں پر پتھر پھینکنا ایک خوش ادائی سہی، لیکن کیا دانائی بھی ہے'،(۲۱) البتہ ان کا یہ سوال قابلِ توجہ ہے کہ 'بلحاظِ فن حالی کے جس اقتصار کی طرف نیک نیتی سے شبلی کا ذہن منتقل ہوا ہے، خود ان کی تصنیفات میں یہ رعایت کہاں تک ملحوظ رکھی گئی ہے، یعنی المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق اور الغزالی میں انسانی کمزوریاں کس حد تک اُبھار کر دکھائی گئی ہے؟'۔(۲۲)

بہر حال کسی ہم عصر کی ایک کتاب پر تنقیدی رائے سے معاصرانہ چشمک کا مذکور غالباً عجلت پسندی ہے، ورنہ تو شبلی مولانا حالی کے علم وعرفان کے نہ صرف قائل تھے، بلکہ انھیں خود پر برتری دیتے تھے۔ خود کو دریا اور حالی کو کنویں سے تشبیہ دیتے ہوئے انھوں نے اس امر کا اعتراف کیا:

> جب تک کافی موادِ تحریر موجود نہ ہو، میں ایک قدم بھی نہیں چل سکتا، مگر حالی کی نکتہ آفرینی اس کی محتاج نہیں۔ اُن کی دقیقہ رس اور نکتہ سنج طبیعت ایسی جگہ سے مطلب نکال لاتی ہے، جہاں ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا۔(۲۳)

www.shibliacademy.org

اس کے ثبوت میں سید سلیمان ندوی کا درج ذیل بیان نہایت اہم ہے:

مولانا کو اپنے معاصرین میں مولانا حالی کے ساتھ سب سے زیادہ عقیدت، محبت اور الفت تھی اور اُن کی دقت نظر اوران کی سخن فہمی کے ہمیشہ مداح رہے۔ فرماتے تھے کہ وہ جوہر کو خوب سمجھتے تھے اور بڑی نازک تنقید کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ جاحظ کی کتاب البیان والتبیین جب نئی نئی چھپ کر آئی تو مجھے وہ بے ترتیب اور پراگندہ معلوم ہوئی۔ رات کو مولانا حالی آئے اور وہ کتاب مانگ کر لے گئے۔ صبح کو واپس کی تو فرمایا کہ ''یہ نثر کا حماسہ ہے''۔ مولانا (شبلی) کہتے تھے کہ ان کے اس ایک فقرے نے کتاب کے موضوع کو میرے سامنے آئینہ کر دیا اور اس کی ترتیب کا وہ پہلو میرے سامنے آیا، جو پہلے سامنے نہ تھا۔(۲۴)

جنوری ۱۸۹۴ء میں جب شبلی کو ''شمس العلما'' کا خطاب ملا تو علی گڑھ کالج کی علمی مجلسوں نے ۱۹؍جنوری کو ان کے اعزاز میں ایک بڑا جلسہ ترتیب دیا، جس میں جملہ اکابر کالج نے شرکت کی، بالخصوص سرسید احمد خاں، سید محمود، نواب محسن الملک، نواب مزمل اللہ خاں، مسٹر بیک (پرنسپل کالج)، پروفیسر آرنلڈ، جسٹس سید کرامت حسین (پروفیسر)، خواجہ غلام الثقلین، مولانا ظفر علی خاں، مولوی بہادر علی، بعض طلبہ اور مولانا الطاف حسین حالی شامل تھے۔ دیگر اکابر کی طرف سے تہنیتی تقاریر کے علاوہ اس جلسے کی خاص بات مولانا حالی کا تیرہ اشعار پر مشتمل قصیدہ ''من الحبیب الی الحبیب ''تھا، جوانھوں نے اس موقعے کے لیے لکھا تھا۔ قصیدے کے اولین تین اشعار پیش کیے جاتے ہیں: (مترجمہ سید سلیمان ندوی)

یا وحیداً من الکرام فریداً   و عزیزاً کمثل علقٍ نفیس

(اے بڑے آدمیوں میں یکتا اور یگانہ اور نادر الوجود، مثل نفیس و نادر چیز کے)

انت اولی بان تُلَقَّبَ شمساً   بل بَاَنْ یَّجْعَلون شمس الشموس

(تو اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ تجھ کو آفتاب کا لقب دیا جائے، بلکہ اس بات کا کہ تجھ کو آفتابوں کا آفتاب قرار دیا جائے)

انت شمسُ الھُدیٰ ولستَ بشمس   یعتریھا الخنوس بعد الخنوس

www.shibliacademy.org

(تو ہدایت کا آفتاب ہے اور وہ آفتاب نہیں، جس کو غروب پر غروب لاحق ہوتا ہے) (۲۵)

اس قصیدے کا جواب شبلی نے یورپی خواتین و افسران اور روسا و طلبہ علی گڑھ کالج کی طرف سے اسٹریچی ہال میں ۱۷ر فروری ۱۸۹۴ء کو منعقدہ ایک عظیم الشان جلسے میں دیا، جس میں رسم خلعت اور عطائے خطاب سرکاری طور پر ادا کی گئی۔ اس موقع پر اپنے خطاب کے آخر میں شبلی نے کہا:

> عطائے خطاب کی تقریب میں اکثر بزرگانِ قوم نے مبارک بادی کے جو خطوط لکھے اور میرے رتبہ اور حالت سے بہ درجہا بڑھ کر جن الفاظ میں قدردانی کا اظہار کیا، ان کا اثر اگر چہ یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ میں 'ایاز قدر خود بشناس' کا مقولہ بھول جاتا، تاہم کچھ شبہ نہیں کہ وہ تحریریں میرے دائمی شرف و عزت کی باعث ہیں اور میں ان بزرگوں کا جس قدر شکریہ کروں، کم ہے۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں اور آج بھی جہاں اسلامی حکومت ہے، وہاں کے حکومت کے عطا کردہ خطابات سے قومی خطابات کی عزت زیادہ کی جاتی ہے، اس لحاظ سے میری اس عزت افزائی کی نسبت ان بزرگانِ قوم کی طرف سے پسندیدگی اور خوشی کا اظہار، جو ہماری قوم کے جائز قائم مقام ہیں؛ علی الخصوص لسان الملک، فخر قوم اور مخدوم قوم مولانا الطاف حسین صاحب حالی دام مجدہ کی نظم، جو جنابِ موصوف نے اس موقع پر لکھی ہے، میرے لیے تمغائے فخر اور سند عزت ہے۔ بے شبہ یہ وہ بڑی سے بڑی عزت ہے، جو مجھ کو حاصل ہوسکتی تھی اور جس کے حاصل ہونے پر مجھ کو اور کسی عزت کی خواہش نہیں ہوسکتی۔ (۲۶)

ایک طرف حالی کا خراجِ عقیدت تو دوسری جانب شبلی کی طرف سے حالی کی نظم کو تمغائے فخر اور سند عزت قرار دینے سے دونوں کے گہرے اور پُر خلوص تعلقات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ جب مولانا حالی کو 'شمس العلما' کا خطاب دیا گیا تو مولانا شبلی نے کہا کہ 'اب اس خطاب کی عزت بڑھ گئی ہے'۔ (۲۷)

۱۸۹۹ء میں شبلی کی علالت اس حد تک شدت اختیار کر گئی کہ انھیں زندگی کی امید نہ رہی۔ ایسے میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو گونڈہ کے ایک اسسٹنٹ سرجن ڈاکٹر مصطفیٰ خاں

www.shibliacademy.org

کی اعظم گڑھ تعیناتی سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ ’انھوں نے عجیب گرم جوشی سے علاج کیا اوراس سے کچھ فائدہ بھی ہے‘۔(۲۸) پھر کچھ امید بندھی تو ۱۱؍جون ۱۸۹۹ء کو انھی کو لکھا کہ ’اگر خدا نے صحت کامل دی تو میں اپنے تمام خالص دوستوں کو مدعو کروں گا، جن میں مولانا حالی، خواجہ عزیزالدین، میرولایت حسین وغیرہ ہوں گے‘۔(۲۹) اسی سلسلے میں شبلی نے گیارہ اشعار پر مشتمل ایک نظم لکھی، جس کے آخری دوشعر ملاحظہ کیجیے:

مژدۂ صحتِ من ہاں برسانند کنوں
ہر کسے را کہ بمن دعویٰ اخلاص و وفاست
می تواں گفت بہ مہدی و بہ حالی و عزیز
بہ شد آں بندہ کہ از حلقہ بگوشانِ شماست (۳۰)

مرض سے نجات کے بعد مذکورہ بالا ’قصیدہ کشمیریہ‘ تخلیق ہوا تو اس کی کاپیاں دوستوں کو بھی ارسال کیں۔ مولانا حالی کو بھی بھیجیں، جن کے جواب میں انھوں نے درج ذیل خط لکھا:

قصیدۂ کشمیریہ کی متعدد کاپیاں وصول ہوئیں۔ پہلے اس سے کہ آپ کے عطیے کا شکریہ ادا کروں، مجھ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے، جس نے مدتِ دراز کے بعد آپ کی صحت کا مژدہ آپ ہی کی زبان سے سنوایا۔ فی الواقع آپ کی حالت نازک ہوگئی تھی اور مرض کو حد سے زیادہ امتداد ہوگیا تھا، باوجودیکہ آب و ہوا کی بہت ضرورت تھی، مگر آپ کو اس کا موقع نہیں ملا۔ اب درحقیقت صرف خدا کے فضل پر اور بحسب ظاہر شفیق و ہمدرد معالج پر صحت کا انحصار ہے۔ اذا اراد اللّٰہ شیئاً ھیئا اسبابہ، ایسی حالت میں ڈاکٹر مصطفیٰ خاں صاحب کا اعظم گڑھ میں آنا صاف دلالت کرتا ہے کہ خداتعالیٰ کو ابھی آپ کی قومی خدمات کا سلسلہ بہت دیر تک جاری رکھنا منظور تھا۔ فالحمد اللّٰہ ثم الحمد للّٰہ علی ما انعم علینا با بقائکم و بنعمة وجوکم لدینا......۔(۳۱)

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حالی، شبلی کی صحت وسلامتی کے بارے میں فکرمند رہتے ہیں اوران کی صحت یابی کی اطلاع پاکر اللہ کے حضور شکر ادا کرتے ہیں۔ حالی کے مذکورہ بالا

www.shibliacademy.org

خط میں سات اشعار پر مشتمل 'قطعہ درشکر صحت یابی شمس العلما مولانا شبلی نعمانی' درج کیا، جس کا پہلا شعر پیش کیا جاتا ہے:

للہ الحمد پس از ناخوشی و رنجِ دراز
شبلیِ ما بہ مراد از سرِ بالیں برخاست (۳۲)

یہی نہیں، بلکہ انھیں شبلی کی فتوحات سے بھی خاص دلچسپی ہے، چنانچہ روم میں منعقدہ اورینٹل کانفرنس میں شبلی کی متوقع شرکت کے بارے میں استفسار کے ذریعے اپنے تعلق کا اظہار کرتے ہیں:

> مسٹر آرنلڈ کی تحریر سے اور نیز آپ کے اعلان سے، جو چودھویں (صدی؟) میں چھپا تھا، یہ معلوم ہوا تھا کہ اورینٹل کانفرنس میں، جو اس سال روم یا اٹلی میں ہونے والی ہے، آپ کا بھی ارادہ تشریف لے جانے کا ہے اور میں خیال کر رہا تھا کہ آپ روانہ ہو گئے ہوں گے، مگر قصیدۂ مذکور کے وصول ہونے سے معلوم ہوا کہ ابھی آپ اعظم گڑھ میں تشریف رکھتے ہیں۔ مجھے تاریخ روانگی ٹھیک طور پر یاد نہیں رہی۔ معلوم نہیں کہ ارادہ فسخ ہو گیا یا تاریخ معین ابھی نہیں آئی۔ (۳۳)

اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علی گڑھ کالج کے حالات سے دونوں کو دلچسپی تھی، چنانچہ جب کالج کے حالات زیادہ ہی ابتر ہو گئے تو شبلی کی طرح حالی بھی پریشان رہنے لگے:

> مسٹر بک کے مرنے کا قبل از وقت ایسا افسوس ہوا کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ سید محمود کی بے اعتدالیاں اب حد سے زیادہ بڑھ گئی ہیں اور لوگوں کو اُن کی آڑ میں کالج کو درہم برہم کرنے کا خاصا موقع مل گیا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ محسن الملک کو نواب لفٹنٹ گورنر نے نینی تال پر بلایا ہے۔ سید محمود پریزیڈنٹی سے علاحدہ کرنا نہایت ضرور ہے۔ کاش! ہز آنران کے برطرف کرنے کا مشورہ دیں۔ مسٹر ماریسن کو مسٹر بک کی جگہ پرنسپلی پر ولایت سے بلایا گیا ہے، مگر معلوم نہیں کہ انھوں نے تار کا کیا جواب دیا؟ دو نئے پروفیسر ولایت سے اور بلائے

www.shibliacademy.org

ہیں۔ سردست کالج کی حالت نہایت نازک ہے۔ خدا انجام خیر کرے۔ (۳۴)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کا یہ کہنا بجا ہے کہ ’شبلی کے علی گڑھ سے ترکِ تعلق کے بعد وہاں کے نازک حالات کا مولانا حالی نے ان سے جس انداز میں ذکر کیا ہے، وہ دونوں کے ذہنی اشتراک کا بھی پتا دیتا ہے‘۔ (۳۵)

۱۷ رمئی ۱۹۰۷ء کے روز اتفاقیہ بندوق چل جانے سے شبلی کے گزند پا کا واقعہ پیش آیا۔ اخبارات کے ذریعے یہ اطلاع ان کے تلامذہ، معتقدین اور احباب تک پہنچی تو ہر طرف سراسیمگی پھیل گئی، ایسے میں بہت سے عیادت کو آئے، بعض نے خطوط لکھ کر خیریت معلوم کی۔ حالی بھی شبلی کے ایک پاؤں کے ضائع ہو جانے پر افسردہ تھے اور ان کی عیادت کے لیے بھی بے قرار، لیکن ایک تو ان دنوں حالی نے آنکھ بنوائی ہوئی تھی اور ڈاکٹروں نے انھیں لکھنے پڑھنے سے بالکل منع کر دیا تھا، دوسرے کبرسنی، چنانچہ وہ فوری طور پر اعظم گڑھ تک کا سفر نہ کر سکے۔ ایسے میں ان کے صاحبزادے حامد حسن نعمانی کے نام ایک خط میں اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کرتے ہیں:

> آج تک جو کچھ اخبارات کے حوالے سے جناب مولانا (شبلی) کے حالات سنے گئے ہیں، ان سے کچھ تشفی نہیں ہوئی، اس لیے ناچار آپ (حامد حسن نعمانی) کو تکلیف دیتا ہوں کہ آپ میرا یہ خط مولانا کو دکھا کر اور جو کچھ وہ اپنا حال لکھوائیں، اس کو قلم بند کر کے از راہِ لطف میرے پاس بھیج دیں، نیز یہ بھی (کذا) لکھیں کہ بمبئ ڈاکٹر رجب علی، جو مولانا کو وہاں سے بلاتے ہیں، وہاں جانے کا ارادہ ہے یا نہیں۔...... مولانا کے دیکھنے کو اعظم گڑھ آنے کا بھی قصد ہے، مگر اب تک ایسے موانع پیش آتے رہے کہ یہ ارادہ پورا نہیں ہو سکا۔ اگر لکھنؤ آنا ہوا تو اعظم گڑھ آنے سے پہلے آپ کو اطلاع دوں گا۔ مولانا کی خدمت میں بصد حسرت دیدار و اشتیاق زیارتِ سلام و نیاز کہہ دیجیے گا۔ (۳۶)

شبلی کی زندگی کا یہ حادثہ ایک طرف ایک المیے کا باعث بنا تو دوسری جانب اس واقعے کی کئی ایک شاعرانہ توجیہات بھی سامنے آئی۔ شبلی کے تلامذہ اور بعض احباب نے اس سانحے پر رباعیات و قطعات لکھے، جو سید سلیمان ندوی کے سپرد کر دیے گئے، جنھوں نے یہ تمام شعری کاوشیں

www.shibliacademy.org

الندوہ کے دو شماروں (ستمبر اور اکتوبر) میں شائع کر دی۔ ان رباعیات کو دیکھ کر مولانا حالی نے بھی ایک رباعی کہی اور منیجر الندوہ کو بھیج دی۔ حالی نے لکھا:

> رسالہ الندوہ میں مولانا شبلی کے احباب کی رباعیات دیکھ کر مجھے بھی یہ خیال ہوا کہ ان کے زمرۂ احباب میں ہونے کا فخر حاصل کروں، لہٰذا ذیل کے چار مصرعے موزوں کر کے آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں، الندوہ کے کسی آئندہ نمبر میں ان کو بھی درج فرما دیجیے گا:

شبلی کہ گزندِ پاش بر دل شکن است
با خستگیش خجستگی مقترن است
چنداں کہ بکاھند فزایند اینجا
کاراستن چمن ز پیراستن است (۳۷)

حالی کے ان جذبات پر شبلی نے الندوہ کے شمارہ دسمبر ۱۹۰۷ء میں 'مولانا حالی کی ذرہ نوازی' کے عنوان سے ایک مختصر سا شذرہ لکھا، جس میں حالی کے مذکورہ خط اور رباعی کے اندراج کے بعد ان الفاظ میں اپنی نیاز مندی کا اظہار کیا:

> مولانا کا میری نسبت ایسے خیالات ظاہر کرنا محض ان کی ذرہ نوازی ہے۔ وہ میرے احباب میں شامل ہونے کا ننگ گوارا فرماتے ہیں، لیکن میری عزت یہ ہے کہ مجھ کو اپنے نیاز مندوں کے زمرے میں شامل ہونے کی اجازت دیں۔ اب چند ہی ایسی صورتیں باقی رہ گئی ہیں، جن کو دیکھ کر قدما کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، خدا ان بزرگوں کا سایہ قائم رکھے، آمین۔ (۳۸)

۱۹۰۸ء میں شبلی کی فارسی نظموں کا مجموعہ دستۂ گل شائع ہوا تو حالی کی خدمت میں بھی پیش کیا۔ یہ وہ مجموعہ ہے، جس میں عطیہ سے متعلق 'زیادہ شوخ اور آزاد اشعار قلم سے نکل گئے' تھے۔ (۳۹) جب یہ مجموعہ حالی کے مطالعے میں آیا تو وہ پکار اٹھے:

> کوئی کیونکر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے، جس نے سیرۃ النعمان، الفاروق اور سوانح مولانا روم جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں۔ غزلیں کا ہے کو ہیں،

www.shibliacademy.org

شراب دو آتشہ ہے، جس کے نشے میں خمار چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے۔ غزلیاتِ حافظ کا جو حصہ محض رندی و بے باکی کے مضامین پر مشتمل ہے، ممکن ہے کہ اس کے الفاظ میں زیادہ دل ربائی ہو، مگر خیالات کے لحاظ سے تو یہ غزلیں اس سے بہت زیادہ گرم ہیں۔ (۴۰)

حالی نے اس مجموعہ کلام پر شبلی کو یوں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا کہ 'میرا ارادہ تھا کہ اپنا فارسی کلام نظم و نثر، جو کچھ ہے، اس کو بھی چھپوا کر شائع کر دوں، مگر دستۂ گل دیکھنے کے بعد میری غزلیں خود میری نظر سے گر گئیں ...... و لیس فی ذلک شائبة من التصنع'۔ (۴۱)

۱۹۰۹ء میں شبلی کا دوسرا مجموعہ کلام بوئے گل شائع ہوا، جس کے بارے میں خود شبلی کو خود احساس تھا کہ بالکل پھیکا ہے (۴۲)، شبلی کے مطابق:

بوئے گل کی نسبت تمام اہل نظر کی رائے ہے کہ دستۂ گل اور اس میں جذب و سلوک کا فرق ہے۔ واقعی دونوں کے شانِ نزول اسی قدر مختلف ہیں، جس قدر دونوں کے جوش و سرمستی میں فرق ہے۔ لیکن مولانا حالی سب سے مختلف الرائے ہیں۔ وہ بوئے گل کو حال بتاتے ہیں اور دستۂ گل کو قال۔ (۴۳)

مذکورہ بالا تمام بحث سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ حیات جاوید پر چند جملوں کے علاوہ شبلی کے زبان و قلم سے حالی سے متعلق شاید ہی کوئی ناگوار جملہ ادا ہوا ہو۔ رہی بات حیات جاوید پر اعتراض کی تو بقول سید سلیمان ندوی، 'یہ مولانا حالی کی ذات پر نہیں، جن کی وہ بے حد قدر کرتے تھے، بلکہ سرسید کے ناتمام بایگرفی (سوانح عمری) پر اظہارِ خیال ہے'۔ سید صاحب کے خیال میں، 'اگر حیات جاوید کا مصنف مولانا کا کوئی عزیز بھی ہوتا، تب بھی وہ اس تصنیف کے متعلق اسی قسم کی رائے قائم کرتے' (۴۴)۔ وجہ محض یہ تھی کہ شبلی سرسید کے دور آخر کی پالیسیوں سے متفق نہ تھے۔ سرسید سے اختلاف کرنے والوں میں ڈپٹی نذیر احمد بھی شامل تھے، جن کے معروف ناول ابن الوقت کو سرسید کا خاکہ قرار دیا جاتا ہے اور سرسید سے اختلاف تو حالی کو بھی تھا، اس امر کی تصدیق آلِ احمد سرور بھی کرتے ہیں:

حالی بھی ایک زمانے میں حیات جاوید لکھنے کا ارادہ ترک کر چکے تھے

www.shibliacademy.org

> اور سرسید کے مرنے سے کچھ پہلے، پیسہ اخبار میں ان کا، وقار الملک اور محسن الملک کا ایک بیان سرسید کے خلاف نکلنے والا تھا کہ ان کی وفات کی خبر نے قدرتی طور پر اسے روک دیا۔ (۴۵)

سرسید سے حالی کے درج بالا اختلاف کے بعد شبلی وحالی کی 'معاصرانہ چشمک' میں کچھ حقیقت نہیں رہتی، بلکہ ثابت ہوجاتا ہے کہ دونوں بزرگوں کے درمیان احترام کا رشتہ زندگی بھر قائم رہا اور وہ ایک دوسرے کے علمی کاموں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے رہے۔

حوالے اور حواشی

(۱) مہدی افادی: افادت مہدی مرتبہ مہدی بیگم، اعظم گڑھ، معارف پریس، ۱۹۳۹ء طبع سوم، ص ۳۱۶۔ ۳۴۲۔ (۲) ایضاً ص ۳۲۳۔ (۳) ایضاً ص ۳۲۸۔ (۴) ایضاً ص ۲۴۲۔ (۵) آل احمد سرور: مقدمہ مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں مصنفہ عبداللطیف اعظمی، دہلی: شبلی اکادمی، ۱۹۴۵ء، ص ۲۔ ۳۔ (۶) عبداللطیف اعظمی: مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں، ص ۵۵۔ (۷) مولوی عبدالحق بنام عبداللطیف اعظمی، مرقومہ ۹/ جولائی ۱۹۶۰ء، مطبوعہ ادیب علی گڑھ ستمبر ۱۹۶۰ء، ص ۱۳۔ شیخ محمد اکرام: یادگار شبلی، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۹۴ء، ص ۲۳۶۔ (۹) مولانا حالی بنام شبلی نعمانی، مرقومہ ۱۸/ ستمبر ۱۸۹۹ء، مشمولہ علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط مرتبہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، اعظم گڑھ: ادبی دائرہ، ۲۰۱۳ء، ص ۴۴۔ ۴۶ (۱۰) مولانا حالی بنام مولوی عبدالحق، مشمولہ مکتوباتِ حالی اول، مرتبہ خواجہ سجاد حسین، پانی پت: حالی پریس، ۱۹۲۵ء، ص ۳۴۔ (۱۱) مولوی عبدالحق بنام عبداللطیف اعظمی، محولہ بالا ۷۔ (۱۲) شبلی نعمانی بنام نواب محسن الملک، مرقومہ ۱۹/ اپریل ۱۹۰۳ء، مشمولہ مکتوبات شبلی مرتبہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، اعظم گڑھ: ادبی دائرہ، ۲۰۱۲ء ص ۳۴۔ (۱۳) شبلی نعمانی بنام مولوی محمد سمیع، مرقومہ ۱۰/ مارچ ۱۸۸۶ء، مشمولہ مکاتیب شبلی اول، مرتبہ سید سلیمان ندوی، اعظم گڑھ: دار المصنّفین، ۱۹۱۶ء، ص ۷۹۔ (۱۴) شبلی نعمانی: شعر العجم دوم، اعظم گڑھ: دار المصنّفین شبلی اکیڈمی، طبع جدید ۲۰۱۰ ص ۲۵۔ (۱۵) شبلی نعمانی بنام شیخ رشید الدین انصاری، ۲۹/ اگست ۱۹۰۷ء، مشمولہ مکاتیب شبلی اول، ص ۳۱۸۔ (۱۶) مولوی عبدالحق بنام عبداللطیف اعظمی، محولہ بالا ۷۔ (۱۷) شبلی نعمانی بنام حبیب الرحمٰن شروانی، مرقومہ ۱۹/ جنوری ۱۹۰۲ء، مشمولہ مکاتیب شبلی اول ص ۱۴۱، ۱۴۲۔ (۱۸) شبلی نعمانی بنام حبیب الرحمٰن شروانی، مرقومہ ۷/ اگست ۱۹۰۰ء، مشمولہ مکاتیب شبلی اول، ص ۱۳۲۔ (۱۹) شیخ محمد اکرام: یادگار شبلی، ص ۲۳۶۔ ۲۳۷۔ (۲۰)

www.shibliacademy.org

آل احمد سرور: تنقیدی اشارے، لکھنؤ: ادارہ فروغِ اردو، ۱۹۵۵ء۔ (۲۱) مہدی افادی: افاداتِ مہدی، ص ۳۳۰۔ (۲۲) مہدی افادی: افادات مہدی، ص ۳۳۳۔ (۲۳) شبلی نعمانی بحوالہ سید سلیمان ندوی: حیات شبلی، اعظم گڑھ: دارالمصنّفین، ۱۹۴۳ء، ص ۸۰۲۔ (۲۴) سید سلیمان ندوی: حیات شبلی، ص ۸۰۱۔ (۲۵) مولانا حالی بحوالہ سید سلیمان ندوی: حیات شبلی، ص ۲۵۳-۲۵۴۔ مکمل قصیدے کے لیے رجوع کیجیے، مولانا حالی: کلیات نظم حالی دوم، مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۰ء، ص ۴۴۰-۴۴۱۔ (۲۶) شبلی نعمانی بحوالہ سید سلیمان ندوی: حیات شبلی، ص ۲۶۲۔ (۲۷) مولوی عبدالحق بنام عبداللطیف اعظمی، محولہ بالا ۷۔ (۲۸) شبلی نعمانی بنام حبیب الرحمٰن شروانی، مرقومہ ۱۸۹۹ء، مشمولہ مکاتیب شبلی اول ص ۱۲۰۔ (۲۹) شبلی نعمانی بنام حبیب الرحمٰن شروانی، مرقومہ ۱۸/ جون ۱۸۹۹ء، مشمولہ مکاتیب شبلی اول، ص ۱۲۱۔ (۳۰) شبلی نعمانی: کلیات شبلی فارسی مرتبہ سید سلیمان ندوی، اعظم گڑھ: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، طبع جدید ۲۰۰۵ء، ص ۲۶۔ (۳۱) مولانا حالی بنام شبلی نعمانی، مرقومہ ۱۸/ستمبر ۱۸۹۹ء، مشمولہ علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط، ۲۰۱۳ء، ص ۴۲۔ (۳۲) مکمل قطعے کے لیے رجوع کیجیے، مولانا حالی: کلیات نظم حالی دوم، ۴۱۸-۴۱۹۔ (۳۳) ایضاً ص ۴۳۔ (۳۴) ایضاً ص ۴۳۔ (۳۵) ڈاکٹر محمد الیاس: علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط، ص ۴۴۔ (۳۶) مولانا حالی بنام حامد حسن نعمانی، مرقومہ ۱۹۰۷ء، مشمولہ علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط، ص ۱۵۲-۱۵۳۔ (۳۷) مولانا حالی بنام منیجر الندوہ، مشمولہ مقالات شبلی ہشتم، مرتبہ سید سلیمان ندوی، اعظم گڑھ: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، طبع جدید ۲۰۱۰ء، ص ۱۹۲۔ رباعی کے لیے رجوع کیجیے، مولانا حالی: کلیات نظم حالی دوم، ص ۳۷۷۔ (۳۸) شبلی نعمانی: مقالات شبلی ہشتم، ص ۱۹۲۔ (۳۹) شبلی نعمانی بنام زہرا فیضی، مرقومہ ۲/ مئی ۱۹۰۸ء، مشمولہ خطوط شبلی، بھوپال: ظل السلطان بک ایجنسی، ص ۹۴۔ (۴۰) مولانا حالی بنام شبلی نعمانی، مرقومہ ۱۹۰۸ء، مشمولہ علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط، ص ۴۶۔ (۴۱) ایضاً، ۴۶-۴۷۔ (۴۲) شبلی نعمانی بنام ابوالکلام آزاد، مرقومہ ۱۵/ جون ۱۹۰۹ء، مشمولہ مکاتیب شبلی اول، اعظم گڑھ: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، طبع جدید ۲۰۱۰ء، ص ۲۵۱۔ (۴۳) شبلی نعمانی بنام مہدی حسن افادی، مرقومہ ۸/ مئی ۱۹۰۹ء، مشمولہ مکاتیب شبلی دوم، مرتبہ سید سلیمان ندوی، اعظم گڑھ: دارالمصنّفین، ۱۹۱۷ء، ص ۲۵۲۔ (۴۴) سید سلیمان ندوی: حیات شبلی، ص ۸۰۷-۸۰۸۔ (۴۵) آل احمد سرور: مقدمہ مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں، ص ۶۔

www.shibliacademy.org

علامہ شبلی نعمانی اور انجمن اسلام

جناب شمیم طارق

''کلیات شبلی'' (اردو) میں نوٹ کے ساتھ ایک نظم شامل ہے جس کا عنوان ہے، ''بمبئی کی وفادار انجمن''۔ نوٹ اور نظم یہ ہے:

''جنگ بلقان کے زمانے میں جب تمام ہندوستان میں وزرائے برطانیہ کی طرز سیاست کے خلاف جوش وغصہ کی لہر دوڑ رہی تھی، بمبئی میں ایک گمنام وفادار اسلامی انجمن بمبئی کے نام سے اخبارات میں مسلمانوں کے عام خیالات کی مخالفت میں اس کی تجویزیں شائع ہوتی تھیں، مولانا نے اس نظم میں اس کی پردہ دری کی ہے''۔

ایک دن تھا کہ وفاداریِ مسلم کی متاع — ہر جگہ عام تھی، اور نرخ میں ارزانی بھی
دفعتاً ہوگئی ہنگامۂ بلقان میں گم — قوم کو سخت مصیبت تھی پریشانی بھی
ہاتھ آنے کا تو کیا ذکر، پتہ تک بھی نہ تھا — ڈھونڈنے والوں نے گو خاک بہت چھانی بھی
ہو مبارک تجھے اے بمبئی اے ناز دکن — کہ ترے تاج میں ہے طرۂ سلطانی بھی
تیرے بازار میں وہ یوسف گم گشتہ ملا — جس کا مشتاق تھا خود یوسف کنعانی بھی
یہ الگ بات ہے، اندھوں کو وہ آئے نہ نظر — گو اسی زمرہ میں ہے ''یوسف ثوبانی'' بھی

مندرجہ بالا نظم اور اس کے ساتھ نوٹ پڑھ کر بعض لوگوں کو مغالطہ ہوا ہے کہ وفادار اسلامی انجمن بمبئی سے انجمن اسلام مراد ہے۔ انجمن اسلام کوئی گمنام ادارہ نہیں ہے۔ ۱۸۷۴ء سے ہی اس

ممبئی۔

www.shibliacademy.org

کو شہرت و مقبولیت حاصل ہے جب اس کی تاسیس عمل میں آئی تھی اور اس کے بعد دن بہ دن اس کی شہرت و مقبولیت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

علامہ شبلی نعمانی کو انجمن اسلام اور اس کے بانیان و ذمہ داران سے ہمیشہ قربت حاصل تھی مگر سرسید کے بنائے ہوئے کالج سے ان کی علاحدگی کے بعد یہ قربت اور زیادہ بڑھ گئی۔

مسلمانوں کی دینی اور جدید تعلیمی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ۱۸۷۵ء میں انجمن اسلام نے اپنا پہلا اسکول قائم کرنے کی تجویز پاس کی۔ باب اللہ ٹینک اور پھر پائیدھونی کی مختلف عمارتوں میں تدریسی عمل شروع ہوا۔ ۲۷؍ فروری ۱۸۹۳ء کو انجمن اسلام کی شاندار عمارت کا افتتاح اس وقت کے بمبئی کے گورنر لارڈ ہیرس نے کیا۔ یہ عمارت آج بھی سی ایس ٹی ریلوے اسٹیشن ممبئی کے قریب واقع ہے اور ممبئی کی پرشکوہ عمارتوں میں شمار کی جاتی ہے، اس عمارت (جس کو ہیریٹیج قرار دیا گیا ہے) کے ارد گرد کئی اور کثیر منزلہ عمارتیں بن چکی ہیں مگر پہلی عمارت کی شان ہی کچھ اور ہے۔

دھیرے دھیرے یہ پودا چھتنار درخت میں تبدیل ہو چکا ہے اور اس وقت انجمن اسلام کے مختلف اداروں کی تعداد ۹۸ ہے۔ اس کے ممبئی (سی ایس ٹی، بائیکلہ، ناگپاڑہ، ممبئی سینٹرل، ماہم) مضافات ممبئی (باندرہ، ورسوا، کرلا)، نوی ممبئی (تربھے، واشی، نیو پنویل) پونے (بند گارڈن)، شولاپور، پنچ گنی (ضلع ستارا)، ماتھیران (ضلع رائے گڑھ) میں جو کمپلیکس ہیں ان میں انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ، انسٹی ٹیوٹ آف ہوٹل مینجمنٹ، کالج آف ہوم سائنس، دو انجینئرنگ کالج، ۵ پالی ٹیکنکس، کالج آف فارمیسی، کالج آف آرکی ٹیکچر، حاجی عبدالرزاق کالسیکر ہاسپٹل اور ڈاکٹر محمد اسحاق جم خانہ والا طبیہ کالج، اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ۳۰؍ یتیم خانے، ۲؍ سہارا یونٹ، اسکولوں اور کالجوں کی الگ الگ لائبریریوں کے علاوہ کریمی لائبریری، ادبی پرنٹنگ پریس، اسپورٹس اکیڈمی، رحمانی۔۳۰ (رحمانی۔۳۰ کے طرز پر آئی آئی ٹی کے لیے ۳۰ طلباء کی مفت ٹریننگ کا انتظام)، ٹیکنیکل ہائی اسکول اور جونیئر کالج، انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ اور ۲؍ ہاسٹل طلباء اور طالبات کی تعلیمی ضرورتوں کی تکمیل کر رہے ہیں۔ انجمن اسلام کے مختلف اداروں میں تقریباً ایک لاکھ دس ہزار طلباء زیر تعلیم ہیں اور تقریباً ساڑھے تین ہزار اساتذہ ان کو بہترین تعلیم سے آراستہ کر رہے ہیں۔ اس کے کچھ اور منصوبے مختلف مراحل میں ہیں اور وہ دن دور نہیں جب انجمن اسلام کے

www.shibliacademy.org

سولا پور میں ایک اینٹگر یٹیڈ کمپلیکس۔ پنچ گنی میں میڈیکل کالج۔ کالج آف پیور سائنسز۔ کالج آف لا۔ ویمنس ڈگری کالج۔ ایک مزید کالج آف کیٹرنگ اینڈ ہاسپٹلٹی مینجمنٹ۔ کالج آف نرسنگ۔ ماتھیران میں ٹیچرز اکیڈمی، ساتھ ہی صابو صدیق کیمپس میں سینٹر فار پوسٹ گریجویشن اینڈ ریسرچ ان انجینئرنگ کا قیام بھی عمل میں آجائے گا۔

انجمن اسلام کے تعلیمی اداروں کا معیار کتنا بلند ہے اس کا اندازہ ریاستی اور مرکزی حکومتوں کے مختلف شعبوں سے حاصل ہونے والی توصیفی اسناد سے کیا جا سکتا ہے۔ محمد حاجی صابو صدیق انجینئرنگ کالج اور محمد حاجی صابو صدیق پالی ٹیکنک کے تعلیمی معیار اور یہاں کے اساتذہ اور طلباء کی کارکردگی کی ستائش عالمی سطح پر کی گئی ہے۔

حاجی عبدالرزاق کالسیکر ٹیکنیکل کیمپس (نیو پنویل) میں واقع پالی ٹیکنک مہاراشٹر کا دوسرا سب سے بڑا پالی ٹیکنک ہے۔ انجمن اسلام کے دوسرے اداروں کی بھی توصیف وستائش کی جاتی رہی ہے۔ اس کی غیر تدریسی ثقافتی اور فلاحی سرگرمیوں کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے۔ مقابلۂ دینیات اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو گذشتہ چار سال سے آل انڈیا سطح پر منعقد کیا جا رہا ہے اور جس میں دی جانے والی شیلڈز میں ایک ''شبلی نعمانی شیلڈ'' ہے۔

انجمن اسلام کے قیام میں جن شخصیتوں نے تاریخی کردار ادا کیا ان میں ایک اہم نام جسٹس بدرالدین طیب جی کا ہے جو انڈین نیشنل کانگریس کے تیسرے صدر اور بمبئی ہائی کورٹ کے پہلے ہندوستانی جج ہوئے اور مدرستہ العلوم سرسید احمد خاں کے خواب کی تعبیر ہے جو ان کی زندگی ہی میں ایم اے او کالج بنا اور ان کے انتقال کے بعد یونیورسٹی کا درجہ حاصل کر کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کہلایا۔ بدرالدین طیب جی کا تعلق اس روشن خیال تجارت پیشہ طبقے سے تھا جو کلکتہ، ممبئی اور مدراس یعنی انگریز Presidencies میں وجود میں آیا اور انگریزوں سے تجارت کر کے دولت منداور جدید تر خیالات کا حامل ہوتا گیا(۱)۔ سرسید احمد خاں کا تعلق اس طبقے سے تھا جس کی معاش کا انحصار پہلے مغلیہ سلطنت کی اور پھر انگریزوں کی ملازمت پر تھا۔ بدرالدین طیب جی بدلتے ہوئے سیاسی سماجی حالات اور تعلیمی منظر نامے میں مسلمانوں کو مغربی تعلیم دلانے اور ان کی ہمہ جہت ترقی کے متمنی تو تھے مگر ان کے ذہن میں تعلیم کا تصور بہت وسیع تھا۔ جب وہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے برطانیہ جانے والے

www.shibliacademy.org

تھے اس وقت انھوں نے گھر والوں کے دلوں میں پیدا ہونے والے اندیشوں کو دور کرنے کے لیے ایک عہد نامہ تیار کر کے خود کو اس کا مکلّف بنالیا تھا۔ اس عہد نامے سے ظاہر ہے کہ تعلیم سے متعلق ان کا تصور عقیدے کو مستحکم رکھنے اور بزرگوں کی توقعات و تربیت کا ہر حال میں لحاظ رکھنے سے مشروط تھا۔ انہی کے لفظوں میں:

> ”.....میرے ایمان کی بنیادیں انگلستان سے واپس آنے پر اتنی ہی مضبوط رہیں گی جتنی کہ آج ہیں۔ اس میں ذرہ برابر فرق نہیں آئے گا۔ اور اگر کہیں معاملہ اس کے برعکس ہوا یا میں اپنے عہد سے پھر گیا تو مجھے اقرار ہوگا کہ مجھ سے زیادہ نالائق اس دنیا میں اور کوئی نہیں اور میں بیرسٹری کے لیے قطعی نااہل ثابت ہوں گا، نہ صرف اپنے والدین، اپنے خاندان اور دوستوں کے بلکہ اللہ کے سامنے بھی عہد شکنی کا مجرم قرار پاؤں گا“۔(۲)

برطانیہ سے واپس آنے کے بعد انھوں نے ثابت کردیا کہ وہ عہد کے پابند ہیں۔ عقیدے میں وہ عام مسلمانوں سے مختلف تھے۔ ”پردہ“ کے سلسلے میں بھی انھوں نے جو خیالات ظاہر کیے وہ مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں تھے مگر انھوں نے اپنے مذہبی خیالات دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش کبھی نہیں کی بلکہ صرف یہ اصرار کیا کہ مسلمان بچے جدید علوم اور انگریزی زبان سیکھنے کے ساتھ اپنی مذہبی بنیاد، ثقافتی پس منظر اور عربی فارسی اردو کی اہمیت کو یاد رکھیں۔ بقول لئیق فتح علی:

> The Muslims could not be expected to abonden their tradional culture and suspicions about a new kind of learning and education had to be slowly over come. So that the most important thing was to setup a school for Muslim boys which would teach Arabic and Persian as well as English and other more necessary subejects. (۳)

بدرالدین طیب جی کے اس تصور کو پروان چڑھانے میں علامہ شبلی نے بڑا اہم کردار ادا کیا

www.shibliacademy.org

تھا جو قیام علی گڑھ کے دوران ہی بدرالدین طیب جی سے ذہنی قربت حاصل کرتے جا رہے تھے۔

سر سید احمد خاں کا تعلیمی تصور بھی محدود نہیں تھا مگر ان کی پہلی ترجیح یہ تھی کہ مغربی تعلیم سے آراستہ ایک ایسا مسلم طبقہ تیار کیا جائے جو انگریز انتظامیہ میں شامل ہو کر اپنے حقوق کی بازیابی کی کوشش کرے۔ یہ تبھی ہو سکتا تھا جب انگریزوں کے دلوں سے یہ بات نکل جائے کہ ان کے خلاف مسلح مزاحمت (پہلی جنگ آزادی) کے اصل ذمہ دار مسلمان تھے اسی لیے انھوں نے پہلے ''اسبابِ بغاوت ہند'' لکھ کر انگریزوں کو یہ جتانے کی کوشش کی تھی کہ ہندوستانیوں نے اس لیے بغاوت کی کہ انھیں قانون ساز کاؤنسل میں نمائندگی نہیں ملی، ایسے قوانین بنائے اور نافذ کیے گئے جن سے صرف عیسائیت قبول کرنے والے مستفیض ہوتے تھے دوسرے لوگ نہیں، رعایا کی پریشانیوں کو سمجھنے اور ان کو دور کرنے کی انگریز سرکار نے کوئی کوشش نہیں کی، ہندوستانی صنعتیں خاص طور سے کپڑے کی صنعت تباہ کر دی گئی اور مسلمان و ہندو فوجی ایک ساتھ ایک ہی پلٹن میں رکھے گئے جس سے انھیں مل کر بغاوت کرنے کا موقع ملا۔

بدرالدین طیب جی ابتدا سے بھی پہلے کی اور پھر ابتدائی اور ثانوی تعلیم کو زیادہ اہم سمجھتے تھے کیونکہ شخصیت کی نشوونماء اور ذہن سازی میں سب سے اہم کردار ابتدائی اور ثانوی تعلیم ہی کا ہوتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات میں جب مسلم اقتدار کا خاتمہ ہو چکا تھا اور ہندوؤں کے برعکس جو ۱۸۱۶ء میں کلکتہ ہندو کالج کے قیام کے ساتھ مغربی تعلیم کی طرف متوجہ ہو چکے تھے، بدرالدین طیب جی کی خصوصی توجہ کا مرکز مسلمان تھے جو اپنے لیے کوئی سیاسی اور تعلیمی لائحہ عمل نہیں تیار کر سکے تھے۔

اس لیے وہ مسلمانوں کی ایسی جامع تعلیم کے خواہشمند تھے جس میں مغربی تعلیم، قومی ذہن اور ملی یا مذہبی احساس کی آمیزش ہو اور انھوں نے اس کی ابتدا پرائمری اور پرائمری سے بھی پہلے کی تعلیم سے کی اور ابتدائی تعلیم میں دینی تعلیم کو بھی شامل رکھا حالانکہ اس وقت انجمن میں جہاں سنی، شیعہ، خوجے، بوہرے یعنی کئی جماعتوں کے بچے اور بچیاں زیر تعلیم تھے، کوئی ایسا دینی نصاب تیار اور نافذ کرنا جو سب کے لیے قابلِ قبول ہو، بڑا نازک معاملہ تھا۔ مگر انجمن اسلام نے اس مشکل کا حل تلاش کر لیا اور دینی تعلیم کا ایک ایسا جامع نصاب تیار کرنے میں کامیابی حاصل کر لی جو ہر مسلک

www.shibliacademy.org

اور مکتب فکر کے لوگوں نے قبول کرلیا۔ بقول بدرالدین طیب جی:

> ”ہمارے اسکول میں تعلیم کا ایک پہلو ایسا تھا جس کی طرف ہم شروع ہی سے توجہ دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن اسے ہم صرف گذشتہ سال (۱۸۹۴ء) ہی میں عمل میں لا سکے۔ انجمن کی ہمیشہ یہی رائے رہی کہ مسلمانوں میں بعض جزوی اختلافات کے باوجود (جن کی بنیاد پر فرقے قائم ہیں) تعلیمات کا بہت بڑا حصہ مشترک ہے اور یہ نہ صرف ممکن بلکہ ضروری بھی ہے کہ اسلام کی وہ تعلیمات جو متنازعہ فیہ نہیں ہیں انجمن اسکول کے ان طلبہ کے ذہن نشین کرائی جائیں جو ابھی طفولیت کی منزل سے گزر رہے ہیں“۔(۴)

۱۸۸۴ء میں تقسیم انعامات کے موقع پر گورنر سر جیمس فرگوسن نے انجمن اسکول میں دینی نصاب پڑھائے جانے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ:

> ”جب کہ ہم لوگ خود بھی اپنے بچوں کے لیے دینی تعلیم کو اعلا اقدار کی تعلیم تصور کرتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ لوگوں کو بھی اپنے اسکول میں دینی تعلیم دینا عزیز ہو۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ آپ ان دوسرے اسکولوں سے فائدہ نہ اٹھائیں جو دوسرے فرقے کے لوگوں نے کھول رکھے ہیں“۔(۵)

یہ تبصرہ انجمن اسلام کے ذمہ داروں کی حوصلہ افزائی کا باعث بنا اور ۱۹۱۰ء میں کلاس شروع ہونے سے پہلے اسمبلی ہال میں تلاوت قرآن، سیرۃ طیبہ اور کسی اخلاقی موضوع پر مختصر تقریر کا سلسلہ بھی شروع کر دیا گیا۔ طلبہ کو بعض سورتیں حفظ کرنے کی بھی تحریک دلائی گئی، نماز کے لیے ایک کمرہ مختص کر دیا گیا اور نماز کی ادائیگی کے لیے جن چیزوں کی ضرورت تھی بوہروں کے سیدنا صاحب نے وہ تمام چیزیں بہ طور عطیہ مہیا کر دیں۔

اسی سال یعنی ۱۹۰۰ء میں ہی انجمن اسلام نے ”کنڈر گارٹن کلاسوں“ کا طریقۂ کار بھی اختیار کیا۔ تین سال بعد جب آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا تو اس

www.shibliacademy.org

کے مندوبین نے ’’کنڈر گارٹن‘‘ کلاسوں کے طریقۂ کار کو بڑی حیرت و مسرت سے دیکھا۔ کانفرنس کی رپورٹ میں اس کا ذکر ان لفظوں میں کیا گیا ہے:

> ’’.....اس (کنڈر گارٹن) طریقۂ تعلیم کو رواج ہوئے اس وقت گو ڈیڑھ سو برس گزر چکے ہیں لیکن ہندوستان اس وقت تک اس مشاہدے سے بے خبر اور لاعلم تھا۔ اس کا باقاعدہ انتظام سب سے پہلے مدرسۂ انجمن اسلام بمبئی میں کیا گیا اور ممبران کانفرنس کو پہلی مرتبہ اس طریقۂ تعلیم کو دیکھنے کا موقع ملا‘‘۔

انجمن اسلام کے تعلیمی تصورات، ماحول اور ابتدائی تعلیم کے دوران ثقافتی قدروں کو پروان چڑھانے کی کوشش اسی دور میں برگ و بار لانے لگی تھی جب اس کی کلاسیس دوسروں کی عمارتوں میں چل رہی تھیں، اس کی اپنی کوئی عمارت نہیں تھی۔

سرسید احمد خاں کے ذہن میں بھی اگرچہ علم اور تعلیمی نصاب کا بہت جامع تصور تھا مگر ان کی پہلی ترجیح انگریزوں کے بنائے ہوئے نظام تعلیم کو اپنانے اور حصول تعلیم کے بعد انگریزی حکومت کی انتظامیہ میں شریک ہونے کی تھی اس لیے ۲۴ رمئی ۱۸۷۵ء کو علی گڑھ میں جو مدرسۃ العلوم قائم کیا گیا وہ نویں جماعت سے شروع ہوتا تھا یعنی شروع ہی سے ان کی توجہ اعلیٰ تعلیم پر تھی (۶)۔ اس کے علاوہ یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ سرسید احمد خاں ایک خاص طبقے کو فوقیت دیتے تھے۔ سرکاری منصب ہی نہیں تعلیم کے معاملے میں بھی ان کی فکر طبقہ واریت سے مملو تھی۔ شبلی نعمانی نے اس طرزِ فکر کا محاسبہ کیا ہے:

> ’’نیشنل کانگریس کی مخالفت کی سب سے بڑی وجہ سرسید نے یہ ظاہر کی تھی کہ اگر مقابلہ کا امتحان جو نیشنل کانگریس کے مطلوبات میں ہے ہندوستان میں جاری ہوا تو کمینہ قوموں کو حکومت کی کرسیاں نصیب ہوں گی، اور ہندوستان کی شریف قومیں اپنے ملک کے ایک ادنیٰ درجہ کے شخص کا جس کی جڑ بنیاد سے واقف ہیں کبھی اپنی جان اور مال پر حاکم ہونا، پسند نہ کریں گے۔

www.shibliacademy.org

لیکن ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ بڑھئی، جلاہے، رائیں،
گاڑیں بڑے بڑے عہدے پر پہنچے اور بڑے بڑے تیس مار خانوں اور نسل
تیمور اور آل ہاشم نے ان کے گھر گردنیں جھکا دیں''۔(۷)

زمین داروں کے لڑکوں کو یہ فضا بہت راس آئی اور سرسید کے بنائے ہوئے کالج میں طبقہ واریت اور فرقہ واریت کو فروغ ہوا۔ پڑوسی ملک کے سابق سربراہ فیلڈ مارشل ایوب خاں نے اپنی سوانح ''آقا نہیں، دوست'' میں ایک صاحب کا حال لکھا ہے جو علی گڑھ کالج میں دسویں میں پڑھتے تھے اور ان کا لڑکا نویں میں۔ اس ایک واقعے سے بھی اس طرز فکر اور طرز زندگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جو سرسید کے ادارے میں رائج تھا۔ بدرالدین طیب جی ہر طبقے اور ہر مکتب فکر کے لوگوں کی تعلیم کے قائل تھے اس لیے ان کے ادارے میں مسلمانوں کے ہر مکتب فکر کے طلبا نہ صرف حکومت کا منظور شدہ نصاب بلکہ انجمن اسلام کا تیار کیا ہوا دینی نصاب بھی پڑھتے تھے اور کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا۔

بدرالدین طیب جی ملک کی سیاسی اور ذہنی بیداری کی تحریکوں میں مسلمانوں کی شرکت کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ وہ اس خیال کے حامی تھے کہ مسلمانوں کے خصوصی تعلیمی، دینی، ثقافتی اور بعض سماجی کام اپنے طور پر انجمن اسلام جیسے ادارے کے ذریعے انجام پائیں اور عام فلاح و بہبود کے کام اور سیاسی حقوق کے حصول کی کوششیں انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ مل کر کی جائیں۔ اس کے برعکس سرسید احمد خاں کو نہ صرف یہ اصرار تھا کہ مسلمان جب تک تعلیم میں ترقی نہیں کر لیتے خود کو سیاسی تحریک سے الگ رکھیں بلکہ وہ کانگریس کو ہندوؤں کی جماعت اور اس کو مسلمانوں کے لیے ہی نہیں، پورے ہندوستان کے لیے مضر سمجھتے تھے۔ یہ انکشاف بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ قیام کانگریس کے سلسلے میں مسٹر ہیوم نے جن مسلمانوں سے صلاح و مشورہ کیا تھا ان میں صرف سرسید اور بدرالدین طیب جی ہی کے نام معلوم ہو سکے ہیں۔ سرسید نے قطعیت سے اس کے قیام کی مخالفت اور بدرالدین طیب جی نے اسی قطعیت سے اس کے قیام کی حمایت کی تھی۔ مدراس میں کانگریس کے تیسرے اجلاس (۱۸۸۷ء) کے بعد پائینر میں شائع ہونے والے اپنے مراسلے میں سرسید نے اعتراف کیا تھا کہ:

www.shibliacademy.org

”مسٹر ہیوم نے قیام کانگریس کے وقت مجھ سے استصواب کیا تھا اور میں نے جواب میں واضح طور پر لکھ دیا تھا کہ میں اس کے خلاف ہوں“۔(۸)

۲۸؍دسمبر ۱۸۸۷ء کو لکھنؤ میں، قیصر باغ بارہ دری میں بھی انھوں نے ایک تقریر کی تھی جس میں برطانوی نظام سلطنت کی تعریف کرتے ہوئے بنگالیوں کو بزدل کہا تھا۔ اس پر ہر طرف سے جو شدید ردعمل ہونا تھا سو تو ہوا ہی علامہ شبلی نے بھی جو اس جلسے میں تماشائی کی حیثیت سے شریک تھے، ان لفظوں میں سرسید سے اختلاف کا اظہار کیا تھا:

”.....تقریر مذکور کا دوسرا ٹکڑا یعنی موجودہ حالت میں کوئی مسلمان وایسرائے کی کونسل کی ممبری کے قابل نہیں ہے علی گڑھ کے لحاظ سے بالکل سچ ہے۔ لیکن کیا بدرالدین طیب جی، مسٹر امیر علی، مسٹر رحمت علی سایانی اس کام کے قابل نہ تھے؟“۔(۹)

بدرالدین طیب جی نے بھی سرسید احمد خاں سے خط کتابت کر کے ان کی لکھنؤ کی تقریر کے بعض اجزا کی سختی سے تردید کرتے ہوئے اصرار کیا تھا کہ:

”میرا پختہ عقیدہ ہے کہ مسلمان متحد ہو کر کانگریس کے مباحث کو ان ہی معاملات تک محدود کر سکتے ہیں جنھیں وہ اپنے حق میں مناسب یا بے ضرر سمجھیں۔ مثال کے لیے لیجسلیٹیو اسمبلی ہی کو لیجیے مسلمان اگر انتخاب کے اصول کو ناپسند کریں تو ان میں تبدیلیاں لاکر اپنے مفاد کے مطابق اسے ڈھال سکتے ہیں۔ اس لیے میری پالیسی یہ ہے کہ باہر رہ کر نہیں، بلکہ اندر رہ کر کام کیا جائے“۔(۱۰)

لیکن کوئی کسی کو مطمئن نہیں کر سکا تھا اور دونوں اپنے اپنے موقف پر اٹل تھے۔ اس کے باوجود ان دونوں کے قائم کیے ہوئے تعلیمی ادارے (انجمن اسلام، بمبئی اور مدرسۃ العلوم، علی گڑھ) جن کی بنیاد ایک سال آگے پیچھے رکھی گئی تھیں، سیاسی نظریات میں اختلاف کے باوجود مسلمانوں میں جدید تعلیم کی ترویج و اشاعت میں مشغول رہے۔ علامہ شبلی نعمانی، بدرالدین طیب جی کے

www.shibliacademy.org

سیاسی خیالات اور ان کے قائم کردہ تعلیمی ادارہ ''انجمن اسلام'' کے ہم نوا تھے اور جب کبھی بمبئی آتے تو اس کے ماہانہ جلسوں میں شریک ہوتے، کبھی کبھی تقریر بھی کرتے۔ یہ دو الگ الگ نقاط نظر تھے جن کے اثرات دونوں اداروں کے مزاج و کردار پر اور پھر ردِ عمل کے طور پر حکومت کے رویے پر مرتب ہوئے۔ انجمن اسلام کے قیام سے شروع میں برطانوی حکومت کو خوشی ہوئی تھی اور اس نے اس کی ترقی میں ہاتھ بھی بٹایا تھا لیکن جب اس نے محسوس کیا کہ انجمن اسلام مسلمانوں کی تعلیم کے مرکز کے علاوہ ان کی ذہنی بیداری کا مرکز بن رہا ہے، یہاں حریت پسند پنپ رہے ہیں اور اس کی کانگریس سے قربت بھی بڑھتی جا رہی ہے تو نہ صرف حکومت نے بلکہ اس کے ہم نوا نوابوں نے بھی انجمن اسلام سے دوری اختیار کر لی۔

حواشی

(۱) لئیق فتح علی کے بقول: جو بدرالدین طیب جی کے پوتے ظفر کی بیوی ہیں، طیب جی کے خاندان کا تعلق کھمبایت (گجرات) سے تھا۔ بدرالدین کے والد طیب علی نے اس دھاگے کو بیچنے کا کاروبار شروع کیا تھا، جو ان کی والدہ اپنے ہاتھ سے کاتا کرتی تھیں۔ جلد ہی انہوں نے ترقی کی اور پنسل اور سلیٹ کا کاروبار کرنے لگے۔

(Badruddin Tayyab Ji, NBT, New Delhi - 1994, Pg: 3-4)

(۲) A.G. Noorani, Badruddin Tyabji, Pg: 5۔

(۳) Laeeq Futehallay, New Delhi, 1994, PP 68۔

(۴) انجمن اسلام کے ۱۰۰ سال، سید شہاب الدین دسنوی، ممبئی، ۱۹۸۶ء، ص ۱۲۰۔ (۵) ایضاً۔ (۶) سہ ماہی فکر و نظر (علی گڑھ، اکتوبر ۱۹۹۲ء) میں وضاحت کی گئی ہے کہ مولوی سمیع اللہ خاں کا قائم کیا ہوا مدرسہ وہ مدرسہ نہیں تھا جو بعد میں ایم اے او کالج بنا، سرسید کا مدرسہ ۲۴ر مئی ۱۸۷۵ء کو چار طلبا سے شروع ہوا، اس کی ابتدا نویں جماعت سے ہوئی تھی۔ (۷) مقالات شبلی، جلد ہشتم، شبلی نعمانی، اعظم گڑھ، ۱۹۳۸ء، ص ۱۵۸۔ (۸) پائنیر، ۱۰ر نومبر ۱۸۸۸ء، ص ۱۶۸۔ (۹) مسلمانوں کی سیاسی کروٹ، مشمولہ مسلم گزٹ، شبلی نعمانی، لکھنؤ، ۱۴ر اپریل ۱۹۱۲ء۔ (۱۰) سرسید احمد خاں - ایک سیاسی مطالعہ، عتیق صدیقی، دہلی، ۱۹۷۷ء، ص ۲۶۲۔

www.shibliacademy.org

علامہ شبلی
اور شبلی شناسی کے چند نئے پہلو

ڈاکٹر عمیر منظر

ایک صدی کے بعد بھی علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء) کے علمی وادبی کارناموں پر نظر ڈالیں تو وہ اب بھی تازہ اور معنویت سے بھرپور ہیں۔ان کی معنویت اور تازگی کو دیکھتے ہوئے محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ان کے افکار ونظریات پر ایک صدی بیت چکی ہے۔ان سو برسوں کے دوران متواتر علامہ شبلی کے افکار ونظریات اور ان کے ادبی مباحث پر غور وفکر کا سلسلہ جاری رہا۔

اس صدی کے دوران علامہ شبلی نعمانی کی بہت سی تحریروں کو جمع کیا گیا۔ان میں خطوط کے ساتھ بہت سی ایسی تحریریں تھیں جن کی تلاش وجستجو کا سلسلہ جاری رہا اور اس میں کامیابی بھی ملی۔ بہت سی نئی تحریروں کی دریافت کے ساتھ علامہ شبلی کی شخصیت اور ان کی تصنیفات سے متعلق بعض ایسے مقالے بھی ملے جن کا ذکر تو ہوتا رہا ہے مگر متن تک رسائی کسی کی نہیں تھی۔

میرے اس مقالے کے دو حصے ہیں۔پہلے حصے میں علامہ شبلی کی ان تحریروں کو زیر بحث لایا گیا ہے جوانھوں نے دیگر مصنّفین کی کتابوں پر رائے،تقریظ یا دیباچے کے طور پر تحریر فرمائی تھیں۔علامہ شبلی کی تقریظ نگاری پر اب تک کسی نے نہیں لکھا ہے۔دوسرے حصے میں علامہ کے ایک معاصر سر عبدالقادر شیخ نے علامہ کی شخصیت یا ان کی تصنیف پر بطور تبصرہ جو کچھ لکھا ہے اس کا احاطہ کیا گیا ہے۔

جہاں علامہ کی تقریظوں یا دیباچوں کا تعلق ہے تو چند تقریظوں کے مطالعہ سے یہ واضح

اسسٹنٹ پروفیسر،شعبۂ اردو،مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی،لکھنؤ کیمپس۔

www.shibliacademy.org

ہوجاتا ہے کہ علامہ منھ دیکھی تعریف کے قائل نہیں تھے۔علمی وادبی معاملات میں ان کے یہاں رعایت کا سوال ہی نہیں تھا۔مثال کے طور پر مولوی نذیر احمد کی سوانح ''حیات النذیر'' میں شامل شبلی نعمانی کے ریویو کو پیش کیا جاسکتا ہے۔اس سوانح کے مصنف سید افتخار عالم بلگرامی ثم مارہروی ہیں،جن کی خوبیوں کے اعتراف کے ساتھ ساتھ علامہ شبلیؒ کو جہاں کہیں بھی کوئی کمی نظر آئی اس کا برملا اظہار کیا ہے۔علامہ نے مصنف کے سعی وتلاش کی تعریف کے ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا ہے:

> ''مصنف نے مولانا اور شاہ ولی اللہ صاحب کا مقابلہ کیا ہے اور وہ اس طرح کہ شاہ صاحب کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کا اردو ترجمہ لے کر مولوی نذیر احمد صاحب کی کتاب حقوق وفرائض سے موازنہ کیا ہے۔یہ ایسی ہی بات ہے کہ کوئی شخص قرآن مجید کے ترجمے سے قرآن مجید کے محاسن کا اندازہ کرے''۔(حیات النذیر،سید افتخار عالم، ص:۱۲۔۱۳)

شبلی نعمانی نے اپنی اس تحریر میں ایک اعتراض یہ کیا ہے کہ ''سوانح نگاری میں آج کل جو طرز ہے وہ ایک قسم کی وکالت کے درجے تک پہنچ گیا ہے''۔ان کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ''مصنف نے فسانہ مبتلا کا انتخاب ضرورت سے زیادہ کیا ہے'' اور تیسری بات ''حجۃ اللہ البالغہ کے اردو ترجمہ سے مولوی نذیر احمد صاحب کی کتاب حقوق وفرائض کا موازنہ کرنا''۔

فاضل مصنف سید افتخار عالم بلگرامی نے علامہ شبلیؒ کے ریویو پر باقاعدہ نوٹ لگا کر کچھ اعتراضات سے عدم اتفاق کا اظہار کرتے ہوئے ان کا جواب دیا ہے۔ایک اعتراض کے ضمن میں افتخار عالم کتاب کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

> ''وکالت کے تو یہ معنی ہیں کہ اپنے موکل کی جا وبے جا طرف داری کی جائے۔لیکن مولف حیات النذیر یقین دلاتا ہے کہ اس کو مولوی نذیر احمد مرحوم کے کل عیبوں پر عبور نہیں ہے۔اگر عبور ہوتا تو وہ ضرور درج کرتا۔اس بارے میں جتنا کچھ بھی علم تھا وہ اس کے لکھنے سے باز نہیں رہا''۔

www.shibliacademy.org

دوسرے اعتراض پر ان کا جواب تھا:

"فسانہ مبتلا" کا ضرورت سے زیادہ انتخاب ایک خاص وجہ سے کیا گیا ہے۔اس نکتے کو ہمارے مکرم مولوی مفتی انوارالحق صاحب ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیمات ریاست بھوپال اپنے ریویو میں خوب سمجھتے ہیں"۔

آخری اعتراض پر انھوں نے حاشیہ لگایا کہ:

اگر آیات اللہ الکاملہ۔حجۃ اللہ البالغہ کا اردو ترجمہ۔ترجمے کی بدتر سے بدتر مثال ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔اس کے سوا موازنہ جو کیا گیا ہے وہ اردو لٹریچر کا موازنہ نہیں ہے بلکہ مطالب ومعانی ونکات اور موشگافیوں کا موازنہ ہے۔مجھ کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ مولوی نذیر احمد مرحوم نے جس وقت الحقوق والفرائض لکھنے کا ارادہ کیا تھا اس وقت نہ صرف حضرت امام غزالی کی بعض تصانیف اور حضرت شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ البالغہ ان کے پیش نظر تھی بلکہ اور مصنّفین کی کتابیں بھی مطالعہ کی تھیں کون کہہ سکتا ہے کہ مولانا نے ان تصانیف سے استفادہ نہیں کیا ہوگا۔مگر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی حضرت امام غزالی کی تصانیف کو پیش نظر رکھا ہوگا۔دنیا میں اسی طرح چراغ سے چراغ جلتے چلے آئے ہیں۔حضرت امام غزالی کے چراغ سے شاہ صاحب نے چراغ جلایا اور شاہ صاحب کے چراغ سے مولوی نذیر احمد نے۔اور یہ بات مسلم ہے کہ پہلے چراغ سے دوسرے چراغ میں زیادہ روشنی ہوتی ہے۔نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول۔اگر اسی طرح تیسرے چراغ میں پہلے اور دوسرے سے زیادہ روشنی ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ فضلنا بعضکم علی بعض ۔(حیات النذیر ص:۱۳۰ حاشیہ:۱)

www.shibliacademy.org

مولوی حسین شریف نے فارسی قواعد پر ایک کتاب ''دستورنامہ فارسی'' کے نام سے تصنیف کی۔حسب سابق شبلی نے کتاب کی مختصر مگر جامع تقریظ لکھی۔اس میں جہاں انھوں نے کتاب کی تحسین کی وہیں بعض چیزوں سے اختلاف بھی کیا۔شبلی کی یہ تحریر ۷ارفروری ۱۹۰۴ء کی ہے۔

''میں نے جناب حسین شریف کی کتاب ''دستورنامہ فارسی'' اکثر جگہ بغور دیکھی۔کوئی شبہ نہیں کہ یہ کتاب ایک معرکہ آرا کتاب ہے مصنف نے مشکل اور اہم مسائل کو بڑی بسط اور تنقیہ سے لکھا ہے۔بہت سے اصول وقواعد خود بھی ایجاد کیے ہیں۔مصنّفین سابق سے جا بجا اختلاف بھی کیا ہےاوروہاں پر بہت زورطبع دکھلایا ہےاسقدر ہے کہ یہ کتاب بوجہ دقت مضامین کے منتہیوں کے قابل ہے۔تشبیہ کی بحث اس میں استطراداً موضوع سے خارج آگئی ہے''۔

علامہ شبلی نعمانی نے منشی محمد امین زبیری کو ایک خط میں لکھا کہ:

سفرنامہ سامنے ہوتو تقریظ لکھوں،غائبانہ شطرنج کھیلنا ہر شخص کا کام نہیں۔شبلی حیدرآباد۔۷،فروری ۱۹۰۹ء۔(مکاتیب شبلی جلد دوم)

سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ اس سفرنامہ سے مراد''سفرنامۂ سرکارعالیہ بھوپال'' ہے۔ خط کو پڑھنے کے بعد سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ یہ سفرنامہ شبلی تک پہنچا تھا کہ نہیں اور اگر پہنچا تو کیا انھوں نے تقریظ لکھی تھی۔سوال یہ بھی ہے کہ آخر اس سفرنامہ کا نام کیا ہے۔عبدالمجید کھوکھر کی ذاتی لائبریری کی کتابوں کی فہرست ''فہارس الاسفار'' دیکھنے سے معلوم ہوا کہ سفرنامے کا نام ''سیاحت سلطانی'' ہے۔مختلف لائبریریوں کے کیٹلاگ دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس کتاب کے دوایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔لاہور سے یہ کتاب ۱۹۱۱ء میں شائع ہوئی ہے۔جبکہ مفید عام پریس آگرہ سے یہ کتاب ۱۹۱۰ء میں منظر عام پر آئی۔تلاش وجستجو کے دوران انٹرنیٹ سے معلوم ہوا کہ یہ کتاب آکسفورڈ پریس کراچی نے بھی شائع کی ہے۔کتاب اب تک دستیاب نہیں ہوسکی ہے اس لیے یہ بتانا مشکل ہے کہ اس پر شبلی نے تقریظ لکھی تھی یا نہیں۔

جہاں تک علامہ کے معاصرین کے ذریعہ ان کی شخصیت یا ان کی تصنیف پر تبصرہ اور

www.shibliacademy.org

تحریروں کا معاملہ ہے تو اس میں سر شیخ عبدالقادر (۱۸۷۲۔۱۹۵۰) کا مقالہ ''مولانا شبلی نعمانی'' بڑی اہمیت کا حامل ہے۔۱۹۸۶ء میں مقالات عبدالقادر کے نام سے محمد حنیف شاہد نے عبدالقادر شیخ کی تحریروں کو کتابی صورت میں جمع کر دیا تھا جس میں یہ مقالہ شامل ہے۔اس سے پہلے یہ مقالہ ''اوراق نو'' (شمارہ:۲) کے عبدالقادر نمبر میں شائع ہوا تھا۔

سر شیخ عبدالقادر نے اس مقالے میں شبلی کی تقریباً تمام ہی کتابوں کا تعارف نہایت جامع انداز میں پیش کیا ہے۔شبلی کی تعلیم وتربیت اوران کی سرگرمیوں کا بھی کسی قدر احاطہ کیا گیا ہے۔یہ مضمون شبلی کی وفات کے بعد تحریر کیا گیا ہے۔

اس مضمون سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ شبلی فرانسیسی گرچہ بول نہیں سکتے تھے لیکن وہ اس زبان کی کتابیں بآسانی پڑھ لیتے تھے۔شبلی کی کتاب شعرالعجم پر زیادہ تنقید ہوئی اور اس کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا۔سر عبدالقادر نے بھی اس مضمون میں اس کتاب کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ آپ بھی ملاحظہ فرمالیں۔

> مولانا شبلی کی ایک اور شہرہ آفاق تصنیف ''شعرالعجم'' ہے۔یہ کتاب ادبیات ایران کی تاریخ ہے اور چار جلدوں پر مشتمل ہے۔(۱) پہلی جلد فیض عام پریس علی گڑھ سے ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی۔اس جلد میں عباس عروضی سے لے کر نظامی تک کے مختلف شعراء کا تذکرہ درج ہے۔اس کے علاوہ شاہنامہ کے مصنف فردوسی کا تذکرہ بھی ہے۔اس کے بعد تین جلدیں اور شائع ہوئیں جنہیں ادبی حلقوں میں دادو تحسین حاصل ہوئی۔انھی دنوں پنجاب یونیورسٹی نے ہر سال کسی دیسی زبان کی بہترین تصنیف پر پندرہ سو روپے کا انعام دینا منظور کیا تھا۔یہ انعام مولانا شبلی کی ''شعرالعجم'' کے صلے میں دیا گیا۔''شعرالعجم'' کی اشاعت سے پہلے پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران شائع ہو چکی تھی۔یہ کتاب مولانا شبلی کی نظر سے گزری تھی اورانھوں نے اس کتاب سے استفادہ کیا ہے۔پروفیسر براؤن کی کاوش اور تحقیق کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے مختلف شعرا کے متعلق براؤن

www.shibliacademy.org

کے آراء سے اختلاف ظاہر کیا ہے۔ غالباً شبلی کو اپنے علم وفضل پر حد سے زیادہ اعتماد تھا۔ اس لیے انھوں نے پروفیسر براؤن سے اختلاف ظاہر کرتے ہوئے انتہا پسندی اور قطعیت سے کام لیا ہے۔ چنانچہ ایک نوجوان محقق پروفیسر محمود خاں شیرانی نے بڑی شد ومد سے براؤن کی تائید کی ہے۔ ان کا ایک مضمون ''اردو'' میں شائع ہوا ہے جو حیدرآباد دکن کا ایک سہ ماہی رسالہ ہے۔ اس رسالے میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ ''شعرالعجم'' کی معلومات اور خاص طور پر فردوسی کے متعلق بیانات غیر معتبر ہیں اور اس کے مقابلے میں پروفیسر براؤن کے اخذ کردہ نتائج زیادہ صائب اور قرین قیاس ہیں۔ یہاں پر ''شعرالعجم'' اور براؤن کی ''تاریخ ادبیات ایران'' کا موازنہ مقصود نہیں۔ یہ بات کیا کم باعث فخر ہے کہ ایک ہندوستانی عالم اردو زبان میں ایک ایسی تنقیدی کتاب لکھے جو مغربی محقق کی لکھی ہوئی تصانیف کے مقابلے میں پیش کی جاسکے۔ مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ایک مشہور یورپین عالم نے مولوی شبلی کی کتاب کو دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ ہندوستانیوں میں بیٹھ کر ایک شخص اتنی پراز معلومات کتاب لکھ سکتا ہے، جب کہ اسے وہ تمام سہولتیں میسر نہیں جو یورپ کی تعلیم گاہوں میں کام کرنے والوں کو آسانی سے مہیا ہوسکتی ہیں۔ اور اس کا ذریعہ اظہار محض ایک غیر ترقی یافتہ ہندوستانی زبان ہے۔ صرف اسی نقطہ نظر سے میں شبلی کی ''شعرالعجم'' کو ایک معرکۃ الآرا کتاب سمجھتا ہوں۔ اور تمام نقائص کے باوجود، جن کا پروفیسر محمود شیرانی نے حوالہ دیا ہے، یہ کتاب اردو ادب میں ایک قیمتی اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب نے مستقبل میں اسی نوعیت کی تصانیف کے لیے راستہ صاف کردیا ہے۔ خاص طور پر اردو کی ایک جدید تاریخ ادب کے لیے ''شعرالعجم''، مشعل راہ کا کام دیتی ہے۔ (مقالات عبدالقادر ص: ۱۲۵۔۱۲۶)

www.shibliacademy.org

عبدالقادر شیخ نے اس مضمون میں لکھا ہے کہ مختصر تصانیف میں ''بیان خسرو'' قابل ذکر ہے جو امیر خسرو دہلوی کی سوانح عمری ہے۔واضح رہے کہ یہ الگ سے کوئی کتاب نہیں ہے بلکہ شعرالعجم حصہ دوم میں امیر خسرو کے بارے میں جو کچھ علامہ شبلی نے لکھا تھا اسے ''بیان خسرو'' کے نام سے الناظر پریس لکھنؤ نے شائع کر دیا ہے۔انٹرنٹ پر پی ڈی ایف فارم میں یہ کتاب دیکھی جاسکتی ہے۔اس پر سن اشاعت درج نہیں ہے۔البتہ ٹائٹل پر مصنف کے نام کے آگے بریکٹ میں مرحوم لکھا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ علامہ شبلی کی وفات کے بعد یہ کتاب شائع ہوئی ہے۔ بیان خسرو کے ٹائٹل پر جو عبارت لکھی ہے وہ اس طرح ہے۔

بیان خسرو

حضرت امیر خسرو رحمتہ اللہ علیہ کی سوانح عمری اور ان کے کلام پر محققانہ ریویو

از شمس العلما مولوی شبلی نعمانی (مرحوم)

جس کو کارپردازان الناظر بک ایجنسی نے برائے نفع

برخورداران اسماعیل سلمہ

الناظر پریس واقع لکھنؤ میں طبع کیا

پرنٹر پبلشر:اسحاق احمد علوی

علامہ شبلی کے خطوط کا ایک مجموعہ ''خطوط شبلی'' کے نام سے ہے، جسے امین زبیری نے مرتب کیا ہے۔اس کا مقدمہ مولوی عبدالحق نے لکھا ہے۔اس کے دیباچہ نگار محمد امین زبیری نے دیباچے میں ظفر علی خاں کے نام ایک خط کا ذکر کیا ہے اور اس کی دو سطریں درج کی ہیں۔شبلی کے خطوط میں ظفر علی خاں کے نام صرف ایک خط (مکاتیب شبلی حصہ اول ص: ۳۲۸۔ ۱۶/نومبر ۱۹۱۲ء) ملتا ہے۔محمد امین زبیری نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ:

> ۱۹۰۳ء میں انھوں نے (مولانا) ظفر علی خاں (ایڈیٹر ''زمیندار''
> لاہور) کو جو اپنی تعلیم کے زمانہ میں ایم اے او کالج علی گڑھ میں مولانا کے
> شاگرد رہ چکے تھے اور اس وقت حیدر آباد میں تھے۔ایک خط لکھا تھا۔جس میں
> ناولوں اور عورتوں کی تعلیم کے مسئلہ پر اظہار رائے کیا تھا۔(خطوط شبلی ص:۷)

www.shibliacademy.org

ظفر علی خاں کے نام علامہ شبلی کے خط کی عبارت یہ ہے۔

> یہ افسوس کے قابل بات ہے کہ اردو کتابوں کے مصنف بیشتر اپنی کتابوں کو عاشقانہ درد انگیز فضولیات کا ذریعہ بناتے ہیں اور یہی دوراز کار مضامین اردو میں پڑھنے کو ملتے ہیں۔ (خطوط شبلی، ص: ۷)

ظفر علی خاں کا یہ خط مکاتیب شبلی کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ یہ کتاب نایاب نہ سہی کم یاب ضرور کہی جاسکتی ہے۔ میرے پیش نظر تاج کمپنی لمٹیڈ لاہور کا شائع کردہ نسخہ ہے۔ اس کا دیباچہ محمد امین زبیری مارہروی نے لکھا ہے جس پر ۲۵/ مئی ۱۹۳۵ء کی تاریخ درج ہے اور مقام میں علی گڑھ لکھا ہوا ہے۔

جیسا کہ شروع میں عرض کیا جاچکا ہے ایک صدی گزرنے کے بعد بھی شبلی کی تحریروں کی تازگی اور ان کی معنویت برقرار ہے اور غالباً اسی لیے ان کی تحریروں کی تلاش و جستجو ابھی تک جاری ہے اور بہت سی نئی چیزیں ملتی جارہی ہیں۔ چونکہ شبلی نے ایک نہایت سرگرم علمی زندگی گزاری ہے اور ان کا تعلق کسی ایک شہر سے نہ ہوکر متعدد شہروں سے تھا اس لیے ان کی تمام تحریروں کو جمع کرنا آسان بھی نہیں ہے۔ صدی تقریبات کے موقع پر شبلی اور شبلی سے متعلق یہ چند تحریریں امید ہے کہ علم وادب کے شائقین کے لیے علمی تحفہ ثابت ہوں گی۔

کتابیات:

حیات النذیر: سید افتخار عالم بلگرامی ثم المارہروی، شمسی پریس دہلی ۱۹۱۲ء۔

خطوط شبلی: مرتبہ مولوی محمد امین زبیری، ظل السلطان بک ایجنسی بھوپال۔

مکاتیب شبلی: مولانا سید سلیمان ندوی، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ۔

مقالات عبدالقادر: مرتب محمد حنیف شاہد، مجلس ترقی اردو، لاہور۔ ۱۹۸۶۔

www.shibliacademy.org

علامہ شبلیؒ کا معارف نامہ

جمشید احمد ندوی

علامہ شبلیؒ (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) کا شمار عصر حاضر کے ان چند مفکرین میں ہوتا ہے جن کے افکار و خیالات کے گہرے اور دور رس اثرات ہندوستانی معاشرہ پر مرتب ہوئے ہیں۔ علامہ شبلیؒ کی شخصیت کا خاص پہلو یہ ہے کہ ان کے چشمۂ فکر کا فیضان آج بھی جاری ہے اور تشنگانِ علم اس سے سیراب ہو رہے ہیں۔ اپنی شخصیت کی ہمہ گیری کی وجہ سے وہ آج بھی مینارۂ نور بنے ہوئے ہیں اور آج کل کے جدید مسائل و مشکلات کا حل ان کے افکار و نظریات کی روشنی میں تلاش کیے جانے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ ان کی شخصیت کی اثر انگیزی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی متعدد کتب کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور ان کا ترجمہ متعدد زبانوں میں ہو چکا ہے۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ غالباً علامہ اپنے معاصرین علماء میں اس لحاظ سے ممتاز قرار دیے جاسکتے ہیں کہ ان کے علاوہ شاید ہی چند علماء ایسے ہوں جن کی کتب کے اس قدر ایڈیشن اور متعدد زبانوں میں ان کے تراجم شائع ہوئے ہوں۔ لہٰذا اسے بھی ان کے امتیازات میں سے ایک امتیاز قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس دعوی کی دلیل ''کتابیات شبلی'' ہے جسے ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے مرتب کیا ہے۔

علامہ شبلی علیہ الرحمہ کا ذکر خیر دارالمصنّفین کے رسالہ معارف کے صفحات میں بار بار ہوتا رہا ہے۔ کبھی ان کی تحریروں کی صورت میں تو کبھی ان کی شخصیت کی کسی ۔ صفحات ذیل میں معارف میں علامہ شبلیؒ کے مقالات، مضامین، نظمیں اور خطوط وغیرہ کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت پر مقالات و مباحث کا احاطہ کیا گیا ہے۔

شعبۂ عربی، ممبئی یونیورسٹی، ممبئی۔

www.shibliacademy.org

معارف میں علامہ شبلیؒ سے متعلق شائع ہونے والے مباحث و مواد کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ علامہؒ کی ذاتی منثور و منظوم تحریروں پر مشتمل ہے۔ اسی حصہ میں ان کی وہ تحریریں بھی شامل کی گئی ہیں جو ان کی وفات کے بعد دریافت ہوئیں اور معارف کے مستقل کالم ''آثار علمیہ وادبیہ'' کے تحت اس کے صفحات کی زینت بنیں۔ ان تحریروں پر کہیں کہیں تمہیدی نوٹس بھی دیے گئے ہیں۔

علامہ شبلیؒ سے متعلق شائع ہونے والے مباحث و مواد کا دوسرا حصہ ان مقالات، مضامین اور مباحث پر مشتمل ہے جن میں ان کی شخصیت کے کسی نہ کسی پہلو کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ ان تحریروں کو زمانی ترتیب سے دیکھا جائے تو اولین مقالہ اگست ۱۹۱۶ء کے شمارہ میں ان کے شاگرد رشید اور علمی جانشین علامہ سید سلیمان ندویؒ (۱۸۸۴-۱۹۵۳ء) کے قلم سے نکلا ہے۔ علامہؒ کے متعلق تازہ ترین تحریر اکتوبر ۲۰۱۴ء کے شمارہ میں آثار علمیہ و تاریخیہ کے تحت شائع ہوئی ہے۔ اصلاً یہ علامہ کی تحریر ہے۔ اس کا عنوان ''مولوی خدا بخش خان کا کتب خانہ'' ہے۔ اس نادر مضمون کو ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن نے ''دبدبہ سکندری''، رام پور، ۱۸۹۱ء کے شمارہ سے نقل کر کے ستمبر ۲۰۱۴ء میں شائع ہونے والے اپنے خط کے ساتھ حوالۂ معارف کیا۔

یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ علامہ شبلیؒ کی شخصیت پر مستقل مقالات کے علاوہ شذرات معارف میں ان کا ذکر خیر متعدد حوالوں سے کیا جاتا رہا ہے۔ مزید برآں مختلف موضوعات پر شائع ہونے والے مقالات معارف میں بھی ان کا حوالہ ملتا ہے۔ ایک مستقل مقالہ کا عنوان بنایا جا سکتا ہے۔

تمام مضامین و مقالات کا ذکر ہم نے زمانی اعتبار سے کیا ہے تا کہ اس بات کا اندازہ ہو سکے کہ معارف میں نگارشات کی رفتار کیا رہی ہے؟

حصہ اول: علامہ شبلی کے مقالات و مضامین و نظمیں اور دیگر تحریریں

۱- ہندو مسلمانوں کا اتحاد (جولائی ۱۹۱۶ء، ص ۴۴-۵۰)۔

۲- خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کا انصاف [منظوم] (جولائی ۱۹۱۶ء، ص ۵۷)۔

۳- ایک ناتمام نظم (جولائی ۱۹۱۶ء، ص ۵۷-۵۸)۔

www.shibliacademy.org

۴- عشقیہ شاعری [ماخوذ از شعر العجم، حصہ پنجم] (ستمبر ۱۹۱۶ء، ص ۳۱-۴۲)۔

۵- نالۂ شبلی [بر وفات برادر خورد محمد اسحاق، منظوم] (ستمبر ۱۹۱۶ء، ص ۵۹-۶۰)۔

۶- غزل فارسی [غیر مطبوع] (ستمبر ۱۹۱۶ء، ص ۶۰)۔

۷- اردو ہندی (اکتوبر ۱۹۱۶ء، ص ۴۷-۵۲)۔

۸- کلام شبلی [منظوم] (اکتوبر ۱۹۱۶ء، ص ۵۵-۵۶)۔

۹- خطاب بہ احرار، ایک مرکز کی ضرورت [منظوم، غیر مطبوع] (مئی ۱۹۱۷ء، ص ۵۲)۔

۱۰- مولانا شبلی کا فارسی غیر مطبوع کلام [منظوم] (مئی ۱۹۱۷ء، ص ۵۴)۔

۱۱- کلام شبلی [منظوم، فارسی غیر مطبوع] (جولائی ۱۹۱۷ء، ص ۵۲)۔

۱۲- مسلم لیگ [منظوم، غیر مطبوع] (اگست ۱۹۱۷ء، ص ۵۱-۵۲)۔

۱۳- مولانا شبلی مرحوم کی ابتدائی تحریر کا نمونہ (مئی ۱۹۱۸ء، ص ۵۳-۵۴)۔

۱۴- ابن رشد کی تصنیفات (جون ۱۹۱۸ء، ص ۴۶-۴۹)۔

۱۵- مولانا شبلی مرحوم کے روزنامچہ کے چند اوراق (ستمبر ۱۹۱۸ء، ص ۱۳۳-۱۳۶)۔

۱۶- کلام شبلی [منظوم، فارسی غیر مطبوع] (ستمبر ۱۹۱۸ء، ص ۱۶۶)۔

۱۷- نامۂ شبلی [بنام محمد علی مونگیری] (دسمبر ۱۹۱۸ء، ص ۳۳۱-۳۳۳)۔

۱۸- نامۂ شبلی و سرسید [ایک دوسرے کے نام خطوط] (اگست ۱۹۱۹ء، ص ۱۵۲-۱۵۳)۔

۱۹- نامۂ شبلی [بنام بشیر الدین، ایڈیٹر البشیر] (دسمبر ۱۹۱۹ء، ص ۴۷۴-۴۷۵)۔

۲۰- مکتوب شبلی [بنام شاکر میرٹھی] (نومبر ۱۹۲۳ء، ص ۳۹۳-۳۹۵)۔

۲۱- باقیات صالحات ترکان عثمانی [منظوم، فارسی] (جنوری ۱۹۲۵ء، ص ۶۳)۔

۲۲- مولانا شبلی مرحوم کی ایک ناتمام غیر مطبوعہ نظم [استدراک بر نظم بالا] (اکتوبر ۱۹۲۵ء، ص ۳۰۷-۳۱۰)۔

۲۳- علامہ شبلی نعمانی کے غیر مطبوعہ مکاتیب [بنام میر مجلس دائرۃ المعارف النظامیۃ] (مئی ۱۹۳۰ء، ص ۳۶۷-۳۷۲)۔

۲۴- علامہ شبلی نعمانی کی دو غیر مطبوعہ تحریریں [رپورٹ و تاثرات برائے کتب خانہ

www.shibliacademy.org

رامپور] (اکتوبر۱۹۳۴ء،ص ۲۹۷-۳۰۲)۔

۲۵- شغل تکفیر [منظوم] (ستمبر ۱۹۳۶ء،ص ۲۲۵-۲۲۶)۔

۲۶- مولانا شبلی کے دو غیر مطبوعہ مکاتیب [بنام احمد علی خان شوق و حکیم اجمل خان] (دسمبر۱۹۴۲ء، ۴۶۵-۴۶۹)۔

۲۷- مکاتیب شبلی بنام مرزا سلیم مرحوم (جنوری ۱۹۵۶ء،ص ۷۲-۷۴)۔

۲۸- دو نایاب تحریریں [محمد حسین آزاد و شبلی کی تحریریں] (جون۱۹۶۲ء،ص ۴۶۴-۴۶۶)۔

۲۹- دو نایاب تحریریں [استدارک بر مضمون بالا از عبدالستار صدیقی و بشیر الحق دسنوی] (جولائی و ستمبر۱۹۶۲ء،ص ۷۵-۷۶و ۲۳۲-۲۳۳)۔

۳۰- مولانا شبلی کی ایک تقریر [اپریل ۱۹۰۹ء، جلسہ انجمن حمایت اسلام، لاہور] (اگست ۱۹۶۷ء،ص ۱۳۸-۱۴۳)۔

۳۱- رپورٹ انجمن ترقی اردو [پیش کردہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، بمبئی، منعقدہ دسمبر ۱۹۰۳ء] (اکتوبر ۱۹۶۷ء،ص ۲۹۷-۳۰۲)۔

۳۲- مولانا شبلی کی ایک تقریر [۳۰/دسمبر ۱۸۹۹ء، کلکتہ] (جنوری ۱۹۶۸ء،ص ۶۵-۷۰)۔

۳۳- علم کلام پر علامہ شبلی کا ایک نایاب لکچر [۱۵/مارچ ۱۹۰۱ء، باغ عامہ، حیدرآباد] (اکتوبر ۱۹۶۹ء،ص ۳۰۰-۳۱۶)۔

۳۴- مکاتیب شبلیؒ بنام مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی (ستمبر ۱۹۷۱ء،ص ۲۲۰-۲۲۹)۔

۳۵- مولانا شبلی نعمانی کی ایک نادر تحریر [سفارشی خط برائے عبدالقوی فانی بنام نظام حیدرآباد، مؤرخہ ۷/فروری ۱۹۱۱ء] (فروری ۱۹۹۹ء، ۱۴۹-۱۵۱)۔

۳۶- علامہ شبلی کی ایک نا تمام نظم (نومبر۲۰۱۲ء،ص ۳۷۸-۳۸۱)۔

۳۷- مولانا شبلی کے چھ نو دریافت خطوط [بنام احسن اللہ خان ثاقب] (نومبر ۲۰۱۲ء، ص ۳۹۲-۳۹۴)۔

۳۸- علامہ شبلی کی ایک نادر تحریر [برائے مکہ میں جامعہ اسلامیہ (یونیورسٹی) کی تجویز] (نومبر۲۰۱۳ء،ص ۳۸۳-۳۸۵)۔

www.shibliacademy.org

۳۹- ولآ کی ایک اہم تصنیف تاریخ النوائط (نومبر ۲۰۱۳ء، ص ۳۸۶-۳۸۷)۔

۴۰- مدینہ یونیورسٹی سے متعلق علامہ شبلی کی ایک نادر تحریر (دسمبر ۲۰۱۳ء، ص ۴۶۲-۴۷۲)۔

۴۱- تعطیل جمعہ کے سلسلہ میں علامہ شبلی کی ایک نادر تحریر (مارچ ۲۰۱۴ء، ص ۲۳۱-۲۳۴)۔

۴۲- مولوی خدابخش خان کا کتب خانہ (اکتوبر ۲۰۱۴ء، ص ۳۱۳-۳۱۷)۔

حصہ دوم: علامہ شبلی پر لکھے گئے مقالات ومضامین ونظمیں وغیرہ

۱- علامہ شبلی از سید سلیمان ندوی (اگست ۱۹۱۶ء، ص ۱۲-۲۵)۔

۲- نامۂ حالی [بنام شبلی نعمانی] (ستمبر ۱۹۱۶ء، ۵۷-۵۹، دسمبر ۱۹۱۶ء، ۵۸-۶۰، اپریل ۱۹۱۷ء، ۴۹، جولائی ۱۹۱۷ء، ۵۱)۔

۳- نوحۂ شبلی از اقبال احمد سہیل [فارسی، منظوم] (نومبر ۱۹۱۶ء، ص ۵۶-۶۰)۔

۴- شبلی منزل از قاضی محمد عبدالرحمٰن حیرتؔ [منظوم] (نومبر ۱۹۱۶ء، ص ۶۰)۔

۵- مولانا شبلی کی تیسری برسی از سید سلیمان ندوی (نومبر ۱۹۱۷ء، ص ۲۹)۔

۶- شبلی سوسائٹی از مہدی حسن افادی (جون ۱۹۱۸ء، ص ۱۶-۳۴) [متعلقات]

۷- مولانا شبلی اور ان کی شاعری از محبوب الرحمٰن کلیم (دسمبر ۱۹۱۸ء، ص ۳۱۳-۳۲۰)۔

۸- معاصرانہ چشمک [حالی وشبلی کے درمیان] از مہدی حسن افادی (اپریل ۱۹۱۹ء، ص ۵۴۱-۵۲۲)۔

۹- یادشبلی از سجاد انصاری [منظوم] (فروری ۱۹۲۰ء، ص ۱۵۶-۱۵۷)۔

۱۰- شعرالعجم اور عمر خیام از سید سلیمان ندوی (فروری ۱۹۲۴ء، ص ۸۲-۱۱۰)۔

۱۱- ''سیرۃ نبوی پر ایک نظر'' پر ایک نظر از سید سلیمان ندوی [استدراک بر مضمون مولانا سورتی، جامعہ، علی گڑھ، فروری ۱۹۲۴ء] (اپریل ۱۹۲۴ء، ص ۲۴۹-۲۶۸)۔

۱۲- مولانا شبلی مرحوم کی ایک ناتمام غیر مطبوعہ نظم [استدراک بر باقیات صالحات ترکان عثمانی] از نصیرالدین ہاشمی (اکتوبر ۱۹۲۵ء، ص ۳۰۷-۳۱۰)۔

۱۳- تضمین بر غزل شبلی از محمد مسلم عظیم آبادی [منظوم، فارسی] (ستمبر ۱۹۲۹ء، ص ۲۳۵-۲۳۶)۔

۱۴- شبلی کا نظریۂ تاریخ از سید محمد عبداللہ (مارچ - اپریل ۱۹۳۸ء، ص ۱۹۴-۲۰۴،

www.shibliacademy.org

۲۸۱-۲۹۳)۔

۱۵- مقالات شبلی جلد ہشتم کا دیباچہ از سید سلیمان ندوی (دسمبر ۱۹۳۸ء، ص ۴۰۵-۴۱۱)۔

۱۶- حیات شبلی از سید سلیمان ندوی [مشتمل بر مقدمۂ مصنف، دیباچہ و فہرست حیات شبلی] (نومبر ۱۹۴۳ء، ص ۳۲۵-۳۹۰)۔

۱۷- مقدم حیات شبلی [از سید سلیمان ندوی] از یحییٰ اعظمی [منظوم] (نومبر ۱۹۴۳ء، ص ۳۹۵-۳۹۶)۔

۱۸- حیات شبلی [از سید سلیمان ندوی] کے معلومات میں کچھ اضافے از محمد ابراہیم فریدی [مکتوب] (اکتوبر ۱۹۴۸ء، ص ۳۱۳-۳۱۵)۔

۱۹- علامہ شبلی بحیثیت فارسی شاعر از مرزا احسان احمد (فروری تا مئی ۱۹۴۹ء، ص ۱۲۱-۱۳۶، ۲۰۳-۲۱۷، ۲۷۵-۲۹۱، ۳۸۱-۳۹۲)۔

۲۰- مکاتیب مولانا ابوالکلام آزاد بنام علامہ شبلی (دسمبر ۱۹۵۳ء، ص ۴۵۵-۴۵۹)۔

۲۱- مقالہ نما شبلی از محمد بشیر الحق دسنوی (جون ۱۹۶۰ء، ص ۴۵۸-۴۶۲)۔

۲۲- مکاتیب سید حسین بلگرامی بنام شبلی (فروری ۱۹۶۵ء، ص ۱۴۸-۱۵۶)۔

۲۳- شبلی (انسان، مصنف، مصنف گر) از عبدالماجد دریابادی (مارچ ۱۹۶۵ء، ص ۱۸۶-۲۰۲)۔

۲۴- مولانا شبلی کا نثری اسلوب از عبدالخالق (اپریل ۱۹۷۳ء، ص ۲۶۵-۲۸۳)۔

۲۵- مشاہیر کے خطوط [مکتوب ابوالکلام آزاد بنام علامہ شبلی] (اگست ۱۹۷۶ء، ص ۱۴۱-۱۴۲)۔

۲۶- مولانا شبلی کے ایک استاد مولانا فیض اللہ مئوی از حبیب الرحمٰن اعظمی (اکتوبر ۱۹۷۸ء، ص ۳۰۳-۳۱۲)۔

۲۷- کلام شبلی از اکبر علی خان عرشی زادہ [منظوم ترجمہ] (اکتوبر ۱۹۷۸ء، ص ۳۱۴)۔

۲۸- مولانا شبلی اور ان کی فارسی خدمات از نذیر احمد (جنوری-فروری ۱۹۸۰ء، ص ۹-۲۶، ۸۵-۱۰۹)۔

۲۹- علامہ شبلی نعمانی کی المامون پر ایک نظر از سید صباح الدین عبدالرحمٰن (جنوری

www.shibliacademy.org

۱۹۸۵ء، ص ۲۱-۴۲)۔

۳۰- مولانا شبلی بحیثیت مؤرخ از خلیق احمد نظامی (مارچ ۱۹۸۶ء، ص ۱۸۷-۲۱۵)۔

۳۱- علامہ شبلی نعمانی کی تنقید نگاری از عبدالمغنی (اپریل-مئی ۱۹۸۸ء، ص ۲۶۶-۲۸۳ و ۳۲۵-۳۴۱)۔

۳۲- مولانا شبلی کے نام مولانا فاروق چریا کوٹی کے چند خطوط از شرف الدین اصلاحی (جون ۱۹۸۸ء، ص ۴۶۵-۴۷۵)۔

۳۳- علامہ شبلی کی تنقید نگاری (تصحیح واستدراک) از محمد اجمل اصلاحی (ستمبر ۱۹۸۸ء، ص ۲۲۶-۲۳۰) [استدراک بر شبلی نعمانی کی تنقید نگاری]۔

۳۴- سرسید، شبلی اور مغرب از رفیع الدین ہاشمی (جولائی ۱۹۸۹ء، ص ۳۵-۴۷)۔

۳۵- ایک تاریخی تحریر: قطعۂ تاریخ وفات شبلی [از حفیظ اللہ خان حفیظؔ] از شرف الدین اصلاحی (اگست ۱۹۸۹ء، ص ۱۵۲-۱۵۳)۔

۳۶- علامہ شبلی اور سیرت نبوی کی تالیف (مقدمۂ سیرت پر ایک نظر) از ضیاء الدین اصلاحی (اگست-ستمبر ۱۹۹۱ء، ص ۸۵-۱۰۱، ۱۶۵-۱۸۰)۔

۳۷- فارسی ادبیات کے دو مورخ: پروفیسر براؤن اور علامہ شبلی از سید محمد طارق (ستمبر ۱۹۹۳ء، ص ۱۸۳-۱۹۷)۔

۳۸- علامہ شبلی کی شعرفہمی اور شعرالعجم کا ایک مطالعہ از ضیاء الدین اصلاحی (اکتوبر-نومبر ۱۹۹۳ء، ص ۲۴۵-۲۶۹ و ۳۲۵-۳۵۵)۔

۳۹- مغربی افکار کی یورش اور علامہ شبلی کا کارنامہ از حبیب ریحان خان ندوی (نومبر ۱۹۹۴ء، ص ۳۲۵-۳۵۰)۔

۴۰- علامہ شبلی شخصیت اور فن [رپورٹ سمینار منعقدہ ۱۴-۱۶/اپریل ۱۹۹۵ء، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی] از ضیاء الدین اصلاحی (مئی ۱۹۹۵ء، ص ۳۸۹-۳۹۱)۔

۴۱- مولانا فاروق چریا کوٹی اور علامہ شبلی از عبدالباری آصفی (جون ۱۹۹۵ء، ص ۴۳۷-۴۴۶)۔

۴۲- مولانا شبلی کی ایک عدیم المثال اور مہتم بالشان تصنیف ''سیرۃ النبی'' از محمد عارف

www.shibliacademy.org

عمری (اکتوبر-نومبر ۱۹۹۵ء، ص ۲۴۵-۲۶۰ و ۳۲۵-۳۴۴)۔

۴۳- سفرنامۂ روم ومصروشام از ضیاء الدین اصلاحی (نومبر-دسمبر ۱۹۹۵ء، ص ۳۴۵-۳۶۴ و ۴۱۷-۴۳۶)۔

۴۴- انٹرنس کورس فارسی مرتبہ علامہ شبلی از سید لطیف حسین ادیب (نومبر ۱۹۹۶ء، ص ۳۶۷-۳۷۴)۔

۴۵- ضمیمۂ انٹرنس کورس فارسی مرتبہ علامہ شبلی از پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی [استدراک بر مضمون بالا] (مارچ ۱۹۹۷ء، ص ۲۰۵-۲۰۸)۔

۴۶- سہ ماہی فکر ونظر شبلی نمبر [مدیر شہر یار، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ] از ضیاء الدین اصلاحی (مئی ۱۹۹۷ء، ص ۳۹۲-۳۹۶)۔

۴۷- علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت کے امتیازی پہلو از ریاض الرحمٰن خان شروانی (جون-جولائی ۱۹۹۷ء، ص ۴۰۵-۴۲۱ و ۵-۱۷)۔

۴۸- دارالمصنّفین کی بنیاد کس نے ڈالی تھی؟ از ضیاء الدین اصلاحی (جون ۱۹۹۷ء، ص ۴۶۰-۴۶۶)۔

۴۹- علامہ شبلی کی سیرۃ النبی از محمد الیاس الاعظمی (فروری-مارچ ۱۹۹۸ء، ص ۹۸-۱۱۷ و ۱۷۹-۱۹۶)۔

۵۰- علامہ شبلی نعمانی کا نظریۂ تاریخ از محمد الیاس الاعظمی (نومبر ۱۹۹۸ء، ص ۳۳۶-۳۵۰)۔

۵۱- ضروری تصحیح [برائے مولانا شبلی نعمانی کی ایک نادر تحریر] از شاہ عبدالسلام [مکتوب] (اپریل ۱۹۹۹ء، ص ۳۱۷)۔

۵۲- الانتقاد علی التمدن الاسلامی از محمد عارف عمری (جون-جولائی ۱۹۹۹ء، ص ۴۴۶-۴۶۶ و ۵۰-۶۷)۔

۵۳- علامہ شبلی کی تصنیفات کے ترجمے از محمد الیاس الاعظمی (نومبر ۱۹۹۹ء، ص ۳۸۲-۳۹۵)۔

۵۴- مولانا شبلی ایک مصنف گر از جمشید احمد ندوی (جنوری ۲۰۰۰ء، ص ۱۸-۳۵)۔

۵۵- علامہ شبلی کی تصنیف اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر-ایک جائزہ از محمد الیاس

www.shibliacademy.org

الاعظمی (جون ۲۰۰۰ء،ص ۴۵۰-۴۷۱)۔

۵۶- تذکرۂ گلشن ہنداور علامہ شبلی [گلزار ابراہیم از علی ابراہیم خان کے اردو ترجمہ از علی خان لطف کی تصحیح شبلی نعمانیؒ] از محمد الیاس الاعظمی (نومبر ۲۰۰۰ء،ص ۳۶۳-۳۸۰)۔

۵۷- مرثیہ علامہ شبلی از مضطر ردولوی (نومبر ۲۰۰۰ء،ص ۳۹۴-۳۹۵)۔

۵۸- الفاروق-ایک مطالعہ از ضیاء الدین اصلاحی (اپریل-مئی ۲۰۰۱ء،ص ۲۴۵-۲۶۸ و ۳۴۷-۳۷۵)۔

۵۹- علی گڑھ کا اقلیتی کردار، کاروان زندگی [از سید ابوالحسن علی ندوی] حصۂ اول میں ایک سہو اور مولانا فراہیؒ سے علامہ شبلیؒ کا استفادہ از وارث ریاضی [مکتوب] (اکتوبر ۲۰۰۱ء،ص ۳۰۹-۳۱۷)۔

۶۰- علامہ شبلی کی عظمت وجامعیت از ضیاء الدین اصلاحی (نومبر ۲۰۰۲ء،ص ۳۲۵-۳۴۱)۔

۶۱- علامہ شبلی پر تحریف کا الزام از محمد عارف عمری (نومبر ۲۰۰۲ء،ص ۳۸۸-۳۸۹)۔

۶۲- الفاروق کے فقہی مباحث از پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی (جنوری ۲۰۰۳ء،ص ۲۰-۳۲)۔

۶۳- مولانا شبلی اور فارسی شاعری از مہر النساء خان (مئی ۲۰۰۴ء، ۳۶۳-۳۷۳)۔

۶۴- موازنۂ انیس ودبیر کا نیا ایڈیشن از عقیل الغروی [مکتوب] (جولائی ۲۰۰۴ء،ص ۷۰-۷۱)۔

۶۵- روداد دوروزہ علامہ شبلی نعمانی، حیات وافکار سمینار، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ از محمد عمیر الصدیق ندوی (دسمبر ۲۰۰۴ء،ص ۴۶۸-۴۷۹)۔

۶۶- سیرۃ النبی کا ایک گم نام مترجم مولوی سبطین احمد اور ان کا وطن بدایوں [انگریزی ترجمہ] از تسلیم غوری بدایونی (جنوری ۲۰۰۵ء، ص ۴۸-۶۴)۔

۶۷- نذر شبلی از محمد عبدالقدیر ایڈوکیٹ [منظوم] (اپریل ۲۰۰۵ء، ۳۱۵-۳۱۶)۔

۶۸- علامہ شبلی نعمانی کے تعلیمی افکار-بلاد اسلامیہ اور ہندوستان کے پس منظر میں از پروفیسر محمد راشد ندوی (مئی ۲۰۰۵ء،ص ۳۲۵-۳۴۷)۔

۶۹- الفاروق کا عربی ترجمہ از مقتدیٰ حسن ازہری (جون ۲۰۰۵ء،ص ۴۲۴-۴۳۹)۔

www.shibliacademy.org

۷۰- علامہ شبلی نعمانی اور مستشرقین از الطاف احمد اعظمی (جولائی ۲۰۰۵ء، ص ۵-۲۱)۔

۷۱- علامہ شبلی نعمانی کی تنقید نگاری کا مطالعہ از اشفاق احمد اعظمی (اگست ۲۰۰۵ء، ص ۸۵-۱۰۸)۔

۷۲- مولانا شبلی کی دینی منزلت از محمد یٰسین مظہر صدیقی (ستمبر-اکتوبر ۲۰۰۵ء، ص ۱۶۵-۱۸۶ و ۲۴۵-۲۶۰)۔

۷۳- موجودہ دور میں علامہ شبلی کے اثرات اور معنویت از خورشید نعمانی ردولوی (نومبر ۲۰۰۵ء، ص ۳۲۵-۳۴۰)۔

۷۴- علامہ شبلی نعمانی کی انفرادیت اور امتیازات از سید عبدالباری (دسمبر ۲۰۰۵ء، ص ۴۰۵-۴۲۰)۔

۷۵- شبلی - حافظ شیراز ہند از عبدالحق (جنوری ۲۰۰۶ء، ص ۳۳-۴۳)۔

۷۶- مولانا شبلی کے خطوط - تدوین جدید کی ضرورت از شمس بدایونی (فروری-مارچ ۲۰۰۶ء، ص ۱۱۹-۱۳۴ و ۲۰۲-۲۱۴)۔

۷۷- استدراک [بر علامہ شبلی نعمانی کی انفرادیت اور امتیازات از سید عبدالباری] از وارث ریاضی (اپریل ۲۰۰۶ء، ص ۲۹۴-۳۰۳)۔

۷۸- علامہ شبلی کی فارسی شاعری - ایک تعارف از عبدالقادر جعفری (مئی ۲۰۰۶ء، ص ۳۶۴-۳۷۳)۔

۷۹- اضافہ و تصحیح [برائے مولانا شبلی کے خطوط] از ضیاء الدین اصلاحی (مئی ۲۰۰۶ء، ص ۳۸۷-۳۸۹)۔

۸۰- مولانا ابوالکلام آزاد پر علامہ شبلی کے اثرات از سید احتشام احمد ندوی (جون ۲۰۰۶ء، ص ۴۲۷-۴۴۰)۔

۸۱- اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر - بعض اعتراضات کا جائزہ از محمد الیاس الاعظمی (جولائی ۲۰۰۶ء، ص ۴۶-۶۲)۔

۸۲- شبلی: شعر العجم اور خواجہ حافظ شیرازی از شعیب اعظمی (اگست ۲۰۰۶ء، ص ۱۲۲-۱۳۵)۔

www.shibliacademy.org

۸۳- اورنگ زیب عالم گیر پرایک نظرازریاض الرحمٰن خان شروانی[مکتوب، استدراک براورنگ زیب عالم گیر پرایک نظر-بعض اعتراضات کا جائزہ ازمحمدالیاس الاعظمی] (ستمبر ۲۰۰۶ء، ص ۲۳۴-۲۳۶)۔

۸۴- شعرالعجم کے متن کی تصحیح ازرحمت اللہ خان شروانی وعابدرضا بیدار (اکتوبر-نومبر ۲۰۰۶ء، ص ۲۶۱-۲۸۰، ۳۵۰-۳۷۳)۔

۸۵- شبلی "ادیب، شاعراورنقاد" ازمحسن عثمانی ندوی (نومبر ۲۰۰۶ء، ص ۳۷۴-۳۸۲)۔

۸۶- علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت، خطوط شبلی کی روشنی میں ازریاض الرحمٰن خان شروانی (دسمبر ۲۰۰۶ء، ص ۴۱۵-۴۲۴)۔

۸۷- سوانح مولانا روم پرایک نظرازشریف حسین قاسمی (جنوری ۲۰۰۷ء، ص ۳۵-۴۳)۔

۸۸- علامہ شبلی بحیثیت مدیرازمحمدالیاس الاعظمی (فروری ۲۰۰۷ء، ص ۱۲۷-۱۳۷)۔

۸۹- مولانا شبلی کی کردارکشی ازوارث ریاضی [مکتوب] (اپریل ۲۰۰۷ء، ص ۳۰۶-۳۰۸)۔

۹۰- مقالات شبلی میں عربی زبان وادب ازابوسفیان اصلاحی (مارچ-اپریل ۲۰۰۷ء، ص ۲۱۳-۲۲۶و۲۸۵-۲۹۶)۔

۹۱- ادبی تحقیق کی روایت میں مولانا شبلی کی اولیت ازشمس بدایونی (مئی ۲۰۰۷ء، ص ۳۲۵-۳۴۸)۔

۹۲- اسلامی مدارس کے نصاب کا مسئلہ، علامہ شبلی نعمانی کے حوالہ سے ازریاض الرحمٰن خان شروانی (جولائی ۲۰۰۷ء، ص ۴۹-۵۶)۔

۹۳- علامہ شبلی، سیدسلیمان ندوی اوررام پورازحکیم محمدحسین خان شفا (ستمبر ۲۰۰۷، ص ۱۹۴-۲۰۳)۔

۹۴- مولانا روم، مولانا شبلی کی نظرمیں ازضیاءالدین اصلاحی (اکتوبر-نومبر ۲۰۰۷ء، ص ۲۴۵-۲۷۰و۳۲۵-۳۵۳)۔

۹۵- عہدحاضرمیں علامہ شبلی کی بعض تجویزوں اورمنصوبوں کی معنویت ازمحمدالیاس الاعظمی (فروری ۲۰۰۸ء، ص ۱۲۵-۱۳۹)۔

www.shibliacademy.org

۹۶- مطالعۂ شبلی-چند معروضات ازافغان اللہ خان (مارچ ۲۰۰۸ء،ص۱۷۲-۱۷۶)۔

۹۷- علامہ شبلی نعمانی-شخصیت،افکاراورکچھ نئی باتیں ازظفراحمدصدیقی (مئی ۲۰۰۸ء، ص۳۳۷-۳۴۷)۔

۹۸- عصرِرواں میں شبلی کی معنویت ازسیدعبدالباری (نومبر ۲۰۰۸ء،۳۳۹-۳۵۳)۔

۹۹- علامہ شبلی کے تعلیمی افکاراورعصرحاضر میں ان کی معنویت ازظفرالاسلام اصلاحی (جولائی ۲۰۰۹ء، ۳۹-۵۷)۔

۱۰۰- مولانا شبلی کی مزاحمتی شاعری ازمحمدآصف قادری (نومبر ۲۰۰۹ء،ص۳۷۰-۳۸۵)۔

۱۰۱- موازنۂ انیس ودبیر:ایک مطالعہ ازمحمدالیاس الاعظمی (نومبر۲۰۱۰ء،ص۳۶۴-۳۷۷)۔

۱۰۲- علامہ شبلی کی سیرت النبی میں وارد مستشرقین کا تعارف ازصاحب عالم اعظمی ندوی (اگست-اکتوبر ۲۰۱۱ء،۸۵-۱۰۳،۱۶۵-۱۸۲،۲۴۵-۲۶۰)۔

۱۰۳- علامہ شبلی نعمانی کے استاد مفتی محمدارشادحسین مجددی رام پوری ازتبسم صابر (نومبر ۲۰۱۱ء،۳۶۰-۳۶۷)۔

۱۰۴- مولانا شبلی کے خطوط کا اشاریہ مع آخذ ازڈاکٹرشمس بدایونی (ستمبر۲۰۱۲ء،ص ۲۱۲-۲۲۲)۔

۱۰۵- خطوط شبلی-اصلاح وتصحیح ازڈاکٹرشمس بدایونی [مکتوب] (اکتوبر۲۰۱۲ء،ص۳۱۱-۳۱۲)۔

۱۰۶- علامہ شبلی کی ایک ناتمام نظم ازسیدحسن رضا عارف ہاشمی (نومبر۲۰۱۲ء،ص ۳۷۸-۳۸۱)۔

۱۰۷- علامہ شبلی نعمانی ازپروفیسرمحمدیٰسین مظہرصدیقی (نومبر-دسمبر۲۰۱۲ء،ص۳۴۳- ۳۵۹،۴۲۶-۴۴۳)۔

۱۰۸- علامہ شبلی نعمانی کا مذہبی نقطۂ نظر ازخورشید جمال قاسم (جنوری ۲۰۱۳ء،ص ۴۶-۵۰)۔

۱۰۹- علامہ شبلی اورمثنوی صبح امیدازڈاکٹرعمیرمنظر (مارچ ۲۰۱۳ء،ص۲۰۷-۲۱۴)۔

۱۱۰- جہان شبلی ازڈاکٹرشمس بدایونی (جولائی ۲۰۱۳ء،ص۳۹-۵۳)۔

www.shibliacademy.org

۱۱۱- اردو ادب میں علامہ شبلی کی خدمات از مسعود الحسن عثمانی [مکتوب] (جولائی ۲۰۱۳ء، ص ۵۶)۔

۱۱۲- مولانا شبلی کے فارسی خطوط از ساجد صدیق نظامی (اگست ۲۰۱۳ء، ص ۱۱۸-۱۳۰)۔

۱۱۳- جہان شبلی از ڈاکٹر شمس بدایونی [مکتوب] (اگست ۲۰۱۳ء، ص ۱۵۳-۱۵۴)۔

۱۱۴- علامہ شبلی اور مسلمان خواتین کی تعلیمی و معاشرتی بیداری از شائستہ خاتون (نومبر ۲۰۱۳ء، ص ۳۶۴-۳۷۴)۔

۱۱۵- علامہ شبلی کی نایاب تحریر از حسن الدین احمد [مکتوب] (نومبر ۲۰۱۳ء، ص ۳۷۸)۔

۱۱۶- علامہ شبلی نعمانی اور ان کے تعلیمی تصورات کی عصری معنویت از پروفیسر اختر الواسع (جنوری ۲۰۱۴ء، ص ۲۵-۳۷)۔

۱۱۷- شبلی اور آزاد (ماہنامہ لسان الصدق کے حوالہ سے) از ڈاکٹر شمس بدایونی (مئی ۲۰۱۴ء، ص ۳۶۴-۳۸۶)۔

۱۱۸- معتقد شبلی، مہدی افادی از ڈاکٹر شاداب عالم (جولائی ۲۰۱۴ء، ص ۵۸-۶۵)۔

۱۱۹- علامہ شبلی نعمانی کے دو فارسی خطوں کا اردو ترجمہ از ڈاکٹر خالد ندیم و نوید احمد گل (ستمبر ۲۰۱۴ء، ص ۲۲۳-۲۲۶)۔

۱۲۰- علامہ شبلی کی ایک نایاب تحریر [مولوی خدابخش خان کا کتب خانہ] از ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن [مکتوب] (ستمبر ۲۰۱۴ء، ص ۲۳۲)۔

مذکورہ بالا مواد و مباحث کو حسب ذیل خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

علامہ شبلی کا نثری سرمایہ:　ہندو مسلمانوں کا اتحاد (جولائی ۱۹۱۶ء)۔ عشقیہ شاعری [ماخوذ از شعر العجم، حصہ پنجم] (ستمبر ۱۹۱۶ء)۔ اردو ہندی (اکتوبر ۱۹۱۶ء)۔ مولانا شبلی مرحوم کی ابتدائی تحریر کا نمونہ (مئی ۱۹۱۸ء)۔ یہ تحریر دراصل ظل الغمام فی مسئلۃ قرأۃ خلف الامام از علامہ شبلی کا مقدمہ ہے۔ اس کو نقل کرنے سے قبل مدیر معارف نے ادارتی نوٹ لکھا ہے جس میں اس تحریر کی اشاعت کا سبب بیان کیا گیا ہے۔ ابن رشد کی تصنیفات (جون ۱۹۱۸ء)۔ مولانا شبلی مرحوم کے روزنامچہ کے چند اوراق (ستمبر ۱۹۱۸ء)۔ علامہ علیہ الرحمہ روزنامچہ لکھنے کے عادی نہیں تھے تاہم انھوں نے

www.shibliacademy.org

کچھ یادداشتیں لکھ چھوڑی تھیں۔اس روزنامچہ کی ابتداء ۲۰؍مئی ۱۹۰۹ء سے ہوتی ہے اور تاریخ کے حساب سے آخری اندراج ۱۴؍اکتوبر ۱۹۱۲ء کا ہے لیکن سلسلہ وار اندراج کے مطابق روزنامچہ کا آخری اندراج ۲۳؍مارچ ۱۹۱۱ء کا ہے۔اس روزنامچہ کے اکثر مندرجات ۲۰؍مئی تا دسمبر ۱۹۰۹ء پر مشتمل ہیں۔ نامۂ شبلی (دسمبر ۱۹۱۸ء)۔علامہ نے مذکورہ خط حیدرآباد سے مولانا محمد علی مونگیری کے نام لکھا تھا جب وہ وہاں نظامت سررشتۂ علوم وفنون سے منسلک تھے۔نامۂ شبلی و سرسید (اگست ۱۹۱۹ء)۔یہ خطوط مولانا محمد عبداللہ انصاریؒ کے متعلق ہیں جس میں علامہ شبلیؒ نے سرسیدؒ کو لکھا تھا کہ انھیں قرآن کے ترجمہ کی بھی ذمہ داری دے دی جائے لیکن سرسیدؒ، علامہؒ کی اس تجویز سے متفق نہیں تھے۔ نامۂ شبلی (دسمبر ۱۹۱۹ء)۔علامہ علیہ الرحمہ کے دو خطوط بشیرالدین، ایڈیٹر البشیر کے نام ہیں جو نظامت سررشتۂ علوم وفنون، حیدرآباد، قیام علی گڑھ اور ندوہ سے متعلق ہیں۔ دوسرا خط مکتوب الیہ کے رویہ میں ہونے والی تبدیلیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔مکتوب شبلی (نومبر ۱۹۲۳ء)۔علامہ نے یہ خط شاکر میرٹھی کے نام لکھا تھا جسے جناب محمد فاروق صاحب کے تمہیدی نوٹس (Notes) کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔علامہ شبلی نعمانی کے غیر مطبوعہ مکاتیب (مئی ۱۹۳۰ء)۔علامہ علیہ الرحمہ کے یہ چار خطوط ہیں جو انھوں نے میر مجلس دائرۃ المعارف النظامیۃ، حیدرآباد کے نام لکھے تھے۔علامہ شبلی نعمانی کی دو غیر مطبوعہ تحریریں (اکتوبر ۱۹۳۴ء)۔ علامہ کی یہ تحریریں کتب خانہ رامپور کے متعلق رپورٹ وتاثرات پر مشتمل ہیں۔یہ تحریریں امتیاز علی خان عرشی کے تمہیدی کلمات کے ساتھ شائع ہوئی ہیں۔مولانا شبلی کے دو غیر مطبوعہ مکاتیب (دسمبر ۱۹۴۲ء)۔اس مضمون میں علامہ شبلی کے ان دو غیر مطبوعہ مکاتیب کا ذکر کیا گیا ہے جو انھوں نے احمد علی خان شوقؔ اور حکیم اجمل خان کے نام لکھے تھے۔یہ خطوط امتیاز علی خان عرشی کے تمہیدی کلمات کے ساتھ شائع ہوئے ہیں۔مکاتیب شبلی بنام مرزا سلیم مرحوم (جنوری ۱۹۵۶ء)۔ان خطوط پر مولانا شاہ معین الدین ندوی علیہ الرحمہ نے ادارتی نوٹ لکھا ہے کہ یہ غیر مطبوعہ خطوط جناب شوکت سلطان صاحب پرنسپل شبلی کالج، اعظم گڑھ نے فراہم کیے ہیں۔ان خطوط کی مجموعی تعداد چھ ہے۔دو نایاب تحریریں (جون ۱۹۶۲ء)۔عطاء الرحمٰن عطا کاکوی نے اپنے تمہیدی نوٹس کے ساتھ محمد حسین آزاد اور علامہ شبلی کی ایک ایک تحریر شائع کی ہے۔آزاد کی تحریر مثنوی نوید ہنداز

www.shibliacademy.org

سید محمد علی شاد رئیس عظیم آباد پر ریویو ہے جب کہ علامہ کی تحریر سفر نامۂ ابن بطوطہ کے ترجمہ از محمد حیات حسین رضوی نعمانی (جلد دوم) سے متعلق ہے جس میں اس ترجمہ کی صحت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی اشاعت کی سفارش کی گئی ہے۔عبدالستار صدیقی (جولائی ۱۹۶۲ء)اور بشیر الحق دسنوی (ستمبر ۱۹۶۲ء) نے عطاء الرحمٰن عطا کاکوی کی مذکورہ بالا تحریر پر استدراک لکھا ہے۔ مولانا شبلی کی ایک تقریر (اگست ۱۹۶۷ء)۔مولانا شاہ معین الدین ندویؒ کے ادارتی نوٹ کے مطابق علامہ نے یہ تقریر انجمن حمایت اسلام، لاہور کے چوبیسویں سالانہ جلسہ اپریل ۱۹۰۹ء میں کی تھی۔اس تقریر کو محمد اقبال، لاہور نے روداد جلسہ سے نقل کر کے معارف میں اشاعت کے لیے بھیجا تھا۔ رپورٹ انجمن ترقی اردو (اکتوبر ۱۹۶۷ء)۔مولانا شاہ معین الدین ندویؒ کے ادارتی نوٹ کے مطابق علامہ نے یہ رپورٹ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ دسمبر ۱۹۰۳ء، بمبئی، میں پیش کی تھی۔اس رپورٹ کو محمد اقبال، لاہور نے لسان الصدق کے شمارہ فروری ۱۹۰۴ء سے نقل کر کے معارف میں اشاعت کے لیے بھیجا تھا۔مولانا شبلی کی ایک تقریر (جنوری ۱۹۶۸ء)۔محمد اقبال مجددی کے تمہیدی کلمات کے مطابق علامہ نے یہ تقریر محمڈن اینگلو اورنٹیل ایجوکیشنل کانفرنس کے تیرہویں سالانہ جلسہ منعقدہ ۳۰؍دسمبر ۱۸۹۹ء، کلکتہ، میں فرمائی تھی۔علم کلام پر علامہ شبلی کا ایک نایاب لکچر (اکتوبر ۱۹۶۹ء)۔علامہ نے مذکورہ لکچر ۱۵؍مارچ ۱۹۰۱ء، باغ عامہ، حیدرآباد میں علم کلام کے موضوع پر دیا تھا۔یہ نایاب لکچر محمد اقبال مجددی کے تمہیدی کلمات کے ساتھ شائع ہوا ہے۔لکچر کے شروع میں علامہ کا تعارف از محمد ابراہیم خان اکبرآبادی بھی شامل ہے۔مکاتیب شبلیؒ بنام مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی (ستمبر ۱۹۷۱ء)۔مولانا شاہ معین الدین ندویؒ کے ادارتی نوٹ کے مطابق ندوۃ العلماء سے متعلق ان خطوط کو پروفیسر ریاض الرحمٰن خان شروانی نے فراہم کیا تھا۔یہ وہ خطوط ہیں جنھیں مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی علیہ الرحمہ نے محض اپنی محتاط طبیعت کی بنا پر اشاعت کے لیے نہیں بھیجا تھا ورنہ ان میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو ناقابل اشاعت ہو۔مولانا شبلی نعمانی کی ایک نادر تحریر (فروری ۱۹۹۹ء)۔علامہ کی مذکورہ تحریر نظام حیدرآباد کے نام ایک سفارشی خط (مؤرخہ ۷؍فروری ۱۹۱۱ء) ہے جو انھوں نے عبدالقوی فانی کے تعاون کے لیے لکھا تھا۔شاہ عبدالسلام صاحب کی عنایت کی وجہ سے یہ تحریر منظر عام پر

www.shibliacademy.org

آئی۔انھوں نے اس کی اشاعت میں درکر آنے والی غلطیوں کی اصلاح اپنے ایک مکتوب ’’ضروری تصحیح‘‘ (اپریل ۱۹۹۹ء) میں کی ہے۔مولانا شبلی کے چھ نودریافت خطوط (نومبر ۲۰۱۲ء)۔یہ خطوط امیر مینائی کے شاگرد مولوی احسن اللہ خان ثاقبؔ (۱۸۶۳-۱۹۳۵ء) کے نام ہیں۔ان خطوط کو ڈاکٹر شمس بدایونی کے تمہیدی نوٹس کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔علامہ شبلی کی ایک نادر تحریر (نومبر ۲۰۱۳ء)۔یہ تحریر مکہ معظّمہ میں ایک اسلامی یونیورسٹی کی تاسیس کی تجویز پر مشتمل ہے۔ مدیر معارف اشتیاق احمد ظلی نے اپنے تمہیدی کلمات کے ساتھ اسے روزنامہ زمیندار (۱۵/اپریل ۱۹۱۳ء) کے حوالہ سے شائع کیا ہے۔ولاؔ کی ایک اہم تصنیف تاریخ النوائط (نومبر ۲۰۱۳ء)۔علامہ کی یہ تحریر دراصل نواب عزیز جنگ ولاؔ کی کتاب ’’تاریخ النوائط‘‘ کے تعارف وتبصرہ پر مشتمل ہے۔اسے حسن الدین احمد نے اپنے مکتوب (نومبر ۲۰۱۳ء) کے ساتھ معارف میں شائع ہونے کے لیے روانہ کیا تھا۔مدینہ یونیورسٹی سے متعلق علامہ شبلی کی ایک نادر تحریر (دسمبر ۲۰۱۳ء)۔یہ تحریر دراصل ترکی حکومت کی جانب سے مدینہ میں اسلامی یونیورسٹی کے نصاب تعلیم سے متعلق ہے۔مدیر معارف نے اپنے طویل نوٹ کے ساتھ اسے شائع کیا ہے۔ مذکورہ تحریر کے حوالہ سے سید شکیل احمد انور نے اپریل ۲۰۱۴ء کے شمارہ میں ایک خط لکھا ہے جو ’’ترکی کے دور عثمانی کی مجوزہ مدینہ یونیورسٹی‘‘ کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔اس خط میں مکتوب نگار نے ان کوششوں کا ذکر کیا ہے جو نواب میر عثمان علی خان آصف جاہ ہفتم کے عہد میں مذکورہ یونیورسٹی کے قیام کے تعلق سے ہوئی تھیں۔تعطیل جمعہ کے سلسلہ میں علامہ شبلی کی ایک نادر تحریر (مارچ ۲۰۱۴ء)۔اس تحریر کو مدیر معارف نے اپنے تمہیدی کلمات کے ساتھ روزنامہ زمیندار (۱۰/اپریل ۱۹۱۳ء) کے حوالہ سے شائع کیا ہے۔مولوی خدابخش خان کا کتب خانہ۔اس نادر تحریر کو ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن نے ’’دبدبۂ سکندری‘‘، رام پور، ۱۸۹۱ء کے شمارہ سے نقل کر کے معارف میں شائع ہونے والے خط (ستمبر ۲۰۱۴ء) کے ساتھ روانہ کیا تھا۔

علامہ شبلی کا منظوم سرمایہ: خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کا انصاف (جولائی ۱۹۱۶ء)۔ایک ناتمام نظم (جولائی ۱۹۱۶ء)۔اس نظم کی اشاعت کے تقریباً ۹۸ سال بعد سید حسن رضا عارف ہاشمی نے ایک مضمون ’’علامہ شبلی کی ایک ناتمام نظم‘‘ (نومبر ۲۰۱۲ء) کے عنوان سے لکھا۔اس مختصر سے

www.shibliacademy.org

مضمون میں انھوں نے ''کلیاتِ شبلی اردو و فارسی مرتبہ سید سلیمان ندویؒ'' میں مذکور ''ایک ناتمام نظم'' کے مضمون کی وضاحت کی ہے کہ اس کا تعلق واقعۂ کربلا سے ہے۔ اور اس بات پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ بالکل سامنے کی بات ہوتے ہوئے بھی سید صاحبؒ نے اس نظم پر نوٹ چڑھاتے ہوئے یہ کیسے لکھ دیا کہ ''معلوم نہیں ان اشعار میں کن واقعات کی طرف اشارہ ہے''۔ اس نظم کا پہلا شعر ہے:

اک شہر میں کہ پایۂ تخت قدیم ہے ۔۔۔ پچھلے پہر سے آج عجب شور و شین ہے

نالۂ شبلی [بر وفات برادر خورد محمد اسحاق] (ستمبر ۱۹۱۶ء)۔ غزل فارسی [غیر مطبوع] (ستمبر ۱۹۱۶ء)۔ کلام شبلی (اکتوبر ۱۹۱۶ء)۔ خطاب بہ احرار، ایک مرکز کی ضرورت [غیر مطبوع] (مئی ۱۹۱۷ء)۔ مولانا شبلی کا فارسی غیر مطبوع کلام (مئی ۱۹۱۷ء)۔ کلام شبلی [فارسی غیر مطبوع] (جولائی ۱۹۱۷ء)۔ مسلم لیگ [غیر مطبوع] (اگست ۱۹۱۷ء)۔ کلام شبلی [فارسی غیر مطبوع] (ستمبر ۱۹۱۸ء)۔ باقیات صالحات ترکان عثمانی [فارسی] (جنوری ۱۹۲۵ء)۔ مولانا شبلی مرحوم کی ایک ناتمام غیر مطبوعہ نظم (اکتوبر ۱۹۲۵ء)۔ یہ تحریر دراصل علامہ شبلی کی نظم ''باقیات صالحات ترکان عثمانی'' پر نصیر الدین ہاشمی کا استدارک ہے جس میں اس نظم کا پس منظر بیان کرتے ہوئے یہ وضاحت کی گئی ہے کہ اس نظم کے مخاطب ترک نہیں تھے بلکہ اس نظم میں دولت آصفیہ کے رہنما میر عثمان علی خان کو مخاطب کیا گیا ہے۔ شغل تکفیر (ستمبر ۱۹۳۶ء)۔

شخصیت: علامہ شبلی از سید سلیمان ندوی (اگست ۱۹۱۶ء)۔ اس مقالہ میں جناب سید نے علامہ شبلی کی جامع شخصیت کا ایک خاکہ پیش کیا ہے۔ مضمون نگار نے مضمون شروع کرنے سے پہلے ایک تمہیدی نوٹ لکھا ہے جس میں اس مقالہ کی غرض وغایت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مولانا شبلی کی تیسری برسی از سید سلیمان ندوی (نومبر ۱۹۱۷ء)۔ ایک صفحہ پر مشتمل یہ تحریر دراصل علامہ شبلی کی تیسری برسی کی رپورٹ ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ علامہ کی تیسری برسی دار المصنّفین میں کیسے منائی گئی تھی؟۔ شبلی (انسان، مصنف، مصنف گر) از عبد الماجد دریابادی (مارچ ۱۹۶۵ء)۔ اس مقالہ میں جناب دریابادی نے علامہ شبلی کی شخصیت کے اس پہلو کو اجاگر کیا ہے وہ انسان اور مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ مصنف گر بھی تھے کہ ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے والے

www.shibliacademy.org

اوران سے قلم پکڑنے کا سلیقہ سیکھنے والے آگے چل کرکس پایہ کے مصنف ومولف بن گئے تھے۔ علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت کے امتیازی پہلو از ریاض الرحمٰن خان شروانی (جون- جولائی ۱۹۹۷ء)۔اس مقالہ میں مقالہ نگار نے علامہ شبلی کی مجموعی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے امتیازات کی طرف اشارہ کیا ہے۔مولانا شبلی ایک مصنف گراز جمشید احمد (جنوری ۲۰۰۰ء)۔اس مضمون میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے علامہ کی تربیت نے کن کن لوگوں کو مصنف بنا دیا تھا۔ علامہ شبلی کی عظمت و جامعیت از ضیاء الدین اصلاحی (نومبر ۲۰۰۲ء)۔اس مضمون میں مضمون نگار نے انیسویں صدی میں مسلمانوں کی حالت زاراور سرسید کی مساعی کا ذکر کرتے ہوئے علامہ شبلی کی شخصیت اوران کے کارناموں کا ذکر کیا ہے۔ یہ مقالہ ۲۲/ جون ۲۰۰۲ء کوادارۂ علوم اسلامیہ،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ میں پڑھا گیا تھااوروفات کے مہینہ کی مناسبت سے اسے قارئین معارف کے نذر کیا گیا تھا۔مولانا شبلی کی دینی منزلت از محمد یٰسین مظہر صدیقی (ستمبر- اکتوبر ۲۰۰۵ء)۔اس مقالہ میں مقالہ نگار نے علامہ شبلی کے متعلق اس غلط فہمی کو دور کیا ہے ان کی شخصیت میں تدین اور دینی رنگ کی کمی پائی جاتی ہے۔مقالہ نگار نے اس بات کو ثابت کیا ہے وہ ایک مکمل اور باعمل عالم دین تھے اوران کے علمی موضوعات کے دائرہ میں تفسیر و اصول تفسیر، حدیث واصول حدیث،فقہ واصول فقہ کے موضوعات شامل تھےاوراس پرانھوں نے سیر حاصل بحث کی ہے۔علامہ شبلی نعمانی کی انفرادیت اورامتیازات ازسید عبدالباری (دسمبر ۲۰۰۵ء)۔اس مضمون میں علامہ کی مجموعی خدمات کا مختصراً جائزہ پیش کیا گیا ہے۔مذکورہ مضمون کے اس حصہ پر وارث ریاضی نے استدراک لکھا ہے جومولانا حسین احمد مدنی اوران کے نظریہ قومیت سے متعلق ہے(اپریل ۲۰۰۶ء)۔علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت،خطوط شبلی کی روشنی میں از ریاض الرحمٰن خان شروانی (دسمبر ۲۰۰۶ء)۔اس مضمون میں علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت کے ان پہلوؤں کواجاگر کیا گیا ہے جوان کے مطبوعہ خطوط کے مجموعی مطالعہ کے نتیجہ میں سامنے آتے ہیں۔مولانا شبلی کی کردارکشی ازوارث ریاضی (اپریل ۲۰۰۷ء)۔اس خط میں مکتوب نگار نے جناب ریاض الرحمٰن شروانی کے مضمون (دسمبر ۲۰۰۶ء) کوسراہتے ہوئے علامہ کی کردارکشی کرنے والوں کا ذکر کیا ہے اوراسے ایک غیر صحت مندانہ رویہ قرار دیا ہے۔اس کے علاوہ معارف میں شائع ہونے والی بعض

www.shibliacademy.org

دیگر شعری کاوشوں میں در کر آنے والی خامیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ علامہ شبلی، سید سلیمان ندوی اور رام پور از حکیم محمد حسین خان شفا (ستمبر ۲۰۰۷ء)۔ اس مضمون میں رام پور سے علامہ شبلی کے تعلق خاطر کا ذکر کیا گیا ہے اور اس رپورٹ کو نقل کیا گیا ہے جو انھوں نے رام پور کے کتب خانہ کے متعلق لکھی تھی۔ ضمناً سید صاحب کے رام پور سے روابط کا ذکر آ گیا ہے۔ مذکورہ رپورٹ اکتوبر ۱۹۳۴ء کے شمارہ میں بھی شائع ہو چکی ہے۔ مطالعۂ شبلی- چند معروضات از افغان اللہ خان (مارچ ۲۰۰۸ء)۔ اس مختصر سے مضمون میں مضمون نگار نے علامہ شبلی کے کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے اس بات کی ضرورت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کے کاموں اور کارناموں کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہونا چاہیے۔ علامہ شبلی نعمانی- شخصیت، افکار اور کچھ نئی باتیں از ظفر احمد صدیقی (مئی ۲۰۰۸ء)۔ اس مضمون میں علامہ شبلی کی خدمات و امتیازات کا مختصراً جائزہ پیش کرتے ہوئے ایسی نئی چار باتوں کا ذکر کیا ہے جن کا ذکر علامہ کے متعلق موجودہ مواد میں نہیں ملتا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی از پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی (نومبر- دسمبر ۲۰۱۲ء)۔ اس مضمون میں مقالہ نگار نے علامہ شبلی کی عبقری شخصیت کے مختلف پہلوؤں جیسے شخصیت و بشریت کے عناصر، شعرگوئی اور نثر نگاری، مصنف شبلی، تصانیف شبلی کے ثمرات و اثرات، استدراک و نقد بر شبلی اور عناد شبلی پر مبنی تنقیدات وغیرہ کو اجاگر کیا ہے۔

منظوم خراج عقیدت: نوحۂ شبلی از اقبال احمد سہیلؔ (نومبر ۱۹۱۶ء)۔ مدیر معارف نے اس فارسی مرثیہ کو نقل کرنے سے قبل ایک نوٹ لکھا ہے جس کے مطابق یہ مرثیہ اس وقت تک غیر مطبوع تھا اور علامہ کی برسی کی مناسبت سے اسے شائع کیا گیا تھا۔ شبلی منزل از قاضی محمد عبدالرحمٰن حیرتؔ [منظوم] (نومبر ۱۹۱۶ء)۔ اس نظم میں شبلی منزل کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ یاد شبلی از سجاد انصاری (فروری ۱۹۲۰ء)۔ اس عنوان کے تحت علامہ کے بنیادی کارناموں کو منظوم پیرایۂ بیان میں پیش کیا گیا ہے۔ ایک تاریخی تحریر: قطعۂ تاریخ وفات شبلی [از حفیظ اللہ خان حفیظؔ] از شرف الدین اصلاحی (اگست ۱۹۸۹ء)۔ یہ قطعہ شرف الدین اصلاحیؒ کے تمہیدی کلمات کے ساتھ شائع ہوا ہے جس میں مذکورہ قطعہ کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے۔ مرثیہ علامہ شبلی از مضطر ردولوی مرحوم (نومبر ۲۰۰۰ء)۔ مدیر معارف جناب ضیاء الدین اصلاحی علیہ الرحمہ نے اس مرثیہ

www.shibliacademy.org

کو نقل کرنے سے قبل ایک نوٹ لکھا ہے کہ یہ مرثیہ جناب اقبال رودولوی صاحب نے بھیجا تھا لیکن بعض جگہ سے پڑھا نہیں جارہا تھا جس کی وجہ سے ایک زمانہ تک اس کی اشاعت کے بارے میں تردد رہا لیکن وفات کے مہینہ کی مناسبت سے ناتمام ہی شائع کیا جارہا ہے۔ نذر شبلی از محمد عبدالقدیر ایڈوکیٹ (اپریل ۲۰۰۵ء)۔ یہ نظم علامہ شبلی سمینار منعقدہ ۲۸-۲۹/نومبر ۲۰۰۴ء، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ میں پڑھی گئی تھی جس میں مولانا کے مجموعی کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔

اساتذۂ شبلی: مولانا شبلی کے ایک استاد مولانا فیض اللہ مئووی از حبیب الرحمٰن اعظمی (اکتوبر ۱۹۷۸ء)۔ اس مضمون میں علامہ کے استاد مولانا فیض اللہ مئووی کی حیات وخدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مولانا فاروق چریا کوٹی اور علامہ شبلی از عبدالباری آصفی (جون ۱۹۹۵ء، ص ۴۳۷-۴۴۶)۔ اس مضمون پر مولانا ضیاءالدین اصلاحیؒ نے ادارتی نوٹ لکھا ہے مکمل طور پر یہ مضمون حیات شبلی سے ماخوذ ہے۔ مضمون نگار کا دوسال قبل اسی مہینہ میں انتقال ہوگیا تھا۔ اسی مناسبت کی وجہ سے اسے شائع کیا جارہا ہے۔ اس مستقل مضمون کے علاوہ معارف میں علامہ شبلی کے نام مولانا فاروق چریا کوٹی کے عربی خطوط بھی شائع ہوئے ہیں۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں مضمون کا ذیلی عنوان ''مکتوب الیہ''۔ علامہ شبلی نعمانی کے استاد مفتی محمد ارشاد حسین مجددی رام پوری از تبسم صابر (نومبر ۲۰۱۱ء)۔ اس مضمون میں مفتی صاحبؒ کی حیات وخدمات کا ذکر کرتے ہوئے علامہ شبلیؒ سے ان کے تعلق کا ذکر کیا گیا ہے اور مضمون کے آخر میں علامہ کے ان دو استفسارات کو نقل کیا گیا ہے جو انھوں نے اپنے استاد کی خدمت میں روانہ کیا تھا۔

اردو ادب وشاعری: مولانا شبلی اور ان کی شاعری از محبوب الرحمٰن کلیم (دسمبر ۱۹۱۸ء) اس مقالہ میں مضمون نگار نے انھیں ایک فطری شاعر بتاتے ہوئے ان کی ابتدائی شاعری، ان کی شاعری کی ایک خصوصیت ''حسن خیال'' اور ان کی تصانیف پر پڑنے والے شاعری کے اثرات وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ یہ مقالہ کی پہلی قسط ہے، دیگر قسطیں شائع نہ ہوسکیں۔ مولانا شبلی کا نثری اسلوب از عبدالخالق (اپریل ۱۹۷۳ء)۔ اس مضمون میں مضمون نگار نے اسلوب کی تعریف کرتے ہوئے علامہ شبلی کے نثری اسلوب کے خصائص کو بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان کے اسلوب کی چاشنی علم الکلام اور کلام جیسے خشک موضوعات میں بھی پائی جاتی ہے۔ شبلی ''ادیب،

www.shibliacademy.org

شاعر اور نقاد'' از محسن عثمانی ندوی (نومبر ۲۰۰۶ء)۔ اس مختصر مضمون میں ادیب، شاعر و ناقد کی حیثیت سے اردو ادب میں علامہ شبلی کے مقام و مرتبہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ مضمون کا زیادہ حصہ شاعری سے متعلق ہے۔ مولانا شبلی کی مزاحمتی شاعری از محمد آصف قادری (نومبر ۲۰۰۹ء)۔ اس مقالہ میں علامہ کی شاعری کے ایک خاص پہلو ''مزاحمت'' کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کے اسباب و علل بیان کرتے ہوئے ان کی مزاحمتی شاعری کا جائزہ صبح امید، حادثۂ کانپور و جنگ بلقان جیسے موضوعات پر لکھی جانے والی سیاسی نظموں کی روشنی میں لیا گیا ہے اور ان کی مزاحمتی شاعری کے خصائص و امتیازی پہلوؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اردو ادب میں علامہ شبلی کی خدمات از مسعود الحسن عثمانی (جولائی ۲۰۱۳ء)۔ اس خط میں مکتوب نگار نے مذکورہ عنوان پر اپنی پی ایچ ڈی کے مقالہ کی ترتیب، اس کے متعلق دیگر کوائف کے علاوہ بعض دیگر امور جیسے موجودہ مدیر معارف پروفیسر اشتیاق احمد ظلی کا دینی تعلیمی کونسل کا رکن نامزد کرنے کی ناظم ندوۃ العلماء مولانا محمد رابع ندوی کی خواہش وغیرہ کا، ذکر کیا ہے۔

فارسی ادب و شاعری: علامہ شبلی بحیثیت فارسی شاعر کے از مرزا احسان احمد (فروری تا مئی ۱۹۴۹ء)۔ معارف میں علامہ شبلی پر شائع ہونے والا یہ سب سے طویل مقالہ ہے جس میں علامہ کی فارسی شاعری پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور فارسی شاعری میں علامہ کے مقام و مرتبہ کو متعین کرتے ہوئے ان کے خصائص و امتیازات کا ذکر کیا گیا ہے۔ مولانا شبلی اور ان کی فارسی خدمات از نذیر احمد (جنوری-فروری ۱۹۸۰ء)۔ اس مقالہ میں علامہ شبلی کی نثری فارسی خدمات کا ذکر شعر العجم کے حوالہ سے کیا گیا ہے۔ مقالہ کا بیشتر حصہ شعر العجم کے مطالعہ پر مشتمل ہے۔ ان کی فارسی شاعری اور اس کے موضوعات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے اور آخر میں علامہ کے فارسی خطوط کی روشنی میں ان کے نثری اسلوب نگارش کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں کیونکہ علامہ نے فارسی میں کوئی مستقل تصنیف بطور یادگار نہیں چھوڑی ہے۔ یہ مقالہ دراصل پروفیسر نذیر احمد کا وہ توسیعی خطبہ ہے جو انھوں نے مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی صدارت میں ۱۰؍ دسمبر ۱۹۷۸ء کو دار المصنفین میں پیش کیا تھا۔ فارسی ادبیات کے دو مؤرخ: پروفیسر براؤن اور علامہ شبلی از سید محمد طارق (ستمبر ۱۹۹۳ء)۔ اس مقالہ میں فارسی ادب کی تاریخ میں مذکورہ دونوں بزرگان کی خدمات کا جائزہ شعر العجم اور

www.shibliacademy.org

A Literary History of Persia کی روشنی میں لیا گیا ہے اوران کی قدر و قیمت متعین کی گئی ہے۔مولانا شبلی اور فارسی شاعری ازمہر النساء خان (مئی ۲۰۰۴ء)۔اس مضمون میں علامہ کی فارسی شاعری خصوصاً قومی شاعری کا ذکر کیا گیا ہے۔شبلی-حافظ شیراز ہند ازعبدالحق (جنوری ۲۰۰۶ء)۔اس مضمون میں مضمون نگار نے علامہ شبلی کی شخصیت اوران کی فارسی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ ان کی فارسی شاعری اور حافظ شیرازی کی شاعری میں کس قدر مماثلت پائی جاتی ہے۔علامہ شبلی کی فارسی شاعری-ایک تعارف ازعبدالقادر جعفری (مئی ۲۰۰۶ء)۔اس مضمون میں علامہ کی فارسی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی دس خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے۔

ان مستقل مقالات کے علاوہ علامہ علیہ الرحمہ کی شاعرانہ بصیرت،سخن فہمی اور ذوق سخن وغیرہ کا ذکر ''علامہ شبلی کی شعرفہمی اور شعرالعجم کا ایک مطالعہ'' از ضیاءالدین اصلاحی (اکتوبر-نومبر ۱۹۹۳ء) میں بھی کیا گیا ہے۔

عربی ادب وشاعری: مقالات شبلی میں عربی زبان وادب ازابوسفیان اصلاحی (مارچ-اپریل ۲۰۰۷ء)۔علامہ شبلی کے مقالات کو سید سلیمان ندوی نے آٹھ جلدوں میں مرتب کیا ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے مذکورہ مجموعۂ مقالات میں عربی زبان وادب سے متعلق بکھرے ہوئے مواد کے حاصل مطالعہ کو اپنے مقالہ میں پیش کیا ہے۔

تعارف کتب: علامہ شبلیؒ نے تصنیفات کا ایک گرانقدر ذخیرہ بطور یادگار چھوڑا ہے جن میں سے بعض بہت ہی معرکۃ الآراء ہیں جیسے سیرۃ النبی،الفاروق اور شعرالعجم وغیرہ۔ان کتابوں کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ دیگر زبانوں میں اب تک ان کی مثال نہیں ملتی ہے۔معارف کے صفحات پر علامہ کی بعض کتابوں کا مطالعہ بھی پیش کیا جاتا رہا ہے۔درج ذیل سطور میں ان مقالات کا ذکر کتابوں کے حروف تہجی کے اعتبار سے کیا جارہا ہے:

الانتقاد علی التمدن الاسلامی: الانتقاد علی التمدن الاسلامی ازمحمد عارف عمری (جون-جولائی ۱۹۹۹ء)۔اس کتاب میں جرجی زیدان کی کتاب ''تاریخ التمدن الاسلامی'' میں درکر آنے والی غلط بیانیوں کا مدلل رد کیا گیا ہے اور تہذیب اسلامی کے صحیح خدو خال اجاگر کیے گئے ہیں۔اس مقالہ میں مذکورہ کتاب کی وجہ تالیف کے اسباب بیان کرتے

www.shibliacademy.org

ہوئے اس کے قدیم وجدید ایڈیشن کا ذکر کیا گیا ہے ساتھ ہی ساتھ اس کے اسلوب و اہم مباحث کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

انٹرنس کورس فارسی: انٹرنس کورس فارسی مرتبہ علامہ شبلی از سید لطیف حسین ادیب (نومبر ۱۹۹۶ء)۔اس مضمون میں علامہ کے اس نصاب فارسی کا جائزہ لیا گیا ہے جو انھوں نے سنڈیکیٹ برائے امتحان فارسی، الہ آباد یونیورسٹی کی تجویز پر مرتب کیا تھا۔اس نصاب کا پانچواں ایڈیشن مطبع فیض عام علی گڑھ سے شائع ہوا تھا اور ۲۲۴ صفحات پر مشتمل تھا۔تاریخ طباعت مذکور نہیں ہے لیکن کتاب کے آخر میں شائع شدہ اشتہار سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا اولین ایڈیشن ۱۸۶۷ء کے آس پاس شائع ہوا تھا۔ پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی صاحب نے مارچ ۱۹۹۷ء کے شمارہ میں ''ضمیمۂ انٹرنس کورس فارسی مرتبہ علامہ شبلی'' کے عنوان سے اس مقالہ پر استدراک لکھا ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر: علامہ شبلی کی تصنیف اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر- ایک جائزہ از محمد الیاس الاعظمی (جون ۲۰۰۰ء)۔مذکورہ کتاب میں اورنگ زیب عالمگیر پر لگنے والے الزامات کا جائزہ لیتے ہوئے انھیں بالکل بے بنیاد اور غلط بتایا گیا ہے۔اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ کن اسباب کی بنا پر یہ کتاب لکھی گئی تھی۔کتاب کا معروضی مطالعہ کرتے ہوئے مضمون نگار نے اس کی اہمیت اور مقام ومرتبہ کو بیان کیا ہے۔

اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر-بعض اعتراضات کا جائزہ از محمد الیاس الاعظمی (جولائی ۲۰۰۶ء)۔مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ کے ادارتی نوٹ کے مطابق یہ مضمون سید عزیز الدین حسین ہمدانی کے اس مضمون کے جواب میں لکھا گیا تھا جو انھوں نے مذکورہ کتاب پر مولانا ابوالکلام آزادؒ کے تبصرہ وتنقید کی روشنی میں لکھا تھا۔ہمدانی صاحب کا مضمون چونکہ ''جامعہ'' میں چھپا تھا اس لیے یہ مناسب سمجھا گیا کہ جواب بھی ''جامعہ'' میں ہی چھپے لیکن ایک سال گذرنے کے بعد بھی جب وہاں مضمون شائع نہیں ہوا تو اسے معارف میں شائع کیا گیا تا کہ ہمدانی صاحب کے مضمون سے پھیلنے والی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکے۔

اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر از ریاض الرحمٰن خان شروانی (ستمبر ۲۰۰۶ء)۔یہ دراصل ایک خط ہے جس میں انھوں نے محمد الیاس الاعظمی کے مذکورہ بالا مضمون کے متعلق اپنے خیالات و

www.shibliacademy.org

نظریات کا ذکر کیا ہے۔

سفر نامۂ روم ومصر وشام: سفر نامۂ روم ومصر وشام از ضیاء الدین اصلاحی (نومبر- دسمبر ۱۹۹۵ء)۔اس مضمون میں مدیر معارف نے علامہ علیہ الرحمہ کے مذکورہ سفر نامہ کا جائزہ پیش کیا ہے۔اس مضمون میں انھوں نے علامہ شبلی کی ترکی کے سفر سے دلچسپی،سفر نامہ کی اہمیت،اس کے مندرجات ومقاصد،اس کے اہم پہلو،علامہ کا ملی وقومی درد،مصریوں وترکوں کے خراب حالات کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ ترکوں کے اخلاق وعادات ودیگر فضائل کا ذکر کرتے ہوئے عیسائیوں اوراہل یورپ کے بعض اعتراضات کا ذکر کیا گیا ہے۔مذکورہ مضمون کے علاوہ ''علامہ شبلی نعمانی کے تعلیمی افکار-بلاد اسلامیہ اور ہندوستان کے پس منظر میں'' از پروفیسر محمد راشد ندوی میں بھی ''سفرنامۂ روم ومصر وشام'' کے جزوی مطالعہ کے حاصل کو پیش کیا گیا ہے (مئی ۲۰۰۵ء)۔

سوانح مولانا روم: سوانح مولانا روم پر ایک نظر از شریف حسین قاسمی (جنوری ۲۰۰۷ء)۔ اس مضمون میں علامہ کی مذکورہ کتاب کا تعارف کراتے ہوئے اس کی اہمیت اوراس کے بنیادی مصادر کا ذکر کیا گیا ہے اورمولانا روم کی مثنوی کے تئیں علامہ کے مخصوص نقطۂ نظر کا ذکر کرتے ہوئے مولانا روم کی غزلیات کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔

مولانا روم،مولانا شبلی کی نظر میں از ضیاء الدین اصلاحی (اکتوبر-نومبر ۲۰۰۷ء)۔مدیر معارف نے اپنے مقالہ میں سوانح مولانا روم کو علامہ شبلیؒ کے سلسلۂ کلامیہ کی چوتھی کڑی بتایا ہے اوراس کتاب کا ناقدانہ جائزہ لیتے ہوئے اس کتاب کی محققانہ حیثیت پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

سیرۃ النبیؐ: علامہ شبلیؒ کی کتابوں میں ''سیرۃ النبی'' سب سے ممتاز کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔ کتاب کی اہمیت کے پیش نظر ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس پر متعدد مقالات معارف کے صفحات کی زینت بنتے لیکن مذکورہ کتاب پر معارف میں چار مقالات لکھے گئے ہیں۔اس کے علاوہ سیرۃ النبی کے حوالہ سے ایک مضمون میں اس کے انگریزی ترجمہ ومترجم کا ذکر کیا گیا ہے اورایک مضمون میں اس کتاب میں وارد مستشرقین کا تعارف کرایا گیا ہے۔

''سیرۃ نبوی کی ایک نظر'' پر نظر از سید سلیمان ندوی (اپریل ۱۹۲۴ء)۔مولانا سورتی کو سیرۃ النبی جلد اول کے بعض مباحث پر اعتراض تھا۔ان کے اعتراضات رسالہ جامعہ،علی گڑھ،

www.shibliacademy.org

فروری ۱۹۲۴ء کے شمارہ میں شائع ہوئے۔اس میں مضمون مولانا سورتی کے ان اعتراضات کا تفصیلی جواب دیا گیا ہے۔

علامہ شبلی اور سیرت نبوی کی تالیف (مقدمۂ سیرت پر ایک نظر) از ضیاءالدین اصلاحی (اگست-ستمبر ۱۹۹۱ء)۔اس مقالہ میں مقالہ نگار نے سیرۃ کی سات اہم خصوصیات و امتیازات کا ذکر کرتے ہوئے صرف مقدمہ سیرت کا ایک تحلیلی تجزیہ پیش کیا ہے۔

مولانا شبلی کی ایک عدیم المثال اور مہتم بالشان تصنیف ''سیرۃ النبی'' از محمد عارف عمری (اکتوبر-نومبر ۱۹۹۵ء)۔ایڈیٹر معارف مولانا ضیاءالدین اصلاحیؒ کے ادارتی نوٹ کے مطابق یہ مقالہ بمبئی یونیورسٹی میں منعقد ہونے والے شبلی سمینار (اکتوبر ۱۹۹۲ء) کو پڑھا گیا تھا اور کچھ حذف و اضافہ کے بعد اسے معارف میں شائع کیا گیا ہے۔اس میں سیرۃ النبی پر ہونے والے اعتراضات کا مدلل جواب دیا گیا اور اس کی قدر و قیمت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

علامہ شبلی کی سیرۃ النبیؐ از محمد الیاس الاعظمی (فروری-مارچ ۱۹۹۸ء)۔مضمون نگار کا معارف میں چھپنے والا یہ پہلا مضمون ہے جس پر مدیر معارف نے ادارتی نوٹ لکھا ہے۔اس مضمون میں کتاب مذکور کے مباحث و مواد کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی تالیف کے سات مقاصد کا ذکر کیا گیا ہے اور کتاب مذکور پر کی جانے والی معاندانہ و غیر معاندانہ تنقیدوں کا ذکر کرتے ہوئے سیرت نبوی پر مستشرقین کی جانب سے وارد کیے جانے والے الزامات کو بیان کیا گیا ہے۔مضمون کے آخر میں تاریخ و سیر کے اصول پر سیرۃ النبی کو پرکھا گیا ہے۔

سیرۃ النبی کا ایک گم نام مترجم مولوی سبطین احمد اور ان کا وطن بدایوں از تسلیم غوری بدایونی (جنوری ۲۰۰۵ء)۔اس مضمون میں سیرۃ النبی (جلد دوم) کے انگریزی ترجمہ کے مترجم جناب سبطین احمد بدایونی اور ان کی مجموعی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے خاص طور پر ان کے مذکورہ ترجمہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

علامہ شبلی کی سیرت النبی میں وارد مستشرقین کا تعارف از صاحب عالم اعظمی ندوی (اگست-اکتوبر ۲۰۱۱ء)۔اس طویل مقالہ میں مقالہ نگار نے استشراق کی لغوی و اصطلاحی تعریف، استشراق کا میدان اور اس کے محرکات و مقاصد، ہندوستان میں استشراق کی تاریخ اور مستشرقین کے متعلق

www.shibliacademy.org

علامہ کے نظریہ کا ذکر کرتے ہوئے ان ۲۹ مستشرقین اوران کی خدمات کا تعارف کرایا ہے جن کا ذکر سیرۃ النبی کے صفحات میں ملتا ہے۔

شعر العجم: شعر العجم اور عمر خیام از سید سلیمان ندوی (فروری ۱۹۲۴ء)۔اس مضمون میں شعر العجم کی مقبولیت واہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے شیخ اقبال متعلم فارسی، اورینٹل کالج، لاہور کے ان چھ اعتراضات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے جوانھوں نے شعر العجم میں موجود عمر خیام کے سوانحی خاکہ کے متعلق اپنے ایک ریویو میں کیا تھا۔ان کا یہ ریویو رسالہ اردو میں چھپا تھا۔

علامہ شبلی کی شعر فہمی اور شعر العجم کا ایک مطالعہ از ضیاء الدین اصلاحی (اکتوبر-نومبر ۱۹۹۳ء)۔اس مقالہ میں مدیر معارف نے علامہ شبلی کی شاعرانہ بصیرت، سخن فہمی اور ذوق سخن کا ذکر شعر العجم کے حوالہ سے کیا ہے۔

شبلی: شعر العجم اور خواجہ حافظ شیرازی از شعیب اعظمی (اگست ۲۰۰۶ء)۔اس مضمون میں مضمون نگار نے سب سے پہلے علامہ شبلی کے مقام ومرتبہ کو عصر حاضر میں شائع ہونے والی اہم عربی و فارسی کتب کی روشنی میں بیان کیا ہے۔اس کے بعد شعر العجم کا ذکر کرتے ہوئے مذکورہ کتاب میں حافظ شیرازی پر موجود مواد کا جائزہ لیا ہے۔

شعر العجم کے متن کی تصحیح از رحمت اللہ خان شروانی وعابد رضا بیدار (اکتوبر-نومبر ۲۰۰۶ء)۔مذکورہ مضمون میں شعر العجم کے طبع ہشتم (۱۹۸۶ء) اور طبع نہم کے کمپوز شدہ صفحات میں درکرآنے والی غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کے متن کی-خاص طور سے اشعار کی- زیادہ سے زیادہ تصحیح ہو سکے۔مدیر معارف نے مضمون کے شروع میں ایک طویل حاشیہ لکھا ہے جس میں طبع ہشتم کے متن میں درکرآنے والی غلطیوں کے اسباب کی وضاحت کی گئی اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے مضمون میں مذکور زیادہ تر غلطیاں ۱۹۵۱ء میں شائع ہونے والے ایڈیشن میں موجود نہیں ہیں یا ان کی تعداد بہت کم ہے۔

مذکورہ مضامین کے علاوہ شعر العجم کا مطالعہ پروفیسر نذیر احمد کے مضمون ''مولانا شبلی اوران کی فارسی خدمات'' (جنوری-فروری ۱۹۸۰ء) اور سید محمد طارق (ستمبر ۱۹۹۳ء) کے مضمون ''فارسی ادبیات کے دو مؤرخ: پروفیسر براؤن اور علامہ شبلی'' میں بھی کیا گیا ہے بلکہ اول الذکر مقالہ کا

www.shibliacademy.org

بیشتر حصہ شعرالعجم کے مطالعہ پر ہی مشتمل ہے۔

الفاروق: الفاروق-ایک مطالعہ از ضیاء الدین اصلاحی (اپریل-مئی ۲۰۰۱ء)۔

الفاروق کے فقہی مباحث از پروفیسر ظفرالاسلام اصلاحی (جنوری ۲۰۰۳ء)۔

الفاروق کا عربی ترجمہ از مقتدیٰ حسن ازہری (جون ۲۰۰۵ء)۔

مذکورہ تمام مقالات ادارۂ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں منعقد ہونے والے سمینار میں پیش کیے گئے تھے۔ مذکورہ سمینار ۱۸-۱۹/نومبر ۲۰۰۱ء میں اس مناسبت سے منعقد کیا گیا تھا کہ الفاروق کی اشاعت کے سو سال پورے ہو چکے تھے۔ مدیر معارف نے اپنے مضمون میں کتاب کا بھرپور تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ جناب پروفیسر ظفرالاسلام صاحب نے اپنے مقالہ میں کتاب مذکور کے فقہی مباحث کو اجاگر کیا ہے اور آسانی اور وضاحت کی خاطر انھیں پانچ حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے ان پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ جناب مولانا مقتدیٰ حسن ازہری مرحوم نے اپنے مقالہ میں کتاب مذکور کے عربی ترجمہ از ڈاکٹر سمیر ابراہیم کا تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہوئے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مذکورہ مقالہ میں ترجمہ سے متعلق صرف ضروری امور کا جائزہ لیا گیا ہے اور ترجمہ سے متعلق دیگر امور کو کسی دوسرے مقالہ میں پیش کرنے کے ارادہ کا ذکر کیا ہے۔ غالباً مولانا علیہ الرحمہ مقالہ کا دوسرا حصہ مکمل نہیں کر سکے۔

المامون: علامہ شبلی نعمانی کی المامون پر ایک نظر از سید صباح الدین عبدالرحمٰن (جنوری ۱۹۸۵ء)۔ اس مضمون میں المامون کی وجہ تالیف کا ذکر کرتے ہوئے اس کتاب کا معروضی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

مقالات شبلی: مقالات شبلی جلد ہشتم کا دیباچہ از سید سلیمان ندوی (دسمبر ۱۹۳۸ء)۔ علامہؒ کے متفرق و منتشر مضامین کو سید صاحب نے آٹھ جلدوں میں مرتب کیا تھا۔ آٹھویں جلد میں مذکور مباحث کا سرسری تعارف انھوں نے مذکورہ دیباچہ میں کرایا ہے۔

مقالات شبلی میں عربی زبان وادب از ابوسفیان اصلاحی (مارچ-اپریل ۲۰۰۷ء)۔

علامہ شبلی کے مقالات کو سید سلیمان ندوی نے آٹھ جلدوں میں مرتب کیا ہے۔ مقالہ نگار نے مذکورہ مجموعۂ مقالات میں عربی زبان وادب سے متعلق بکھرے ہوئے مواد کا مطالعہ اپنے مقالہ

www.shibliacademy.org

میں پیش کیا ہے۔

مثنوی صبح امید: علامہ شبلی اور مثنوی صبح امید از ڈاکٹر عمیر منظر (مارچ ۲۰۱۳ء)۔اس مضمون میں علامہ کی مذکورہ مثنوی کا جائزہ لیا گیا ہے۔مذکورہ مثنوی کا مطالعہ ''مولانا شبلی کی مزاحمتی شاعری'' از محمد آصف قادری (نومبر ۲۰۰۹ء) کے ضمن میں بھی ملتا ہے۔

موازنۂ انیس ودبیر: موازنۂ انیس ودبیر کا نیا ایڈیشن از عقیل الغروی (جولائی ۲۰۰۴ء)۔اس خط میں مکتوب نگار نے یہ لکھا ہے کیا ہی بہتر ہوتا کہ مذکورہ کتاب کے انگریزی وفارسی ایڈیشن کے ساتھ ہی دارالمصنّفین سے شائع ہونے والا اردو ایڈیشن بھی ۲۰۰۶ء میں شائع ہوتا اور اسے ''صدی ایڈیشن'' سے موسوم کیا جاتا کہ کتاب مذکور کا پہلا ایڈیشن ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا تھا۔اس کے علاوہ دیگر امور کا بھی ذکر ہے۔

موازنۂ انیس ودبیر: ایک مطالعہ از محمد الیاس الاعظمی (نومبر ۲۰۱۰ء)۔اس میں موازنۂ انیس ودبیر کا تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہوئے اس کے اولین اڈیشن سے اب تک اس کے شائع شدہ پندرہ ایڈیشن اور اس کے متن کی تحقیق، تصحیح اور مراجعت کے بعد اس کا محقق ایڈیشن شائع کرنے والے چھ محققین کا ذکر کیا ہے۔

علامہ شبلی کی مذکورہ کتابوں کے مستقل مطالعہ کے علاوہ ایک مضمون معارف میں ایسا شائع ہوا ہے جس میں علامہ کی تصنیفات کے مختلف زبانوں میں ہونے والے تراجم کا ذکر کیا گیا ہے۔یہ مضمون ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے لکھا ہے۔

محقق: تذکرۂ گلشن ہند اور علامہ شبلی از محمد الیاس الاعظمی (نومبر ۲۰۰۰ء)۔اس مضمون میں مذکورہ کتاب کے تعارف کے ساتھ اس ایڈیشن کا جائزہ لیا گیا ہے جسے علامہ نے مرتب کیا تھا اور اس کے متن کی تصحیح کی تھی اور جا بجا حواشی لکھے تھے۔مضمون نگار نے علامہ کی ان کاوشوں کو مثالوں کے ساتھ پیش کیا ہے جو انھوں نے تصحیح متن وتحشیہ نگاری کے ضمن میں انجام دی تھیں۔مذکورہ کتاب دراصل علی ابراہیم خان کی فارسی کتاب ''گلزار ابراہیم'' کا اردو ترجمہ از علی خان لطف ہے۔

ادبی تحقیق کی روایت میں مولانا شبلی کی اولیت از شمس بدایونی (مئی ۲۰۰۷ء)۔اس مضمون میں بتایا گیا ہے کہ علامہ شبلی کو ادبی تحقیق کے میدان میں بھی اولیت کا درجہ حاصل ہے کہ

www.shibliacademy.org

ان کے بیان کردہ اصول ہی آگے چل کر ادبی تحقیق اور تدوین متن کے بنیادی اصول قرار پائے۔ اس کے باوجود ان کا شمار محققینِ ادب میں نہ ہونا قابل تعجب وحیرت ہے۔مضمون نگار نے پانچ وجوہات نقل کی ہیں جن کی بنیاد پر ان کا شمار محققین میں نہیں کیا جاتا ہے۔ان وجوہات کو نقل کرنے کے بعد انھوں نے علامہ کی ادبی تحقیق کے میدان میں اولیت کو استدلالی انداز میں پیش کرتے ہوئے متن کی تحقیق، تدوین وتحشیہ میں علامہ شبلی سے ہونے والی غلطیوں کی بھی نشاندہی کی ہے اور ان غلطیوں کے در کر آنے کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

مؤرخ: شبلی کا نظریۂ تاریخ از سید محمد عبداللہ (مارچ-اپریل ۱۹۳۸ء)۔یہ مضمون علامہ سید سلیمان ندویؒ کے ادارتی نوٹ کے ساتھ شائع ہوا ہے۔اس نوٹ کے مطابق مضمون نگار ''اردو کی نثر جدید'' کے موضوع پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں جس میں علامہ شبلی کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔مذکورہ مضمون علامہ شبلی سے متعلق لکھے جانے والے باب کا ایک جزء ہے۔اس مضمون میں علامہ شبلی کے نظریۂ تاریخ کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس میدان میں ان کی کاوشوں اور کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے تاریخ کے حوالہ سے علامہ کے تیرہ اصولوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

مولانا شبلی بحیثیت مورخ از خلیق احمد نظامی (مارچ ۱۹۸۶ء)۔یہ مضمون دارالمصنّفین میں توسیعی خطبات کے تحت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی صدارت میں فروری ۱۹۸۶ء میں پیش کیا گیا تھا۔اس مضمون میں مضمون نگار نے علامہ شبلی کی شخصیت کا جائزہ بحیثیت مورخ پیش کیا ہے اور مذکورہ میدان میں ان کے امتیازات وکمالات کا ذکر کیا ہے۔

علامہ شبلی نعمانی کا نظریۂ تاریخ از محمد الیاس الاعظمی (نومبر ۱۹۹۸ء)۔اس مضمون میں علامہ شبلی کی مورخانہ بصیرت کا ذکر واعتراف کرتے ہوئے ان کے ان چودہ اصولوں کا جائزہ لیا گیا ہے جو ان کے پیش نظر رہے تھے۔

ناقد: علامہ شبلی نعمانی کی تنقید نگاری از عبدالمغنی (اپریل-مئی ۱۹۸۸ء)۔اس مضمون میں علامہ شبلی کی تنقید کو مشرقی تنقیدی روایات کا بہترین نمونہ قرار دیتے ہوئے ان کی تنقید نگاری کا جائزہ سوانح مولانا روم، موازنۂ انیس ودبیر، شعرالعجم کی روشنی میں لیا گیا ہے اور ان کے تنقیدی نظریات کے متعلق کلیم الدین احمد اور عبادت بریلوی کی آراء کو بیان کیا گیا ہے۔مضمون کے آخر

www.shibliacademy.org

میں ان کے اسلوب کو ان کی تنقید کا بہترین نمونہ قرار دیتے ہوئے علامہ شبلی کے تنقیدی اثرات اور اس کی جامعیت وخصوصیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

یہ مضمون دراصل وہ توسیعی خطبہ ہے جسے سید صباح الدین عبدالرحمٰن علیہ الرحمہ کی مدت کار میں ہونا تھا لیکن ان کی ناگہانی موت کی وجہ سے یہ توسیعی خطبہ ۱۰ر مارچ ۱۹۸۸ء کو پیش کیا گیا تھا۔

علامہ شبلی کی تنقید نگاری (تصحیح و استدراک)[بر شبلی نعمانی کی تنقید نگاری] از محمد اجمل اصلاحی (ستمبر ۱۹۸۸ء)۔اس استدراک میں اصلاحی صاحب نے اشارہ کیا ہے کہ فاضل مقالہ نگار نے علامہ کی تنقید نگاری وتحقیق کے لیے جو تعریفی کلمات لکھے ہیں ان کے مستحق دراصل مولانا حمیدالدین فراہیؒ ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی کی تنقید نگاری کا مطالعہ از اشفاق احمد اعظمی (اگست ۲۰۰۵ء)۔اس مقالہ میں علامہ شبلی کے تنقید نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان کے تنقیدی کارناموں کا مشہور نقادوں کے اقوال کی روشنی میں جا بہ جا مولانا حالی کی تنقید نگاری سے تقابل کیا گیا ہے۔اس مقالہ پر ادارتی نوٹ موجود ہے جس کے بموجب یہ مقالہ شبلی سمینار، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، نومبر ۲۰۰۴ء کے لیے لکھا گیا تھا لیکن مقالہ نگار کی سمینار میں موجودگی کے باوجود پیش نہیں کیا جا سکا اور اس کی اشاعت سے قبل ان کا انتقال ہوگیا۔

مدیر: علامہ شبلی بحیثیت مدیر از محمد الیاس الاعظمی (فروری ۲۰۰۷ء)۔اس مضمون میں بتایا گیا ہے کہ شبلی کن کن رسائل کے مدیر اعلی/ مدیر/شریک مدیر رہے۔وہ علی گڑھ کے کالج میگزین اورالندوہ کے مدیر رہے۔مسلم گزٹ لکھنؤ ان کی نگرانی میں اور وحیدالدین سلیم کی ادارت میں نکلتا رہا اور آخری عمر میں معارف کا خاکہ مرتب کیا جس میں ان کی وفات کے بعد ان کے شاگرد رشید نے ایسا رنگ بھرا جس کی آب وتاب آج بھی برقرار ہے۔

ماہر تعلیم: انٹرنس کورس فارسی مرتبہ علامہ شبلی از سید لطیف حسین ادیب (نومبر ۱۹۹۶ء، ص ۳۶۷-۳۷۴)۔اس مضمون کا ذکر ''تعارف کتب'' کے ذیل میں کیا جا چکا ہے۔پروفیسر ظفرالاسلام اصلاحی نے ''ضمیمۂ انٹرنس کورس فارسی مرتبہ علامہ شبلی'' کے عنوان سے اس پر استدراک لکھا ہے (مارچ ۱۹۹۷ء)۔

www.shibliacademy.org

علامہ شبلی نعمانی کے تعلیمی افکار-بلاد اسلامیہ اور ہندوستان کے پس منظر میں از پروفیسر محمد راشد ندوی (مئی ۲۰۰۵ء)۔اس مضمون میں علامہ شبلی نعمانی کے تعلیمی افکار کو ان کے ''سفر نامۂ روم ومصر وشام'' کے حوالہ سے پیش کیا گیا ہے کہ مولانا نے وہاں کے نظام کو ہندوستان میں کس طرح نافذ کرنا چاہا اور اس میں ان کو کس قدر کامیابی حاصل ہوئی؟۔

اسلامی مدارس کے نصاب کا مسئلہ، علامہ شبلی نعمانی کے حوالہ سے از ریاض الرحمٰن خان شروانی (جولائی ۲۰۰۷ء)۔اس مضمون میں پہلے ملت اسلامیہ کے مدارس کی اہمیت کے ساتھ علامہ شبلی کے ان نظریات کا ذکر کیا گیا ہے جن کا تعلق مدارس کے نصاب تعلیم سے ہے۔

علامہ شبلی کے تعلیمی افکار اور عصر حاضر میں ان کی معنویت از ظفر الاسلام اصلاحی (جولائی ۲۰۰۹ء)۔اس مضمون میں علامہ شبلی کے تعلیمی افکار اور عصر حاضر میں ان کی معنویت کا معروضی انداز میں جائزہ لیا گیا ہے۔

علامہ شبلی نعمانی اور ان کے تعلیمی تصورات کی عصری معنویت از اختر الواسع (جنوری ۲۰۱۴ء)۔ یہ مقالہ در پروفیسر صاحب کا وہ خطبہ ہے جو انھوں نے ''علامہ شبلی یادگاری خطبہ'' کے تحت ۲۳ رفروری ۲۰۱۳ء کو دارالمصنّفین، اعظم گڑھ میں پیش کیا۔اس میں انھوں نے قدیم وجدید تعلیم کے تعلق سے علامہ علیہ الرحمہ کے نظریات کو اور زمانہ حاضر میں ان کی معنویت اور افادیت کا ہے۔

مکتوب نگار: معارف میں علامہ علیہ الرحمہ کے خطوط یا ان کی خطوط نگاری کے متعلق مواد کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں علامہ کے مکاتیب اور دوسرے حصہ میں ان کی خطوط نگاری سے متعلق مضامین ومقالات کا ذکر کیا گیا ہے۔

حصۂ اول: نامۂ شبلی [بنام محمد علی مونگیری] (دسمبر ۱۹۱۸ء)۔ نامۂ شبلی وسرسید [ایک دوسرے کے نام خطوط] (اگست ۱۹۱۹ء)۔ نامۂ شبلی [بنام بشیر الدین، ایڈیٹر البشیر] (دسمبر ۱۹۱۹ء)۔مکتوب شبلی [بنام شاکر میرٹھی] (نومبر ۱۹۲۳ء)۔علامہ شبلی نعمانی کے غیر مطبوعہ مکاتیب [بنام میر مجلس دائرۃ المعارف النظامیۃ] (مئی ۱۹۳۰ء)۔مولانا شبلی کے دو غیر مطبوعہ مکاتیب [بنام احمد علی خان شوقؔ اور حکیم اجمل خان] (دسمبر ۱۹۴۲ء)۔مکاتیب شبلی بنام مرزا سلیم مرحوم (جنوری ۱۹۵۶ء)۔مکاتیب شبلی بنام مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی (ستمبر ۱۹۷۱ء)۔مولانا شبلی نعمانی کی

www.shibliacademy.org

ایک نادر تحریر [نظام حیدر آباد کے نام ایک سفارشی خط مؤرخہ ۷/فروری ۱۹۱۱ء] (فروری ۱۹۹۹ء)۔

مولانا شبلی کے چھ نو دریافت خطوط [بنام احسن اللہ خان ثاقبؔ] (نومبر ۲۰۱۲ء)۔

مذکورہ بالا خطوط کی تفصیلات کے لیے مضمون کا ذیلی عنوان ''علامہ شبلی کا نثری سرمایہ'' ملاحظہ فرمائیں۔

حصۂ دوم: مولانا شبلی کے خطوط-تدوین جدید کی ضرورت از شمس بدایونی (فروری-مارچ ۲۰۰۶ء)۔اس مقالہ میں خطوط شبلی کو ان کی سوانح کا ایک معتبر مصدر قرار دیتے ہوئے اس کی تدوین جدید کی ضرورت کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے اب تک شائع شدہ مستقل پانچ مجموعوں کے ساتھ ''مکتوبات مشاہیر'' اور ''متفرق رسائل وکتب میں منتشر خطوط'' کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مذکورہ مضمون پر سابق مدیر معارف ضیاء الدین اصلاحی نے ''اضافہ وتصحیح'' کے عنوان سے خطوط شبلی کے متعلق کچھ معلومات کا اضافہ وتصحیح کی ہے (مئی ۲۰۰۶ء)۔

مولانا شبلی کے خطوط کا اشاریہ مع مآخذ از ڈاکٹر شمس بدایونی (ستمبر ۲۰۱۲ء)۔اس میں علامہ شبلی کے اب تک شائع شدہ خطوط کا تنقیدی جائزہ ہے اب تک ان کے مکاتیب کتنے مجموعے طبع ہو چکے ہیں اور کن کن رسالوں میں ان کے مکاتیب شائع ہوئے ہیں اور ان کے مکتوب الیہ کون ہیں اور ان کے نام شائع ہونے والے مکاتیب کی تعداد کتنی ہے۔اس مضمون میں در آنے والی غلطیوں کی تصحیح انھوں نے معارف میں شائع شدہ اپنے مکتوب (اکتوبر ۲۰۱۲ء) میں کی ہے۔

مولانا شبلی کے فارسی خطوط از ساجد صدیق نظامی (اگست ۲۰۱۳ء)۔اس مضمون میں علامہ شبلی کی فارسی مکتوب نگاری کا تعارف کراتے ہوئے فارسی اور اردو مکتوب نگاری کے درمیان پائے جانے والے فرق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

علامہ شبلی نعمانی کے دو فارسی خطوں کا اردو ترجمہ از ڈاکٹر خالد ندیم و نوید احمد گل (ستمبر ۲۰۱۴ء)۔اس مضمون میں علامہ شبلی کے ان دو خطوط کا اردو ترجمہ فارسی متن کے ساتھ نقل کیا گیا ہے جو انھوں نے اپنے والد محترم کے نام لکھے تھے۔اس مضمون کا مقصد یہ ہے کہ غالب اور اقبال کے تمام غیر اردو مکتوبات کا ترجمہ اردو میں ہو چکا ہے لیکن ابھی تک علامہ شبلی کے فارسی خطوط کا ترجمہ نہیں ہوا ہے لہٰذا ان خطوط کے اردو ترجمہ کی ضرورت اب بھی باقی ہے۔مضمون نگاران نے

www.shibliacademy.org

نمونہ کے طور پر مذکورہ ترجمہ پیش کیا ہے اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ترجمہ میں علامہ شبلی کے اسلوب کو باقی رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ان مستقل مقالات ومضامین کے علاوہ علامہ کے خطوط کا ضمنی ذکر ''علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت، خطوط شبلی کی روشنی میں'' از ریاض الرحمٰن خان شروانی (دسمبر ۲۰۰۶ء) اور ''جہان شبلی'' از ڈاکٹر شمس بدایونی (جولائی ۲۰۱۳ء) میں بھی پایا جاتا ہے۔

مکتوب الیہ: نامۂ حالی۔ علامہ شبلی کے نام علامہ حالی کے ان خطوط کے ذریعہ معارف نے اپنے مستقل کالم ''آثار علمیہ ادبیہ'' کا آغاز کیا تھا۔ اس سلسلہ میں علامہ حالی کے ۴؍ خطوط ہیں (ستمبر-دسمبر ۱۹۱۶ء)۔

مکاتیب مولانا ابو الکلام آزاد بنام علامہ شبلی (دسمبر ۱۹۵۳ء)۔ معارف اکتوبر تا دسمبر ۱۹۵۳ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کے وہ ۲۱؍ مکاتیب شائع ہوئے تھے جو انھوں نے علامہ سید سلیمان ندوی کے نام لکھے تھے۔ غالباً غلطی سے ان خطوط میں وہ دو خط بھی شائع ہو گئے جو انھوں نے علامہ شبلی کے نام لکھے تھے۔ ان خطوط کا نمبر ۱۶ و ۱۷ ہے۔ مذکورہ عنوان راقم کا مقرر کردہ ہے۔

مکاتیب سید حسین بلگرامی بنام شبلی (فروری ۱۹۶۵ء)۔ مکتوب نگار نے قرآن کا انگریزی ترجمہ کرنا شروع کیا تھا۔ مذکورہ خطوط اسی سلسلہ میں لکھے گئے ہیں۔ یہ سات خط ہیں۔

مشاہیر کے خطوط (اگست ۱۹۷۶ء)۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے یہ چند مشاہیر کے خطوط ہیں۔ دو خط ابوالکلام آزاد کے بنام علامہ شبلی ہیں۔

مولانا شبلی کے نام مولانا فاروق چریا کوٹی کے چند خطوط (جون ۱۹۸۸ء)۔ یہ عربی خطوط شرف الدین اصلاحیؒ کے تمہیدی نوٹس کے ساتھ شائع ہوئے ہیں۔ انہوں نے ان کے اردو ترجمہ کے ساتھ دیگر امور کی وضاحت بھی کی ہے۔

خطیب ومقرر: مولانا شبلی کی ایک تقریر [اپریل ۱۹۰۹ء، جلسہ انجمن حمایت اسلام، لاہور] (اگست ۱۹۶۷ء)۔

مولانا شبلی کی ایک تقریر [۳۰؍ دسمبر ۱۸۹۹ء، کلکتہ] (جنوری ۱۹۶۸ء)۔

علم کلام پر علامہ شبلی کا ایک نایاب لکچر [۱۵؍ مارچ ۱۹۰۱ء، باغ عامہ، حیدرآباد] (اکتوبر

www.shibliacademy.org

۱۹۶۹ء)۔

تفصیلات کے لیے مضمون کا ذیلی عنوان ’’علامہ شبلی کا نثری سرمایہ‘‘ دیکھیے۔

علامہ شبلی کی نادر تحریریں: علامہ شبلی نعمانی کی دو غیر مطبوعہ تحریریں [رپورٹ و تاثرات متعلق کتب خانہ رامپور] از امتیاز علی خان عرشی (اکتوبر ۱۹۳۴ء)

دو نایاب تحریریں [آزاد و شبلی کی تحریریں] از عطاء الرحمٰن عطا کاکوی (جون ۱۹۶۲ء)

رپورٹ انجمن ترقی اردو [پیش کردہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، بمبئی، منعقدہ دسمبر ۱۹۰۳ء] (اکتوبر ۱۹۶۷ء)۔

مولانا شبلی نعمانی کی ایک نادر تحریر [سفارشی خط برائے عبدالقوی فانی بنام نظام حیدرآباد، مؤرخہ ۷رفروری ۱۹۱۱ء] از شاہ عبدالسلام (فروری ۱۹۹۹ء)۔

علامہ شبلی کی ایک نادر تحریر [مکہ میں جامعہ اسلامیہ (یونیورسٹی) کی تجویز] از اشتیاق احمد ظلی (نومبر ۲۰۱۳ء)۔

علامہ شبلی کی ایک نادر تحریر [نواب عزیز جنگ ولاؔ کی ایک اہم تصنیف تاریخ النوائط کا تعارف] از حسن الدین احمد (نومبر ۲۰۱۳ء)۔

مدینہ یونیورسٹی سے متعلق علامہ شبلی کی ایک نادر تحریر از اشتیاق احمد ظلی (دسمبر ۲۰۱۳ء)۔

تعطیل جمعہ کے سلسلہ میں علامہ شبلی کی ایک نادر تحریر از اشتیاق احمد ظلی (مارچ ۲۰۱۴ء)۔

مذکورہ بالا نادر تحریروں کے لیے ذیلی عنوان ’’علامہ شبلی کا نثری سرمایہ‘‘ ملاحظہ فرمائیں۔

شبلی اور آزاد: مولانا ابوالکلام آزاد پر علامہ شبلی کے اثرات از سید احتشام احمد ندوی (جون ۲۰۰۶ء)۔ اس مضمون میں حیات شبلی اور مکاتیب شبلی بنام مولانا آزاد کی روشنی میں دونوں بزرگوں کی اثر اندازی و اثر پذیری کا ذکر ہے۔

شبلی اور آزاد (ماہنامہ لسان الصدق کے حوالہ سے) از ڈاکٹر شمس بدایونی (مئی ۲۰۱۴ء)۔ اس میں علامہ شبلی اور ابوالکلام آزاد کے تعلقات و روابط کا جائزہ مذکورہ رسالہ کے حوالہ سے لیا گیا ہے اور اس رسالہ میں علامہ شبلی کی تحریروں، زیر طبع یا زیر تصنیف کتب کے متعلق خبروں اور دیگر امور کا ذکر ہے۔

مذکورہ بالا تحریروں کے علاوہ علامہ شبلی کے نام مولانا ابوالکلام آزاد کے تین خطوط بھی

www.shibliacademy.org

شائع ہوئے ہیں۔جن کی تفصیل ذیلی عنوان ’’مکتوب الیہ‘‘ کے آچکی ہے۔

شبلی اور مغرب: سرسید،شبلی اور مغرب از رفیع الدین ہاشمی (جولائی ۱۹۸۹ء)۔اس مقالہ میں سرسید وشبلی اور علی گڑھ تحریک پر مختصر اًروشنی کے بعد بتایا گیا ہے کہ مغرب اور مغربی افکار وخیالات کے تئیں دونوں بزرگوں کا کیا نقطۂ نظر تھا؟۔

مغربی افکار کی یورش اور علامہ شبلی کا کارنامہ از حبیب ریحان خان ندوی (نومبر ۱۹۹۴ء)۔اس میں مقالہ نگار نے مغربی افکار کی یورش اور اس کا مقابلہ کرنے کی تدابیر کو بطور تمہید بیان کرنے کے بعد علامہ شبلی کے کارناموں کو ان کی تحریروں کے حوالہ سے پیش کیا ہے۔آخر میں مقالہ نگار نے علامہ شبلی کی معنوی اولاد جیسے سید سلیمان ندوی،عبدالسلام ندوی وغیرہ کے ساتھ علامہ اقبال اور مولانا مودودی کو بھی ان کی معنوی اولاد قرار دیا ہے۔

شبلی اور مستشرقین: علامہ شبلی نعمانی اور مستشرقین از الطاف احمد اعظمی (جولائی ۲۰۰۵ء)۔ اس میں مستشرقین کے علمی کارناموں کے ساتھ ان کی بددیانتی اور غلط بیانیوں کا جائزہ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے زہر کے خاتمہ کے لیے علامہ کی کاوشوں کا ذکر ہے۔

علامہ شبلی کی سیرت النبی میں وارد مستشرقین کا تعارف از صاحب عالم اعظمی ندوی (اگست-اکتوبر ۲۰۱۱ء)۔اس مضمون کا ذکر ’’تعارف کتب‘‘ میں سیرۃ النبی کے تحت کیا جاچکا ہے۔

عصر حاضر میں علامہ شبلی کی معنویت: موجودہ دور میں علامہ شبلی کے اثرات اور معنویت از خورشید نعمانی ردولوی (نومبر ۲۰۰۵ء)۔اس مضمون میں سرسید وشبلی کی منفرد خصوصیات کا ذکر ہے۔

عہد حاضر میں علامہ شبلی کی بعض تجویزوں اور منصوبوں کی معنویت از محمد الیاس الاعظمی (فروری ۲۰۰۸ء)۔اس میں علامہ شبلی علیہ الرحمہ کے متعدد منصوبوں وتجویزوں کا ذکر ہے۔ان میں سے کچھ منصوبے وتجاویز ناتمام رہ گئے۔عصر حاضر میں ان کی معنویت کا تقاضہ ہے کہ ان کو عملاً بروئے کار لایا جائے۔

عصر رواں میں شبلی کی معنویت از سید عبدالباری (نومبر ۲۰۰۸ء،۳۳۹-۳۵۳)۔اس میں علامہ شبلی کی تصانیف ومکتوبات کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ ان کے نظریات وافکار کی معنویت آج بھی برقرار ہے۔

www.shibliacademy.org

علامہ شبلی کے تعلیمی افکار اور عصر حاضر میں ان کی معنویت از پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی (جولائی ۲۰۰۹ء)۔

علامہ شبلی نعمانی اور ان کے تعلیمی تصورات کی عصری معنویت از پروفیسر اختر الواسع (جنوری ۲۰۱۴ء)۔

آخر کے دو مضامین کا ذکر ''ماہر تعلیم'' کے تحت کیا جا چکا ہے۔

رپورٹ شبلی سمینار: علامہ شبلی شخصیت اور فن از ضیاء الدین اصلاحی (مئی ۱۹۹۵ء)۔ یہ دراصل اس سمینار کی رپورٹ ہے جو ۱۴تا ۱۶/ اپریل ۱۹۹۵ء، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی میں منعقد ہوا تھا۔

روداد دو روزہ علامہ شبلی نعمانی، حیات و افکار سمینار، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ از محمد عمیر الصدیق ندوی (دسمبر ۲۰۰۴ء)۔ ۲۸-۲۹/ نومبر ۲۰۰۴ء کو دارالمصنّفین میں منعقد ہونے والے سمینار کی یہ تفصیلی رپورٹ ہے۔

متعلقات شبلی: شبلی سوسائٹی از مہدی حسن افادی (جون ۱۹۱۸ء) اس میں شبلی سوسائٹی کے قیام کی تجویز وضرورت اور اس کے لائحہ عمل کا ذکر ہے کہ اس کا بنیادی مقصد علامہ شبلی کے غیر مکمل کاموں کی تکمیل ہے۔

معاصرانہ چشمک از مہدی حسن افادی (اپریل ۱۹۱۹ء)۔ اس میں حالی و شبلی کے علمی اختلافات کا ذکر ہے اور ان کی نکتہ سنجیوں کا بیان بھی ہے۔

تضمین برغزل شبلی از محمد مسلم عظیم آبادی [منظوم، فارسی] (ستمبر ۱۹۲۹ء)۔ علامہ کی ایک فارسی غزل پر شاعر نے تضمین کی ہے۔

حیات شبلی [از سید سلیمان ندوی] (نومبر ۱۹۴۳ء)۔ اس عنوان کے تحت حیات شبلی کے ابتدائی اوراق یعنی مقدمہ مصنف، دیباچہ و فہرست کتاب کو معارف کے صفحات کی زینت بنایا گیا ہے۔ یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نومبر ۱۹۴۳ء کے شمارہ کے اکثر صفحات (یعنی ۸۰/ صفحات میں سے تقریباً ۶۷/ صفحات) حیات شبلی اور اس سے متعلق مواد پر مشتمل ہیں۔ علامہ شبلی سے متعلق معارف میں چھپنے والے اس مقالہ کا شمار دو طویل ترین مقالات میں ہوتا ہے۔ دوسرے مقالہ کا عنوان ہے: علامہ شبلی بحیثیت فارسی شاعر از مرزا احسان احمد۔

www.shibliacademy.org

مقدمہ حیات شبلی از یحییٰ اعظمی (نومبر ۱۹۴۳ء)۔ اس نظم میں حیات شبلی کی اشاعت پر خوشی و مسرت کا اظہار کیا گیا ہے۔

حیات شبلی [از سید سلیمان ندوی] کے معلومات میں کچھ اضافے از محمد ابراہیم فریدی (اکتوبر ۱۹۴۸ء)۔ اس میں حیات شبلی میں مذکور کچھ غلطیوں کی نشاندہی اور کچھ امور کی وضاحت ایک خط میں ہے۔ اس میں جو ۶/امور پر محیط ہے۔

مقالہ نما شبلی از محمد بشیر الحق دسنوی (جون ۱۹۶۰ء)۔ علامہ شبلی سے متعلق مرتب کی جانے والی کتابیات میں اس کو دوسرا مقام حاصل ہے۔ یہ فہرست ۴۲/مندرجات پر مشتمل ہے۔ اولیت کا مقام احمد اسحاق نعمانی کی مرتب کردہ مختصر کتابیات کو حاصل ہے جو دہلی کے رسالہ ''آج کل'' کے شمارہ جنوری ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی تھی لیکن اس میں متعدد مآخذ کا ذکر نہیں تھا اس فہرست میں ان مآخذ کا ذکر کیا گیا ہے۔

کلام شبلی [کا منظوم ترجمہ] از اکبر علی خان عرشی زادہ (اکتوبر ۱۹۷۸ء)۔ یہ منظوم ترجمہ چھ اشعار پر مشتمل ہے لیکن یہ وضاحت نہیں ہے کہ یہ علامہ کے کن اشعار کا ترجمہ ہے۔ ''شبلی سخنوروں کی نظر میں'' میں بھی یہ منظوم ترجمہ نقل کیا گیا ہے لیکن وضاحت وہاں بھی نہیں ہے کہ یہ علامہ کی فارسی غزل: این نمی دانم کہ گبرم یا مسلماں نیستم ...... الخ کا ترجمہ ہے۔

سہ ماہی فکر و نظر شبلی نمبر [مدیر شہریار، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ] از ضیاء الدین اصلاحی (مئی ۱۹۹۷ء)۔ یہ تفصیلی تبصرہ معارف کے مستقل عنوان ''باب التقریظ والانتقاد'' کے تحت شائع ہوا ہے۔

دارالمصنّفین کی بنیاد کس نے ڈالی تھی؟ از ضیاء الدین اصلاحی (جون ۱۹۹۷ء)۔ یہ دراصل ایک استفسار کا جواب ہے جو معارف کے مستقل عنوان ''استفسار و جواب'' کے تحت شائع ہوا ہے۔ دارالمصنّفین کے بانی کے متعلق سوال ہے کہ اس کا بانی کون تھا؟ مدیر معارف نے ثابت کیا ہے کہ اس کے بانی علامہ شبلی ہی تھے اور سید سلیمان ندوی و دیگر فرزندان ندوۃ العلماء نے شبلی کے خوابوں کو شرمندہ تعبیر کا فریضہ انجام دیا۔

علامہ شبلی کی تصنیفات کے ترجمے از محمد الیاس الاعظمی (نومبر ۱۹۹۹ء)۔ اس مقالہ میں علامہ شبلیؒ کی کتابوں میں تاریخ بدء الاسلام (اردو و فارسی کے تین تراجم)، سیرۃ النعمان (انگریزی ترجمہ)، الفاروق (انگریزی و فارسی کے تین تراجم) کے ترجموں کا ذکر ہے۔ مضمون نگار کو غالباً اس کے عربی ترجمہ کا علم نہیں تھا بعد میں ایک دوسرے مقالہ

www.shibliacademy.org

''الفاروق کے تراجم'' میں اس کے عربی ترجمہ از ڈاکٹر سمیر ابراہیم کا ذکر کیا ہے۔ڈاکٹر محمد صلاح الدین عمری نے ''الفاروق'' سے متعلق اپنے ایک مضمون میں ڈاکٹر جلال السعید الحفناوی کے عربی ترجمہ کا ذکر کیا ہے جو المجلس الأعلی للثقافة، قاہرہ سے ۲۰۰۰ء میں شائع ہو چکا ہے۔

علی گڑھ کا اقلیتی کردار، کاروان زندگی [از سید ابوالحسن علی ندوی] حصہ اول میں ایک سہو اور مولانا فراہیؒ سے علامہ شبلیؒ کا استفادہ از وارث ریاضی (اکتوبر ۲۰۰۱ء)۔یہ دراصل ایک خط ہے جس میں کئی امور کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔اس خط میں علی گڑھ کے اقلیتی کردار کے متعلق مدیر معارف کے نقطۂ نظر کی تعریف کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ کے تئیں کاروان زندگی (جلد اول) میں درآنے والی غلطی کی نشاندہی کی گئی ہے یہ بھی بتایا گیا کہ علامہ شبلیؒ نے مولانا حمید الدین فراہیؒ سے کس قدر استفادہ کیا تھا؟۔ معارف نے خط کے آخر میں لکھا کہ علامہ شبلی کے مولانا فراہیؒ سے علمی استفسار کے لیے استفادہ کا لفظ زیادہ مناسب نہیں ہے بلکہ علامہ شبلیؒ کے الفاظ میں ''استفسار و تحقیق'' اور علامہ سید سلیمان ندویؒ کے بقول ''مشورہ'' کا استعمال زیادہ مناسب ہے۔علامہ شبلی پر تحریف کا الزام از محمد عارف عمری (نومبر ۲۰۰۲ء) اس میں سیرۃ النعمان کے حوالہ سے ایک قضیہ میں علامہ شبلی پر تحریف کے الزام کی تردید ہے۔علامہ شبلی نعمانی کا مذہبی نقطۂ نظر از خورشید جمال قاسم (جنوری ۲۰۱۳ء)۔اس میں علامہ کے مذہبی نقطۂ نظر پر گفتگو میں یہ بتایا گیا کہ اس میں مولانا فاروق چریاکوٹی کا کتنا دخل رہا ہے۔

جہان شبلی از ڈاکٹر شمس بدایونی (جولائی ۲۰۱۳ء)۔''جہان شبلی'' کی یہ چوتھی قسط ہے۔اس کی ابتدائی تین قسطیں ہماری زبان، نئی دہلی میں شائع ہوئی تھیں۔اس قسط میں علامہ شبلی سے متعلق ۹ر منتشر معلومات ہیں۔ان میں زیادہ تر کا تعلق مکتوب نگاری سے ہے۔اس مضمون کے حوالے سے مضمون نگار کا معارف ایک مکتوب (اگست ۲۰۱۳ء) بھی ہے۔علامہ شبلی اور مسلمان خواتین کی تعلیمی و معاشرتی بیداری از شائستہ خاتون (نومبر ۲۰۱۳ء)۔اس میں مسلمان خواتین کی ترقی اور ان کی تعلیمی و معاشرتی بیداری کے حوالہ سے علامہ شبلی کی تحریری و عملی کاوشوں کا ذکر ہے۔معتقد شبلی، مہدی افادی از ڈاکٹر شاداب عالم (جولائی ۲۰۱۴ء)۔اس مہدی افادی کی نظر میں علامہ کے مقام و مرتبہ کا بیان ہے۔

نتائج بحث: معارف میں شبلیات پر تحریروں کی مجموعی تعداد ۱۶۲ ہے۔ایک حصہ علامہ شبلی

www.shibliacademy.org

کی تحریروں پر مشتمل ہے جس کی مجموعی تعداد ۴۲ ہے۔ دوسرا حصہ علامہ شبلی پر لکھے جانے مقالات و مضامین ومنظومات ہیں۔کل ۱۲۰ ہیں۔ علامہ شبلی سے متعلق ان تحریروں سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ معارف کی زندگی کے اعتبار سے علامہ شبلی علیہ الرحمہ پر شائع ہونے والے مقالات و مضامین اور دیگر تحریروں کی تعداد بظاہر کم ہے لیکن استدراکات واستفسارات، تبصروں، رودادوں اور مقالات ومضامین کے عنوانوں کے تنوع کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اگر چہ شبلی کی شخصیت کا مکمل احاطہ تو نہیں ہوتا تاہم بعض اہم پہلو بہرحال سامنے آجاتے ہیں۔ان سے یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ علامہ شبلی پر سب سے زیادہ مقالات ان کی تصانیف سے متعلق ہیں۔ جیسے **الانتقاد علی التمدن الاسلامی** ،انٹرنس کورس فارسی،اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر،سفرنامۂ روم ومصر وشام،سوانح مولانا روم، سیرۃ النبی، شعرالعجم، الفاروق، المامون، مقالات شبلی،مثنوی صبح امیداور موازنۂ انیس ودبیر وغیرہ،ان میں بعض پر ایک سے زیادہ تحریریں ہیں۔جبکہ **الانتقاد علی التمدن الاسلامی**،سفرنامۂ روم ومصروشام،المامون اور مثنوی صبح امید کے تعارف میں ایک ایک مضمون مرزا احسان احمد کا مقالہ ''علامہ شبلی بحیثیت فارسی شاعر کے'' سب سے طویل مقالہ ہے۔دوسرا طویل ترین مقالہ حیات شبلی از سید سلیمان ندوی ہے۔

معارف کی اولین اشاعتوں میں علامہ شبلیؒ کی تحریریں شائع ہوتی رہی ہیں۔ان کی تحریروں کی اشاعت کا سلسلہ اس کے پہلے شمارہ سے شروع ہوتا ہے اور ۱۹۱۹ء تک یہ سلسلہ مستقل جاری رہا۔ نومبر ۱۹۲۳ء، جنوری و اکتوبر ۱۹۲۵ء، مئی ۱۹۳۰ء، اکتوبر ۱۹۳۴ء، ستمبر ۱۹۳۶ء، دسمبر ۱۹۴۲ء، جنوری ۱۹۵۶ء، جون، جولائی اور ستمبر ۱۹۶۲ء، اگست و اکتوبر ۱۹۶۷ء، جنوری ۱۹۶۸ء، اکتوبر ۱۹۶۹ء، ستمبر ۱۹۷۱ء،فروری ۱۹۹۹ء،نومبر ۲۰۱۲ء،نومبر ودسمبر ۲۰۱۳ء اور مارچ واکتوبر ۲۰۱۴ء کے شماروں میں علامہ کی مختلف النوع تحریریں شائع ہوئیں۔علامہ شبلیؒ پر لکھے جانے والے مضامین کی ابتداء بھی معارف کے دوسرے شمارہ سے ہوتی ہے۔ یہ سلسلہ فروری ۱۹۲۰ء تک کسی حد تک ایک تسلسل سے جاری رہا۔مارچ ۱۹۲۰ء کے بعد شائع ہونے والے شماروں علامہ کی شخصیت پر مقالات کی اشاعت میں مہینوں بلکہ سالوں کا وقفہ پایا جاتا ہے مثلاً نومبر ۱۹۲۵ء تا اگست ۱۹۲۹ء، اکتوبر ۱۹۲۹ء تا فروری ۱۹۳۸ء، مئی ۱۹۳۸ تا نومبر ۱۹۳۸ء،جنوری ۱۹۳۹ تا اکتوبر ۱۹۴۳ء، دسمبر ۱۹۴۳ تا ستمبر ۱۹۴۸ء کے دوران ایسی کوئی تحریر

www.shibliacademy.org

نہیں یہی صورت حال ۱۹۸۴ء تک پائی جاتی ہے۔۱۹۸۵ء سے تا اکتوبر ۲۰۱۴ء کے شماروں میں شائع ہونے والے مضامین ومقالات کے درمیان یہ وقفہ کم ہوگیا۔

مختصراً پہلا دور ابتداء تا ۱۹۸۴ء پر محیط ہے۔قریب ۶۸ سال کے اس میں ۲۸ مقالات شائع ہوئے ہیں جن کا سالانہ اوسط ایک سے بھی بہت کم ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تقریباً ہر ڈھائی سال بعد ایک مقالہ شائع ہوتا رہا ہے۔دوسرا دور ۱۹۸۵ء سے لے کر اکتوبر ۲۰۱۴ء کے عرصہ پر مشتمل ہے ۔تقریباً تیس سال کے اس دورانیہ میں علامہ شبلی کی شخصیت کا مطالعہ کسی قدر تیز رفتاری کے ساتھ کیا گیا ہے۔اس دوران شائع ہونے والے مقالات کی تعداد ۹۲ ہے۔گویا اوسطاً سالانہ تین مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔

سنہ ۲۰۰۶ء وہ واحد سال ہے جس کے ہر مہینہ کے شمارہ میں علامہؒ کی شخصیت کے کسی نہ کسی پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے۔سنہ ۲۰۰۵ء اور ۲۰۰۷ء کے اکثر شماروں میں علیہ الرحمہ کی شخصیت پر کچھ نہ کچھ لکھا گیا ہے۔سنہ ۲۰۰۸ء اور ۲۰۱۱ء تا اکتوبر ۲۰۱۴ء کے درمیان شائع ہونے والے شماروں میں چار یا چار سے زائد مقالات شائع ہوئے ہیں۔معارف میں بعض مقالات ومضامین ایسے ہیں جو ان کی برسی کی مناسبت سے ماہ نومبر میں شائع ہوئے ہیں۔مدیران معارف نے بعض مقالات کو ان کی برسی کی مناسبت سے شائع کرنے کی وضاحت کی ہے۔نومبر کے مہینے میں شائع ہونے والے مضامین کی مجموعی تعداد ۲۷ ہے۔نومبر کے حوالہ سے راقم یہ بات کہنا زیادہ مناسب سمجھتا ہے کہ اگر ارباب دارالمصنّفین نومبر کے شمارہ کو علامہؒ کی شخصیت کے مطالعہ کے لیے مختص کردیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ایسا کرنا کوئی معیوب ومشکل کام نہیں ہے کیونکہ ہمارے سامنے ایک معاصر رسالہ تہذیب الاخلاق کی عمدہ مثال موجود ہے کہ اس نے اپنے بانی کے یوم پیدائش کی مناسبت سے اکتوبر کے شمارہ کو سرسید کی حیات وشخصیت اور ان کے افکار وخیالات کے مطالعہ کے لیے مختص کر رکھا ہے۔

یہ بھی واضح ہے کہ عام طور سے مدیران معارف نے علامہ شبلیؒ پر بہت کم لکھا ہے۔زیادہ تر تحریریں علامہ سید سلیمان ندویؒ اور مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ کی ہیں۔مجموعی تعداد کے اعتبار سے مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ کو سید صاحبؒ پر فوقیت حاصل ہے۔دونوں بزرگوں نے چھ چھ مقالات لکھے ہیں۔مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ نے مقالات کے علاوہ علامہ شبلی سے متعلق

www.shibliacademy.org

استفسار، رسالہ پر تبصرہ، سمینار کی رپورٹ وغیرہ پر قلم اٹھایا ہے جس کی وجہ سے ان کی تحریروں کی تعداد (دس تحریریں) بڑھ جاتی ہے۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰنؒ کا مضمون کا عنوان ''المامون'' ہے۔ شاہ صاحب کے ساتھ ساتھ موجودہ مدیروں نے ان پر کوئی مقالہ نہیں لکھا۔ اشتیاق احمد ظلی صاحب نے علامہ شبلی کی چند نادر و نایاب تحریروں کو اپنے تمہیدی کلمات کے ساتھ آثار علمیہ و تاریخیہ کے تحت شائع کیا ہے، جب کہ جناب محمد عمیر الصدیق کے قلم سے نومبر ۲۰۰۴ء میں علامہ شبلی پر منعقد ہونے والے سمینار کی تفصیلی رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ ان مقالات کی فہرست پر نظر ڈالنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رفقائے دارالمصنّفین میں کسی نے اب تک علامہ کی شخصیت کے متعلق معارف میں کوئی علاحدہ مضمون نہیں لکھا۔

دارالمصنّفین کے علاوہ علامہؒ کا جن اداروں سے تعلق رہا ان میں شبلی کالج، علی گڑھ، ندوۃ العلماء، مدرسۃ الاصلاح نمایاں ہیں۔ لیکن معارف کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حلقوں کی تحریریں معارف میں کم ہیں۔

معارف میں علامہ شبلی پر تین یا تین سے زیادہ مرتبہ قلم اٹھانے والوں میں علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ، پروفیسر ریاض الرحمٰن خان شروانی، پروفیسر ظفر الاسلام، مولانا محمد عارف عمری، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی اور ڈاکٹر شمس بدایونی شامل ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مقالات جناب ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کے ہیں۔ جن کے مقالات کی تعداد ۹ ہے۔

علامہ شبلی پر ایک سے زائد مرتبہ قلم اٹھانے والوں میں امتیاز علی عرشی، بشیر الحق دسنوی، شرف الدین اصلاحی، پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی و سید عبدالباری وغیرہ شامل ہیں۔ جناب وارث ریاضی صاحب کی بھی تحریریں ایک سے زائد مرتبہ مکتوب کی صورت میں شائع ہو چکی ہیں۔ منظوم حصہ میں نوحۂ شبلی از اقبال احمد سہیلؔ، شبلی منزل از قاضی محمد عبدالرحمٰن حیرتؔ، یاد شبلی از سجاد انصاری، قطعۂ تاریخ وفات شبلی از حفیظ اللہ خان حفیظؔ، مرثیہ علامہ شبلی از مضطر ردولوی مرحوم، نذر شبلی از محمد عبدالقدیر ایڈوکیٹ وغیرہ ہیں۔

www.shibliacademy.org

نیشنل اسکول اور شبلی

(۱۸۸۳-۱۹۴۰ء)

ڈاکٹر علاؤالدین خان*

شبلی عالم دین، شاعر و ناقد، جلیل القدر و لاثانی ادیب، وسیع النظر مورخ و محقق اور ماہر تعلیم تھے، تعلیم کی ترویج و اشاعت اور اسلامی فکر کے ارتقاء میں ان کا حصہ سب سے نمایاں نظر آتا ہے، وہ ہندوستانی مسلمانوں کو تعلیمی پسماندگی سے نکالنا چاہتے تھے اور مسلمانوں کے روایتی تعلیمی نظام میں ایسی اصلاحات چاہتے تھے جو انہیں دور جدید کے تقاضوں اور حالات سے ہم آہنگ کر سکیں۔ شبلی نے شعور کی آنکھیں اس وقت کھولیں جب ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی اور اسے علم اور تعلیم کی ترویج اشاعت کا خیال نہ تھا اور لوگ ایک چھوٹا سا مدرسہ قائم کرتے ہوئے بھی سوچتے تھے کہ معلوم نہیں یہ کب تک چل سکے گا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ سرکاری تہذیب ہماری قومی تہذیب پر چھائی ہوئی تھی ایسے میں علامہ شبلی نے ۲/جون ۱۸۸۳ء میں نیشنل اسکول کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ اس عمل میں ان کے والد اور برادری کے دوسرے عمائدین نے ہر طرح کی مدد کی اور بعض لوگوں نے اپنی جائداد اور زمین اسکول کو دیں (۱)۔ شبلی جنوری ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ گئے اور صرف چار مہینے میں علی گڑھ تحریک سے اتنا متاثر ہوئے کہ اپنے وطن میں اسکول کھول دیا۔

یہ بڑی معنی خیز بات ہے کہ شبلی کا قائم کیا ہوا ادارہ نیشنل کہلایا اور اس لفظ کا استعمال شبلی نے اس وقت کیا جب لوگ نیشنل لفظ کے استعمال سے خوف کھاتے تھے۔ یہ ادارہ صرف ایک مدرس اور تین طالب علموں سے شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ بڑھتا گیا یہاں تک کہ ۱۸۸۷ء میں مڈل اسکول اور ۱۸۹۵ء میں ہائی اسکول ہو گیا (۲)۔ مکاتیب شبلی میں اس اسکول کا کثرت سے ذکر ہے۔ شبلی نے

---

* شعبہ تاریخ، شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ۔

www.shibliacademy.org

اس اسکول کی ترقی کے لیے جس طرح اپنے عزیزوں کی توجہ مبذول کرائی ہے اس سے ان کے انہماک کا پتہ چلتا ہے، جوان کو قوم میں انگریزی تعلیم کی اشاعت کے ساتھ پیدا ہو گیا تھا۔(۳)

دسمبر ۱۸۸۳ء میں جب شبلی علی گڑھ سے آئے تو نیشنل اسکول کا جلسۂ انعام بھی ہوا جس میں حکام کو بھی مدعو کیا گیا، کچھ وجوہ کی بنا پر مولوی سمیع (۴) نے اس جلسہ میں شرکت نہیں کی جس کا مولانا کو افسوس رہا۔ ان کے شرکت نہ کرنے کی وجہ کوئی امتحان تھا، اس جلسہ میں طلباء سے کچھ ایسی باتیں سرزد ہوئیں کہ اسکول کے ماسٹر کی خوبیاں اجاگر نہ ہو سکیں، اس لیے حکام کو کچھ کمیاں محسوس ہوئیں جس کا شبلی کو افسوس ہوا ان کو ایک اچھے ماسٹر کی تلاش ہوئی، مولوی محمد سمیع کو بھی تاکید کی کہ نیشنل اسکول کی دن رات فکر رہے۔ ۱۸ر فروری ۱۸۸۴ کو محمد سمیع کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

”دیکھو شب و روز مدرسہ کی فکر رہے، ذرا قوم کو ابھارو“۔(۵)

شبلی نیشنل اسکول کی ذرا ذرا سی بات سے باخبر رہنا چاہتے تھے، اسکول کی باقاعدہ رپورٹ ان کے پاس بھیجی جاتی تھی، رپورٹ کی کمیوں پر نظر رکھتے تھے۔ احباب و اعزا کو آگاہ کرتے اور گرفت کرتے تھے۔ اسکول میں اصلاحات نافذ کرنے اور اسے صحیح سمت میں لے جانے کے لیے کوشاں رہتے۔ سب سے زیادہ مولوی محمد سمیع کو جواب دہ سمجھتے تھے، طلبہ کی علمی استعداد معلوم کرنے کے لیے بے چین رہتے تھے۔ محمد شریف طالب علم پر کسی وجہ سے جرمانہ عاید کیا گیا، مولانا چاہتے تھے کہ وہ ضرور وصول کیا جائے۔ بغیر فیس وصول کیے اسکول آنے کی اجازت دینے کے حق میں نہ تھے، اس لیے کہ اسکول کو اسکول بنانا چاہتے تھے، کھیل یا مذاق نہیں۔ محمد سمیع کو ۱۸۸۳ء میں لکھے گئے خط میں رقم طراز ہیں:

”مدرسہ نیشنل اسکول کی رپورٹ جو آتی ہے وہ بالکل ناقص ہوتی ہے، آج تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ لڑکوں نے کس قدر کس علم کو پڑھ لیا ہے، ہاں محمد شریف پر جو جرمانہ ہوا وہ ضرور وصول ہو ورنہ اس کو مدرسہ میں آنے کی اجازت نہ ہو۔ شفیع بندولی و فخر الدین کی پوری فیس اگر وصول نہ ہوئی ہو تو وہ ہرگز مدرسہ میں جانے نہ پائے، یہ مدرسہ ہے ملعبہ نہیں“۔(۶)

شبلی یہ جاننے کی ضرورت محسوس کرتے تھے کہ جو نئے طلبا اسکول میں داخل ہوئے ان

www.shibliacademy.org

میں کس کس نے فیس جمع کی اور ان کا نام ونسب کیا ہے۔شبلی ۱۹؍ستمبر ۱۸۸۳ء کے ایک خط میں محمد سمیع کو لکھتے ہیں:

"جہاں تک ممکن ہو قوم کے معزز لوگوں میں مدرسہ کی وقعت اور اس کی ضرورت کا تذکرہ کرنا چاہیے اور ان کو شرکت پر آمادہ کرنا چاہیے، اگر چند اہل ہمت ساتھ دیں تو مدرسہ ایک مستقل حالت میں ہوسکتا ہے، جو لڑکے مدرسہ میں نئے داخل ہوں، ان کا نام ونسب مجھ کو ضرور لکھا کرو اور یہ بھی لکھو کہ ان کی فیس داخل ہوتی ہے یا نہیں"۔(۷)

شبلی اپنے اسکول سے متعلق کس درجہ حساس تھے اور اس کے تحفظ و بقا کے لیے کتنا پریشان رہتے تھے۔اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کسی بھی فرد کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔چنانچہ محمد سمیع کو مشورۃً لکھتے ہیں کہ:

"گریس (۸) بابو کو ناراض کرنا منظور نہیں، ہمارے مدرسہ (نیشنل اسکول) کے لڑکے اوپر کی صف میں جب آئیں گے تو شاید مشن میں بھرتی ہوں گے، ابھی مدرسہ کی یہ حالت نہیں ہے کہ دوسرے مدرسوں سے چشمک رکھی جائے، خدانخواستہ کوئی امر ہو جائے تو لوگوں کو تضحیک کا موقع ہوگا کہ دو دن کے لیے انہوں نے بھی مدرسہ کھولا تھا، ہاں خدا وہ دن لائے کہ مدرسہ ایک مستقل حالت میں ہو، پھر لڑکوں کی کیا کمی ہوگی"۔(۹)

شبلی اسکولوں کی آپسی رقابت کو پسند نہیں کرتے تھے۔اس لیے کہ رقابت شروع ہوجانے پر نیشنل اسکول کے بیٹھ جانے کا اندیشہ تھا اور اسکول کے بند ہوجانے پر جگ ہنسائی ہوتی۔

شبلی جس عہد میں تھے اس عہد میں قدیم وجدید تعلیم کی تقسیم بہت ہی واضح اور نمایاں تھی، وہ اس تقسیم کو ختم نہیں کرسکتے تھے اور نہ انہوں نے کبھی اس کی وکالت کی، وہ مذہبی تعلیم کے ساتھ انگریزی تعلیم کی اہمیت پر زور دیا کرتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ نیشنل اسکول میں شروع ہی سے انگریزی پر زور تھا، وہ عام نصاب سے ہٹ کر انگریزی کا ایک درجۂ تکمیل بھی چاہتے تھے کہ طلبا انگریزی پڑھیں گے تو زبان دانی میں ماہر ہوسکیں گے۔چنانچہ نیشنل اسکول کے طلباء سے متعلق ۲۲؍ فروری ۱۸۸۴ء میں محمد سمیع کو لکھتے ہیں کہ:

www.shibliacademy.org

۱-تمام لڑکے خصوصاً پانچویں صف کے بقدر امکان انگریزی بولتے ہیں یا نہیں۔ ٹیچروں نے اس طرف توجہ مبذول کی ہے یا نہیں۔۲- چھوٹے لڑکے مشق خط کرتے ہیں یا نہیں اور مسودہ لکھایا جاتا ہے یا نہیں۔۳- جمعرات کے دن انگریزی ہوتی ہے یا امتحان۔

شبلی نیشنل اسکول قائم کر کے خاموش یا غافل نہیں رہے۔ دوسرے علمی، ملی اور قومی کاموں کے ساتھ نیشنل اسکول کی بقا و ترقی کے لیے بھی کوشاں رہے۔ نیشنل اسکول سے متعلق اپنے اعزہ و احباب کو جس طرح سے ڈانٹتے اور توجہ دلاتے ہیں، اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ برابر اس کی ترقی چاہتے تھے، اپنے بھائی محمد اسحاق کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ”میں نے کئی بار (دفعہ) اس بات پر غور کیا اور جانچا کہ تم پانچ روپے مہینہ اسکول میں نہیں دے سکتے ہو یا تمہارے دل پر اس کی ضرورت کا اثر نہیں ہے، میں نے وقتاً فوقتاً تمہارے مصارف پر نظر ڈالی، معلوم ہوا کہ تم جس قدر بچوں کے فضول کھیل تماشا کی چیزوں کو ضروری سمجھتے ہو، اسکول کو اس قدر بھی نہیں سمجھتے، تم کبھی کبھی مجھ کو کبھی مظفر کو کبھی شیخ کو کوئی چیز بھیج دیتے ہو یا ساتھ لاتے ہو، اگر تم اسکول کو ذرا بھی ضروری سمجھتے تو بجائے ان غیر ضروری مصارف کے وہی رقم اسکول میں دے دیتے، جس سے دو ایک مہینہ کا چندہ ہو جاتا، ماہوار خرچ کی فہرست میں پانچ روپیہ کی رقم ایک ہفتہ سے بھی کم ہے، لیکن تم کو اسکول کا خیال نہیں، شفیع کو درد نہیں، میاں شوکت کو ہمدردی کی وجہ نہیں، اسکول کا کام بالکل رک گیا ہے، میں بیمار ہوں اور بے اثر بھی، اسکول کا خدا مالک ہے“۔(۱۰)

وہ اپنے بھائیوں اور رشتہ داروں کو نیشنل اسکول کی ترقی کے لیے برابر تحریک و تشویق دیتے ہیں، اپنے بھائی محمد اسحاق کو ۱۴ر جنوری ۱۸۸۸ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ تم کو درج ذیل پہلوؤں پر غور کرنا ہے:

۱-نیشنل اسکول کا قائم رکھنا کیوں ضروری ہے۔۲- کیا بہ لحاظ حالات موجودہ اور توقعات آیندہ کے وہ مستقل طور پر قائم رہ سکتا ہے۔۳- وطن اور قوم کے تعلیم یافتہ نوجوان جن میں مولوی اسحاق کا بھی شمار تھا۔ اسکول کی خدمت پر آمادہ ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ اسی خط میں شبلی نے لکھا ہے کہ:

www.shibliacademy.org

"یہ اسکول ہم لوگوں کے خیالات اور حوصلوں کا ایک عمدہ مشغلہ ہے، ہم توقع کرتے ہیں کہ ہم اپنی زندگی کی عملی ترقی کے ساتھ اس کو بھی ترقی دیتے جائیں گے۔ ہم میں جو لوگ قومی مذاق پیدا کرتے جائیں گے، ان کے لیے اپنی قومی فیاضی کے صرف کرنے کا اس اسکول سے عمدہ تر موقع کیا ہوگا"۔ (۱۱)

شبلی یہ چاہتے تھے کہ محمد اسحاق اپنی ترقی کے ساتھ ساتھ اسکول کو بھی ترقی دیتے اور یہی قومی کام کہا جا سکتا تھا اور جن لوگوں میں قومی مذاق پیدا ہوتا جاتا وہ اپنی قومی فیاضی اسکول کے لیے صرف کرتے جاتے۔

اگر چہ اسکول اس وقت معمولی حیثیت میں تھا مگر شبلی کو اس سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں، ان کو امید تھی کہ یہ کبھی ضرور معراج ترقی پر پہنچے گا۔ نیشنل اسکول جس مکان میں چلتا تھا وہ شبلی کی ملکیت تھا۔ جب اسکول کی تعمیر کا معاملہ آیا تو شبلی نے مولوی اسحاق کو اس کی طرف توجہ دلائی اور لکھا کہ:

"مکان مدرسہ اپنا مکان ہے، اس لیے اس پر پبلک کا روپیہ لگایا جائے اور آئندہ مدرسہ کہیں اور اٹھ جائے تو لوگوں کو کہنے کا موقع ہوگا کہ عام چندہ سے اپنا مکان بنوایا گیا، اعظم گڑھ میں ایسے ہی بدگمانوں کی زیادہ آبادی ہے۔ سب سے مقدم بورڈنگ ہے"۔ (۱۲)

شبلی بڑے حساس اور دور اندیش تھے لوگوں کے اعتراض اور بدگمانی کے امکان کو پہلے ہی تاڑ لیا تھا، اس لیے شبلی اسکول کی عمارت کی تعمیر سے پہلے بورڈنگ کی تعمیر کرانے کے حق میں تھے کیونکہ ان کے پیش نظر تربیت نہایت ضروری تھی۔ اسکول تو اور بھی تھے مگر بورڈنگ والے اسکول کی ضرورت تھی جہاں لڑکوں کی صحیح تربیت کی جائے۔

اسکول کے لیے چندہ کس کس سے لیا جائے اور کس طرح پیسہ اکٹھا کیا جائے اس کے لیے وہ بہت کوشاں رہتے تھے۔ مکاتیب میں جگہ جگہ مختلف لوگوں سے چندہ لینے کا ذکر ہے۔ خود اپنے بارے میں محمد اسحاق کو لکھا کہ جس قدر چندہ میرے نام تجویز کرو بھیج دوں گا۔ چند لوگوں کے نام بھی ملتے ہیں جن سے چندہ لیا جا سکتا تھا۔ ان میں قابل ذکر نام ماموں عبدالحق، میاں احمد علی، حافظ حبیب اللہ، حافظ علی حسن وغیرہ کے ہیں۔ حافظ حبیب اللہ کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی مالی

www.shibliacademy.org

حالت اچھی ہوگی تو دریغ نہ کریں گے، چندہ میں مولوی محمد حسین، بی، اے، مولوی مرزا سلیم، مولوی سلیم نداوی، مولوی محمد نعیم وغیرہ کو چھوڑنا نہ چاہیے۔ شبلی نے ۱۸۹۴ء میں ایک خط کے ذریعہ مولوی محمد سمیع سے یہ دریافت کیا کہ حافظ حسن علی سے روپے وصول ہوئے یا نہیں اگر نہیں تو مولوی سمیع کو دینا پڑیں گے۔

۱۱/اپریل ۱۸۹۳ء میں جب شبلی کی مجموعہ نظم فارسی منظر عام پر آئی تو اس کا کاپی رائٹ نیشنل اسکول اعظم گڑھ کو دیا تھا اس کی عام قیمت چار آنے رکھی تھی مگر اعظم گڑھ والوں کے لیے خصوصی قیمت ایک روپیہ رکھی تھی تاکہ اسکول کی خدمت ہوسکے۔ (۱۳)

نیشنل اسکول میں جب داخلے سے متعلق مسئلہ درپیش آیا کہ پست اقوام کے لڑکوں کو داخلہ دیا جائے یا نہیں تو شبلی کی رائے تھی کہ ایک گشتی مراسلہ کے ذریعہ تمام ممبروں سے اس معاملہ میں استفسار کیا جائے جیسی سب کی رائے ہو اس پر عمل کیا جائے۔ (۱۴)

نیشنل اسکول کے اساتذہ کی تنخواہ سے متعلق بھی شبلی فکرمند رہتے تھے، ۲۲/جولائی ۱۸۹۹ء میں محمد اسحاق کو ایک خط لکھا جس میں ذکر کیا کہ:

> ”ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنی تنخواہ بڑھالی ہے اور ساتھی مدرسین کی تنخواہ میں اضافہ کردیا ہے یہاں تک کہ تنخواہیں دوگنی سے بھی زیادہ ہوگئیں اور بعض لوگوں کی ایک حبہ نہیں بڑھی۔ تنخواہ کے اضافہ سے ۲۰ روپیہ مستقل خرچ بڑھ گیا اور ۲۵۰ روپیہ قرضہ ہوگیا، میں نے بڑی محنت سے جمع خرچ برابر کیا ہے۔ اب بقایا کی فکر ہے، تنخواہیں رک گئی ہیں، اس کے لیے میں نے دو تدبیریں اختیار کی ہیں، ایک تو ممبروں سے بقایا چندہ وصول کرنا، دوسرے غیر ممبروں سے ڈونیشن لینا۔ ابھی تک کچھ بھی وصول نہیں ہوا ہے“۔ (۱۵)

نیشنل اسکول بڑی پریشانیوں سے چل رہا تھا، اس کا اندازہ شبلی کے اس خط سے لگایا جاسکتا ہے جو ۱۱/اگست ۱۸۹۹ء کو محمد اسحاق کے نام لکھا گیا، اس خط کے مطالعہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اسکول کو گرانٹ ان ایڈ پر لانے کی کوشش چل رہی تھی جو جنوری تک کے لیے ملتوی ہوگئی تھی، خط ملاحظہ ہو:

www.shibliacademy.org

''پریشانیوں نے برسوں کی فکریں پیش نظر کر دیں، تعطیل کے ساتھ مکان پر آؤ تو اور بہت سے اہم امور پر غور کرنا ہے، نیشنل اسکول کی ایڈ جنوری تک پھر ٹل گئی ہے، مشکل یہ ہے کہ قحط اور وبا کی وجہ سے فیس میں ۱۵۰ روپے ماہوار کی کمی آ گئی ہے، جس کی وجہ سے تنخواہیں رک گئی ہیں۔ ماسٹروں نے واویلا کیا، اس لیے چندروزہ چندہ سب پر برقرار رہا، پانچ روپے ماہوار تمہارے نام بھی لکھا گیا ہے، یہ رقم فوراً بھیج دو''۔(۱۶)

۷/اپریل ۱۹۰۱ء میں شبلی نے حیدر آباد سے محمد اسحاق کو جو خط لکھا ہے، اس میں انہوں نے اپنے مستقبل کا ارادہ اور لکھنؤ میں قیام کر کے ندوہ یا کالج کے لیے کام کرنے کی بات لکھی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''میں نے یہ عزم کر لیا ہے کوئی معقول بات نکل آئے تو خیر، ورنہ دنیاوی خواہشوں سے صاف دست بردار ہوتا ہوں، ۱۰۰ روپے ہیں، چھاؤنی، عالیہ، اسکول وغیرہ کے چالیس پچاس نکل جائیں گے، باقی جس قدر بچے گا اس سے غریبانہ زندگی خاصی طرح بسر ہو سکتی ہے، لکھنؤ یا علی گڑھ میں بستر ہوگا اور ندوہ یا کالج کا مشغلہ تنہائی اور بے تعلقی میں انشاءاللہ قوم کی خدمت اچھی طرح بن آئے گی، کالج تو میری مدد کا محتاج نہیں لیکن ندوہ کام کرنے کی جگہ ہے''۔(۱۷)

نیشنل اسکول جس کے لیے شبلی، ان کے بھائی محمد اسحاق اور دیگر لوگ بہت پریشان رہا کرتے تھے۔ وہ بہت نشیب وفراز سے گذرا اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ منتظمین کی بے توجہی اور مالی بحران کی وجہ سے ۱۸۹۵ء میں ہائی اسکول ہو جانے والا یہ اسکول تنزل کر کے پھر مڈل اسکول ہو گیا، مولانا سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں:

''اپنے اسکول جس سے انہیں بڑی محبت تھی، بھول سے گئے اور اتنے عرصے میں اس کی کیفیت یہ ہوئی کہ وہ ہائی اسکول سے تنزل کر کے مڈل اسکول ہو گیا، اس وقت جن لوگوں کے ہاتھ میں تھا انہوں نے شاہ جارج پنجم کی تاج پوشی کے موقع پر اسکول کا نام ''جارج اسکول'' بنا کر لفظی تغیر سے اس کی معنوی ترقی کا

www.shibliacademy.org

خیال باندھا جو تمام تر بے سود تھا۔ اسکول اپنی موجودہ حالت سے ذرا آگے نہ بڑھ سکا۔ آخر جب مولانا ندوہ کے کاموں سے الگ ہوئے تو پھر اگلی محبت یاد آئی لیکن کچھ دنوں پہلے ایک ماسٹر اور تین طالب علموں سے شروع ہونے کے صرف بارہ سال کے اندر ہائی اسکول ہو جانے والا مدرسہ تنزل کا ایسا شکار ہوا کہ اب جب دوبارہ مولانا نے اس جسد نیم مردہ میں روح تازہ پھونکنے کی کوشش کی تو حالت یہ تھی کہ ۱۸؍دسمبر ۱۹۱۳ء میں یعنی اپنے انتقال سے صرف ایک سال پہلے انہوں نے اپنے بھائی محمد اسحاق کو لکھا کہ:

''قابل غور یہ مسئلہ ہے کہ نیشنل اسکول کو ہائی اسکول بنانا چاہیے یا ایک بورڈنگ قائم کرنا چاہیے''۔(۱۸)

شبلی مزید لکھتے ہیں کہ اسکول ہر شہر میں سرکاری یا مشن کے موجود ہوتے ہیں، ان کے برابر اسٹاف کا اسکول بنانا آسان نہیں، بڑی قوت و محنت صرف کرنی پڑتی ہے، اسلامی بورڈنگ بنانا زیادہ مفید ہے، جس میں اخلاقی اور مذہبی تربیت ہو، باقی تعلیم تو کسی اسکول میں حاصل کریں گے، اگر یہ رائے صحیح ہو تو نیشنل کی عمارت کے قریب بورڈنگ کی بنیاد ڈالنا چاہیے، بورڈنگ کی وجہ سے بہت زیادہ بچے تعلیم حاصل کر سکیں گے اور کفایت شعاری کے ساتھ۔(۱۹)

اعظم گڑھ کے لوگوں کی تعلیم و تربیت کے لیے شبلی ہمہ وقت فکر مند رہتے تھے، نیشنل اسکول اور مدرسۃ الاصلاح کو پروان چڑھانے نیز ان اداروں کو مثالی بنانے اور اہل اعظم گڑھ کو ان دونوں اداروں کی ترقی کیسلسلہ میں سید سخی ہاشمی لکھتے ہیں کہ اکتوبر ۱۹۱۳ء میں نیشنل اسکول کی مزید تعمیر کے سلسلہ میں دو ہزار روپیوں کی ضرورت تھی اور اعظم گڑھ والے اس کو مہیا نہیں کر پا رہے تھے۔ (۲۰) ۲۲؍اکتوبر ۱۹۱۳ء کو شبلی کو اعظم گڑھ سے یہ اطلاع ملی کہ نیشنل اسکول کی حالت اچھی ہے اور گورنمنٹ نے عمارت کے لیے تین ہزار کی منظوری دی ہے لیکن شرط یہ تھی کہ تین ہزار انتظامیہ کمیٹی بھی دے، لہٰذا شبلی نے مشورہ دیا کہ تین ہزار کی رقم دینا چاہیے اور وہ خود اس مد میں رقم دینے کو تیار تھے، واضح ہو کہ یہ اسکول اپنی آمدنی ہی سے چل رہا تھا، شبلی کے سامنے اب یہ سوال تھا کہ مدرسۃ الاصلاح سرائے کو ترقی دینے پر توجہ دی جائے یا نیشنل اسکول پر، اس لیے کہ دونوں کو

www.shibliacademy.org

بیک وقت چلانے میں سرمائے کی ضرورت تھی، شبلی یہ چاہتے تھے کہ دونوں کی حیثیت جداگانہ ہو اور آپس میں تعلق بھی قائم رہے(۲۱)۔

نیشنل اسکول کے لیے شبلی نے کارکنوں کو اطلاع دے دی کی ڈیڑھ ہزار روپے کا انتظام کارکن لوگ کریں، پانچ سو شبلی اپنی جیب خاص سے دینے کو تیار تھے اور راجہ ابوجعفر سے بھی خاصی رقم دلانے کا ارادہ تھا، گویا اس طرح تقریباً تین ہزار کی رقم پوری کرنے کا ارادہ تھا، جب ہی گورنمنٹ سے تعمیر کے سلسلہ میں مالی اعانت ملتی۔(۲۲)

اہل اعظم گڑھ کی تعلیم وتربیت کے لیے شبلی کی فکرمندی کا اندازہ مذکورہ خطوط سے لگایا جاسکتا ہے۔نیشنل اسکول اور مدرسۃ الاصلاح کی ترقی کے لیے سبیل نکالتے رہتے تھے اور اس کے لیے برابر اپنے بھائی محمد اسحاق کے رابطہ میں رہتے تھے۔ ۷/دسمبر ۱۹۱۳ء کو حیدرآباد سے محمد اسحاق کو لکھتے ہیں کہ:

> ''ایک عمدہ پراسپکٹس انگریزی اور اردو میں چھپوا کر تمام برادری کے معزز ملازمین سرکار اور روسائے دیہات کے پاس بھیجنا ضروری ہے، بڑی ضرورت یہ ہے کہ وکلاء، منصف، عہدہ دار جو اچھی حالت رکھتے ہیں وہ برادری کی تعلیم پر متوجہ ہوں، اب یہ گروہ محض بے پرواہ ہے،نیشنل اسکول یا سرائے میر (۲۳) کی ان لوگوں کو خبر ہی نہیں''۔(۲۴)

انہوں نے اسی خط میں یہ بھی لکھا کہ سب لوگوں کو خط لکھ کر اور تقاضا کرکے جمع کرو، مولوی عبدالحمید سرحدی، مولوی عبدالحلیم منصف، میاں جنید وغیرہ پر تمہارا اثر پڑسکتا ہے(۲۵)، اسی خط میں بورڈنگ کے بارے میں بھی لکھتے ہیں کہ اگر اسے وسعت دی جائے تو گورکھپور اور جونپور تک کے لڑکے آسکتے ہیں(۲۶)۔شبلی نیشنل اسکول کا دائرہ وسیع کرنا چاہتے تھے، تاکہ گردو پیش کے اضلاع سے طلبا یہاں آکر تعلیم کے ساتھ ہی بورڈنگ میں قیام کرکے اخلاقی تربیت حاصل کرسکیں،شبلی کے پیش نظر بورڈنگ کا قیام ضروری تھا بلکہ وہ اس کو اسکول سے زیادہ ضروری اور مقدم سمجھتے تھے جو ان کے ۷/اور ۸/دسمبر ۱۹۱۳ء کے مکتوب سے ظاہر ہے، بورڈنگ کے قیام کا خواب اب تک شرمندۂ تکمیل نہ ہوسکا۔گو اس کی ضرورت واہمیت مسلم ہے۔

www.shibliacademy.org

شبلی کے جو مکاتیب مولوی محمد سمیع، مولانا حمید الدین فراہی، مولوی مسعود علی ندوی اور محمد اسحاق کے نام ہیں، ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے فکر مند رہتے تھے۔ وہ نیشنل اسکول، مدرسۃ الاصلاح اور دار المصنّفین تینوں کو ملا کر ایک جامعہ اسلامیہ قائم کرنا چاہتے تھے، جہاں دینی و عصری تعلیم کے ساتھ اچھے مصنف بھی تیار ہو سکیں۔

شبلی کی تحریک پر ان کے بھائی محمد اسحاق نے ۲۷ر جون ۱۹۱۴ء میں رفقاء اور عمائدین اعظم گڑھ کی نگرانی میں دی اعظم گڑھ مسلم ایجوکیشن سوسائٹی قائم کر کے اسکول کو اس کی نگرانی میں دے دیا، انہوں نے اسکول انٹر تک پہنچانے اور اعظم گڑھ کے قصبات میں اسکول اور مکاتب قائم کرنے کے لیے دورہ کا پروگرام بھی بنایا تھا، دورہ کے مصارف کے لیے پانچ سو روپے بھی الگ کر لیے تھے، اشتہارات اور رسید بھی چھپوالی تھی مگر افسوس کہ پندرہ اگست ۱۹۱۴ء کو ان کی وفات سے سارے کام ادھورے رہ گئے۔ بھائی کی وفات کے بعد شبلی نے متعدد عزیزوں سے چندہ کر کے چند کمروں کی تعمیر کا کام شروع کیا لیکن ابھی پورا نہیں ہوا تھا کہ ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو انہیں بھی اس دار فانی سے نجات مل گئی۔ (۲۷)

محمد اسحاق نے ۲۷ر جون ۱۹۱۴ء میں جس سوسائٹی کو تشکیل دیا تھا اس کے کل ۴۶ ممبر تھے، جن میں عہدے داروں کے نام درج ذیل ہیں:

۱-شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی (صدر)۔ ۲-آنریبل سید عبد الرؤف، بار ایٹ لا اینڈ سب آرڈینیٹ جج، غازی پور (نائب صدر)۔ ۳-مولوی شیخ محمد حسین (نائب صدر)۔ ۴-مولوی حمید الدین انصاری، پروفیسر عربی و فارسی، میور کالج الٰہ آباد (آنریری سکریٹری)۔ ۵-مولوی محمد ولی جان وکیل (آنریری جوائنٹ سکریٹری)۔ ۶-مولوی محمد مختار احمد وکیل (آنریری اسسٹنٹ سکریٹری)

اس کے علاوہ اعظم گڑھ کے ۴۰ سر برآوردہ و تعلیم یافتہ لوگ اس سوسائٹی کے ممبر تھے جن میں محمد اسحاق، مولوی عبد الحلیم، مولوی محمد سمیع، مولوی محمد عمر، مرزا محمد سلیمان، خواجہ محمد عظمت اللہ، رشید الدین انصاری، شیخ محمد وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ (۲۸)

۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء میں شبلی کی وفات کے بعد سید عبد الرؤف اور مولوی حمید الدین فراہی، محمد ولی جان، مولوی مختار احمد اور مرزا مصطفیٰ بیگ وغیرہ نے مل کر اسکول کا کام اپنے ہاتھ میں لیا،

www.shibliacademy.org

اس سوسائٹی کے آنریری جوائنٹ سکریٹری، مولوی ولی جان تھے لیکن وکالت کی مصروفیت کے باعث وقت نہ دے سکے۔ آخر شبلی کے ماموں زاد بھائی شیخ محمد رئیس پھریہا نے اس کی باگ ڈور سنبھالی اوران کی محنت اور کوشش سے اسکول ترقی کر کے ۱۹۲۸ء میں دوبارہ ہائی اسکول ہوگیا نیز تعمیرات میں بھی قدرے اضافہ ہوا۔(۲۹)

۲۱/اکتوبر ۱۹۲۸ء میں مرزا مرتضیٰ بیگ جب سوسائٹی کے سکریٹری ہوئے تو اسکول نے شاندار کامیابی حاصل کی، ۲۱/نومبر ۱۹۲۸ء میں مولوی محمد ولی جان کی صدارت میں جو جلسہ ہوا اس میں یہ تجویز پاس ہوئی کہ شبلی کا نام اسکول کے نام کے ساتھ جوڑا جائے اس طرح ۱۹۱۱ء میں نیشنل اسکول جو جارج اسکول ہوگیا تھا وہ ۱۹۲۹ء کے اوائل میں بانی کا نام شامل ہو جانے سے شبلی جارج اسکول ہوگیا۔(۳۰)

اس ادارے سے جارج ہٹ کر نیشنل کب منسلک ہوا ابھی تحقیق طلب ہے۔ ۱۹۴۰ء میں سوسائٹی کے سکریٹری مرزا مرتضیٰ بیگ اور اسکول کے پرنسپل بشیر احمد صدیقی کی کوششوں سے یہ انٹر کالج ہوگیا۔ ۱۹۴۶ء میں ضلع کا پہلا ڈگری کالج ہوگیا۔ ۳۱/مارچ ۱۹۴۰ء کی شام میں انٹر کالج کے سنگ بنیاد کا عظیم الشان جلسہ ہوا۔ جس میں علامہ شبلی کے حبیب صدیق مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے ہاتھوں نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ جس کی تعمیر مولوی مسعود علی ندوی کے زیر نگرانی ہوئی۔(۳۱)

ابتدا ہی سے یہ اسکول سیکولر مزاج کا حامل رہا ہے، مسلم و غیر مسلم طلبا کا شرح تناسب دیکھا جائے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بغیر کسی تفریق کے ہندو و مسلم طلبا یہاں داخلہ پاتے رہے ہیں اور تمام سہولیات کا فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔ ۱۸۸۳ء میں ایک ماسٹر اور تین طالب علموں سے شروع ہونے والے اس اسکول میں ۹۶-۱۸۹۴ء میں کل ۱۹۴ طالب علم تھے، جس میں ۹۹ مسلم طالب علم تھے اور ۹۵ ہندو اور ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۶ء کے بیچ ۱۵۱ طالب علم تھے جس میں ۶۵ مسلمان اور ۸۶ ہندو۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۱ء کے درمیان کل ۳۵۷ طالب علم تھے جس میں ۱۹۶ مسلم اور ۱۶۱ ہندو تھے۔ ۱۹۴۰ء میں کل ۸۰۷ طالب علم تھے جس میں ۳۶۱ مسلم اور ۴۱۹ ہندو تھے۔(۳۲)

نیشنل اسکول میں بغیر کسی تفریق کے اساتذہ کی تقرریاں بھی ہوا کرتی تھیں، قابل اور

www.shibliacademy.org

لائق اساتذہ کو ترجیح دی جاتی تھی مسٹر بی آر بدھے مراٹھا برہمن جنھوں نے اعظم گڑھ کے دوسرے اسکولوں میں تدریسی خدمات انجام دی تھیں کو ۱۹۱۹ء میں بطور پرنسپل رکھا گیا، یہ انگلش میں ماہر تھے،ان کے بعد ایک عیسائی فلپ (ایم اےڈ) کو پرنسپل بنایا گیا۔ضلع مرزا پور کے قاضی منصور الحسن بھی پرنسپل رہے،سی بی اوجھا نے بھی بحیثیت پرنسپل اپنی خدمات انجام دیں۔اس کے علاوہ سید اکبر علی بھی پرنسپل کے عہدہ پر فائز رہے۔(۳۳)

اسکول کے اساتذہ میں ریاضی کے استاد رام آ گیاں یادو بہت ہی قابل اور لائق احترام تھے۔(۳۴) ۱۹۲۳ء میں وائس پرنسپل غیر مسلم تھے،نام تلاش وجستجو کے بعد بھی نہیں مل سکا۔۱۹۲۵ میں کل ۱۸ اساتذہ میں پانچ ہندو تھے(۳۵)، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسی شہر کے مشنری کے ویسلی اسکول میں کوئی غیر عیسائی پرنسپل نہیں بن سکتا اور اساتذہ کی تقرری میں بھی عیسائی کو ترجیح دی جاتی تھی جبکہ شبلی کے نیشنل اسکول میں ایسی کوئی شرط نہیں تھی،۱۹۴۲ء میں اسکول کے اساتذہ کی فہرست پر نظر ڈالیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۲۵ اساتذہ میں ۱۹ مسلمان اور ۶ ہندو تھے۔(۳۶)

تلاش وجستجو کے بعد نیشنل اسکول کے اساتذہ کے جو نام ملتے ہیں ان میں حافظ احمد حسین (انگلش گرامر)،ترونی پاٹھک (سنسکرت)،شرماجی (ریاضی)،تلک دھاری گلواں نصیر پور کے مولوی نصیر،مولوی عبدالرحمٰن،محمد احمد نعمانی، بدایوں کے مولوی عبدالوافی،مولوی سعید،مولوی فیاض وغیرہ قابل ذکر ہیں۔(۳۷)

نیشنل اسکول کی سرگرمیوں کے مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس کی تمام تر تعلیمی وعلمی سرگرمیوں میں قومی وملکی احساسات،زندگی کے بلند اقدار کا پاس ولحاظ ہوتا رہا ہے اور اس کا اولین مقصد مسلمانوں کی تعلیم کے ساتھ ہی آپسی رواداری،سمجھ بوجھ اور بھائی چارے کے جذبوں کو فروغ دینا رہا ہے۔اللہ کا شکر ہے کہ تمام تر مشکلات کے باوجود آج بھی یہ ادارہ فرقہ واریت،مخصوص جانب داری اور ہر طرح کی تنگ نظری سے قطعی آزاد ہے۔

رواں سال میں دی اعظم گڑھ مسلم ایجوکیشن سوسائٹی اور شبلی کی وفات کے سو سال نیشنل اسکول کے قیام کے ایک ۱۳۱ سال ہو چکے ہیں۔اس پوری ایک صدی میں اس ادارہ کی جتنی ترقی ہونی چاہیے تھی نہیں ہو سکی۔سوسائٹی اپنے بنیادی اہداف ومقاصد کو پورا نہیں کر پائی آخر وجہ کیا

www.shibliacademy.org

ہے؟ وہ کون سے عوامل ہیں جن کے باعث ہم اپنے اہداف و مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکے؟ ادارہ جمود کا شکار ہے آج جن کورسز کی ضرورت ہے وہ ہمارے پاس نہیں ہیں۔ اس کے بارے میں سوچنا ہوگا اور موزوں لائحہ عمل تیار کرنا ہوگا تا کہ رفتار زمانہ کے ساتھ ہم اور ہمارے طلبا چل سکیں اور اکیسویں صدی کے چیلنجز کو قبول کر سکیں۔

مآخذ

(۱) سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، معارف پریس، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۹ء، ص ۱۳۳۔ (۲) ایضاً، ص ۱۳۴-۱۳۳۔ (۳) ایضاً، ص ۱۳۴۔ (۴) مولوی سمیع اعظم گڑھ کے موضع کونرہ گھنی کے رہنے والے تھے، مولانا شبلی کے شاگرد رشید تھے، یہ جونپور کی ججی میں محافظ دفتر تھے، ان کی ماموں زاد بہن سے شبلی کا عقد ثانی ہوا تھا۔ (۵) سید سلیمان ندوی، مکاتیب شبلی حصہ اول، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء، ص ۵۸۔ (۶) ایضاً، ص ۶۳۔ (۷) نیشنل اسکول کے بنگالی ماسٹر کا نام مکاتیب شبلی اول ص ۶۳۔ لیکن قرائن سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ مشن اسکول (ویسلی اسکول) کے ماسٹر تھے۔ (۸) مکاتیب شبلی حصہ اول، ص ۶۳۔ (۹) ایضاً، ص ۳۹۔ (۱۰) ایضاً، ص ۳۵۔ (۱۱) ایضاً، ص ۳۶۔ (۱۲) ایضاً۔ (۱۳) ڈاکٹر سید سخی ہاشمی، شبلی کا ذہنی ارتقاء، کراچی، ص ۱۵۷۔ (۱۴) ایضاً، ص ۸۷۔ (۱۵) مکاتیب شبلی اول، ص ۴۲۔ (۱۶) ایضاً، ص ۴۴۔ (۱۷) ایضاً، ص ۴۹۔ (۱۸) سید سلیمان ندوی، حیات شبلی حوالہ مذکور ص ۸۰-۶۷۹، مکاتیب شبلی اول، ص ۵۳۔ (۱۹) مکاتیب شبلی اول، ص ۵۴-۵۳۔ (۲۰) ڈاکٹر سید سخی ہاشمی، حوالہ مذکور ص ۶۲۰۔ (۲۱) ایضاً، ص ۶۲۱۔ (۲۲) ایضاً۔ (۲۳) یہاں سرائے میر سے مدرسۃ الاصلاح مراد ہے۔ (۲۴) مکاتیب شبلی اول، ص ۵۳-۵۲ ۔ (۲۵) ایضاً، ص ۵۲۔ (۲۶) ایضاً، ص ۵۳۔ (۲۷) مجموعہ مقالات سمینار، عصر حاضر میں علامہ شبلی نعمانی کے تعلیمی افکار کی معنویت، جامعۃ الفلاح بلریا گنج، ۲۰۱۴، ص ۱۴۲-۱۴۱۔ (۲۸) دی اعظم گڑھ مسلم ایجوکیشن سوسائٹی میمورنڈم آف ایسوسی ایشن، ۲۷ر جون ۱۹۱۴ء۔ (۲۹) سید سلیمان ندوی، حیات شبلی حوالہ مذکور ص ۶۸۱۔ (۳۰) نیاز احمد اعظمی، شبلی انسٹی ٹیوشن، اے، کیس اسٹڈی، پی ایچ ڈی مقالہ ۱۹۷۵، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، ص ۱۵۹۔ (۳۱) مجموعہ مقالات سمینار، حوالہ مذکور ص ۱۴۳۔ (۳۲) نیاز احمد اعظمی حوالہ مذکور ص ۱۸۰-۱۶۱۔ (۳۳) ڈاکٹر جاوید علی خاں، محمد شبلی نعمانی لائف اینڈ کنٹری بیوشن، شبلی اکیڈمی ۲۰۱۴ء، ص ۱۷۴۔ (۳۴) ایضاً، ص ۱۷۴۔ (۳۵) ایضاً۔ (۳۶) نیاز احمد اعظمی حوالہ مذکور ص ۱۴۳۔ (۳۷) ڈاکٹر جاوید علی خاں حوالہ مذکور ص ۱۷۵۔

www.shibliacademy.org

نئے ادبی اصول اور شبلی

ڈاکٹر احمد محفوظ

انیسویں صدی کے ہندوستان میں جو چند مایہ ناز ہستیاں پیدا ہوئیں، ان میں علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء) کی حیثیت بہت ممتاز ہے۔ ان کے علمی اور ادبی کارناموں کا دائرہ اس قدر وسیع ہے اور اس میں موضوعات کا ایسا تنوع ہے کہ اس سے شبلی کی غیر معمولی علمی شخصیت کا آسانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ متعدد دیگر موضوعات کے علاوہ انہوں نے ادب و شعر کے میدان میں بھی اپنے علمی کارناموں کے ایسے نقوش چھوڑے ہیں جن کی اہمیت اور معنویت ایک صدی سے زیادہ عرصہ گذرنے کے بعد بھی آج کم نہیں ہوئی ہے۔ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ شبلی نے ''شعر العجم'' کی صورت میں فارسی شاعری کی مفصل تاریخ لکھ کر جدید عہد کو اپنی کلاسیکی روایت سے جس طرح روشناس کرایا اور ''موازنہ انیس و دبیر'' کے ذریعے اردو میں تقابلی اور عملی تنقید کا جو اولین نمونہ پیش کیا، وہ آج بھی ہمارے لیے حد درجہ قابل قدر ہے۔ شاعری سے متعلق یہ ایسے علمی کارنامے ہیں جن کی بنا پر اردو تنقید کے میدان میں شبلی کو بجا طور پر ایک اعلیٰ پائے کے نقاد کی حیثیت حاصل ہے۔ اسی کے ساتھ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ شبلی کی تنقید نگاری میں نظری اور عملی دونوں طرح کی تنقید کا خاطر خواہ سرمایہ موجود ہے۔

اس مقالے کا موضوع چونکہ ''نئے ادبی اصول اور شبلی'' ہے۔ لہٰذا یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس امر کی وضاحت کردی جائے کہ نئے ادبی اصول سے میری کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ ادب بالخصوص شاعری کے بارے میں وہ نئے خیالات اور تصورات جو ہمارے یہاں انیسویں صدی کے اواخر میں منظر عام پر آئے اور جنہیں شاعری کی تفہیم و تنقید کی

ایسوسی ایٹ پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی۔

www.shibliacademy.org

غرض سے اصولی حیثیت سے پیش کیا گیا، انہیں نئے ادبی اصول کہنا نامناسب نہ ہوگا۔ دوسری بات یہ کہ یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ وہ نئے اصول جو اواخر انیسویں صدی میں سامنے آئے، کیا اس سے پہلے ان کا وجود نہیں تھا؟ کیونکہ اگر وہ تصورات پہلے سے موجود تھے تو پھر انہیں نئے اصول کیوں کر کہا جاسکتا ہے؟ اس سوال کا جواب یہی ہے کہ ہاں وہ نئے تصورات جن کا رواج نئے زمانے میں ہوا، ان میں سے کچھ ایسے ہیں جن کا نشان ہماری قدیم کلاسیکی شعری روایت میں نہیں ملتا۔

اپنی قدیم شاعری کے بارے میں تفصیلی اظہار خیال کا سب سے پہلا نمونہ ''آب حیات'' (۱۸۸۰ء) ہے۔ اگرچہ نئے خیالات کی اچھی خاصی جھلک یہیں سے ملنی شروع ہوجاتی ہے، لیکن ان خیالات کو اصولوں کے پیکر میں ڈھالنے کی کوشش اس میں نہیں نظر آتی، البتہ یہ راہ ہموار ہوتی ہوئی ضرور دکھائی دیتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ان نئے خیالات کو باقاعدہ طور پر اصول بند کرنے کا کام سب سے پہلے مولانا حالی نے ''مقدمہ شعر وشاعری'' (۱۸۹۳ء) میں کیا۔ اس کتاب میں حالی نے زیادہ تر باتیں جو بطور اصول بیان کیں، وہ اس سوال کا جواب کہی جاسکتی ہیں کہ شاعری کیسی ہونی چاہیے؟ اگر وہ اس سوال کو سامنے رکھ کر کہ شاعری کیسی ہوتی ہے، باتیں بیان کرتے تو ان کے خیالات وہ نہ ہوتے جو موجودہ صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ نئے زمانے کے حالات کے پیش نظر حالی شاعری کو اپنے مخصوص زاویے سے دیکھ رہے تھے۔ اس زاویے پر ایک طرف مغربی تصورات کا دباؤ تھا تو دوسری طرف قوم و ملت کی اصلاح کا جذبہ بھی انہیں مجبور کررہا تھا کہ وہ شاعری کو مخصوص تقاضوں کی تکمیل کا آلۂ کار سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کریں۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں حالی کے بیان کردہ زیادہ تر جدید خیالات قدیم شاعری اور اس کے بیشتر تصورات سے میل نہیں کھاتے۔ بہرحال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اردو میں نئے ادبی اصولوں کے بنیادگزار مولانا حالی ہی ہیں۔

حالی کے بعد اسی زمانے میں جس شخص نے شاعری کے تعلق سے اصولی مباحث قائم کیے، وہ علامہ شبلی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ شبلی نے فن شعر اور اس کے اصولوں سے متعلق الگ سے کوئی کتاب نہیں لکھی، بلکہ انہوں نے اپنی تصنیف ''شعرالعجم'' کی چوتھی جلد کے ابتدائی تقریباً سو صفحات

www.shibliacademy.org

ان مباحث کے لیے وقف کیے ہیں۔ ملحوظ رہے کہ یہ چوتھی جلد کل تین ابواب پر مشتمل ہے، جس میں سے پہلا باب مکمل طور پر شاعری سے متعلق مذکورہ مباحث پر محیط ہے۔ یہاں نامناسب نہ ہوگا اگر باب اول کی چند ذیلی سرخیوں کی نشاندہی کردی جائے، جس سے یہ اندازہ ہوگا کہ شاعری سے متعلق مباحث میں کیا امور شبلی کے پیش نظر تھے؟ چنانچہ چند ذیلی سرخیوں کے عنوانات یہ ہیں: شاعری کی حقیقت، شاعری کے اصلی عناصر کیا ہیں؟ محاکات یعنی شاعرانہ مصوری کی تعریف، تخیل کی حقیقت، تخیل کی بے اعتدالی، تشبیہ اور استعارہ، جدت اور لطف ادا، حسن الفاظ، فصیح اور مانوس الفاظ، سادگی ادا، واقعیت اور اصلیت، شعر کیوں اثر کرتا ہے، شاعری کا استعمال، شعر اور شاعری کی عظمت۔

ان عنوانات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاعری سے متعلق بحث و گفتگو کے دوران شبلی نے تقریباً ان تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھا ہے جو اس موضوع کے لیے ضروری اور ناگزیر کہے جاسکتے ہیں۔

قدیم زمانے سے شعر کی جو مروجہ تعریف بیان کی جاتی رہی ہے اس کی رو سے کلام موزوں اور مقفیٰ کو شعر کہا گیا ہے۔ ظاہر ہے اس تعریف میں شعر کو ظاہری صورت میں نثر سے ممتاز قرار دینا بنیادی مقصد رہا ہے لیکن اسی کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس تعریف سے شاعری کی حقیقی کیفیت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ یعنی یہ کہ فی الحقیقت شاعری کیا ہے، اس کے بارے میں ہمیں کچھ نہیں معلوم ہوتا۔ شبلی شاعری کی حقیقت پر بحث کا آغاز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”شاعری چونکہ وجدانی اور ذوقی چیز ہے، اس لیے اس کی جامع و مانع تعریف چند الفاظ میں نہیں کی جاسکتی۔ اس بنا پر مختلف طریقوں سے اس کی حقیقت کا سمجھانا زیادہ مفید ہوگا کہ ان سب کے مجموعے سے شاعری کا ایک صحیح نقشہ پیش نظر ہوجائے“۔

اس کے بعد شبلی شاعری کے نمایاں اوصاف زیر بحث لاتے ہیں اور ان میں جذبات کا برانگیختہ کرنا اور اثر انگیزی کا خاص طور سے ذکر کرتے ہیں۔ چونکہ یہ خصوصیات شاعری کے علاوہ دوسرے فنون مثلاً موسیقی، مصوری اور فن خطابت وغیرہ میں بھی عموماً پائی جاتی ہیں، اس لیے شبلی

www.shibliacademy.org

شاعری کو ان فنون سے ممتاز کرنے کے لیے ایسے پہلوؤں کی نشاندہی کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن سے شاعری کی انفرادی شناخت قائم ہو سکے۔ انہوں نے خطیب اور شاعر کے فرق کو واضح کرتے ہوئے شاعری کی امتیازی خصوصیت کی طرف عمدہ اشارہ کیا ہے:

> ”(خطیب کے برخلاف) شاعر کو دوسروں سے غرض نہیں ہوتی، وہ یہ نہیں جانتا کہ کوئی اس کے سامنے ہے بھی یا نہیں؟ اس کے دل میں جذبات پیدا ہوتے ہیں، وہ بے اختیار ان جذبات کو ظاہر کرتا ہے، جس طرح درد کی حالت میں بے ساختہ آہ نکل جاتی ہے۔ بے شبہ یہ اشعار اوروں کے سامنے پڑھے جائیں تو ان کے دل پر اثر کریں گے، لیکن شاعر نے اس غرض کو پیش نظر نہیں رکھا تھا“۔

اسی سلسلے میں وہ مزید لکھتے ہیں:

> ”اصلی شاعر وہی ہے جس کو سامعین سے کچھ غرض نہ ہو۔ لیکن جو لوگ بہ تکلف شاعر بنتے ہیں، ان کا بھی فرض ہے کہ ان کے انداز کلام سے یہ مطلق نہ پایا جائے کہ وہ سامعین کو مخاطب کرنا چاہتے ہیں۔...... شاعر اگر اپنے نفس کے بجائے دوسروں سے خطاب کرتا ہے، دوسروں کے جذبات کو ابھارنا چاہتا ہے، جو کچھ کہتا ہے اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے کہتا ہے، تو شاعر نہیں بلکہ خطیب ہے“۔

درج بالا دونوں اقتباسات میں بیان کردہ باتوں میں یہ پہلو تو یقیناً بے حد اہم ہے کہ یہاں شاعر کے حقیقی منصب اور اس کی تخلیقی آزادی پر بہت زور دیا گیا ہے۔ لیکن اس بیان کا یہ پہلو کہ شاعر جو کچھ بیان کرتا ہے، وہ اپنے نفس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے اور یہ کہ شاعر کا یہ بیان اس کے شدید ذاتی احساسات اور جذبات کا اظہار ہوتا ہے، قدیم مشرقی شعریات کی رو سے پوری طرح درست نہیں معلوم ہوتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ شاعری کی یہ صفت، شاعری کی تمام انواع اور ہر دور کی تمام شاعری پر منطبق نہیں کی جا سکتی۔ خیال رہے کہ شاعر کے ذریعے اپنے ذاتی احساسات کے بیان کا تصور درحقیقت مغرب سے ہمارے یہاں رائج ہوا اور یہ بھی کہ مغرب میں بھی اس صفت

www.shibliacademy.org

کو تمام شاعری کے لیے ضروری قرار نہیں دیا گیا۔ الیٹ نے شاعری کی تین آوازوں کا جو تصور پیش کیا، اس میں پہلی آواز کی بنیاد اسی صفت پر قائم کی گئی ہے۔

شبلی شاعری کے اصلی عناصر کے بارے میں بھی تفصیلی بحث کرتے ہیں۔ اصلی عناصر سے ان کی مراد ان چیزوں سے ہے جن کے بغیر شعر حقیقی میں شعر کہلانے کا مستحق نہیں ٹھہرتا۔ اس سلسلے میں انہوں نے تخیل اور محاکات پر الگ الگ نہایت مفصل اور کارآمد بحث کی ہے۔ شاعری میں تخیل کی ناگزیر حیثیت اور اس کی کارفرمائی سے متعلق تصورات تو ہماری قدیم شعریات میں موجود رہے ہیں۔ چنانچہ قدیم زمانے میں ہمارے یہاں یہ تصور عام رہا ہے کہ شاعری دراصل خیالی باتوں کا بیان ہوتی ہے اور عموماً شعرا خیالوں کی دنیا کی سیر کرتے ہیں۔ البتہ شبلی نے شاعری کے بارے میں محاکات کا جو تصور پیش کیا وہ اس لحاظ سے نیا کہا جاسکتا ہے کہ ہماری قدیم شعری روایت میں اس کا وجود نہ تھا۔ اس تصور کے نئے ہونے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ خود شبلی نے اسے ارسطو کے وضع کردہ تصور کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ یہاں اس تفصیل میں جانے کا موقع نہیں کہ ارسطو کے Muineses کے تصور کی اصل حقیقت کیا ہے اور شبلی نے اسے محاکات یعنی شاعرانہ مصوری کہہ کر جو کچھ مراد لیا ہے، کیا وہی مراد ارسطو کی بھی تھی؟ لیکن اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ ارسطو نے Muineses کا جو نظریہ پیش کیا، وہ یونانی المیوں کو پیش نظر رکھ کر وضع کیا گیا تھا۔ اسی کے ساتھ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ قدیم مشرقی شعری روایت میں المیہ یا Tragedy کا کوئی وجود نہیں رہا ہے۔

شبلی نے محاکات کے بارے میں جو کچھ بیان کیا ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں کی صراحت میں جس قدر زور قلم صرف کیا ہے وہ یقیناً قابل تعریف ہے اور اس سے بہت سے نئے پہلو روشن ہوتے ہیں۔ تاہم شبلی کی اصابت فکر سے یہ بات پوشیدہ نہیں تھی کہ مشرقی شاعری کی تفہیم و تعیین قدر کے عمل میں ہر جگہ محاکات کا نظریہ بامعنی نہیں ٹھہرے گا۔ اسی کے نتیجے میں انہوں نے نہایت بنیادی بات بہت واضح الفاظ میں کہی جس سے تخیل کی حقیقی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ شبلی لکھتے ہیں:

”اگرچہ محاکات اور تخیل دونوں شعر کے عنصر ہیں لیکن حقیقت یہ

www.shibliacademy.org

ہے کہ شاعری دراصل تخیل کا نام ہے۔ محاکات میں جو جان آتی ہے، تخیل ہی سے آتی ہے، ورنہ خالی محاکات نقالی سے زیادہ نہیں“۔

محاکات کے مقابلے میں تخیل کی ترجیحی حیثیت کو مزید مستحکم کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

”محاکات کا یہ کام ہے کہ جو کچھ دیکھے یا سنے، اس کو الفاظ کے ذریعے سے بعینہٖ ادا کردے۔ لیکن ان چیزوں میں ایک خاص ترتیب پیدا کرنا، تناسب اور توافق کو کام میں لانا، ان پر آب ورنگ چڑھانا قوت تخیل کا کام ہے“۔

اوپر پہلے اقتباس میں مندرج شبلی کا یہ جملہ کہ ”شاعری دراصل تخیل کا نام ہے“ اس بنیادی حقیقت کا واضح اعلان ہے، جس پر قدیم مشرقی شاعری کی مہتم بالشان عمارت قائم ہے۔ ایسے ہی خیالات کی بنا پر بجاطور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ شاعری کے بارے میں شبلی کے بیان کردہ خیالات حالی کے خیالات کے مقابلے میں شاعری کی حقیقت سے زیادہ قریب رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ نئے زمانے کے نئے تصورات کا دباؤ شبلی بھی محسوس کررہے تھے، جس کے نتیجے میں انہوں نے بھی بہت سی ایسی باتیں بیان کیں جو ایک طرف اس وقت کے حالات سے ہم آہنگ تھیں لیکن دوسری طرف قدیم شعری تصورات سے ان کی مطابقت نہ تھی۔

تخیل کے تعلق سے شبلی نے جو تفصیلی بحث کی ہے اور فارسی شعراء کے یہاں سے مثالیں لاکر جن پہلوؤں کو روشن کرنے کی کوشش کی ہے وہ حددرجہ اہم اور لائق توجہ ہے۔ شبلی کا یہ جملہ ایک نہایت بلند حقیقت کی طرف ہمیں متوجہ کرتا ہے کہ ”شاعر کی نظر میں عالم کائنات قوت تخیل سے ایک اور عالم بن جاتا ہے“۔

ملحوظ رہے کہ ”مقدمۂ شعروشاعری“ میں حالی نے قوت متخیلہ کو قوت ممیّزہ کا محکوم ہونے پر اصرار کیا ہے تاکہ قوت متخیلہ بےلگام نہ ہوسکے۔ اس سلسلے میں شبلی بھی تخیل کی بےاعتدالی کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

”شعر کی اس سے زیادہ کوئی بدقسمتی نہیں کہ تخیل کا بےجا استعمال کیا جائے۔ طبیعیات کے متعلق جس طرح یونانی حکماء کی قوتیں بیکار گئیں

www.shibliacademy.org

اور آج تک ان کے پیرو ہیولیٰ اور صورت کی فضول بحثوں میں الجھ کر کائنات کا ایک عقدہ بھی حل نہ کر سکے، بعینہٖ ہمارے متاخرین شعراء کا یہی حال ہوا۔ ان کی قوت تخیل قدماء سے زیادہ ہے، لیکن افسوس بالکل رائیگاں صرف کی گئی''۔

وہ مزید لکھتے ہیں:

''متاخرین کی اکثر نکتہ آفرینیاں اسی قسم کی ہیں [یعنی ایسے اشعار جن میں مضمون کو خیال بندی اور نازک خیالی کی صورت میں باندھا گیا ہے] جس کی وجہ یہی ہے کہ قوت تخیل کا استعمال بے جا طور سے ہوا ہے''۔

شبلی تخیل کی بے اعتدالی کے مختلف اسباب میں سے ایک اہم سبب مبالغے کو قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ کہتے ہیں:

''قوت تخئیل کو سب سے زیادہ بے اعتدالی کا موقع مبالغے میں ملتا ہے۔ یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ مبالغے کے لیے اصلیت اور واقعیت کی ضرورت نہیں، اس بنا پر قوت تخئیل جی کھول کر بلند پروازی دکھاتی ہے اور کج روی اور بے راہ روی کو اس کو پرواہ نہیں ہوتی''۔

درج بالا اقتباسات سے کئی باتیں سامنے آتی ہیں، جن کے بارے میں خاطر خواہ بحث کے لیے خاصی تفصیل درکار ہوگی۔ مثلاً متاخرین شعراء کی پوری شاعری کو عمومی طور سے بے راہ رو کہنا، متاخرین شعراء کے تمام کارناموں کا رائیگاں جانا اور یہ کہ شاعری میں مبالغے کی کیا حیثیت ہے۔ یہ ایسے مسائل ہیں جن کے بارے میں شبلی کے بیان کردہ خیالات کو پوری طرح قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں شبلی کا عام نظریہ یہ ہے کہ قدماء اور متوسطین کا دور شاعری کے لحاظ سے مستحسن تھا لیکن متاخرین کا تقریباً پورا دور حقیقی شاعری سے بیگانہ ہے اور اسی بنا پر ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ شبلی کے خیال میں جلال اسیر، ناصر علی، غنی کاشمیری اور بیدل اور انہیں کی طرح کے دیگر شعراء نے اپنی شاعرانہ صلاحیت کا صحیح استعمال نہیں کیا۔ چونکہ ان شعراء کی قدر و منزلت اور عظمت جن تصورات شعر پر قائم تھی، وہ تصورات بذات خود شبلی کے لیے قابل قبول نہ

www.shibliacademy.org

تھے، لہٰذا ان شعراء کے شعری کارناموں کو معرض سوال میں آنا ناگزیر تھا۔

تخئیل کی بے راہ روی کو ثبوت فراہم کرنے کے لیے شبلی نے خیال بندی اور نازک خیالی کے طرز پر مبنی کئی اشعار مثال میں پیش کیے ہیں اور یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ ان اشعار میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ محض بے لطف خیال آفرینی ہے اور ان میں لفظی شعبدہ بازی کے سوا کچھ نہیں ہے، اس ضمن میں ایک شعر کی مثال دینے سے پہلے وہ کہتے ہیں:

''وہ تخئیل اکثر بیکار اور بے اثر ہوتی ہے جس میں تمام عمارت کی بنیاد صرف کسی لفظی تناسب یا ایہام پر ہوتی ہے۔ متاخرین کی اکثر نکتہ آفرینیاں اسی قسم کی ہیں مثلاً ایک شاعر کہتا ہے ؎

مستانہ کشتگان تو ہر سو فتادہ اند
تیغ ترا مگر کہ بہ مئے آب دادہ اند

اس کے بعد شعر کا مطلب بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق کی تلوار کے مارے ہوئے ہر طرف مست پڑے ہوئے ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ معشوق نے جس تلوار سے قتل کیا ہے، اس پر شراب کی باڑھ رکھی گئی تھی۔

اس خیال کی تمام تر بنیاد آب کے لفظ پر ہے۔ آب تلوار کی چمک دمک اور باڑھ کو کہتے ہیں۔ آب کے معنی پانی کے بھی ہیں، شراب بھی پانی کی طرح سیال ہے۔ تلوار کی باڑھ کو پانی سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ پانی سے تلوار کو زنگ لگ جاتا ہے۔ لیکن چونکہ باڑھ کو فارسی میں آب کہتے ہیں، اس لیے یہ قرار دیا کہ تلوار میں پانی ہے، اور جہاں پانی مستعمل ہوسکتا ہے، شراب بھی ہوسکتی ہے۔ اس لیے تلوار میں شراب کی باڑھ ہے۔ اس لیے مقتولین نشے میں چور ہیں۔ اس تمام عبارت کی بنیاد آب کے لفظ پر ہے۔ اس لفظ کے دو معنی نہ ہوتے تو یہ گورکھ دھندا قائم نہیں رہ سکتا تھا''۔

اس بات سے قطع نظر کہ لفظی مناسبت اور ایہام کی مشرقی شعریات کے عالم میں غیر

www.shibliacademy.org

معمولی اہمیت رہی ہے اور مضمون آفرینی اور بعد میں معنی آفرینی کی عملی صورت میں ان کا بہت اہم کردار رہا ہے، قابل غور پہلو یہ ہے کہ شبلی ان چیزوں کا ذکر جس تحقیر آمیز انداز میں کرتے ہیں، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاعری میں یہ چیزیں شبلی کو قطعاً پسند نہیں تھیں۔ کیونکہ ہم ہرگز یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ عربی اور فارسی کی پوری شعری روایت پر ایسی گہری نظر رکھنے والے شبلی مضمون آفرینی اور خیال بندی کے تقاضوں سے ناواقف رہے ہوں گے۔ یہاں لطف کی بات یہ بھی ہے کہ شبلی جن عناصر کی تنقیص کرتے ہیں وہی عناصر دراصل قدیم شعریات میں روح کی طرح داخل ہیں۔ اردو شعراء میں میر کو ایک زمانے تک نہایت سادہ اور سلیس شاعر کی حیثیت سے دیکھا جاتا رہا لیکن وہی میر صاحب جہاں جہاں مضمون آفرینی اور خیال بندی کے جوہر دکھاتے ہیں تو انہیں اصولوں کی پاس داری کرتے ہیں جو اس طرز کے لیے مخصوص ہیں۔ میر کی مشہور زمانہ غزل کا یہ مقطع دیکھیے جس کی بنیاد بھی اسی آب کے لفظ پر ہے

تشنۂ خوں ہے اپنا کتنا میرؔ بھی ناداں تلخی کش
دمدار آبِ تیغ کو اس کے آبِ گوارا جانے ہے

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ میرؔ کی اس غزل کا مطلع جس قدر مشہور ہے، اتنا ہی یہ مقطع گمنام ہے۔ اس مقطعے کے تئیں عام بے توجہی کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں ایک اہم سبب اس طرز شعر کے بارے میں نئے تصور کا حد درجہ پھیلاؤ بھی ہے، جس پر اس مقطع کی بنیاد ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعری کے بارے میں شبلی نے جو خیالات پیش کیے، ان میں سے بیشتر ایسے تھے جن کو انھوں نے پہلی بار نہایت شرح وبسط کے ساتھ اصولی بنیاد فراہم کی۔ شبلی کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ انہوں نے شاعری کی بحث میں ان باتوں پر زیادہ توجہ دی جن کا تعلق براہ راست شعر کی فنی حیثیت سے ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان مباحث میں شبلی کے یہاں غیر ادبی امور کم سے کم زیر بحث آئے ہیں۔

www.shibliacademy.org

شبلی صدی مطبوعات
ایک نظر

عمیر الصدیق دریابادی ندوی

علامہ شبلی صدی تقریبات کے انعقاد کا مقصد یہی تھا کہ علامہ شبلی کی شخصیت اوران کے تخیل اور ناتمام منصوبوں کی تکمیل کی غرض سے قائم ہونے والے ادارہ دارالمصنّفین کی سوسالہ خدمات کا جائزہ لیا جاسکے اور تجزیہ کا فرض بھی ادا کیا جاسکے۔ یہ عمل کتنا اور کس طرح سامنے آیا اس کا اندازہ اسی خاص شمارہ کے شذرات اور روداد کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے۔

دارالمصنّفین نے اس موقع پر سمینار، نمائش اور ابلاغ کے وسائل سے اپنے ماضی، حال اور مستقبل کے مختلف گوشوں، زاویوں اور امکانات کو ایمانداری سے پیش کردیا اور اس کی داد علم و دانش کے نمائندوں سے بھی ملی، اسی سلسلے میں شبلی صدی تقریبات کے موقع پر شبلی صدی مطبوعات کا خانہ یا خاکہ بھی ہے۔

ناظم ادارہ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی عرصہ سے اپنی اس خواہش کا اظہار فرماتے تھے کہ دارالمصنّفین میں ان تقریبات کے جونقوش مرتب ہوں وہ یادگار بن جانے کی خوبی رکھنے والے بھی ہوں، خاص طور پر دارالمصنّفین کی سب سے قابل فخر اور مایہ ناز کتاب ''سیرۃ النبیؐ'' کی طباعت حتی الامکان شایان شان ہو، طبع اول میں جس حسن طباعت کا اہتمام کیا گیا تھا وہ بھی عظمت شان کے احساس کا مظہر ہی تھا، بعد میں یہ کتاب بار بار چھپی اور کوشش یہی رہی کہ ہر طبع نو پیشرو سے بہتر ہو لیکن حسن ونفاست کے معیار کی نہایت کہاں، جہاں نظر ٹھہر کر رہ جائے، چنانچہ آج کے دور کی بعض خوبصورت ترین طباعتوں کو سامنے رکھ کر دارالمصنّفین کے حوصلہ مند ناظم نے فیصلہ کیا کہ مکمل سیٹ نہیں تو کم از کم دو ابتدائی جلدوں کو محدود تعداد ہی میں ممکن وسائل سے اس شکل میں

www.shibliacademy.org

پیش کیا جائے کہ ہر زبان یہی اعتراف کرے کہ ''چشم ما روشن و دل ما شاد'' اور پیش کرنے والا زبان حال سے کہتا رہے کہ ''......گو ہر را تماشا کن'' شکر ہے کہ سیرت کی یہ دونوں جلدیں تقریبات کے آغاز کو برکت بخشنے کے لیے وقت پر شائع ہوگئیں اور قدر دانوں نے ان کو سر آنکھوں پر لیا، دو ہزار کی قیمت والی ان دونوں جلدوں کو کم تعداد میں شائع کیا گیا تھا لیکن اس بیش قیمت ترین سوغات کی جس طرح پذیرائی ہوئی اس سے توقع ہے کہ پہلے سے کہیں زیادہ اس کی چاہت اور طلب ہوگی۔

سیرت کے بعد شبلی صدی مطبوعات کی منفرد اور بہت دلچسپ کتاب ''شبلی کی آپ بیتی'' ہے، آہوان شبلی میں سرگودھا پاکستان کے ڈاکٹر خالد ندیم بھی نمایاں ہیں، انہوں نے علامہ شبلی کی حیات اور کارناموں پر مشتمل خاصے ذخیرہ کتب میں شبلی سے اظہار عقیدت کا سب سے جدا طریقہ نکالا، ان کے مطالعہ کی اصابت اور فہم کی سلامت برابر شبلی کے خوابوں، خیالوں، ارادوں اور کاوشوں کے مطالعہ کے ساتھ مزید استخراج نتائج کا تقاضہ کرتی رہی، اپنے دائرہ علم میں ان کو یہ احساس رہا کہ تقاضہ کی تکمیل میں کہیں کوتاہی ہوئی، اب یہ ان کا خیال ہے کہ شبلی کے سوانح نگاروں کے ہاں حمایت ومخالفت کے جذبات نے ان کی سوانح عمری کا کما حقہ مطالبہ پورا نہیں کیا، یہ خیال دراصل واقعہ کتنا ہے، اس کا محل نظر اور معرض بحث ہونا عین ممکن ہے، تاہم اس سے یہ فائدہ ہوا کہ انہوں نے سوانح عمری کے اس خانہ مصوری میں داخل نہ ہونے کا فیصلہ کیا جہاں شخصیت کے پس منظر میں زمانہ اور اس کے مناظر کی گوناگوں اور مختلف رنگوں کی فراوانی، شخصیت کے ہیولے کو اس طرح گھیر لیتی ہے کہ بعض نظریں شخصیت کے رنگوں کی تابانی اور پس منظر میں ابھرتے ڈوبتے عکسوں میں گم ہوجاتی ہیں، خالد ندیم صاحب نے اسی لیے اس خانہ مصور کو زیادہ پسند کیا جہاں صرف شبلی ہوں، داستان گو بھی شبلی ہوں اور مشاہدہ بھی ایسا مرکوز ہو کہ کہنے والا کہہ سکے کہ ہاں یہ ہیں خلوت کی ملاقاتیں، اس کے لیے انہوں نے سوانح شبلی بہ زبان شبلی مرتب کرنے کا ویسا ہی عزم کیا جیسا کسی بحر ناپیدا کنار میں غواصی کا کسی حوصلہ مند کا ہو، تصنیفات، مقالات، مکتوبات ایک وسیع ترین دنیا کی یہ جہاں گشتی ہمت کی طالب تھی۔ خالد ندیم نے جس کامیابی سے یہ سیر کی اور قلابے ملائے، وہ جتنی مسرت خیز ہے اتنی ہی حیرت انگیز بھی، ادب کی یہ دونوں شناختیں جہاں جمع ہوجائیں، بصیرت انگیز افادیت خود بخود ظاہر ہوکر رہتی ہے، ظاہر ہے یہ سوانح نہیں، خودنوشت بھی نہیں لیکن جس ژرف نگاہی

www.shibliacademy.org

اور دیدہ ریزی سے انہوں نے خوشہ چینی کی ہے اس سے ایک مسلسل، مربوط و مکمل ایسی آپ بیتی سامنے آگئی جو اردو کے سوانحی ادب میں ہمیشہ اپنی جاذبیت وکشش سے زندہ رہے گی۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک سال بہ سال انہوں نے اس آپ بیتی کی بازیافت وساخت میں کیسی کیسی منزلیں سر کی ہوں گی، اس کا اندازہ دشوار نہیں، حرف آغاز میں ظلی صاحب نے اس کام یا کارنامہ کو کوہ کنی سے تعبیر کیا ہے، اس کی صداقت میں شاید ہی کسی کو کلام ہو، کتاب بہت خوبصورت چھپی ہے، اب عموماً کتاب اور کمپوزنگ کے اغلاط کی نشاندہی سے صرف نظر کیا جاتا ہے، تاہم اس کتاب کے لیے دل تو یہی چاہتا تھا کہ کاش یہ مکمل پاک ہوتی۔

اس سلسلہ مطبوعات میں تیسرا نمبر کتاب "دارالمصنّفین کے سوسال" کا ہے، صدی تقریبات کا دوسرا رخ دارالمصنّفین کی سویں سالگرہ کا ہے، ہندوستان ہی نہیں پوری ملی تاریخ میں ایک منصف و غیر جانب دار مورخ، اس ادارہ کے قیام اور اس کے مقام سے صرف نظر نہیں کرسکتا، جزوی طور پر وقتاً فوقتاً دارالمصنّفین کی دینی، علمی، تاریخی خدمات کا مطالعہ ہوتا رہا ہے، کئی تحقیقی مقالے سامنے آئے، معارف اور بعض مطبوعات پر سند تحقیق سے محققین و باحثین سرفراز ہوتے رہے، لیکن بعض دوسرے نامور اداروں کے برخلاف دارالمصنّفین کی کوئی مکمل تاریخ اب تک مرتب نہیں ہوئی، تقریبات کی برکت تھی کہ یہ ضرورت بھی ایک شان کے ساتھ پوری ہوئی، بظاہر یہ روایتی تاریخ نہیں لیکن لمحہ تاسیس سے اب تک دارالمصنّفین جن شخصیتوں سے عبارت رہا ان کی مستند اور واضح ترین شکلیں اور ان کے ضمن میں واقعات کی تمام لہریں اس کتاب میں کمال خوبی سے جمع کردی گئی ہیں، کتنے صدور و ناظم، کتنے مہتمم، رفقا و ملازم، کتنے اراکین و معاون، کتنے کرم فرما و محسن، صدی کی گردش ماہ وسال میں طلوع وغروب ہوتے رہے، ہر شعبہ، وقت کے نشیب وفراز کس طرح طے اور عبور کرتا رہا، وہ کون سے مقام تھے جہاں اس کارواں نے ایک سنگ میل بلکہ نشان منزل مرتب کردیا، سوسال کے صفحات پر مرتسم ہر نقش کو اس کتاب میں جس محنت وسلیقہ سے اپنے مقام پر نگینہ کی طرح جڑ دیا گیا، وہ یقیناً اس کے مرتب مولانا کلیم صفات اصلاحی کی محنت ولیاقت وصلاحیت کا آئینہ ہے، اب دارالمصنّفین کی تاریخ کو جاننے کے خواہش رکھنے والوں کے لیے یہ ایسی دستاویز ہے جو محققین کے لیے افادیت میں ناگزیر ہے، شروع میں ہونہار مرتب نے بڑی جامعیت سے دارالمصنّفین کی

www.shibliacademy.org

اور خود اس کتاب کی بابت مفید اور مطالعہ کے لائق گفتگو کی ہے۔

''شذرات شبلی'' (ماہنامہ الندوہ کے اداریوں کا مجموعہ) اس نام کی یہ کتاب صدی مطبوعات کی چوتھی پیش کش ہے۔ ذکر شبلی میں ماہنامہ الندوہ کا عنوان ہمیشہ جلی حروف سے لکھا گیا ہے، ندوہ کو ندوہ بنانے میں رسالہ الندوہ صرف ترجمان ہی نہیں بذات خود ایک تحریک کی صورت وقوت رکھتا تھا، ثقافت وروایت کے اہتمام اور اصل وجود کے تحفظ بلکہ احیاء کا ایسا مؤثر ترین اور پرزور ترین داعی گزشتہ صدی کے اوائل میں شاید ہی کوئی اپنا اور ہم نوا پیش کر سکے، زوال آمادہ جمود اور ترقی کی شکل میں ایک نئے غلامانہ رجحان کی نمود کے درمیان ایک ایسے خمیر کی تشکیل جس میں عقل وروح کی آمیزش ہو اور جس سے قومی زندگی کو زیادہ مفید وصحت مند عناصر کے ذریعہ تشکیل وتسکین ہو سکے، اس کے لیے الندوہ کے اثر ونفوذ کا وسیع اور متنوع پیمانہ پر مشاہدہ کیا گیا، علامہ شبلی، مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا آزاد، اکرام اللہ ندوی وغیرہ نے اس رسالہ کو ایک نئی فکری وعلمی مہم کا ہراول دستہ بنا دیا، رسالہ نے اپنی مدت حیات پوری کی تو علامہ شبلی کی بیش قیمت تحریروں کو مقالات شبلی کی شکل میں باقی اور محفوظ کر دیا گیا تاہم شذرات کی شکل میں علامہ کی مختصر تحریریں قدر وقیمت میں ان کے اور مقالات ومضامین سے کم نہیں، ان تحریروں کو ڈاکٹر الیاس الاعظمی نے سلیقہ سے جمع کر کے ایک ترتیب سے اور ظاہر ہے یہ زمانی ہی زیادہ بہتر ہو سکتی ہے، پیش کر دیا۔ بظاہر یہ کہنا آسان ہے لیکن جمع وترتیب کے مرحلے اتنے آسان نہیں لیکن لائق مرتب اخذ واستفادہ بلکہ جمع وتالیف میں اب کہنہ مشقوں میں شامل ہیں، ان کی پے در پے کتابی کاوشیں اس کا ثبوت ہیں، اسی سلیقہ ومہارت کی شاہد یہ کتاب بھی ہے جو شبلی صدی مطبوعات کے ذریعہ ایک دلکش ترین سوغات بن گئی ہے۔

ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی کا شمار اردو ہی نہیں عربی کے ان فاضل محققوں میں ہوتا ہے جن کو خبر کی کثرت و وسعت کے ساتھ نظر کی گہرائی بھی میسر ہے، تحقیق وتنقید کے وہ اعلیٰ اور جدید پیمانوں سے واقف ہیں، مباحث کے تشنہ پہلوان سے پوشیدہ نہیں رہتے اور ساتھ ہی کسی بھی علمی بحث کو خوب سے خوب تر بنانے والے عناصر بھی ان کی دسترس سے باہر نہیں رہتے، علامہ شبلی کی مشہور عربی تحریر ''الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی'' اردو دنیا کے لیے محتاج تعارف نہیں،

www.shibliacademy.org

جرجی زیدان کے بعض اعتراضات کا جائزہ اور محاسبہ اور پھر اس کا علامہ رشید رضا مصری کے جریدہ المنار میں شائع ہونا اور اس کے لیے مراسلت وغیرہ، شبلی کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے اسی طرح معروف ہے جس طرح الجزیہ اور کتب خانہ اسکندریہ والی تحریریں ہیں، ''الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی'' سنہ ۱۲ میں پہلی بار ہندوستان میں چھپی تھی اور اس کا اخیر ایڈیشن دارالمصنّفین سے مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے زمانہ میں شائع ہوا لیکن حق یہ ہے کہ یہ رسالہ جس شان کی طباعت کا حق رکھتا ہے اس کا احساس ہوتا رہا، صدی تقریبات کی برکات کا اثر ہے کہ اس رسالہ کی علمی طباعت کے لیے فاضل محقق کی توجہ حاصل کی گئی ہے جنہوں نے حسب معمول حواشی، تعلیقات، مزید معلومات، فہارس وغیرہ سے اس کو آراستہ کردیا، تمہیدی کلمات لکھے، ہندی طباعت اور المنار کی طباعت کا مقابلہ کیا اور اس طرح یہ رسالہ ایک ایسی کتاب کی شکل میں سامنے آیا جو تحقیق و تدوین کے جدید مطالبات میں کہیں کم نہیں۔

''محمد شبلی نعمانی - لائف اینڈ کنٹری بیوشنس''، یہ کتاب بھی عملاً شبلی صدی مطبوعات کا حصہ ہے، گو اس پر مذکورہ بالا کتابوں کی طرح تصریح نہیں ہے، ڈاکٹر جاوید علی خاں شبلی ڈگری کالج کے شعبہ تاریخ کے صدر ہیں، انگریزی میں اپنے مقالات اور ایک اہم تصنیف ارلی اردو ہسٹوریوگرافی کی وجہ سے علمی حلقوں میں معروف ہیں، دارالمصنّفین کے وہ اعزازی رفیق بھی ہیں، اس سے پہلے ''محمد شبلی نعمانی'' کے نام سے ان کی ایک اور انگریزی تصنیف طبع ہوئی اور بہت مقبول ہوئی، اس میں اختصار تھا، زیرنظر کتاب اسی کی توسیع و تفصیل ہے، علامہ شبلی کی تاریخ و سوانح نگاری، تحریک ندوۃ العلماء، تعلیم اور اصلاح نصاب، شاعری اور تصنیف و تالیف پر انہوں نے سیر حاصل بحث کی، انگریزی میں غالباً اس درجہ تفصیل کے ساتھ یہ مطالعہ و تجزیہ پہلی بار آیا ہے، شبلی اور ہندوستانی سیاست اس کتاب کا سب سے اہم حصہ ہے کیونکہ اس موضوع پر اتنی گہرائی سے کم لکھا گیا ہے، یقیناً یہ کتاب شبلی صدی تقریبات کا قابل فخر عطیہ ہے۔

رضا لائبریری رامپور کی جانب سے کیٹلاگ آف پرشین مینواسکرپٹس، اقبال سہیل کی سیرت شبلی اور جامعۃ الفلاح سے علامہ شبلی کے تعلیمی افکار پر مجموعہ مقالات کی اشاعت بالواسطہ صدی تقریبات ہی کا حصہ ہیں، ان کا ذکر معارف میں مطبوعات جدیدہ کے صفحات میں ان شاءاللہ آئے گا۔

www.shibliacademy.org

روداد شبلی صدی تقریبات
و
بین الاقوامی سمینار

منعقدہ ۲۹/نومبر تا ۱/دسمبر ۲۰۱۴ء

کلیم صفات اصلاحی

الحمدللہ شبلی صدی تقریبات کے سلسلہ میں منعقد ہونے والا بین الاقوامی سمینار بہ خیر و خوبی اور نہایت کامیابی سے اختتام کو پہنچا۔اس سے قبل ملکی سطح پر ممبئی،لکھنؤ،بلریا گنج اور دہلی میں اس مناسبت سے متعدد اہم علمی مذاکرے اور سمینار منعقد کیے جا چکے تھے۔بعض رسائل و جرائد نے علامہ شبلی اور دارالمصنّفین پر خصوصی گوشے بھی شائع کیے۔جب دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی میں ۲۹/نومبر تا ۱/دسمبر ۲۰۱۴ء کو ایک عالمی مجلس مذاکرہ کے انعقاد کا اعلان کیا گیا تو شبلی و سلیمان کے عقیدت منداور دارالمصنّفین کے بہی خواہ اس تاریخ ساز تقریب میں شرکت کرنے کے لیے اعظم گڑھ تشریف لائے۔امریکہ،لندن،پاکستان،ساؤتھ افریقہ،سعودی عرب،ابوظبی،ملیشیا،مصر،ترکی اور ملک کے گوشہ گوشہ سے بڑی تعداد میں مندوبین تشریف لائے۔بہت سے علماء و محققین ویزا کی دشواری کے سبب اس محفل میں شریک نہ ہو سکے۔دارالمصنّفین کی انتظامیہ کو اس کا شدید قلق ہے۔

بیرونی ملکوں کے نمائندوں میں امریکہ سے پروفیسر ڈیوڈ لیلیولڈ اور جناب میکس بروس، ڈاکٹر اے عبداللہ رکن مجلس انتظامیہ دارالمصنّفین،ڈربن سے علامہ سید سلیمان ندوی کے فرزند ارجمند پروفیسر سید سلمان ندوی،لندن سے مولانا عیسیٰ منصوری اور مولانا رضوان احمد فلاحی،ترکی سے

www.shibliacademy.org

پروفیسر عبدالحمید براشق، پروفیسر طالپ الپ اور یوسف قاراچا، مصر سے پروفیسر علا محمد رافت اور پروفیسر محمود علاوی، ملیشیا سے پروفیسر جمیل فاروقی، ڈاکٹر ارشد اسلام اور پروفیسر اسرار احمد خاں، سعودی عرب سے ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی، جناب عزیز شمس، پروفیسر جلال سعید الحفناوی اور پروفیسر سامی سلیمان محمد، ابوظبی سے مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی، جناب فریدالدین ندوی اور پاکستان سے جسٹس محمد الغزالی تشریف لائے اور اس علمی مذاکرہ کو عالمی وقار عطا کیا۔

ملک کے ممتاز علماء اور دانشوروں میں مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، صدر مسلم پرسنل لا بورڈ و ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، مولانا سید جلال الدین عمری، امیر جماعت اسلامی ہند، مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی، مہتمم ندوۃ العلماء و چانسلر انٹگرل یونیورسٹی لکھنؤ، مولانا سید محمد واضح رشید ندوی، معتمد تعلیم ندوۃ العلماء، پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی، پروفیسر نعیم الرحمٰن فاروقی وائس چانسلر الٰہ آباد یونیورسٹی، پروفیسر اختر الواسع کمشنر برائے لسانی اقلیات، پروفیسر محمد شمیم جیراج پوری سابق وائس چانسلر مولانا آزاد اردو نیشنل یونیورسٹی، حیدرآباد۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر محسن عثمانی ندوی، پروفیسر رفاقت علی خاں، پروفیسر سید محمد عزیز الدین ڈائریکٹر رام پور رضا لائبریری۔ پروفیسر ظفر احمد صدیقی، پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، پروفیسر خالد محمود وائس چیئرمین دہلی اردو اکیڈمی، پروفیسر شافع قدوائی، پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی شعبہ اسلامک اسٹڈیز علی گڑھ، پروفیسر شہپر رسول، پروفیسر عبدالقادر جعفری صدر شعبہ عربی و فارسی الٰہ آباد یونیورسٹی اور ڈاکٹر شمس بدایونی وغیرہ نے اس میں شرکت کی۔

دارالمصنّفین نے جب اپنے بانی کی وفات اور اپنے قیام کے پچاس سال پورے کیے تھے تو اس وقت بھی اس کی خدمات کے اعتراف و جائزے کے لیے دنیا بھر سے اہل علم و دانش دارالمصنّفین میں مجتمع ہوئے تھے، یہ دارالمصنّفین کی تاریخ کا عہد شباب تھا اور اس وقت دارالمصنّفین کے معماروں میں مولانا مسعود علی ندوی زندہ تھے۔ ان کے وجود سے دارالمصنّفین کا وزن اور وقار قائم تھا۔ اس علمی اجتماع کے متعلق مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے مارچ ۱۹۶۵ء کے شذرات میں لکھا تھا" ۱۹۴۷ء کے بعد مسلمانوں کا ایسا منتخب اور نمائندہ اجتماع نہیں ہوا تھا۔ حکومت کے ارکان، اسلامی ملکوں کے سفراء، مشاہیر علماء، یونیورسٹیوں اور عربی درس

www.shibliacademy.org

گاہوں کے نمائندے، نامور اصحاب علم و قلم اور مسلمانوں کے مختلف مکاتب خیال کے اکابر شریک ہوئے، گولڈن جبلی کا افتتاح ڈاکٹر سید محمود صاحب صدر مجلس منتظمہ دارالمصنّفین و سابق وزیر خارجہ حکومت ہند نے کیا تھا۔ اس کی صدارت ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے کی تھی جو اس وقت نائب صدر جمہوریہ کے منصب پر سرفراز تھے۔ ناظم دارالمصنّفین مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا تھا۔ اس سپاس نامہ کے جواب میں نائب صدر نے جو حسن اتفاق سے دارالمصنّفین کے معزز رکن تھے اور اس کی خدمات اور سرگرمیوں سے بہ خوبی واقف تھے، دارالمصنّفین کے بانی، اس کے معماروں اور اس کی علمی، تحقیقی اور تاریخی خدمات پر انتہائی بلیغ، پرمغز اور عالمانہ خطبہ دیا تھا۔ یہ خطبہ خیالات کی بلندی و گہرائی، قومی و ملی جذبات اور ادبی فصاحت و بلاغت کا شاہکار تھا۔ اس کے متعلق مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے فرمایا تھا کہ ''یہ خطبوں کا تاج محل تھا''۔ واقعہ یہ ہے کہ دارالمصنّفین کے لیے اس سے بہتر خراج عقیدت پیش کرنا ممکن نہیں۔ اس تاریخ ساز موقع پر نواب ساجدہ سلطان صاحبہ بیگم بھوپال اور مسز سچیتا کرپلانی وزیر اعلیٰ اتر پردیش کی شرکت نے اس محفل کو چار چاند لگا دیا تھا۔ ان کی خدمت میں بھی سپاس نامے پیش کیے گئے تھے۔ جو آج بھی میوزیم کی زینت بنے ہوئے ہیں۔

دارالمصنّفین کے لیے یہ انتہائی فخر و ناز اور اہل اعظم گڑھ کے لیے اعزاز کی بات ہے کہ جب اس ادارہ نے اپنی زندگی کے سو سال پورے کیے تو اس وقت جمہوریہ ہند کے نائب صدر کے عہدہ پر عالی جناب محمد حامد انصاری فائز ہیں۔ ان کا تعلق غازی پور کے اس خانوادہ سے ہے جس کے اجداد میں حکیم عبدالوہاب نابینا علامہ شبلی نعمانی کے ہم درس تھے۔ ان کے جد امجد ڈاکٹر مختار احمد انصاری اپنے عہد کے نامور طبیب حاذق تھے، انہوں نے مظلومین بلقان کے لیے ترکی جانے والے طبی وفد کی قیادت کی تھی اور ان کو یہ فخر حاصل ہے کہ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی نے رخصت کرتے وقت ان کی قدم بوسی کی تھی اور ان کی معذرت کے جواب میں مولانا شبلی نے فرمایا تھا: ''یہ تمہارے پاؤں نہیں اسلام کے مجسمۂ غربت کے پاؤں ہیں''۔ شبلی و مملکت شبلی سے اسی خاندانی و دیرینہ تعلق کی بنا پر انہوں نے دارالمصنّفین کی دعوت قبول فرمائی اور یہاں تشریف آوری

www.shibliacademy.org

کی زحمت فرمائی۔

یوپی حکومت کے نمایندہ اور کابینی وزیر جناب بلرام یادو ان کے ہمراہ تھے۔ جناب نائب صدر ڈھائی بجے دن میں اکیڈمی تشریف لائے۔ کارکنان دارالمصنّفین سے مختصر ملاقات کے بعد میوزیم میں تشریف لے گئے جہاں مخطوطات ومسودات اور دوسری اہم تصاویر دیکھ کر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ اکبرنامہ، مونس الارواح، گاندھی جی اور اپنے دادا مختار احمد انصاری کے خطوط دیکھنے کی خوشی حاصل کی۔ لائبریری کے مرکزی ہال کو تھوڑی دیر کے لیے رونق بخشی اور وزٹرس بک پر اپنے تاثرات تحریر کیے، پھر افتتاحی اجلاس کے لیے اندرونی راستہ سے شبلی ڈگری کالج گراؤنڈ تشریف لیے گئے۔

اسٹیج پر نائب صدر کے علاوہ جناب بلرام یادو، شبلی کالج کے پرنسپل ڈاکٹر افسر علی، ڈاکٹر ظفرالاسلام خاں صدر مجلس عاملہ دارالمصنّفین اور پروفیسر اشتیاق احمد ظلی تشریف فرما ہوئے۔ سب سے پہلے قومی ترانہ پیش کیا گیا۔ اس کے بعد شاہنواز فیاض نے تلاوت کی۔ اس اجلاس کی صدارت نائب صدر عالی جناب محمد حامد انصاری صاحب نے اور نظامت کے فرائض پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے انجام دیے۔ سب سے پہلے ڈاکٹر افسر علی نے نائب صدر کی خدمت میں اور ڈاکٹر ظفرالاسلام خاں نے شری بلرام یادو کو گلدستہ پیش کیا۔

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں نائب صدر جمہوریہ ہند اور دوسرے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ علم وادب، تہذیب وشائستگی، حب الوطنی، سرفروشی اور قربانی کی سرزمین اعظم گڑھ پر علم ودانش کے مرکز دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی میں ہم اعظم گڑھ کے باشندوں اور اس کے علمی، تعلیمی اداروں کی طرف سے دل کی گہرائیوں سے آپ کا استقبال کرتے ہیں۔ شبلی صدی تقریبات میں شرکت کے لیے دور دراز سے آپ کی تشریف آوری، علم وادب، حریت پسندی اور حب الوطنی کی اس درخشاں روایت سے آپ کے تعلق خاطر کی دلیل ہے جس کی علم برداری کا شرف علامہ شبلی کے قائم کیے ہوئے اس ادارہ کو گزشتہ ۱۰۰ سال سے حاصل رہا ہے۔ اس سے بھی زیادہ یہ اس ادارہ کے عظیم موسس سے آپ کی عقیدت ومحبت کی غماز ہے، جنھوں نے اپنی پوری زندگی علم وادب اور ملک وقوم کی خدمت میں گذار دی اور عمر کے آخری حصہ میں دارالمصنّفین کی

www.shibliacademy.org

شکل میں دنیا کو ایک ایسا بے نظیر تحفہ دیا جس پر بغداد کے بیت الحکمۃ کا اطلاق بے جا نہ ہوگا۔ دارالمصنّفین نے نہایت ناسازگار حالات کے باوجود علم وادب کی بے مثال خدمت کی ہے۔اسی کے ساتھ اس ادارے سے وابستہ محققین ومورخین اور ادباء نے اپنے گراں بہاں لٹریچر کے ذریعہ وطن عزیز کے باشندوں کے درمیان باہمی مفاہمت اور اتحاد و یگانگت پیدا کرنے اور ان کو ایک دوسرے سے قریب لانے کا جو عظیم الشان کارنامہ انجام دیا ہے، اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔اکیڈمی نے یہ کام جن حالات اور جس سطح اور جس پیمانے پر انجام دیا ہے وہ قابل فخر بھی ہے اور نہایت دل خراش بھی۔انھوں نے مزید کہا کہ علامہ شبلی کو جہاں اسلامی ورثہ پر فخر تھا اور بہ حیثیت مسلمان اپنی شناخت کی حفاظت پر اصرار تھا وہیں وہ ملک کے مختلف طبقات کے درمیان اتحاد و یکجہتی کے زبردست حامی بھی تھے اور ہر طرح کی فرقہ واریت کے سخت مخالف تھے۔وقت اور حالات نے ثابت کردیا ہے کہ ان کی سوچ صحیح تھی۔آیئے عہد کریں کہ جو پیغام علامہ شبلی نے ایک صدی قبل دیا تھا اس کو ہندوستان کے ہر گھر اور ہر فرد تک پہنچائیں گے۔اس کے بعد عالی جناب نائب صدر جمہوریہ ہند کی خدمت میں پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے سپاس نامہ پیش کیا۔

جناب بلرام یادو نے نائب صدر جمہوریہ کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ دارالمصنّفین اور شبلی کالج اعظم گڑھ کی شناخت ہیں۔علامہ شبلی نے ان اداروں کو جس مقصد کے لیے قائم کیا تھا یہ آج بھی اسی راہ پر گامزن ہیں۔ان اداروں کی فلاح و بہبود کے لیے جو بھی تجاویز پیش کی جائیں گی حکومت اتر پردیش انہیں پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کرے گی۔

اس کے بعد پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب نے صدر اجلاس نائب صدر جمہوریہ ہند عالی جناب محمد حامد انصاری صاحب کو صدارتی خطاب کے لیے مدعو کیا۔انھوں نے افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ شبلی نے جس دور میں جنم لیا وہ مسلمانان ہند کے لیے نازک اور تغیر پذیر عہد تھا، وہ بالکل ہی مختلف عہد تھا۔شاید وہ ہمارے ادراک سے بھی پرے ہے۔ان کی زندگی، ان کے سفرنامے، ان کا حلقۂ احباب اور ان سب سے بڑھ کر ان کا فضل و کمال ایک متجسس ذہن کی گواہی دیتے ہیں۔ان کا شاہکار علمی کارنامہ ''الفاروق'' کا ئی زبانوں میں ترجمہ ہوچکا ہے۔مولانا شبلی کو جو مسائل درپیش تھے، ان میں سے ایک تعلیم سے متعلق

www.shibliacademy.org

جدیدیت کے اس مخصوص رجحان کے تناظر میں تھا جو برطانوی حکومت کے قیام کے بعد ہندوستان اور ہندوستانیوں پر تھوپ دیا گیا تھا۔اس تبدیلی کا ایک ایسا گہرا نفسیاتی اثر ہوا جو احساس محرومی کا عکاس تھا۔شبلی نے اس کرب کا اظہار اپنی ایک طویل نظم ''شہر آشوب اسلام'' میں کیا ہے۔انہوں نے دارالمصنّفین کے متعلق کہا کہ ''گذشتہ ایک صدی سے شبلی اکیڈمی نے علم وتحقیق بطور خاص سیرۃ النبیؐ ، اسلام کی ابتدائی تاریخ ، قرآنیات ،عہد وسطیٰ پر ترکیز کے ساتھ ہندوستانی تاریخ ، اردو، فارسی اور عربی ادب اور عربی شخصیات کے حوالے سے نہایت وقیع خدمات انجام دی ہیں۔ اس کی مطبوعات متاثر کن اور ماضی وحال کی علمی کاوشوں کا نذرانہ ہیں۔ ہندوستان اور ہندوستانی بجا طور پر اسے اپنی وراثت کا ایک اہم حصہ تصور کرتے ہیں۔اسی طرح ان سے بھی یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس ورثہ کی حفاظت کریں اور اس کے فضل وکمال میں ایسا اضافہ کریں جو اس کی عظمت وشوکت کو بڑھائے۔اس کے لیے بنیادی شرط تعلیم ہے جس میں ہم باوجود متواتر اور صحیح تشخیص کے پچھڑ گئے ہیں۔انہوں نے مزید کہا کہ ہماری وسیع اور متنوع آبادی کا کوئی بھی حصہ بحیثیت شہری حکومت سے چار بنیادی مطالبات کے تقاضا کا حق رکھتا ہے،سماجی امن ،تحفظ اور تشخص کی حفاظت ،مناسب تعلیم کے ذریعہ ترقی ،روزگار اور سرکاری اسکیموں میں مناسب اور مساوی حصہ داری نیز فیصلہ سازی میں بھی مناسب حصہ داری۔ان تمام امور کی حصول یابی میں یقیناً کچھ کمیاں ہیں،ان کمیوں پر قابو پانا یقیناً ایک بڑا چیلنج ہے۔ یہ حقوق کا مسئلہ ہے خیرات کا نہیں۔ان کے لیے جدوجہد،صبر تسلسل اور شمولیت کے دائرے میں رہتے ہوئے کی جانی چاہیے۔ عدم شمولیت اور اجنبیت کے راستہ سے پرہیز کرنا چاہیے۔''سب کے ساتھ سب کا وکاس'' کا ہدف درست اور قابل قدر ہے۔اس کے لیے ایک مشترکہ نقطۂ آغاز اور مطلوبہ رفتار سے سب میں شانہ بہ شانہ چلنے کی صلاحیت ضروری ہے۔اس صلاحیت کو انفرادی وسماجی اقدام حکومتی سطح پر کرنا ہوگا جو زمینی سطح پر ثمر آور ہوں۔آخر میں نائب صدر نے شبلی اکیڈمی کی صدسالہ تقریب کے انعقاد پر کارکنان درالمصنّفین کو تہنیت پیش کی اور یہاں مدعو کیے جانے پر تہ دل سے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ''مجھے یقین ہے کہ ایک صدی مکمل کرنے کے بعد آنے والے سالوں میں یہ ادارہ اور بھی بامقصد پیش رفت کرے گا''۔

www.shibliacademy.org

اس کے بعد ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں صدر مجلس عاملہ نے شکریہ کی قرارداد پیش کی اور اس افتتاحی نشست کے خاتمہ کا اعلان کیا گیا۔

شام کو بعد نماز مغرب پونے چھ بجے خصوصی نشست منعقد کی گئی جس کی صدارت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب اور نظامت مولانا حافظ محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی سینئر رفیق دارالمصنّفین نے فرمائی۔ تلاوت حافظ عبدالرحمٰن قمر عباسی صاحب نے کی۔ ناظم اجلاس مولانا محمد عمیر الصدیق دریابادی نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ علامہ شبلی نعمانی عہد آفریں شخصیت کے مالک تھے، ان کی وفات اور دارالمصنّفین کے وجود کو سو سال ہوگئے ہیں۔ اس خوبصورت تقریب کا حصہ بننے کے لیے دنیا بھر سے آئے ہوئے مندوبین و مدعوبین کی زحمت فرمائی۔ شبلی اور دارالمصنّفین سے ان کے بے پناہ محبت کی دلیل ہے۔ علامہ شبلی کی وفات کے تیسرے روز اس ادارہ کی بنیاد ان ہی کے طے کردہ خطوط پر رکھی گئی۔ اس کے بعد اس کے معماروں مولانا حمید الدین فراہی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا مسعود علی ندوی سے لے کر شاہ معین الدین ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مولانا ضیاء الدین اصلاحی تک نے اس ادارہ کو بام عروج پر پہنچانے کے لیے جو لازوال قربانیاں دی ہیں، وہ ناقابل فراموش ہیں۔ شبلی صدی تقریبات کو منانے میں ان کے علمی اور تصنیفی کارناموں کی گونج بھی ضرور سنائی دیتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر تلامذۂ شبلی اور ان کے بعد کے لوگوں نے قناعت، صبر اور استقلال کا ثبوت نہ دیا ہوتا اور انتہائی نامساعد حالات میں ادارہ کی بقا کو اپنی زندگی کا مشن نہ بنایا ہوتا تو شاید آج اس انتہائی باوقار علمی بزم کے آراستہ ہونے کا امکان نہ ہوتا۔ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے مقصد میں کامیاب کرے۔

پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی رکن مجلس انتظامیہ دارالمصنّفین نے حبیب شبلی مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے حفید پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی مدیر کانفرنس گزٹ علی گڑھ و رکن مجلس انتظامیہ دارالمصنّفین کا کلیدی خطبہ سامعین کو پڑھ کر سنایا جو اپنی پیرانہ سالی اور ضعف کے سبب تشریف نہ لا سکے تھے لیکن انہوں نے علامہ شبلی سے متعلق اپنے جذبات کلیدی خطبہ کے قالب میں ڈھال دیا تھا۔ اس میں موصوف محترم نے علامہ شبلی کی علمی و عملی جدوجہد اور ان کے کارہائے

www.shibliacademy.org

نمایاں کا تذکرہ بڑے دل نشین انداز میں کیا ہے، ان کی شاعری، تاریخ دانی، علی گڑھ میں ان کی زندگی پر مرتب ہونے والے اثرات، سرسید سے تعلق، ندوۃ العلماء سے وابستگی، قیام حیدرآباد، علی گڑھ میں علامہ شبلی کے اثرات، سفرنامہ روم ومصروشام، شمس العلماء کا خطاب، تمغہ مجیدیہ، الفاروق کی تصنیف، انجمن ترقی اردو ہند کے پہلے سکریٹری کی حیثیت سے ان کی خدمات کا بہت اچھے پیرایہ میں تذکرہ کیا ہے۔ علامہ شبلی کے سلسلہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں ”علامہ شبلی ذکی الحس تھے، انہوں نے اختلافات کی وجہ سے علی گڑھ کو چھوڑا تھا اور حیدرآباد کو بھی۔ وہ شاید ندوۃ العلماء کو پہلے ہی چھوڑ دیتے لیکن عام اساتذہ اور طلبہ میں ان کی مقبولیت اس درجہ تھی کہ وہ ان کے گلے کا ہار بن گئی، بالآخر ۱۹۱۲ء آتے آتے یہ ابال اتنا بڑھ گیا کہ جھاگ اٹھا یعنی علامہ نے ندوۃ العلماء سے رسمی تعلقات منقطع کرلیے۔ رسمی اس لیے کہ دلی تعلق ہرحال باقی رہا“۔

کلیدی خطبہ کے بعد پروفیسر نعیم الرحمٰن فاروقی وائس چانسلر الٰہ آباد یونیورسٹی نے علامہ شبلی کی تاریخ نویسی پر انگریز مورخین کے سائنٹفک اصولوں کی روشنی میں بڑی اہم گفتگو کی اور یہ بتایا کہ علامہ شبلی کا مورخانہ شعور مغربی مورخین کے تاریخی شعور وآگہی سے کسی طرح کم نہ تھا، انہوں نے بھی تاریخی حوالوں میں عملی اصولوں کو اہمیت دی ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ شبلی نے ایسے دور میں جب کہ وسائل کا فقدان تھا کیوں کر اتنے بڑے اور اہم کارنامے انجام دیے۔

اس کے بعد پروفیسر شمیم جیراج پوری سابق وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی حیدرآباد کو اظہار خیال کی دعوت دی گئی، انہوں نے کہا کہ علامہ شبلی نعمانی کے شاگردوں میں علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی وغیرہ اس بلند مرتبہ کے شخص تھے کہ انہوں نے ان کے مشن کو آگے بڑھانے میں کامیابی حاصل کی۔ اگر انہوں نے اپنے پیچھے لائق و باصلاحیت جانشینوں کو نہ چھوڑا ہوتا تو دارالمصنّفین کے نام سے یہ جو عظیم الشان علمی سلطنت آپ کو نظر آرہی ہے، موجود نہ ہوتی، میں سمجھتا ہوں یہ ان کے تلامذہ اور جانشینوں کا عظیم کارنامہ ہے۔

اس کے بعد پروفیسر اختر الواسع کو اظہار خیال کے لیے بلایا گیا۔ انہوں نے کہا کہ علامہ شبلی اور ان کے جانشینوں کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے ملت کو احساس کمتری سے نکالا۔ وہ تعلیم کے تعلق سے انقلابی سوچ رکھتے تھے۔ ان کا ایک مقصد یہ تھا کہ تعلیم کا نظام ہمارے ہاتھ میں

www.shibliacademy.org

ہونا چاہیے، اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انہوں نے عصری علوم کے لیے اعظم گڑھ میں اسکول کی بنیاد رکھی۔ وہ ماضی آشنا اور مستقبل شناس تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے علمی، تحقیقی اور تعلیمی افکار کی معنویت آج بھی ویسے ہی باقی ہے اور ان سے ملت سو سال کے بعد بھی مستفیض و فیض یاب ہو رہی ہے۔ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی نے علم و ادب اور تحقیق و تاریخ کے فروغ میں جو رول ادا کیا ہے وہ بے مثال ہے۔

اس کے بعد مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی، رکن مجلس انتظامیہ، نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ سیرت پر بہت سی کتابیں تصنیف کی گئیں لیکن علامہ شبلی نعمانی کی سیرت النبی پوری دنیا کے لیے مثال ہے۔ انہوں نے علم حدیث میں علامہ شبلی کی دست رس اور ان کی گہری نظر کا تذکرہ بھی کیا، بخاری پر ان کے اہم حواشی کے متعلق بھی گفتگو کی اور علامہ شبلی کو نابغۂ روزگار بتایا۔

مولانا سید جلال الدین عمری، امیر جماعت اسلامی ہند، نے کہا کہ کسی بھی قوم کی بلند مرتبہ شخصیات اس کا سرمایہ اور روشنی کا مینار ہوتی ہیں۔ ان کے کارناموں سے قوم کو حرکت و عمل کا جذبہ ملتا ہے۔ ہماری تاریخ ایسی شخصیات سے بھری پڑی ہے جنھوں نے علامہ شبلی ہی کی طرح نہایت کم عمر پائی اور بے نظیر کارنامے انجام دیے۔ علامہ شبلی نے مختلف جہات سے ملت کی جو خدمات انجام دی ہیں، وہ بے مثال ہیں۔ ان کی کوشش تھی کی ملت باوقار زندگی گذارے، انہوں نے اپنے پیچھے بہت بڑا علمی ورثہ چھوڑا جس کی حفاظت و ترقی ملت کا فریضہ ہے۔ اس کے علاوہ وہ ملت کے مسائل سے بے خبر نہ تھے۔ ملت کے تئیں ان کی دل سوزی اور تڑپ نے ان کو نہایت اعلیٰ مقام پر پہنچا دیا تھا۔ وہ ملت کے درد کو اپنا درد سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں اس درد کو نہایت کھل کر بیان کیا ہے۔ دارالمصنّفین علامہ شبلی نعمانی کی ایک یادگار ہے۔ برصغیر کا کوئی بھی ادارہ اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ دارالمصنّفین جیسے ادارے امت کا بہت بڑا سرمایہ ہیں، ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ یہ ادارے زندہ اور فعّال رہیں۔

اس کے بعد صدارتی تقریر سے قبل مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے ہاتھوں ''سیرۃ النبی شبلی'' کے یادگاری ایڈیشن، راقم الحروف کی کتاب ''دارالمصنّفین کے سو سال''، ڈاکٹر خالد ندیم کی ''شبلی کی آپ بیتی''، علامہ شبلی نعمانی کی تصنیف ''الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی'' مع اضافہ و

www.shibliacademy.org

تحقیق وتخریج ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی، ''شذرات شبلی'' (الندوہ کے شذرات) مرتبہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ڈاکٹر جاوید علی خاں کی انگریزی تصنیف ''محمد شبلی نعمانی - لائف اینڈ کنٹری بیوشنس'' کا اجرا عمل میں آیا۔ یہ کتابیں دارالمصنّفین نے شبلی صدی تقریبات کی مناسبت سے شائع کی تھیں۔ ان کے علاوہ رضا لائبریری رام پور کے ''فارسی قرآنی مخطوطات کی فہرست'' مرتبہ ساجدہ شروانی، معاونت ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی اور عصر حاضر میں علامہ شبلی کے تعلیمی افکار کی معنویت (مجموعہ مقالات سمینار) مرتبہ مولانا عبیداللہ طاہر مدنی، مولانا ذکی الرحمٰن غازی فلاحی کا بھی اجرا کیا گیا۔

اس کے بعد صدر اجلاس مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ مسلمانوں میں تعلیمی پس ماندگی کا احساس سرسید احمد خاں اور علامہ شبلی نعمانی جیسی شخصیات کو بہت پہلے ہوگیا تھا۔ انہوں نے حالات کی نبض پر انگلی رکھی اور محسوس کیا کہ تعلیم کی کمی کے سبب قوم پس ماندگی کی شکار ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ ملت کی رسوائی ہورہی ہے، اسلام کو بدنام کیا جارہا ہے اور پوری ملت مایوسی وقنوطیت کے دلدل میں پھنستی چلی جارہی ہے۔ انہوں نے ملت کو اس سے نکالنے کے لیے تعلیم وتعلم کی رسی کو مضبوطی سے پکڑا اور اسی میں قوم کے درد کا درماں تلاش کیا۔ ان کے پختہ عزم کے سبب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور شبلی اکیڈمی جیسے انقلابی ادارے وجود میں آئے۔ انہوں نے مزید کہا کہ علامہ شبلی نے اپنے رفقاء اور شاگردوں کی ایسی ٹیم تیار کی جنہوں نے ان کے انتقال کے بعد بھی ان کے مشن کو جاری رکھا۔ آج علامہ شبلی کے انتقال کو ۱۰۰ برس مکمل ہوچکے ہیں، ہمیں اس وقت علامہ شبلی اور ان کے محبوب ادارہ دارالمصنّفین کے کاموں کا جائزہ لینا چاہیے۔ دارالمصنّفین اور ندوۃ العلماء کے تعلقات پر بھی روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ ہم دارالمصنّفین کو اسی طرح روز بہ روز ترقی پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب موجودہ ناظم دارالمصنّفین نے اس ادارہ کے تعلق سے اپنا حق ادا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ہم تہ دل سے شبلی صدی تقریبات کے انعقاد پر ان کو اور ان کے رفقائے کار کو مبارک باد دیتے ہیں اور اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دعا گو ہیں کہ وہ ان تقریبات کو نتائج وثمرات کے لحاظ سے بارآور کرے۔ اس کے بعد اس نشست کے اختتام کا اعلان کیا گیا۔

دوسرے دن ۳۰ر نومبر کی صبح کو ۹ بجے شبلی صدی بین الاقوامی سمینار کے مقالات کی نشست

www.shibliacademy.org

کا آغاز ہوا۔ مقالہ نگاروں کی تعداد کی کثرت کے باعث بیک وقت تین جگہوں پر (شبلی اکیڈمی کے کانفرنس ہال اور شبلی کالج کے دو ہالوں) میں مقالہ خوانی کی نشستیں منعقد ہوئیں۔ شبلی اکیڈمی کے ہال میں پروفیسر جسٹس محمد الغزالی کی صدارت اور مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی کی نظامت میں کل چھ مقالات پڑھے گئے۔ پروفیسر جلال السعید الحفناوی نے ''الترجمۃ العربیۃ لعلم الکلام الجدید لمولانا شبلی النعمانی''، مولانا محمد فرمان ندوی نے مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن الاعظمی صاحب کا مقالہ ''علامہ شبلی اور ندوۃ العلماء''، پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی نے ''علی گڑھ علامہ شبلی کی اولین تصنیف۔ مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم''، ڈاکٹر محمد شارق نے شبلی کے مقالہ ''اردو ہندی کی تحلیل و تجزیہ'' کے موضوع پر پڑھا، پروفیسر شافع قدوائی کا مقالہ ''شبلی کی قدر سنجی اور مولانا دریابادی'' کے عنوان سے تھا۔ اس نشست میں پروفیسر محمد الغزالی کے ہاتھوں ''سیرت شبلی از علامہ اقبال سہیل'' ترتیب و تصحیح مولوی فضل الرحمٰن اصلاحی، اسکالر دار المصنّفین کا اجراء ہوا۔

شبلی کالج ہال نمبر ایک میں پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی کی صدارت اور ڈاکٹر محمد طارق ایوبی کی نظامت میں کل پانچ مقالات پڑھے گئے، پروفیسر محمد محسن عثمانی ندوی نے ''شبلی ادیب و نقاد''، پروفیسر سامی سلیمان محمد نے ''تقنیات سرد۔ سیرۃ الفاروق بین شبلی النعمانی وطٰہٰ حسین''، پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی ندوی نے ''شبلی اور ان کا عہد''، پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی نے ''شبلی کی تاریخ نگاری۔ اسباب و محرکات''، ڈاکٹر احسان اللہ فہد نے ''مولانا شبلی نعمانی اور درس نظامی'' کے عنوان سے پیش کیا۔

شبلی کالج کے ہال نمبر ۲ میں پروفیسر شریف حسین قاسمی کی صدارت اور ڈاکٹر فیضان احمد اعظمی کی نظامت میں پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے ''تحقیق منسوبات اور علامہ شبلی نعمانی''، ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی جامعی نے ''الفاروق۔ علامہ شبلی کی ایک شاہکار تصنیف''، ڈاکٹر شمس بدایونی نے ''ملاقات شبلی و آزاد کے زمانے کا تعین'' اور ڈاکٹر عرفات ظفر نے ''تاریخ بدء الاسلام للعلامہ شبلی النعمانی'' کے عنوان سے مقالات پڑھے۔ یہ نشستیں ۹ سے ۱۱ بجے دن تک چلیں۔

اس کے بعد پون گھنٹہ وقفہ کے بعد دوسری نشست منعقد کی گئی۔ شبلی اکیڈمی کے کانفرنس ہال کا سیشن ہندی اسکالرز کے لیے مخصوص تھا، جس میں علامہ شبلی پر ہندی زبان میں

www.shibliacademy.org

مقالات پیش کیے گئے اور کچھ بڑے اور ممتاز ہندو دانش وروں نے علامہ شبلی کی حیات اور کارناموں پر مفصل روشنی ڈالی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ علامہ شبلی کی مقبولیت بہ حیثیت مورخ اور ایک عظیم اسکالر ہندی داں طبقہ اور برادران وطن میں کم نہیں۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر دویندر راج آنکر اور نظامت جناب راجیو رنجن نے کی۔ اس میں جناب مکیش بھوشن، جناب رویندر رای، جناب جگدیش چند برنوال نے مقالات پیش کیے۔ ان مقالات میں علامہ شبلی کے سوانح کے ساتھ ان کی حب الوطنی اور وطن دوستی پر خاص گفتگو کی گئی تھی۔ اس اجلاس میں جگدیش برنوال کند نے کہا کہ علامہ شبلی و حالی دونوں کی سوچ وفکر ایک تھی اور اسی فکری اساس پر علامہ اقبال نے اپنی شاعری کی داغ بیل ڈالی۔ علامہ شبلی دلی اور لکھنؤ کے باشندہ نہ ہونے کے باوجود اردو کے عناصر خمسہ میں شامل ہیں اور صاحب اسلوب مصنف گذرے ہیں، جس کا اعتراف پوری علمی دنیا کرتی ہے اور ہمیں بھی ان کی بلند مقامی پر فخر ہے۔ مکیش بھوشن جی نے کہا کہ شبلی کو پڑھ کر یہاں کے مسلمانوں کو اپنے اسلاف کی تاریخ اور اپنے مقام کا اندازہ ہوا۔ ان کے علاوہ جناب عالم بدیع اور جناب حولدار یادو نے بھی خطاب کیا۔ جناب حولدار یادو نے کہا کہ اس وقت پوری دنیا میں مسلمانوں پر جو زیادتی اور ظلم ہو رہا ہے، اس کو شبلی نے بہت پہلے محسوس کرلیا تھا اور اس کے تدارک کا طریقہ بھی بتادیا تھا اور وہی طریقہ آج بھی کارگر ہے۔ جناب عالم بدیع ایم ایل اے نے بھی حاضرین سے خطاب کیا اور شبلی کی فکر وسوچ کی موجودہ زمانے میں معنویت واہمیت بتائی۔ آخر میں صدر اجلاس دویندر رائے انکر نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ علامہ شبلی نے اپنی تحریر وتقریر دونوں میں ہندو مسلم اتحاد، بھائی چارگی اور قومی یکجہتی کی بات کی ہے، ان کے افکار ونظریات ملک وملت کی فلاح و بہبود کے تئیں انتہائی مخلصانہ تھے اور وہ ہر طرح کی فرقہ واریت کے سخت مخالف تھے۔

شبلی کالج ہال نمبر ا میں پروفیسر محسن عثمانی ندوی کی صدارت اور مولانا اشہد رفیق ندوی کی نظامت میں پروفیسر شکیل اختر نے ''شبلی اور تعلیم نسواں''، پروفیسر شریف حسین قاسمی نے ''فارسی شاعری کی تاریخ میں علامہ شبلی کے امتیازات''، ڈاکٹر فریدہ خانم نے انگریزی میں ''علامہ شبلی-اے گریٹ وژیزی''، ڈاکٹر قمر اقبال نے ''شبلی اور عربی ادب کی تنقید'' اور ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی نے

www.shibliacademy.org

''علامہ شبلی اور تاریخ طب'' کے موضوعات پر مقالے پیش کیے۔

ہال نمبر ۲ میں پروفیسر رفاقت علی خاں کی صدارت اور ڈاکٹر عمیر منظر کی نظامت میں پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین نے ''مولانا شبلی اور رضا لائبریری - ایک تاریخی تجزیہ''، ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی نے ''ندوۃ العلماء کا فکری، ملی شعور مولانا علی میاں پر علامہ شبلی کے اثرات کے حوالے سے''، ڈاکٹر محمود حافظ عبد الرب مرزا نے ''افکار العلامہ شبلی النعمانی السیاسیۃ: اہمیتھا و مدی افادتھا''، ڈاکٹر فیضان احمد اعظمی نے ''علامہ شبلی، شبلی منزل اور نیشنل آرکائیوز آف انڈیا''، ڈاکٹر ایاز احمد اصلاحی نے ''سیرۃ النبی اپنی تاریخ اور بعض علمی مباحث کے آئینہ میں'' کے عنوان سے مقالات پیش کیے۔ یہ نشستیں پونے بارہ بجے سے ڈیڑھ بجے تک چلیں۔ پھر ڈیڑھ گھنٹے وقفہ کے بعد ۳ سے ۴ بجے تک مقالات کی تیسری نشست ہوئی۔

اکیڈمی کے ہال میں پروفیسر عبد القادر جعفری کی صدارت اور ڈاکٹر توقیر احمد ندوی کی نظامت میں ڈاکٹر عبد الرحمٰن گوندو نے ''علامہ شبلی کا سفر کشمیر''، مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی کا مقالہ ''علامہ شبلی اور علم حدیث''، جناب فرید الدین ندوی نے، جناب شمیم طارق نے ''ٹیگور کی شاعری اور شبلی کی شعریات'' اور ڈاکٹر شاداب عالم نے ''شبلی کا نظام تنقید'' کے عنوان سے مقالات پیش کیا۔

شبلی کالج کے ہال نمبر ا میں پروفیسر عبد الحمید براشق کی صدارت میں انگریزی مقالات کی نشست منعقد ہوئی، اس میں پروفیسر جمیل فاروقی نے "Al-Farooque and its Significance: Sociological Perspective"، پروفیسر اسرار احمد خان نے "Allama Shibli's Aunthentication of Historical Events in His Sirat al Nabi an Analysis"، مسٹر میکس بروس نے "Moulavi Among Missionaries, Muftis and Modemists: Shibli Nomani in the Levant Methodolog of Allama Shibli Nomani" کے عنوان سے مقالات پیش کیے۔

ہال نمبر ۲ میں ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی کی صدارت اور ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کی نظامت میں ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن نے ''سفر نامہ روم و مصر و شام انیسویں صدی کے آخر کا شاندار کارنامہ''، جناب عزیر شمس نے ''امام ابن تیمیہ اور علامہ شبلی''، ڈاکٹر عمیر منظر نے ''علامہ شبلی اور شبلی

www.shibliacademy.org

شناسی کے چند پہلو‘ کے عنوان سے مقالات پیش کیے۔اس اجلاس کے خاتمہ کے بعد عصر کی نماز ہوئی۔ بعد نماز عصر طلبائے قدیم مدرسۃ الاصلاح کی جانب سے دیے گئے عصرانہ میں مندوبین و حاضرین نے شرکت کی۔

بعد نماز مغرب ساڑھے پانچ بجے مقالات کی نشست دوبارہ شروع ہوئی۔شبلی اکیڈمی کے کانفرنس ہال میں پروفیسر ظفر احمد صدیقی کی صدارت اور ڈاکٹر محمد طاہر کی نظامت میں مولوی فضل الرحمٰن اصلاحی نے ”دارالمصنّفین اور مولانا حمیدالدین فراہی“، جناب احمد کلیم فلاحی نے ”علامہ شبلی نعمانی کی شاعری کے پس پشت کارفرما عناصر“،ڈاکٹر جمشید احمد ندوی نے ”علامہ شبلی کا فیضان مسلسل: دارالمصنّفین“، مولانا اشہد رفیق ندوی نے ”عظمت رفتہ کی بازیافت میں شبلی کا کردار-تعلیم کے حوالہ سے“،ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے ”مراسلات شبلی-ایک مطالعہ“،مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی نے ”یادگار شبلی کے قیام و بقا میں علامہ فراہی کا کردار“، پروفیسر خالد محمود نے ”سفرنامہ روم ومصروشام“اور راقم الحروف نے ”ذکر مسعودؔ“ کے نام سے مقالات پیش کیے۔

ہال نمبرا میں پروفیسر ڈیوڈ لیلی ولڈ کی صدارت میں انگریزی مقالات پڑھے گئے۔ پروفیسر عبدالحمید براشق نے "Turkey's Shibli: Shibli Nomani Studies in Turkish"، پروفیسر عبدالقادر جعفری نے "Analytical Study of Allama Shibli's Persian Poetry"، پروفیسر طالب الپ نے "Our Decline and its Cause" اور ڈاکٹر جاوید علی خان نے "Shibli and Indian Politics" کے موضوع پر مقالات پڑھے۔

ہال نمبر۲ میں پروفیسر جمیل فاروقی کی صدارت اور ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی کی نظامت میں کل سات مقالات پیش کیے گئے۔ پروفیسر علا محمد رافت نے ”سفرنامہ روم ومصروشام-قرأۃ و تحلیل“، پروفیسر محمود علاوی نے ”قرأۃ فی کتاب شعرالعجم لشبلی النعمانی“،مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی نے ”علامہ شبلی نعمانی اور مسئلہ خلافت“،ڈاکٹر محمد ایوب واقف نے ”سفرنامہ روم ومصروشام“، ڈاکٹر محمد عارف عمری نے ”مسلمانان ہند کا مذہبی تشخص-فکر شبلی کے آئینہ میں“، ڈاکٹر محی الدین آزاد نے ”علامہ شبلی نعمانی اور جدید عربی ادب کا ارتقاء-سفرنامہ کے حوالہ سے“ کے عناوین پر مقالات پیش کیے۔

www.shibliacademy.org

اس نشست کے بعد دس بجے شب میں ایک مختصر بزم مشاعرہ منعقد ہوئی۔ گولڈن جبلی میں بھی دوسرے دن شب کو پنڈت آنند نرائن ملا کی صدارت میں ایک ادبی نشست منعقد ہوئی تھی، جس میں روش صدیقی، حبیب احمد صدیقی، جگن ناتھ آزاد، عارف عباسی، شمس الرحمٰن قیسی فاروقی اور یحییٰ اعظمی وغیرہ نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا تھا۔ یہ مختصر محفل مشاعرہ پروفیسر خالد محمود کی صدارت اور ڈاکٹر عمیر منظر کی نظامت میں منعقد کی گئی، جس میں ڈاکٹر اے عبداللہ (امریکہ)، پروفیسر شہپر رسول، میکس بروس نادر (امریکہ)، جناب شمیم طارق، ڈاکٹر شمس بدایونی، ڈاکٹر احمد محفوظ، جناب مصداق اعظمی اور جناب نیاز جیراجپوری وغیرہ نے اپنے اشعار سے سامعین و حاضرین کی ضیافت طبع کا سامان کیا۔ یہ ایک مختصر لیکن کامیاب بین الاقوامی شعری مجلس تھی۔

اگلے روز تمام مقالات شبلی اکیڈمی کے کانفرنس ہال اور لائبریری ہال میں پڑھے گئے۔ پہلی دسمبر کو صبح ۹ بجے شبلی اکیڈمی کے کانفرنس ہال میں پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی کی صدارت اور ڈاکٹر ایاز احمد اصلاحی کی نظامت میں پروفیسر سید سلمان ندوی خلف الصدق علامہ سید سلیمان ندوی نے ''مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا شبلی اور مولانا تھانوی''، پروفیسر جسٹس محمد الغزالی نے ''علم کلام پر علامہ شبلی کے کارنامے کے چند پہلو''، ڈاکٹر احمد محفوظ نے ''نئے ادبی اصول اور شبلی''، مولانا عمیر الصدیق دریابادی نے ''حضرت مولانا سید سلیمان ندوی'' اور مولانا نسیم ظہیر اصلاحی نے ''علامہ شبلی اور علم حدیث'' کے عنوان سے مقالات پڑھے۔

لائبریری ہال میں مولانا محمد طاہر مدنی کی صدارت اور ڈاکٹر علاء الدین خاں کی نظامت میں ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی نے ''نگارشات شبلی میں قرآنی مباحث''، حکیم شمیم ارشاد اعظمی نے ''علامہ شبلی اور طب یونانی''، ڈاکٹر محمد طاہر نے ''شبلی کی سخنوری اردو کے حوالے سے''، ڈاکٹر محمد آصف زہری نے ''علامہ شبلی کی نظموں میں احتجاج اور مزاحمت''، مولانا فریدالدین ندوی نے ''منہج تنقید العلامہ شبلی النعمانی دعاوی المستشر قین'' کے عنوانات سے مقالات پیش کیے۔

اس کے بعد ۱۵ منٹ چائے کے لیے وقفہ ہوا۔ وقفہ کے بعد پونے بارہ بجے شبلی اکیڈمی کے کانفرنس ہال میں پروفیسر خالد محمود کی صدارت اور مولانا نسیم ظہیر اصلاحی کی نظامت میں جناب یوسف قاراچانے ''علامہ شبلی اور نظام تعلیم''، پروفیسر شہپر رسول نے ''شبلی کی قطعہ نگاری''،

www.shibliacademy.org

پروفیسر ابوسفیان اصلاحی نے ''سیرۃ النبی میں قرآنیات''، پروفیسر محمد سمیع اختر نے ''عربی زبان و ادب کی ترویج اور شبلی''، ڈاکٹر علاء الدین خاں نے ''نیشنل اسکول اور شبلی'' کے عنوان سے مقالات پڑھے۔

لائبریری ہال میں پروفیسر طالب الپ کی صدارت میں پروفیسر ڈیوڈ لیلی ولڈ نے "Rooted Cosmopolitanism: Shibli; Sir Sayed and Aligarh"، ڈاکٹر ارشد اسلام نے "Contribution of Darul Musannefin to the Study of the History of Islam in Europ"، ڈاکٹر عبداللہ امتیاز نے ''علامہ شبلی کا جدید نظریہ تعلیم اور اس کے محرکات''، ڈاکٹر راجرشی گھوش نے "Use of History: Shibli Nomani and the Muslim Middle Class in Colonial Bengal" کے عنوان سے مقالات پیش کیے۔ یہ نشست پونے بارہ بجے سے ۱ بجے تک چلی۔ اس کے ڈیڑھ گھنٹے بعد ڈھائی بجے اختتامی اجلاس منعقد کیا گیا۔

اختتامی اجلاس کی صدارت ڈاکٹر سید سلمان ندوی صاحب ڈربن کو کرنی تھی لیکن علی گڑھ روانگی کے سبب اس اجلاس کی صدارت پروفیسر اشتیاق احمد ظلی اور نظامت ڈاکٹر محمد عارف عمری نے کی۔ ناظم اجلاس نے مختصر تمہید کے بعد تاثرات کے لیے سب سے پہلے بہار کے سابق رکن اسمبلی جناب اختر الایمان کو دعوت دی۔ انہوں نے کہا کہ عصر حاضر میں فکر شبلی سے استفادہ کی سخت ضرورت ہے۔ مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی نے کہا کہ اس قدر وسیع پیمانے پر اعظم گڑھ جیسی چھوٹی جگہ پر بین الاقوامی سمینار اس سلیقہ سے کرنا بڑی بات ہے، ہم اس کے کارکنان بالخصوص پروفیسر اشتیاق احمد ظلی اور ان کے رفیق کار مولانا عمیر الصدیق ندوی وغیرہ کو مبارک باد دیتے ہیں۔ ترکی کے عبدالحمید براشق نے کہا کہ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے مجھے اس علمی مجلس کا حصہ بننے کے لیے مدعو کیا، اس سے مجھے بہت خوشی و مسرت حاصل ہوئی، انہوں نے کہا کہ جب میں نے ترکی سے ہندوستان آنے کا ارادہ کیا تو ذہن میں ایک بات یہ تھی کہ جس شبلی کا نام پوری دنیا میں انتہائی عزت واحترام کے ساتھ لیا جاتا ہے اور جن کی کوششوں سے قائم شبلی اکیڈمی پوری دنیا میں ایک شناخت رکھتی ہے، وہ انتہائی عظیم الشان اور بلند عمارت میں قائم ہوگی لیکن میں جب یہاں پہنچا تو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی

www.shibliacademy.org

کہ یہ ایک چھوٹی جگہ ہے لیکن ساتھ میں یہ خوش گوار مسرت بھی ہوئی کہ یہاں کے لوگوں کا نظریہ اور دل بہت بڑا اور وسیع ہے۔انہوں نے مزید کہا کہ زندگی نے اگر وفا کیا تو انشاء اللہ میں دارالمصنّفین پھر آنا چاہوں گا۔انہوں نے کہا کہ اکیڈمی مسلمانوں کی وراثت کا اہم حصہ ہے اور نو جوانوں کو اس سے جوڑنے کی ضرورت ہے۔مولانا مستقیم احسن اعظمی نے اپنے تاثرات دل نشین انداز میں پیش کیے اور اس کامیاب سیمینار پر پروفیسر ظلی صاحب اور کارکنان دارالمصنّفین کو ہدیۂ تبریک پیش کیا۔ علامہ شبلی کے اوصاف وکمالات اور ان کے علمی و تحقیقی سرگرمیوں کے حوالہ سے بھی اہم باتیں کیں اور دارالمصنّفین کے اکابر سے اپنے دیرینہ تعلقات کا تذکرہ بھی کیا اور دعائیں دیں کہ اللہ تعالیٰ اس ادارہ اور اس مجلس کے معماروں اور خدمت گزاروں کو ہر قسم کی ترقیات سے نوازے۔جناب شمیم طارق نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ پورے شہر کو ایک ہی رنگ میں رنگا ہوا دیکھا۔سہ روزہ سیمینار میں کل ۷۱ مقالات پیش کیے گئے اور ۹ ممالک کے مندوبین نے اس میں شرکت یہ شبلی اور ان کے اخلاص کا نتیجہ ہے اور اس عظیم کارنامے کے لیے شبلی اکیڈمی کے کارکنان مبارک باد کے مستحق ہیں،انہوں نے مزید کہا کہ شبلی نے ایک نسل کی آبیاری کی جس کے فیض کے چشمے جاری وساری ہیں،انہوں نے آخر میں اس بین الاقوامی سیمینار کے متعلق بعض اہم تجاویز پیش کیں،پروفیسر رفاقت علی خاں نے کہا کہ دارالمصنّفین اور یہاں کے لوگ قوم کی امانت ہیں،اس سے وابستہ محققین وادباء نے جس بے سروسامانی میں علم وتحقیق اور ادب کی خدمت کی ہے اور حتی الامکان اپنے عہد کے چیلنجز کا سامنا کیا ہے،وہ لائق تعریف ہے،مگر اب نئی صدی میں ایک جامع پالیسی اور ہدف کے ذریعہ ہی متعینہ مقاصد کی تکمیل ہوسکتی ہے کیونکہ اب پہلے کے مقابلہ میں چیلنجز زیادہ ہیں۔آخر میں پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے کہا کہ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی قومی ورثہ ہے،انہوں نے حاضرین ومندوبین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ آج میرے جسم کا ایک ایک رویاں بے پایاں احساس تشکر سے سرشار ہے،میں سوچتا تھا کہ اتنا بڑا کام کیسے انجام پائے گا لیکن یہ سب اللہ کا کرم ہے کہ یہ کام ہم لوگ انجام دے سکے۔مجھے امید ہے کہ آپ کی دعاؤں کے سہارے یہ سفر مستقبل میں بھی جاری رہے گا۔انہوں نے مزید کہا کہ شبلی نے ایک صدی قبل برادران وطن کی تہذیب وثقافت اور ان کی مذہبی روایات واقدار کو جاننے اور سمجھنے کی

www.shibliacademy.org

اہمیت کو محسوس کیا تھا۔ضرورت ہے کہ نئی صدی میں ہم تقابل ادیان کا شعبہ قائم کریں اور شبلی کے اس خواب کو پورا کریں جس میں انہوں نے سب کے ساتھ مل کر اس ملک کی خوش حالی کا خواب دیکھا تھا۔انہوں نے کہا کہ نئی صدی کی ضرورتوں کے لحاظ سے نئی پالیسیوں کو بنانے کی ضرورت ہے۔علم و تحقیق کے جس معیار پر دنیا کام کر رہی ہے ہمیں بھی اسی انداز پر کام کرنا ہوگا۔انہوں نے مزید کہا کہ ہمیں احساس ہے کہ شبلی اکیڈمی کے بہت سے منصوبے ابھی ادھورے ہیں،ان کی تکمیل ہماری ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ہم تاریخ اسلام کے نامکمل سلسلہ کی تکمیل، یورپ،ملیشیا،انڈونیشیا میں اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کو بھی اپنی تحقیقات کے زمرہ میں لانا چاہتے ہیں۔علامہ شبلی کا ایک اہم کام حفاظت و اشاعت اسلام سے متعلق تھا۔اہل نظر واقف ہیں کہ موجودہ حالات میں اس کی ضرورت اور اہمیت کتنی بڑھ چکی ہے۔مزید براں ان دنوں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف الزامات کی لے تیز ہو چکی ہے،اس کے جواب کا بھی منصوبہ ہمیں بنانا ہوگا۔انہوں نے کہا کہ جب اکیڈمی کی نظامت مجھے سپرد کی گئی تو اس کا ہر گوشہ توجہ کا طالب تھا،جب مجھے یہ خیال آتا تھا کہ علامہ شبلی نعمانی کی وفات اور اس ادارہ کی بنیاد کو سو سال ہو رہے ہیں تو اس کے تقاضوں اور ضروریات کے پیش نظر مجھے اپنی کم مائیگی کا شدت سے احساس ہوتا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ممکن ہو سکے گا لیکن اللہ نے اس کے لیے اسباب پیدا کیے جو آپ کے سامنے ہیں۔ادارہ نے ایک برس قبل جو پکار لگائی تھی اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ آپ یہ یاد کریں علامہ شبلی نے ہمارے لیے کیا کیا،ان کے بعد اس ادارے کے معماروں مولانا سید سلیمان ندوی،مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی وغیرہ نے ان کے منصوبوں کو کس طرح بہترین انداز میں پایہ تکمیل تک پہنچانے کی مسلسل کوشش کی اور اب عہد حاضر میں اس کے تقاضے کیا ہیں اس پر غور کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے حاضرین کو یقین دلایا کہ اس موقع پر جو مشورے دیے گئے ہیں ان پر عمل کرنے کی حتی الامکان کوشش کی جائے گی۔انہوں نے آخر میں ان تمام علمی و تعلیمی اداروں اور کارکنان شبلی اکیڈمی اور اپنے تمام محسنین کا شکریہ ادا کیا،جنہوں نے شبلی تقریبات کو کامیاب بنانے میں کسی طرح کا بھی تعاون دیا۔خاص طور سے ضلع انتظامیہ اور الکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے اس پورے پروگرام کی تشہیر میں پوری دلچسپی دکھائی۔جناب راجیو رنجن،جناب حوالدار یادو اور ڈاکٹر

www.shibliacademy.org

انوپ سنگھ نے اس سلسلہ میں خاص طور پر حصہ لیا تھا، ان کا شکریہ ادا کیا۔ پھر اس کے بعد ناظم اجلاس ڈاکٹر محمد عارف عمری صاحب نے اجلاس کے اختتام کا اعلان کیا۔

بیرونی ممالک کے مندوبین نے علامہ شبلی اور دارالمصنّفین کے متعلق اپنے جن احساسات وتاثرات کا اظہار کیا، ان کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ ترکی کے ممتاز اسکالر یوسف قاراچا نے کہا کہ ساٹھ کی دہائی میں یہاں آنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس وقت علامہ شبلی سے جو دلچسپی پیدا ہوئی تھی اس کا عملی ثبوت میں نے الغزالی، سیرۃ النبی اور سفرنامہ روم ومصر وشام کا ترکی زبان میں ترجمہ کرکے دیا ہے، جو وہاں پر بہت مقبول ہیں۔ انہوں نے اس موقع پر ترکی کے صدر طیب اردگان کا اکیڈمی اور بین الاقوامی سیمینار کے مندوبین کی خدمت میں سلام پیش کیا۔ پاکستان کے ممتاز اسکالر جسٹس محمد الغزالی نے کہا کہ علامہ شبلی کا بڑا کارنامہ سید سلیمان ندوی کی تربیت ہے۔ انہوں نے کہا کہ اصلی کام آدمی کی تصنیف ہے، انہوں نے اپنے پیچھے اہل قلم کی ایک صف کھڑی کردی۔ ہندوستان اور پاکستان میں کوئی بھی ایسا ممتاز ادارہ نہیں کہ جہاں شبلی وشاگردان شبلی کی علمی وادبی خدمات کا تذکرہ نہ ہوتا ہو۔ پروفیسر سید سلمان ندوی خلف الصدق علامہ سید سلیمان ندوی نے کہا کہ علامہ شبلی کی عبقریت ایک صدی بعد بھی برقرار ہے، علامہ شبلی سے جو محبت وعقیدت والد صاحب کو تھی وہ ناقابل بیان ہے۔ انہوں نے حضرت تھانویؒ سے بیعت وارادت کے باوجود مولانا شبلی سے وفاداری وعقیدت ومحبت میں کوئی فرق نہیں آنے دیا اور تزکیہ واحسان کی راہ بھی اس عقیدت ومحبت کو کم نہ کرسکی۔ پروفیسر سامی سلیمان نے کہا کہ ہمارے مطالعہ کے مطابق علامہ شبلی کی مقبولیت مصر میں ہندوستان سے کم نہیں، علامہ شبلی روشنی کے ایسے مینار تھے، جس کی روشنی سے دنیا کا ہر گوشہ روشن ہے۔

عرب اور ترکی کے محققین کے سلسلہ میں خاص بات یہ تھی کہ ان میں زیادہ تر اردو زبان سے اچھی طرح واقف تھے اور بعض نے اپنے مقالات اردو زبان میں پیش کیے، اس سے بیرونی ممالک میں اردو سے دلچسپی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ پروفیسر جلال السعید حفناوی، ڈاکٹر محمود علاوی، پروفیسر علا محمد رافت وغیرہ اردو میں گفتگو کررہے تھے اور اپنا مقالہ اردو میں پیش کیا، پروفیسر جلال السعید کے بیان کے مطابق ۱۹۳۱ء سے مصر کی متعدد یونیورسٹیوں میں باقاعدہ اردو کے شعبے قائم ہیں اور وہاں اردو پڑھائی جاتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ علامہ شبلی کی الفاروق، الکلام، علم الکلام،

www.shibliacademy.org

سفرنامہ روم و مصر و شام کا عربی میں ترجمہ انہوں نے ہی کیا ہے۔انہوں نے کہا کہ شبلی عالمی سطح کے عالم دین اور مفکر و دانشور تھے۔انہیں مصر میں بہت عزت و احترام سے دیکھا جاتا ہے اور ان کی تصنیفات کے ترجموں کو پسند کیا جاتا ہے۔عصر کے بعد شبلی چلڈرن اسکول، نظام آباد کی طرف سے دیے گئے عصرانہ میں مندوبین نے شرکت کی۔

دارالمصنّفین میں شبلی صدی تقریبات کے آغاز کا سب سے مرکزی اور اہم کام سہ روزہ بین الاقوامی سمینار کا انعقاد تھا، جس کی تفصیلات سطور بالا میں نقل کی گئی ہیں، اس میں کل ۹۲ مقالات پیش کیے گئے، جس میں ۹ عربی زبان اور ۱۴ انگریزی میں تھے لیکن سمینار میں کل ۷۱ مقالات پڑھے گئے۔ان مقالات کی تلخیص ’’تلخیص مقالات شبلی صدی بین الاقوامی سمینار منعقدہ ۲۹ رنومبر تا یکم دسمبر ۲۰۱۴ء‘‘ کے عنوان سے ۱۹۲ صفحات پر مشتمل مندوبین کو پیش کر دی گئی تھی۔

ان تقریبات کو یادگار بنانے کے لیے کئی مہینہ قبل سے عمارتوں پر رنگ و روغن کا کام شروع کر دیا گیا تھا، سب سے مشکل کام کتب خانہ کے اندر کی پینٹنگ تھی، کتابوں سے بھری سینکڑوں الماریاں ہٹائی گئیں، کتب خانہ کے اندر کے مرکزی ہال، علامہ سید سلیمان ندوی ہال اور داہنے بائیں جانب دونوں ہالوں کی بلند بالا چھت کی صفائی اور پینٹنگ میں خاصا وقت لگا۔ ان کے علاوہ کانفرنس ہال، مہمان خانہ، مسجد، دفتر اور رہائشی مکانات وغیرہ کے بیرونی حصہ پر سفید رنگ کی چادر اڑھا دی گئی، جس نے خاص طور پر مہمانوں اور زائرین کے دامن دل کو اپنی جانب کھینچا۔ادارہ کے ہر حصہ کو صاف ستھرا کر دیا گیا تھا اور پورا احاطہ روشنی سے جگمگا رہا تھا، پورا شہر اس منظر کو دیکھنے اور اس منظر کو تصویروں میں قید کرنے کے لیے ٹوٹ پڑا۔ دارالمصنّفین کے محدود خدمت گزاروں نے تو اپنی جان کی بازی لگا دی تھی۔ ہر فرد متحرک تھا، جس کے ذمہ جو کام دیا گیا اس نے نہایت ایمان داری اور دیانت داری سے انجام دیا۔ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب نے ادارہ کی خدمت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے، خاص طور پر ان تقریبات کو یادگار و تاریخ ساز بنانے کے لیے انہوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔مولانا حافظ عمیر الصدیق ندوی نے اس موقع کے تمام علمی کام بالخصوص پرنٹ میڈیا کی تمام ذمہ داریاں اپنے سر اوڑھ لیں اور ان کو دارالمصنّفین اور علامہ شبلی سے متعلق تمام معلومات فراہم بلکہ املا کراتے رہتے تھے۔ راقم

www.shibliacademy.org

نے انہیں کی نگرانی میں عمدہ علمی نمائش کا اہتمام کیا جو مہمانوں اور زائرین کے لیے بہترین علمی اور ثقافتی ضیافت ثابت ہوئی، میوزیم میں پہلے علامہ شبلی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی اور قدیم رفقائے دارالمصنّفین سے متعلق فریم دیواروں پر آویزاں تھے،ان کو پھر سے ازسرنو نہ صرف مرتب کیا بلکہ اس میں عہد حاضر تک کے رفقاء کا اضافہ کیا گیا۔اس کے علاوہ دارالمصنّفین عہد بہ عہد بہ اعتبار نظامت کے عنوان سے الگ فریم بنائے گئے،جس میں ہر ناظم کے عہد میں مجلس منتظمہ اور مجلس عاملہ کے صدور،رفقاء واعزازی رفقاء،مہتمم یا جوائنٹ سکریٹری کے نام اوران کے عہد کی مطبوعات وتصنیفات درج کی گئی ہیں۔دارالمصنّفین کے اراکین،ممتاز زائرین، حیاتی اراکین اور علامہ شبلی اور دارالمصنّفین کے نظماء،عربی اور اردو میں پیش کیے گئے سپاس نامے اور خود دارالمصنّفین نے جن شخصیات کو سپاس نامے پیش کیے تھے ان کے فریم بھی تیار کرائے گئے، مخطوطات ومسودات اور میوزیم میں رکھی گئی تصاویر اور خطوط پر ہندی اور اردو میں ٹیگ تیار کیا گیا، یہ تمام کام کمپیوٹر کتابت کے ذریعہ ہوا جس کو حافظ عبدالرحمٰن قمر عباسی اور حافظ محمد ذاکر نے انجام دیا،اس کے علاوہ کمپیوٹر کے ذریعہ تمام کام مثلاً مقالات وتلخیصات کی حصول یابی،تمام طرح کی مراسلت اوراس موقع پر خاص کتابوں کو طباعت کے لیے بھیجنے سے متعلق کام دن رات ایک کرکے حافظ عبدالرحمٰن قمر عباسی نے انجام دیا۔اسسٹنٹ لائبریرین سلیم جاوید اعظمی نے محمد زاہد، امان اللہ،نصیرالدین،احمد اور نثار احمد (کلو) کے ساتھ مل کران تمام اشیاء کو شوکیس میں نہایت سلیقہ سے رکھا،مولوی فضل الرحمٰن اصلاحی،حافظ محمد شریف اور ابوسعد فلاحی وغیرہ بھی ان کی معاونت کو حاضر تھے۔رہائشی مکانات اور دوسری عمارتوں پر اس موقع کے لیے خاص تختیاں تیار کرائی گئیں، اس خاص موقع پر علامہ سید سلیمان ندوی کی میز اوران کی باقیات کو میوزیم میں رکھ دیا گیا تھا تاکہ ایک جگہ نمائش ہوسکے،اس کے بعد یہ اپنی جگہ پر منتقل کردی جائیں گی۔

شعبہ مراسلات کے انچارج مرزا احمدان بیگ نے پوری لائبریری کو کمپیوٹر پر لانے کے لیے انتہائی اہم پروگرام ''شبلب'' کے نام سے دوسال کی محنت شاقہ کے بعد تیار کیا جس کا افتتاح سمینار کے چندروز قبل پروفیسر ظلی صاحب کے ہاتھوں ہوا۔یہ بھی شبلی صدی تقریبات کے لیے عظیم علمی تحفہ تھا۔میوزیم کی تزئین وآرائش،فریم کی ڈیزائن اور کتب خانہ کی ازسرنو تنظیم میں ان کی تجویزوں

www.shibliacademy.org

اورمشوروں کوخاص اہمیت دی گئی۔ پورے پروگرام کولائیواسٹریم کرنے کے لیےانہوں نے بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے کام لیا اوراس کام میں ان کو ہشام اجمل اعظمی کا پورا تعاون حاصل رہا۔ دارالمصنّفین کے تمام کمپیوٹر کوایک دوسرے سے جوڑنے کا کام انہیں کی محنت کا نتیجہ ہے۔اس کے علاوہ آن لائن پرچیزنگ فارم بھی انہوں نے تیار کر کےشبلی صدی تقریبات کے موقع پرنہایت مفید کام انجام دیا۔

شبلی صدی تقریبات کی خاص تیاریوں میں پروفیسراشتیاق احمدظلی صاحب نے سیرۃ النبی حصہ اول ودوم کوآرٹ پیپر پریادگارایڈیشن شائع کرنے کاپروگرام بنایا تھاجوالحمدللہ پوراہوا۔اس کے علاوہ انہوں نے اس موقع پرشبلی کی آپ بیتی، دارالمصنّفین کےسوسال،شذرات شبلی،محمدشبلی نعمانی۔ لائف اینڈ کنٹری بیوشن اورالانتقاد کامحقق ایڈیشن بھی شبلی صدی مطبوعات کے نام سے دارالمصنّفین کےسلسلہ مطبوعات میں اضافہ کیا۔سیرت عائشہ،دین رحمت،اسلام میں مذہبی رواداری اورخطبات مدراس،عرب وہند کےتعلقات کے ہندی اورانگریزی زبانوں میں ترجموں کی اشاعت بھی شبلی صدی تقریبات کےتحت کرائی اورظاہری لحاظ سے پورے دارالمصنّفین کودلہن بنادیا،جس کے دید کے لیے پوراشہرٹوٹاپڑرہاتھا۔

ان تقریبات کےمصارف کے لیے جوائنٹ سکریٹری جناب عبدالمنان ہلالی،پبلی کیشن انچارج ڈاکٹرفخرالاسلام اعظمی نے مالیات کی فراہمی میں قابل قدرکوششیں کیں،محمد ماجد،ظریف الحسن،اخترالزماں نے آفس کاپوراکام سنبھالا،وصی الرحمٰن نےسمینار کے لیے خط وکتابت اورآفس کےکاموں کےعلاوہ صفائی ستھرائی کےکام کی نگرانی کی۔محمدشاہد،رام شکل،اعجازاحمد،محمداحمد،رشید احمد،محمدحکیم،کلپناتھ اورمحمد فیروز نے اپنے فرائض منصبی بحسن خوبی انجام دیے،محمدعبید،اشتیاق حسین،محمدآصف،محمدراشداورآتمارام (پپو)،سریندرموریہ،دھرم دیونےاپنی ذمہ داری نبھانے میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں کی۔

شبلی صدی تقریبات کےایک حصہ کےطورپر۲۹/نومبر سے۵/دسمبر تک کتاب میلہ کابھی اہتمام کیاگیاجس کی ذمہ داری جناب راجیورنجن نےسنبھالی۔ہندوستان کےاہم اوربڑے ناشرین نے اس میں شرکت کی،دیپ پرکاش،نیشنل بک ٹرسٹ،راج کمل پرکاشن،رادھا کرشنا پرکاشن،

www.shibliacademy.org

ساہتیہ اکیڈمی، ساہتیہ بھنڈار، ماڈرن پبلی کیشن، بھارتی گیان پیٹھ، ششانک پریس، رضا لائبریری رامپور، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، مکتبہ نعیمیہ اور مکتبہ الفہیم وغیرہ نے اس میں شرکت کی۔ دارالمصنّفین کی کتابیں خاص طور پر اردو داں طبقہ کی توجہ کا مرکز رہیں۔ میلہ میں متعدد ثقافتی اور مقابلہ جاتی پروگرام بھی منعقد کیے گئے جس میں طلبہ وطالبات نے بڑی دلچسپی دکھائی۔

صد سالہ تقریبات کے اختتام کے بعد دارالمصنّفین کے کارکنوں کی جانب سے پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب کو اس کامیاب پروگرام پر مبارک باد دینے کے لیے مجلس تہنیت منعقد کی گئی۔ اس مجلس کی صدارت جوائنٹ سکریٹری جناب عبدالمنان ہلالی اور نظامت راقم السطور نے کی۔ مولانا حافظ محمد عمیر الصدیق صاحب نے پہلے پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا اور اسے پڑھ کر سنایا۔ جس سے حاضرین مجلس پر رقت طاری ہوگئی۔ راقم نے پروفیسر ظلی صاحب کو، ڈاکٹر محمد عارف عمری نے جناب عبدالمنان ہلالی کو، ڈاکٹر جاوید علی خاں نے مولانا عمیر الصدیق دریابادی کو، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی کو یادگاری نشان پیش کیا۔ آخر میں پروفیسر ظلی صاحب نے کارکنان دارالمصنّفین کی جانب سے کی گئی اس قدر افزائی پر ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ شبلی صدی تقریبات کی یہ کامیابی اللہ کے خاص فضل اور آپ حضرات کی بے پناہ محنت کا ثمرہ ہے۔ اب ہماری ذمہ داریاں اور بڑھ گئی ہیں اور قوم ہم سے مزید کا مطالبہ کرتی ہے۔ میرے جسم کی ان بوڑھی ہڈیوں میں جو جان ہے وہ آپ حضرات اور ادارہ کی خدمت کے لیے وقف ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمارے آیندہ سفر کی مشکلات آسان فرمائے اور ہم سب مل کر ادارہ کو ہر قسم کی بلندیوں تک پہنچانے کی کوشش کریں۔ آمین!

www.shibliacademy.org

نذر علامہ شبلی نعمانیؒ

جناب وارث ریاضی

وہ جس کی شخصیت تھی کاشفِ اسرار قرآنی
کرے گی ناز صدیوں جس پہ بزمِ علم و عرفانی
وہ شبلی عالم و سیرت نگارِ رحمتِ عالم
وہ شبلی آسمانِ آگہی کا نیرِ اعظم
وہ شبلی حجتِ اسلام تھا ، حکمت کا داعی تھا
وہ ابن رشد تھا ، اپنے زمانے کا وہ رازی تھا
وہ شبلی جس نے کی دنیائے فکر و فن پہ سلطانی
مگر پھر بھی نہیں تھا اس کو دعوائے ہمہ دانی
وہ شبلی نازشِ شعر و دابِ تنقید کا بانی
جہانِ نثر میں ملتا نہیں اس کا کوئی ثانی
فصاحت اس کی تحریرِ رواں پر ناز کرتی ہے
بلاغت اس کے اسلوب بیاں پر ناز کرتی ہے
تخیل کی فراوانی پہ حیرت ہے زمانے کو
خطابت پر ، سخن دانی پہ حیرت ہے زمانے کو
وہ سرسید کا ہم سر قوم کا رہبر مفکر تھا
مورخ تھا ، محقق تھا ، مصنف تھا مدبر تھا
ہوئے ہیں فیض سے اس کے ہزاروں دیدہ ور پیدا
مصنف ، اہلِ دانش اور اصحابِ نظر پیدا
کبھی ویراں نہیں ہوگا بسایا ہے چمن ایسا
خزاں اس میں نہ آئے گی سجایا ہے چمن ایسا
رہے آٹھوں پہر گردش میں فکر و فن کا پیمانہ
رہے آباد وارث حشر تک شبلی کا مے خانہ

کاشانۂ ادب، سکٹا دیوراج، پوسٹ بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن، بہار۔۸۴۵۴۵۳

www.shibliacademy.org

تصانیف

شبلی صدی تقریبات

سیرۃ النبیؐ حصہ اول ودوم (یادگار ایڈیشن)

علامہ شبلی نعمانی قیمت=/۲۰۰۰روپے

شبلی کی آپ بیتی

ڈاکٹر خالد ندیم قیمت=/۳۲۵روپے

دارالمصنّفین کے سو سال

کلیم صفات اصلاحی قیمت=/۳۵۰روپے

شذرات شبلی (الندوہ کے شذرات)

مرتبہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی قیمت=/۲۲۰روپے

الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی

علامہ شبلی نعمانی۔تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی

قیمت=/۳۵۰روپے

محمد شبلی نعمانی الائف اینڈ کنٹری بیوشنس

ڈاکٹر جاوید علی خاں قیمت=/۲۳۰روپے